نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیوة الدنیا

معیشت و اقتصاد کا اسلامی تصور

حکیم محمود احمد ظفر

Marfat.com

نحن قسمنا بينهم معيشتهم في الحيوة الدنيا

معیشت و اقتصاد
کا
اسلامی تصور

حکیم محمود احمد ظفر

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

* دیناناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۲۴۴۴۱۲، ۷۲۳۲۸۵، فیکس ۹۲-۴۲-۷۲۳۲۸۵

* ۱۹۰ انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۷۲۲۲۹۹۱ - ۷۳۵۲۲۵۵

* موہن روڈ
چوک اردو بازار، کراچی فون ۲۰۲۲۳۰۱

Marfat.com

٧٩٥٦٠

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب .... معیشت واقتصاد کا اسلامی تصور

نام مصنف .... حکیم محمود احمد ظفر

باہتمام .... حافظ زاہد علی

کمپوزر .... محمود 0333-4331105

طبع اول ۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء

ناشر .... ادارہ اسلامیات 190-انارکلی لاہور

کل صفحات 608

قیمت 500/-

مطبع: .... میٹرو پرنٹرز لاہور

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

٭ ـــ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۳۲۴۴۱۲، ۷۳۲۴۴۸۵، فیکس ۹۲-۴۲-۷۳۲۴۴۸۵

٭ ـــ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ـــ ۷۲۲۳۹۹۱-۷۳۵۳۲۵۵

٭ ـــ موہن روڈ
چوک اردو بازار، کراچی فون ۲۷۲۲۴۰۱

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

(الزخرف : ۳۲)

ہم نے بانٹ دی ان میں روزی ان کی

دنیا کی زندگانی میں

Marfat.com

فہرست

معیشت واقتصاد کا اسلامی تصور

- پیش آہنگ 21
  - دو نظاموں کی جنگ 23
  - قیام پاکستان کی جدوجہد 24
- پاکستان ....ایک نظریاتی مملکت 28
  - اسلام ....ایک جامع نظام زندگی 30
  - عقیدۂ ختم نبوت کے اسرار و حکم 33
  - نفاق ....بدترین روگ 40
  - غیر قوموں کی نظریات سے وابستگی 41
  - مغرب زدگی بلکہ عیسائیت زدگی 43
  - اسلام اور نظام اقتصاد 44
- نظام سرمایہ داری کی چند جھلکیاں 49
  - بعث نبوی سے قبل دُنیا کا نظام معیشت 51
  - ایران کی حالت زار 55
  - رومی حکومت کی حالت 62
  - جدید نظامِ سرمایہ داری 68
  - کائنات کا تصور 69

Marfat.com

- تصورِ انسان 70
- ایک معاشی انسان کا مفروضہ 71
- مادہ پرستی 72
- آزادروی 72
- افادیت پسندی 72

سرمایہ دارانہ نظام معیشت 74

- خصوصیات 74
- نجی ملکیت کا استحقاق 74
- مسابقت 74
- ذاتی منافع کا محرک 75
- معاشی آزادی 75
- نظام اُجرت 75
- صارف کی حکمرانی 76
- قیمتوں کی میکانیت 76
- ریاست کی عدم مداخلت 77
- خوبیاں 77
- وسائل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ 77
- ایجادات واختراعات 77
- خامیاں 78
- فکری لغزشیں 78
- طبقاتی کشمکش 78

Marfat.com

- دولت کی غیر منصفانہ تقسیم 78
- ریاست کی عدم مداخلت 79
- غربت کے سائے 80

□ اشتراکی نظام معیشت 82

- اسلامی نظامِ معیشت اور دوسرے معاشی نظاموں میں فرق 85

□ اسلامی معاش کے رہنما اصول 89

- مالک الملک حق تعالیٰ شانہ ہے 89
- ہر شخص کو اکتساب رزق کے مواقع میسر ہیں 89
- تقسیم دولت 92
- اسلام طبقاتی امتیاز کا قائل نہیں 97
- انسان .... خدا کا نائب اور خلیفہ 98
- اسلام .... توازن کا علمبردار 98
- مساواتِ انسانی کا ٹھوس نظریہ 105
- مساوات کا صحیح مفہوم 106
- معاشی اعتبار سے مساوات 107
- معاشرہ کا اصل مرض 111
- تذکیہ قلب کی ضرورت 115
- اسلام میں زندگی کا تصور 116

□ معاشی ناہمواری اور اقتصادی عدم مساوات 119

- معاشی مساوات کے داعی ممالک 126

Marfat.com

- معاشی عدم مساوات کی حکمت 131
- انفرادی ملکیت 133
- ملکیت کی حقیقت 135
- ذاتی ملکیت کے حدود 141
- مال کے حق استعمال کے حدود 142
- مال کو ضائع کرنے کی ممانعت 142
- غیر شرعی مصارف میں صرف کرنے کی ممانعت 144
- اسراف کی ممانعت 145
- عیش کوشی کی ممانعت 147
- ملکیت کے نقصان دہ استعمال کی ممانعت 149

هر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے 152
- کسب رزق میں تقویٰ اختیار کرنا 154
- تبادلۂ دولت اور تقویٰ 156
- کسب معاش اسلام میں ضروری ہے 157

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت 161
- دُنیا کی بے ثباتی اور بے مائیگی 165
- مطامع دنیا کی اصل علت 175

اسلامی معیشت کا اجتماعی نظام 178
- بیت المال 179
- بیت المال کی آمدنی کے ذرائع 181
- زکوٰۃ 182

Marfat.com

- عشر 183
- اجارہ 183
- خراج 184
- جزیہ 186
- غنیمت اور فئے 187
- جاگیریں 188
- دفینے 190
- عطایا اور اوقاف 190
- ضرائب 191
- عشور 193
- لقطہ 195
- لاوارث ترکے 196
- ضبطی 197
- حکومت کے مصارف 198
- کفالت عامہ 199
- معاشی ترقی 204
- تقسیم دولت میں تفاوت کی کمی 208
- اسلامی ریاست کے مصارف کے چند اصول 209
- بیت المال کے دیگر مصارف 233
- (1) وظائف اور تنخواہیں 233
- (2) قرضے 233

Marfat.com

- مردم شماری 234
- حکومتی وظائف 244
  - (1) پہلا شعبہ 263
  - دوسرا شعبہ.........وظائف 270
  - تیسرا شعبہ.........اشاعت اسلام 282
  - ایک شعبہ اور اس کا ازالہ 299
- پیدائش دولت 304
- زراعت 307
- ملکیت زمین 316
  - (1) انفرادی ملکیت 318
  - (2) سرکاری ملکیت یا اجتماعی ملکیت 318
  - قرآن حکیم اور تصور ملکیت 318
- اسلام میں اراضی کی اقسام 320
  - (1) اراضی مفتوحہ 320
  - مفتوحہ اراضی کے بارے میں فاروقی اصطلاحات 322
  - اسلام نے مفتوحہ ممالک کی ہر شے کی حفاظت کی 327
  - زمین کا بندوبست اور پیمائش 328
- اراضی معاہدہ 31
- اراضی مسلم 34
- اراضی خالصہ 36
  - کس قسم کی زمین قطیعہ میں دی جاتی؟ 339

Marfat.com

- زمینیں کس کو دی جاتی ہیں؟ 340
- صاحب زمین کے اختیارات 344
  - زمین کو حبہ کرنا جائز ہے 346
- بنجر زمینیں 349
- قدرتی پیداوار والی زمینیں 354
- زراعت اور باغبانی 360
- مزارعت 368
  - مزارعت کی تعریف 368
  - مزارعت کے جواز میں شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق 375
  - مزارعت کی ممانعت کی بحث 376
  - مزارعت سے ممانعت والی حدیث کی تحقیق 380
  - اجارہ 388
  - مساقات 389
- آبپاشی 391
  - چشموں سے آبپاشی 398
  - تالاب اور کنویں کا حکم 399
- تجارت 401
  - معاشی ترقی کا معنی 402
  - اسلام میں معاشی ترقی کا تصور 403
  - نفع کے لیے تجارت کرنے کا حق 405
  - تجارت کے چند بنیادی اصول 410

Marfat.com

- بیع کی تعریف 412
- اسلام میں چند ناجائز بیع 413
- (1) بیع ملامسہ ملابذہ 414
- (2) کنکری پھینکنے والی اور دھوکہ بیع 414
- (3) بیع پر بیع کرنا 415
- (4) بیع بخش کی ممانعت 416
- (5) تلقی جلب کی ممانعت 417
- (6) شہری کو دیہاتی کا مال فروخت کرنا 418
- (7) قبضہ سے قبل کسی چیز کا فروخت کرنا 418
- (8) مجہول ڈھیر کی بیع ممنوع ہے 420
- (9) ظہور صلاحیت سے قبل درختوں پر پھلوں کی بیع 420
- (10) ہنڈی کی بیع 422

شراکت 425

- اسلام میں شرکت کا جواز 425
- شرکت کے شرائط 427
- شرکت کی قسمیں 427
- (1) شراکت ملک 428
- (2) شراکت عقود 428
- (الف) شراکت مال 428
- (1) شراکت معاوضہ 428
- (2) شرکت عنان 429

Marfat.com

- (ب) شراکت اعمال 430
- (ج) شرکت الوجوہ 430
- شرکت کے احکام 431
- (1) نفع کی تقسیم 431
- (2) نقصان کی ذمہ داری 432
- شراکت کی ذمہ داریاں اور حقوق 432
- شراکت کی مدت 433
- شراکت کی منسوخی 433
- شراکت اور صنعتی کاروبار 434

مضاربت 436

- مضاربت کی اہمیت احادیث سے 438
- مضاربت کے احکام 440
- ارکان مضاربت 442
- مضاربت کے شرائط 442
- مضارب کے حقوق 443
- معاہدہ مضاربت کی مدت 445
- مضاربت میں نفع ونقصان 445
- موجودہ دور میں مضاربت 446

تجارتی بدعنوانیاں 449

- احتکار واکتناز 449
- قمار یا سٹہ 460

Marfat.com

- سود 469
  - سود کیا ہے؟ 474
  - جاہلیت کا ربوا 480
  - تجارت اور سود میں فرق 481
  - سود کی حرمت قرآن حکیم سے 486
  - سود کی مذمت احادیث نبویہ میں 499
  - سود کے مختلف مفاسد 508
  - اسلامی معاشرہ میں بنکوں کا قیام 512
  - اسلامی دنیا میں بلاسود بنک کاری کی ضرورت 515
  - غیرسودی بنک کاری عملی میدان میں 517
  - غیرسودی بنکوں اور مالیاتی اداروں کی اجمالی فہرست 519
  - انشورنس 521
  - انشورنس کا ارتقاء 523
  - انشورنس کے بارے میں علمائے کرام کے نظریات 525
  - علامہ ابن عابدینؒ کا فتویٰ 531
  - انشورنس (بیمہ) کا متبادل نظام 533
- اسلام اور تقسیم دولت 537
  - زمین کا لگان 540
  - منافع 544
  - اجارہ 546
  - اجرتوں کے تعین کا مسئلہ 547

Marfat.com

- اسلامی نظریہ اجرت 548
- محنت کی عظمت 550

زکوٰۃ اور تقسیم دولت 553

- قانونی اقدامات 544
- زکوٰۃ 544
- انسان کسی شی کا حقیقی مالک نہیں 556
- مسلمانوں میں انفاق فی سبیل اللہ کی گرم جوشی 560
- زکوٰۃ کب فرض ہوئی؟ 561
- زکوٰۃ کی مقدار 565
- زکوٰۃ کی مدت کا تعین 568
- زکوٰۃ کے فوائد 568
- زکوٰۃ دہندہ کے متعلق شرائط 573
- مال زکوٰۃ کے متعلق شرائط 574
- زکوٰۃ کن لوگوں کو دی جائے؟ 576
- (1) فقیر 577
- (2) مسکین 577
- (3) عاملین 578
- (4) مؤلفۃ القلوب 578
- (5) فی الرقاب 578
- (6) غارمین 578
- (7) فی سبیل اللہ 579

Marfat.com

- (8) ابن السبیل 579
- کیا ٹیکسوں کی موجودگی میں زکوٰۃ دینا ضروری ہے؟ 580
- کن مالوں پر زکوٰۃ فرض ہے؟ 582
- مال ہے کیا؟ 582
- سونے اور چاندی پر زکوٰۃ 582
- زرنقد پر زکوٰۃ 583
- زرنقد پر زکوٰۃ کی مقدار 584
- زرنقد کا نصاب 585
- مال تجارت پر زکوٰۃ 586
- مال تجارت کی شرائط 587
- مال تجارت پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ 587
- تجارتی زمین پر زکوٰۃ 589
- کمپنیوں پر زکوٰۃ 589
- پراویڈنٹ پر زکوٰۃ 591
- مویشیوں پر زکوٰۃ 591
- زکوٰۃ الفطر 592
- صدقات وخیرات 592

- اسلام کا قانون وراثت 594
  - قانون وراثت کی معاشی اہمیت 596
- اوقاف 599

پیش آہنگ

اسلامی اقتصادیات کے موضوع پر کتابوں کی بازار میں کوئی کمی نہیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید وحمایت میں جو چاہا ہے لکھا ہے، اور چونکہ معاش کا مسئلہ انسانی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس لیے بعض لوگوں نے اپنے افکار ونظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے خدا اور رسول ﷺ کے احکام وفرامین کے غلط استعمال تک سے گریز نہیں کیا اور سلف صالحین کی بعض معروف شخصیتوں کے افکار ونظریات کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا کہ ان کے باطل اور بر خود غلط نظریات کی توثیق ہو سکے۔

افسوس کہ مسلمان قوم کا باشعور طبقہ اپنے دین و مذہب کی بیگانگی کے باعث ہر غلط عقیدہ اور ہر باطل نظریہ سے، دو سو سالہ غلامی کے زیر اثر بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے، اور اس کی اس ذہنی محکومی نے اسے کہیں کا نہیں رکھا۔ اور اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

اسلام کے نظام اقتصادیات پر جن لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے ان میں قابل ذکر نام چند ایک اہل علم ہی کے ہیں۔ اس سلسلہ میں اولیت کا سہرا برصغیر کے مشہور سیاسی زعیم اور نامور عالم دین حضرۃ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی قدس سرہ کے سر بندھتا ہے جنہوں نے اس موضوع پر "اسلام کا اقتصادی نظام" کے عنوان سے ایک جامع کتاب مرتب کی، اور اگرچہ انہوں نے اشتراکی نظام کے معاملہ میں غیر جانب دار مبصر سے زیادہ ایک جانب دار محقق کا انداز اختیار کیا مگر چونکہ مولانا موصوف نیشلسٹ ذہن کے سیاسی راہ نما تھے اور جس دور میں انہوں نے یہ کتاب لکھی وہ دور برطانوی امپریلزم اور امریکی

Marfat.com

استعمار کے عروج و کمال کا دور تھا، اس لیے آزادی پسند طبقہ روس کے اشتراکی نظام کی جانب امید کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس سیاسی پس منظر کے ساتھ اشتراکیت کی حمایت کا سبب بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ نے اپنی اس عالمانہ کتاب میں زیادہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے معاشی نظریات کو پیش کیا ہے اور کہیں کہیں انہیں اشتراکی اصولوں پر منطبق کرنے کی غیر شعوری کوشش بھی کی ہے۔

ان کے بعد جناب مظہر الدین صدیقی نے اشتراکیت اور اسلام کے تقابلی مطالعہ پر ایک سبوط کتاب لکھی مگر وہ عوامی ذہن کے لیے چنداں مفید مطلب ثابت نہ ہوئی اور اس کا مخاطب زیادہ تر وہ طبقہ تھا جو کمیونزم کے فلسفہ سے متاثر تھا۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی قدس سرہ نے ''اسلامی معاشیات'' کے عنوان سے جو کتاب لکھی اس میں انہوں نے ہر پھر کر ابن حزم اندلسیؒ کے نظریات ہی کی تائید پر اکتفا کیا' اور جیسا کہ ان کا علمی اور ادبی مقام تھا وہ اپنے موضوع سے پوری طرح انصاف نہ کر سکے ان کی کتاب میں مضامین کا تکرار بھی کھٹکتا ہے، اور انہوں نے کتاب کو علمی اور تحقیقی مواد کی بہ نسبت صحافتی اور اخباری انداز میں مرتب کیا ہے جس سے اس کی افادیت مجروح ہو گئی ہے۔

جناب سید مودودی صاحب نے اسلام کے معاشی نظریہ کو نہایت منقح کر کے پیش کیا اور ان کی اس سلسلہ میں یہ ایک بہت اچھی کاوش ہے لیکن بعض حلقے ان سے استفادہ نہیں کرنا چاہتے۔

بہر حال اس سلسلہ میں احقر نے بھی کوشش کی ہے اور اسلامی اقتصادیات کو اپنی استطاعت کے مطابق ایک اچھے اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے، امید ہے کہ قارئین کرام کو یہ انداز پسند آئے گا۔

محتاج دعا: (حکیم) محمود احمد ظفر۔ سیالکوٹ
فون نمبر: 0300-6106968
10 اگست 2005ء مطابق 4 رجب 1426ھ

29070

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دنیا کے پس ماندہ اور ترقی پذیر ملکوں میں جو ایک طویل عرصہ کی غلامی کے بعد آزادی سے ہم کنار ہوئے ہیں، وہاں استعماری قوتوں اور سامراجی طاقتوں نے بعض ایسی سیاسی اور اقتصادی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں کہ یہ ملک قومی اور ملکی تعمیر و ترقی کے کثیر المقاصد منصوبوں پر عمل درآمد کے بجائے داخلی الجھنوں اور اندرونی مسائل میں الجھ کر رہ گئے۔ یہ الجھنیں سیاسی بھی ہیں، اقتصادی بھی ہیں، مذہبی اور تہذیبی امور سے بھی متعلق ہیں اور نظریات و افکار کے باہمی تصادم کے نتیجہ میں بھی ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔

دو نظاموں کی جنگ:

دنیا اس وقت دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام حکومت اور نظام معیشت ہے اور دوسری جانب کمیونزم اور سوشلزم کے اصولوں پر مبنی انداز فکر ہے۔ دونوں قوتیں اپنے اپنے نظریات کے لیے جدید ترین وسائل سے بہرہ ور ہیں اور خلق خدا کو اپنے دام ہم رنگ زمین میں پھانسنے کے لیے گہری چالیں چل رہی ہیں۔ کمیونزم اگر چہ اس زمانہ میں فیل ہو چکا ہے لیکن پھر بھی چین اور روس کا خاص علاقہ ابھی تک اس نظریہ کا پرچار کر رہا ہے۔

نظریات و افکار کا یہ ٹکراؤ انسانی مشکلات و مصائب کا ازالہ کرنے کے بجائے انسانیت کے لیے ذہنی اور جسمانی اذیت کے نت نئے سامان مہیا کر رہا ہے اور لوگ ایک مفروضہ جنت کے دھوکہ میں کبھی ادھر لپکتے ہیں اور کبھی ادھر۔ منزل مقصود کا سراغ گم ہو چکا ہے اور ''شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا'' کی کیفیت ہر طرف نمایاں ہے اور ''کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا است'' کی صورت حال درپیش ہے۔

قومیں جب راہ و منزل کی تلاش میں بھٹک جاتی ہیں تو ان کی گمراہی کا سلسلہ بڑا

Marfat.com

ہی خطرناک ہوتا ہے، بلکہ یہ خطرہ بھی ممکن الوقوع ہوتا ہے کہ ایسی گم کردہ راہ قومیں اپنے قومی تشخص ہی سے محروم نہ ہو جائیں۔ پاکستان اس وقت ایسے ہی سنگین حالات سے دو چار ہے۔ گذشتہ اٹھاون برس میں فرنگی استعمار کی دوسو سالہ غلامی سے رہائی حاصل کرنے کے بعد استعمار کے پیدا کردہ مسائل نے پاکستانی قوم کو نظریات کے ایک ایسے چوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ وہ ہر چہار جانب ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح ٹک ٹک دیکھ رہی ہے، اور نہیں جانتی کہ اس کی منزل کا راستہ کون سا ہے؟ حالانکہ جب یہی قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی تو اس کی منزل اس کے سامنے تھی اور منزل تک پہنچنے والی شاہراہ بھی اس کی نظروں کے آگے تھی، مگر اب اس کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک ایک کے چہرے کو تک رہی ہے کہ شاید کوئی اسے منزل تک پہنچا دے۔ شاعر نے غالباً اسی قسم کی کیفیت کے پیش نظر یہ شعر کہا تھا۔ اس شعر کا مصداق ہم سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے ۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک رہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

یہ بات ساری دنیا پر آشکارا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ، مستقل اور خود مختار سلطنت کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا تھا اور جس کی حمایت قوم نے کی تھی، وہ یہ تھا کہ اس برصغیر کے مسلمان اپنی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی اقدار کا تحفظ کرنا چاہتے تھے اور اپنی دینی روایات، قومی امتیازات اور مذہبی خصوصیات کے تحت زندگی گزارنا ان کا اولین مقصد تھا۔

قیام پاکستان کی جدوجہد:

اس مقصد کے لیے مسلمانانِ پاک و ہند نے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور اس غرض و غایت کے حصول کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں بہ طیب خاطر گوارا کیا اور بالآخر ایک فعال قیادت اور جاندار لیڈر شپ کی سرکردگی میں وہ اپنا نصب العین پانے میں کامیاب و سرخرو ہو گئے، لیکن قوم و ملک کی بدقسمتی دیکھئے کہ ادھر سفر کا آغاز ہوا اور ادھر منزل کا نشان گم ہو کر رہ گیا۔ وہ دن اور آج کا دن یہ قوم بظاہر سرگرم سفر ہے

Marfat.com

لیکن اس کے سفر کی نوعیت کولہو کے اس بیل کی طرح ہے جو صبح کو چلتا ہے تو شام تک جب اس کی آنکھوں سے پٹی اترتی ہے، وہ اپنے سفر کے نقطۂ آغاز سے ایک قدم آگے نہیں بڑھا ہوتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ تھکن اس کو نڈھال کر دیتی ہے اور سارے دن کی تگ و دو سے اس کا سر چکرانے لگتا ہے۔ پاکستان کے مسلمان بھی ایسی ہی شدید اور کربناک تھکن اور دماغی چکر کا شکار ہیں۔ ذرا اٹھاون سال پیچھے مڑ کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں قیام پاکستان کے وقت کھڑے تھے بلکہ بعض لحاظ سے اس سے بہت پیچھے ہیں کیونکہ اس وقت ہر شخص کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ تھی، قوم میں اخلاقی اور تہذیبی اقدار کا چلن تھا، لوگوں میں اسلام کی سچی محبت تھی، منافقت کا نام ونشان نہیں تھا، باہمی الفت ومحبت کا دور دورہ تھا۔ آج یہ سب چیزیں اور تمام اقدار قصۂ ماضی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اگرچہ قوموں کی زندگی میں نصف صدی کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا لیکن جن قوموں میں منزل کی سچی لگن موجود ہو، ان کے لیے ایک ایک دن ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔

نصف صدی کے اس سفر میں ہمیں کیا حاصل ہوا، کپڑے کے چند کارخانے، غیر ملکی مال سے اٹی ہوئی چند دکانیں، مغربی ثقافت کے ایمان سوز جلوے، بے حیائی، فحاشی، عریانی اور بے راہ روی کے دل فریب نظارے، عیش وعشرت کے ہنگامے، گناہ و معصیت کے ترانے اور اخلاق باختگی، عصمت فروشی، بے آبروئی اور مادر پدر آزادی کے جان لیوا مظاہرے، بسنت اور جشن بہاراں کے نام پر حیا سوز مشاہدے۔ ''یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں''۔

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابن آدم نے
خرد گنوا کے جنوں آزما کے کیا پایا؟
وہی شکستہ تمنا، وہی غم ایام
نگار زیست کے جلوے لٹا کے کیا پایا؟

گذشتہ اٹھاون برس کے عرصہ میں ملک میں چار دفعہ مارشل لا لگا، سینکڑوں مرتبہ گولی چلی، فسادات رونما ہوئے، غارت گری کا بازار گرم ہوا، مسجدوں اور امام بارگاہوں میں کئی مرتبہ خون کی ہولی کھیلی گئی، اغواء کی وارداتیں بڑھنے لگیں، طبقاتی امتیاز کو

Marfat.com

فروغ حاصل ہوا، غربت وامارت کا تضاد نمایاں تر ہوا، اقتصادی بدحالی کا عفریت ننگا ہو کر ناچنے لگا، رشوت ستانی نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، سودی کاروبار کو دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوئی، جوئے بازی کو قانون نے سند جواز عطا کی، شراب وشاہد کے کاروبار کی وہ ارزانی ہوئی کہ ہر شخص نے ملکی مفاد اور قومی احساس کو ''ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ'' کی نذر کر دیا۔ بنکوں کو قومی ملکیت میں لے کر سیاست دانوں اور بیورو کریٹس سے اس طرح لٹوایا گیا جیسے بھوکے ضیافت کو لوٹتے ہیں، ملک کو قرضوں کے شکنجوں میں اس طرح کس طرح دیا گیا کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ قرض کا بار گراں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ حال اس قوم کا ہوا جس کے عزم نے انگریز کی طاغوتی قوت کو اور ہندو کی دسیسہ کاریوں کو عبرت ناک ذلت وخواری سے دوچار کیا تھا۔ جو اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتی تھی، ایک نصب العین کی حامل تھی اور ایک مقصد حیات کے لیے کام کر رہی تھی، لیکن گذشتہ اٹھاون برس کے اندر اس کا نصب العین، اس کے نظریات اور اس کا مقصد زندگی کچھ اس طرح ایک سازش کے تحت اس کی نظروں سے اوجھل ہوئے کہ وہ ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح ہو کر رہ گئی۔ اب نہ اس کی ملکی پالیسیاں اپنی ہیں، نہ اس کا نصاب تعلیم اپنا ہے، نہ اس کے نظریات اپنے ہیں، نہ اس کی اخلاقی اقدار اپنی ہیں اور نہ اس کی ثقافت اور تہذیب وتمدن اپنا ہے۔ گویا اب وہ اس قسم کی تصویر ہو کر رہ گئی ہے کہ

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے
آنکھیں نرگس کی، دہن غنچے کا حیرت میری

ایسے پُر آشوب دور میں ان طالع آزماؤں کی بن آئی جو اس قسم کے موقعوں پر ہمیشہ اپنی دوکان ہوس چمکانے کے لیے ملمع سازی کا سہارا لیا کرتے ہیں، اور جن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ چشم خریدار کو دکھاوے اور دل بہلاوے کے ساز وسامان سے فریب دے کر اپنے عیش وعشرت کا سامان فراہم کریں۔ ان شعبدہ بازوں میں جبّہ وقبّہ کا بہروپ بھرنے والے مذہبی اجارہ دار بھی تھے، سیاسی شطرنج کے پرانے مہرہ باز بھی تھے، ثقافتی اور تہذیبی ناٹک رچانے والے بھی تھے اور اقتصادی اور معاشی بہبود کے کھوکھلے نعرے لگانے والے مداری بھی تھے۔ ہر شخص کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکلا تھا، ہر ایک نے

Marfat.com

اپنے فن کو آزمایا، ہر شخص نے چابک دستی کا ایک دوسرے سے بڑھ کر مظاہرہ کیا اور ہر دوکان دار نے خریدار کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ناپاک سازش کی ع

نئے جال لائے پرانے شکاری

قوموں پر نحوست و ادبار کا اس سے بُرا دن اور کوئی نہیں ہوتا جب اس کی قیادت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے جن کے عزائم میں خلوص نہ ہو، جن کی نیتوں میں پاکیزگی نہ ہو، جن کی اغراض میں بے نفسی نہ ہو، جن کے ارادوں میں عزیمت نہ ہو اور جن کے مقاصد میں استقامت نہ ہو۔ پاکستانی قوم اس صورت حال سے اپنے روز آغاز سے دوچار ہے اور کوئی نہیں جو اس کے اس دکھ کا مداوا کر سکے، اس کے اندر کے زخموں پر مرہم رکھ سکے اور اس کے دردوں کا درماں تلاش کر سکے۔

........❖❖❖........

Marfat.com

پاکستان..........ایک نظریاتی مملکت

پاکستان کا قیام ایک سراسر نظریاتی مملکت کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ ایک ایسی فلاحی مملکت جو اسلام کے اصول سیاست وتمدن کی اخلاقی بنیادوں پر استوار ہو۔ یہ صرف ایک نعرہ نہیں تھا بلکہ ایک عقیدہ اور ایک نظریہ تھا۔ اور عقیدہ ہی وہ شئی ہے جو ایک انسان کو اس کے جان و مال سے، اس کی عزت وآبرو سے، اس کی غیرت و ناموس سے اور اس کے اہل وعیال سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ ہی کی قوت ہے جو ایک جیتے جاگتے انسان کو ہنستے اور مسکراتے ہوئے پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ جو ظالم بیٹے کو باپ کے ہاتھوں قتل کروا سکتی ہے، جو ماں باپ کے مقدس رشتہ کے درمیان آہنی دیوار بن جاتی ہے، جو بیوی اور شوہر کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے، جو محبتوں کے محل مسمار کر دیتی ہے، جو نفرت اور تعصب کی سموم تند کو نسیم صبح گاہی کے خوش گوار جھونکوں میں تبدیل کر دیتی ہے اور جو آگ کو گلزار بنا دیتی ہے، سمندروں کو شاہراؤں میں بدل کر رکھ دیتی ہے اور صلیب کو آسمان کی چھت کا زینہ بنا دیتی ہے اور جو مکہ کے ایک یتیم اور بے آسرا نوجوان کے سر پر عرب وعجم کی فرماں روائی کا تاج رکھ دیتی ہے۔

عقیدہ انسان کے دل ودماغ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ وہ جسم کے رگ وپے میں خون کی طرح گردش کرتا ہے، وہ عشق بن کر دیدۂ ودل کے ہر ایک گوشہ پر چھا جاتا ہے۔ شاعر نے جب یہ کہا تھا کہ ؏

عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی

تو کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ یہ کم سے کم بات ہے جو عقیدہ کی عظمت کے بارہ میں کہی جا سکتی تھی ۔

تمنت سلمیٰ ان نموت بجبها
واھون شئی عندنا ماتمنت

پاکستان کا قیام جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے، ایک عقیدہ کی عملی شکل تھی، ایک عقیدہ تھا جو عمل کے قالب میں ڈھل گیا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کی تشکیل کی راہ میں جیسی عظیم قربانی مسلمانانِ برصغیر نے دی، پوری تاریخ انسانی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ دس لاکھ سے زیادہ نفوس عقیدہ کی اس جنگ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک کروڑ سے زائد افراد کو جلاوطنی کا بھوگ بھوگنا پڑا، قوم کی ساٹھ ہزار بہو بیٹیوں کی عصمتوں کا خون ہوا اور تین کروڑ کی تعداد میں انسانوں کی اتنی بڑی جمعیت کو یرغمال بنا دیا گیا، تب کہیں جا کر ایک عقیدہ نے اپنی جگہ بنائی اور ایک نظریہ پروان چڑھا۔

لیکن وائے حسرت ہماری قوم کی قسمت پر کہ آج وہ قوم اس عقیدہ کو تارِ عنکبوت بنا چکی ہے اور جس عقیدہ کے تقدس کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے کبھی اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا، آج اسی عقیدہ کو اس نے بازار میں نیلام کا مال بنا دیا ہے

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
اور کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

قوم کی اس بے مائیگی کے اسباب وعوامل کی چھان پھٹک کیجیے تو اس کی تہ میں ایک ہی چیز سب سے بڑی محرک اور ایک ہی بات سب سے اہم باعث کے طور پر نظر آئے گی، اور وہ ہے ”غلط قیادت“ جو قوم پر زبردستی مسلط کر دی گئی۔

یہ غلط قیادت کس نے مسلط کی؟ اس کے دو جواب ہیں:

(1) قوم کی اپنی بے شعوری اور بے پروائی نے

(2) استعمار کی دسیسہ کاری نے

یہی وہ قوم دشمن عناصر تھے جنہوں نے قوم پر اس قیادت کو تسلط جمانے کا موقع دیا، اور چوں کہ یہ قیادت عوام کے اندر سے نہیں ابھری تھی، اس میں ”اولی الامر منکم“ (حکمران جو خود تمہارے اندر سے ابھرے ہوں) کی کیفیت موجود نہیں تھی۔ یہ اوپر سے مسلط ہوئی تھی اور باہر سے درآمد کی گئی تھی، اور مانگے تانگے کا مال تھا، اس لیے ظاہر ہے

Marfat.com

کہ اس نے ملکی، سیاسی، دینی اور مذہبی معاملات میں وہ گل کھلائے کہ ع

آسمان را حق بود گر خوں ببارد برزمیں

اس سے بڑی بدبختی کسی قوم کی اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ جس عقیدہ کو اپنے ایمان و دین کا محور قرار دیتی ہے، اس عقیدہ کی مخالف قوتوں کو اپنا راہ نما چن لیتی ہے اور اس کے ہاتھ میں اپنے تمام معاملات کی زمام کار دے دیتی ہے۔ پھر ایک دن نہیں دو دن نہیں، سال دو سال نہیں بلکہ اٹھاون برس تک اپنے عقیدہ کی پامالی کا بچشم خود نظارہ کرتی ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتی تا ایں کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اس کے عقیدہ کے دشمن مٹھی بھر افراد اس پر داد حکومت دینے لگتے ہیں اور وہ خواب غفلت کے مزے لیتی رہتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان کا وجود پذیر ہونا کس عقیدہ کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا؟ وہ عقیدہ صحیح بھی تھا یا نہیں؟ اور آیا اس عقیدہ کو بروئے کار لانے کی کبھی کوشش بھی کی گئی یا نہیں؟ کیا اس سے بہتر کسی عقیدہ کا سراغ مل گیا ہے کہ اسے چھوڑ کر اور اس سے منہ موڑ کر کسی اور عقیدہ کی جانب نظر اٹھائی جائے اور اسے اپنانے کی بابت سوچا جائے؟

اگر ان سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب مل جائے تو بہت سی الجھنوں کا آپ سے آپ ازالہ ہوسکتا ہے۔ بہت سے عقدے حل ہو سکتے ہیں، بہت سی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔

آیئے! ایک نظر ان سوالات پر اور ان کے صحیح صحیح جوابات پر ڈال لیں اور پھر سوچیں کہ ہم نے ان اٹھاون برسوں میں کیا کھویا اور کیا پایا؟ اور آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں؟

اسلام............ایک جامع نظام زندگی:

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ پختہ اعتقاد، مستحکم یقین اور راٹل عقیدہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب و ادیان میں صرف اسلام ایک ایسا دین ہے جو مکمل نظام زندگی ہے، جو دنیا و آخرت دونوں کا جامع ہے، جو دینی اور دنیوی فلاح و بہبود کا یکساں طور پر علمبردار ہے، جو خدا کا پسندیدہ دین ہے اور جس کے سوا اور کوئی دین اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے؟

Marfat.com

﴿ان الدّین عنداللّٰه الاسلام﴾

''بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔''

اس دین کو ماننے کے بعد جو شخص اپنی زندگی کے معاملات میں راہ نمائی کے لیے کسی اور جانب نگراں ہوں تو اس کے دعویٰ مسلمانی کا بھی کوئی اعتبار باقی نہیں رہے گا، اور وہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ خداوندی ہو جائے گا۔

﴿ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه، وهو فی الآخرة من الخاسرین، کیف یهدی الله قوماً کفروا بعد ایمانهم وشهدوا ان الرسول حق وجاء تهم البینات، والله لا یهدی القوم الظالمین، اولئک جزائهم ان علیهم لعنة الله والملائکة والناس اجمعین، خالدین فیها، لایخفف عنهم العذاب ولا هم ینظرون﴾ (آل عمران:۸۵۔۸۸)

''جو شخص اسلام کے سوا کسی اور نظام حیات کی جستجو میں ہے تو اسلام کے سوا اور کوئی چیز اس سے ہرگز قبول نہیں کی جائے گی اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔ بھلا اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو کیوں کر راہ راست پر چلنے کی توفیق دے سکتا ہے جو ایمان لانے کے بعد کفر کرے، جس نے تسلیم کیا ہو کہ رسول برحق ہے، اور واضح دلائل بھی اس کے پاس موجود ہوں، ایسی ظالم قوم کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دے گا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اس قوم پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی، وہ اس لعنت میں ہمیشہ گرفتار رہے گی۔ اس کے عذاب کی شدت میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور اس کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔''

قرآن حکیم کی اس آیت کے تیور دیکھیے اور اس کے بین السطور میں غیرت خداوندی کی جو جھلکیاں نظر آ رہی ہیں ان پر نگاہ ڈالیے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی کتاب تعزیرات میں اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں ہے کہ ایک مسلمان اسلام کی صداقتوں

Marfat.com

کو تسلیم کرنے کے بعد زندگی کے امور میں ہدایت وراہ نمائی کے لیے کسی اور کا محتاج ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود قرآن حکیم ہی کی تصریحات کے مطابق اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کی تکمیل میں فکر خداوندی نے براہِ راست حصہ لیا ہے۔ قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً﴾ (المائدہ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور ایک نظام حیات کے پسندیدہ قرار دیا۔''

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آیت میں دین اسلام کی تکمیل کے لیے دو لفظ استعمال کیے گئے۔ ایک ''کمال'' اور دوسرا ''تمام'' یہ دونوں الفاظ نقصان کے مقابلہ میں ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے۔ ''کمال'' اوصاف خارجیہ کے نقصان کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جب کہ ''تمام'' اجزاء کے لحاظ سے مکمل ہونے کو کہتے ہیں، جیسے کسی شخص کی ایک ٹانگ نہ ہو تو وہ شخص ناتمام اور ناقص ہے خواہ وہ کتنا ہی حسین وجمیل کیوں نہ ہو۔ اور اگر اس کے تمام اجزاء اور اعضاء تو پورے اور مکمل ہوں لیکن صورت اچھی نہ ہو، اخلاق بگڑے ہوئے ہوں، خصائل درشت اور ناہموار ہوں تو اس کو بجائے ناتمام کے نامکمل انسان کہا جائے گا۔ آیت بالا میں ان دونوں لفظوں کو جمع کر کے یہ بتایا گیا کہ دین اسلام اوصاف خارجیہ اور تمام اجزاء کے لحاظ سے مکمل اور تمام ہے، لہٰذا اب اس دین کی تکمیل ہو گئی اور اسلام کے سوا اور کوئی دین اب نہیں ہے جس کی پیروی کی جائے بلکہ اب اگر کوئی گذشتہ نبی بھی دنیا میں آ جائے جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام یا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تو وہ بھی اسی کتاب اور اسی دین کی پیروی کریں گے۔

پھر اس دین کی کتاب قرآن حکیم کہ اس کی ترتیب و تدوین تک خود خداوند قدوس نے فرمائی ہے۔ چنانچہ سورۃ القیامہ میں ارشاد فرمایا:

﴿انّ علینا جمعہ و قرأنہ، فاذا قرأناہ فاتبع قرأنہ، ثم انّ

Marfat.com

علینا بیانہ﴾ (القیامۃ:۱۷۔۱۹)

''بلاشبہ اس کتاب کی جمع و تدوین اور اس کا صحیح شکل میں پڑھنا ہمارے ذمہ ہے، تم اس کے مطابق اسے پڑھو، پھر اس کی وضاحت کرنا بھی ہمارا کام ہے۔''

یہ تکمیل اس قدر ہمہ جہتی اور اتنی ہمہ گیر تھی کہ انسان کو پیش آنے والے کسی ایک مسئلہ کے بارہ میں فروگذاشت باقی نہیں رہنے دی گئی۔ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

''بھلائی کی کوئی بات ایسی نہیں جس کا میں نے تمہیں حکم نہ دیا ہو اور برائی کا کوئی کام ایسا نہیں جس سے میں نے تمہیں روک نہ دیا ہو۔''

عقیدۂ ختم نبوت کے اسرار وحکم:

یہ دین کی اسی تکمیل کا نتیجہ تھا کہ نبوت کے سلسلۂ عالیہ کو جناب رسول اللہ ﷺ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا اور رسالت خداوندی اور وحی الٰہی کا دروازہ قیامت تک کے لیے بند ہو گیا۔ گویا اس دین کو مکمل کرنے کے بعد حق تعالیٰ شانہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا بلکہ ہر ایک چیز کو اس کے منطقی کمال تک پہنچانے کے لیے جتنے لوازم درکار تھے ان سب کو ایک ساتھ مہیا کر دیا گیا تا کہ

﴿لئلا یکون للناس علیٰ اللہ حجۃ بعد الرسل﴾ (النساء:۱۶۵)

''تا کہ لوگوں کو حق تعالیٰ پر کسی حجت کا موقع نہ ملے۔''

اس دین کی جامعیت، اس کی آفاقیت، اس کی ہمہ گیری، اس کا درجہ تمام وکمال تک پہنچنا یہ سب کچھ ایسا منظم اور مربوط تھا کہ اسلام کا بدترین سے بدترین ناقد بھی انگلی رکھ کر یہ نہیں بتا سکا کہ اس کے اصول وفروع میں کہیں کوئی ادنیٰ سے نقص کا شائبہ یا احتمال بھی ہے، یا اس کی تعلیمات میں کسی تغیر وتبدل کی معمولی سی گنجائش بھی ہے۔

پھر تحدی کے ساتھ یہ ضمانت بھی دی گئی کہ اسلام کی کتاب دستور کو ہر قسم کے ردّوبدل سے محفوظ ومصئون رکھنے کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ خود لی!

Marfat.com

﴿انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون﴾ (الحجر:۹)

''ہم نے نصیحت کی یہ کتاب نازل کی اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اس کی حفاظت بھی کئی طریقوں سے کی۔ چنانچہ گذشتہ چودہ سو سال میں اس کے کسی لفظ اور حرف میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، اور ویسے بھی اس میں تحریف ہو نہیں سکتی کیونکہ یہ ''کلام اللہ'' ہے اور کلام جب متکلم کی زبان سے نکلتا ہے تو پھر نہ تو وہ مٹتا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اللہ کا کلام تو اللہ ہی کا کلام ہے، آپ جو بولتے ہیں وہ بھی موجودہ سائنس کی رو سے نہیں مٹتا۔ جب وہ آپ کی زبان سے نکلا تو وہ محفوظ ہو گیا۔ جب بندے کا کلام نہیں مٹتا اور نہ اس میں تحریف ہو سکتی ہے تو اللہ تعالیٰ جس کلام کا تکلم فرمائے وہ کیسے مٹ سکتا ہے؟ اور اس میں کیسے تحریف ہو سکتی ہے؟ آپ جب بولتے ہیں تو آپ کے کلام کو فضا گھیر لیتی ہے لیکن اللہ کا کلام جب چلتا ہے تو وہ فضا کو گھیر لیتا ہے۔ فضا خود اس کلام میں محفوظ ہے لہٰذا نہ وہ مٹنے والا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تحریف کر سکتا ہے۔

• یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم بار بار لوگوں کو اس امر کی جانب متوجہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری زندگی کا یہ انداز ہرگز پسند نہیں ہے کہ من مانی سے کام لو اور دین کی جو بات تمہیں پسند ہو اسے تم قبول کر لو اور جو ناگوار خاطر ہو اسے قبول کرنے سے گریز کرو۔ یعنی ''آدھا تیتر آدھا بٹیر'' والی صورت اسلام کے مزاج عمومی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی اور 'میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو' کا فلسفہ اس کے فلسفہ سے کوئی مطابقت اور ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ ذہن میں رہے کہ اسلام کے ہاں دورنگی کا فلسفہ بار نہیں پا سکتا۔ وہ تو یک رنگی کا قائل ہے اور یک رنگی بھی وہ جو قرآن حکیم کے الفاظ میں خدا کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

﴿صبغة اللہ ومن احسن من اللہ صبغة، ونحن له عابدون﴾ (البقرہ:۱۳۸)

''اللہ کا رنگ، اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے اور ہم اسی کے عبادت گذار ہیں۔''

Marfat.com

کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لانا اور کچھ کا انکار کرنا اس کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے دنیا کی زندگی میں بھی رسوائی نصیب ہو اور قیامت کے روز بھی ایسے لوگوں کو سخت ترین عذاب کے سپرد کر دیا جائے، اللہ تعالیٰ ہماری بدعملیوں سے غافل نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایک بات پر نظر رکھتا ہے، اگرچہ قرآن حکیم میں یہ خطاب یہودیوں سے ہے مگر اس کی عمومیت تمام اقوام وملل پر محیط ہے۔

قرآن حکیم تو سیدھی اور دوٹوک بات کہتا ہے۔ اس کا مختصر جامع منشور یہ ہے کہ ''اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقوش پا کی پیروی مت کرو اس لیے کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ایمان کی راہ پر گامزن ہونا چاہتے ہو تو کفر کے راستہ کا انکار کر کے آؤ۔ کیونکہ ایمان کی راہ سلامتی کی راہ ہے، نجات کی شاہراہ ہے، امن کی رہگزر ہے، مگر اس راہ تک پہنچنے کے لیے جن گھاٹیوں کو سر کرنا پڑتا ہے، جن دشوار گذار راہوں کو طے کرنا پڑتا ہے وہ بڑی ہی خطرناک ہیں

کیف الوصل الیٰ سعاد و دونھا
قلل الجبال وبینھن حقوق

یعنی محبوبہ سعاد تک رسائی کی کیا صورت ہو کہ راہ میں پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں اور بیچ میں گہرے کھڈ ہیں۔

یہ جو سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا تو یہ ایمان اور کفر ہی کی بابت ہی تو فرمایا تھا کہ

﴿حفت الجنة بالمکاره وحفت النار بالشهوات﴾

''جنت کا راستہ مکروہات سے اٹا پڑا ہے اور جہنم کا راستہ شہوات کی رنگینیوں سے معمور ہے۔''

قرآن حکیم کہتا ہے کہ اگر تم ایمان کے دعویٰ میں سچے ہو، اگر اسلام کو انشراح صدر سے اور طیب خاطر سے قبول کیا ہے تو ہر رشتہ قرابت جو اسلام کی راہ میں سنگ گراں بن سکتا ہو بالکلیہ منقطع کرنا پڑے گا اور زن و مال اور والدین و اولاد کی محبتوں کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹنا پڑے گا۔ چنانچہ اس بات کو حق تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: ''تو

Marfat.com

ہر گز نہیں پائے گا ان لوگوں کو جو اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہوں خواہ وہ ان کے باپ دادا ہوں، ایسے ہی ایمان دار لوگوں کے دلوں میں ایمان کا نقش اللہ تعالیٰ نے ثبت فرما دیا ہے اور ایسے ہی لوگوں کو وہ اپنی تائید غیبی سے نوازتا ہے اور انہیں ایسی بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔'' (المجادلہ: ۲۲)

ایک اور مقام پر فرمایا: ''آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے ماں باپ، تماری اولاد، تمہارے بھائی بند، تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور وہ مال جو تم نے جمع کر رکھا ہے اور وہ سامان تجارت جس کی کساد بازاری کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے، اور وہ مکانات اور کوٹھیاں جن کو تم بہت پسند کرتے ہو، اگر یہ سب چیزیں تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر خدا کے عذاب کا انتظار کرو، اور اللہ تعالیٰ ایسے بدکردار لوگوں کو کبھی راہ راست کی توفیق ارزانی نہیں فرمائے گا۔ (التوبہ: ۲۴)

گویا بتایا یہ کہ دین حق کی راہ میں جان و مال کی قربانی، بیوی بچوں کی محبت سے دست کشی، قبیلہ و خاندان سے بے تعلقی پرانی ہے جو آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ جل شانہ کی امانت کا بار گراں کچھ برگزیدہ بندوں کے کاندھوں پر ڈالا گیا ہے، چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں اور یعقوب علیہ السلام کو وصیت کی تھی اور کہا تھا کہ اے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو منتخب فرما دیا ہے، اس لیے اب تمہارا مرنا بھی اسی دین پر ہوگا اور تمہارا جینا بھی اسی دین پر ہوگا۔''

(البقرہ:۱۳۶)

یہ دین برحق جسے اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے، یہی وہ دین ہے جسے ہر دور میں اللہ کے رسولوں اور برگزیدہ پیغمبروں نے نسل انسانی تک پہنچایا، اس کے مقابلہ میں اور جس قدر بھی باطل نظام تھے، وہ اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکے اور اس کی صداقتوں کے حریف نہیں بن سکے کیونکہ ''باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے عقب سے'' اس لیے کہ یہ ایک دانشور اور قابل تعریف ذات کا نازل کیا ہوا قانون حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مثال دے کر وضاحت فرمائی کہ دین اسلام کی حیثیت اس شجر

بارآور کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال کی خبریں لے رہی ہیں اور جس کی شاخوں کو آسمان جھک کر چومتا ہے۔ ایسا سرسبز و شاداب درخت جسے خزاں کی تاراج کاریوں سے کوئی اندیشہ نہیں ہے، جسے وقت کا کوئی بڑے سے بڑا طوفان جھکا نہیں سکتا، آندھیاں اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں اور زمانہ کی گردشیں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت کا لگایا ہوا پودا ہے جسے اس نے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے خون سے سینچا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی کیا مثال بیان فرمائی ہے جیسے ایک پاکیزہ درخت ہو کہ جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور شاخیں آسمان کی خبر لا رہی ہوں، اور وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے ہر لحہ اپنا پھل دے رہا ہو، اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی مثالیں دے کر لوگوں کو سمجھاتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور برے کلمہ کی مثال اس ناپاک درخت کی سی ہے جو زمین کی اوپر کی سطح سے ابھرا ہے اور اسے قرار و ثبات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو دنیا کی زندگی میں بھی ثبات و استقامت عطا فرمائے گا اور آخرت میں بھی، اور ظالموں کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرے گا اور اللہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔'' (ابراہیم:۲۴۔۲۷)

دین برحق میں اسلام کے اس نقش کو قلوب و اذہان میں مرتسم کرنے کے لیے مختلف تعبیرات سے واضح کیا گیا۔ چنانچہ ایک اور مقام پر اسلام کو ندی کے بہتے ہوئے صاف و شفاف پانی سے تشبیہ دی اور باطل کے ادیان متفرقہ کو جھاگ قرار دیا۔ حق کو ابریز خالص کی مانند ہر قسم کی آلائش سے پاک اور صاف بتایا اور باطل کو میل کچیل سے تعبیر کیا۔

چنانچہ فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے ندیاں نالے اپنی اپنی بساط کے مطابق بہ نکلے، اور پانی کے اس بہاؤ پر جھاگ ابھر آئی۔ اسی طرح سونے اور چاندی کو زیور بنانے کی غرض سے یا

Marfat.com

ویسے بطور ایک متاع دنیوی کے جب آگ پر تپاتے ہیں تو اس پر
بھی جھاگ ابھر آتی ہے، ایسی ہی مثال اللہ کے نزدیک حق و باطل
کی ہے۔ جھاگ تو سوکھ کر ختم ہو جاتی ہے لیکن جو چیز انسان کو فائدہ
دیتی ہے وہ زمین پر باقی رہ جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ مثالیں
بیان فرماتا ہے۔'' (الرعد:۱۷)

ایسا عظیم الشان دین جس کی تبلیغ واشاعت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ہر جگہ بے شمار انبیاء ورسل مبعوث فرمائے اور جس کی ابدیت پر تمام صحف سماوی اور کتب الہامی نے مہر تصدیق ثبت کی اور جس کی نشر و ترویج کے لیے سب سے آخر میں نسل انسانی کا وہ عظیم فرزند مبعوث ہوا جس سے زیادہ باعظمت انسان اس صفحۂ گیتی پر اس کے روز آغاز سے پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ آئندہ رہتی دنیا تک اس کا نظیر و مثیل معرض وجود میں آئے گا۔

ظاہر ہے کہ اس دین کو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں بلند و بالا کرنے کے لیے خود حق تعالیٰ کی تائید و نصرت کی کرشمہ زائیوں کی کیسی کیسی نمود نہ ہوئی ہو گی۔ یوں ہی تو نہیں کہہ دیا گیا کہ

﴿ھو الذی ارسل رسوله بالھدیٰ و دین الحق لیظھره علی الدین کله، و کفی بالله شھیداً﴾ (الفتح:۲۸)

''وہ مقدس ذات جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین برحق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے اور اللہ اس پر کافی گواہ ہے۔''

ایک اور مقام پر اس مضمون کو تعبیر کے ایک جاندار اسلوب کے ذریعہ اور زیادہ شدت کے ساتھ بیان کیا اور فرمایا:

﴿یریدون لیطفؤا نور الله بافواھھم، ویابی الله الا ان یتم نوره، ولو کره الکافرون﴾ (التوبۃ:۳۲)

''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے گل کر دیں

Marfat.com

اور اللہ کو اس بات سے انکار ہے تا آنکہ وہ اپنے نور کو مکمل کر دے،
خواہ کافروں کو یہ بات ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔‘‘

گویا وہ عقیدہ جس کی آبیاری کی جاتی رہی اور انبیاء و رسل کے ذریعہ اس کی نشر واشاعت کا اہتمام ہوتا رہا اور جس کی صداقت کی قسمیں ملاء اعلیٰ میں کھائی گئیں اور جس کی تائید وحمایت کے لیے قدوسیوں کے لشکروں کو آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر اتارا گیا، وہ محض عقیدہ کی حد تک ہی ایک بات نہ تھی بلکہ یہ بھی ضروری تھا کہ باقی سارے عقیدوں پر اس کو برتری حاصل ہو، اس کو فوقیت دی جائے، اس کی عظمت کا لوہا دنیا سے منوایا جائے اور اس کی قرار واقعی اہمیت کو دنیا میں قطعی طور پر تسلیم کرایا جائے، اور یہ ذمہ داری ان لوگوں کے سر ڈال دی گئی جو اس عقیدہ کے ماننے والے اور اس کو دل و جان سے قبول کرنے والے ہیں۔

پس جو مسلمان بھی صرف نام کا مسلمان نہیں ہے بلکہ اس نے اسلام کو ایک نظام زندگی کے طور پر اپنایا ہے، اسے اچھی طرح یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اس نے دین اسلام کو اسی شرط لازم کے ساتھ قبول کیا ہے کہ وہ اسلام کے نظریہ حیات کو دنیا میں دیگر تمام نظریات پر غالب کرنے کی آخری دم تک کوشش کرے گا اور اس راہ میں اپنی جان و مال سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

اسلام کو قبول کرنے اور دائرہ اسلام میں شامل ہونے کے بعد ہر شخص آپ سے آپ اس معاہدہ کا پابند ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری تگ و دو اور اس کی تمام تر جدوجہد اسلام کی سربلندی کے لیے وقف ہو چکی ہے۔ اس کا مرنا جینا اسی مقصد کی خاطر ہوگا اور اس کی پوری زندگی اس کاز (Cause) کے حصول کے لیے صرف ہوگی۔ یہ ایک دست بدست عہد و پیمان ہے جو اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے کیا ہے۔

ایسے مضبوط بندھن میں جکڑا ہوا انسان جو اسلام قبول کرنے کی صورت میں اپنا قول دے چکا ہے کہ وہ صرف اور صرف اسلام ہی کے لیے اپنی ساری تگ و تاز کو محدود رکھے گا، اسے یہ بات ہرگز ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ بدعہدی کا مرتکب ہو کر اسلام کے سوا کسی دوسرے نظریہ یا عقیدہ کا دم بھرے اور کسی دوسرے نظام حیات کو برپا کرنے کی

Marfat.com

کسی بھی کوشش میں شریک ہو۔ دوعملی کو دنیا کا کوئی بھی نظام پسند نہیں کرتا اور دورخی کی پالیسی کو شرافت کا کوئی اصول بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دورنگی اختیار کرنا کبھی بھی اچھی پالیسی نہیں رہی ہے ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا دل بہ رخ دوست می باید داد
یا قطع نظر ز یار می باید کرد

نفاق.......... بدترین روگ:

قرآن حکیم اس دورخی کو نفاق کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، اور نفاق کو بدترین روحانی روگ قرار دے کر بڑے ہی سخت لفظوں میں ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو نفاق کا شعار اپنائے ہوئے ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنے خیال میں اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ جب وہ لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو محض دکھاوے کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔ تذبذب کی حالت میں ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں، نہ ادھر کے ہوتے ہیں اور نہ ادھر کے کیونکہ جنہیں اللہ تعالیٰ گمراہ کرے، ان کے اس گمراہی سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اپنی انہی کرتوتوں اور منافقت اور دورنگی پالیسیوں کی وجہ سے وہ لوگ جہنم کے نچلے درجہ میں ہوں گے اور وہاں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا لیکن جو لوگ تائب ہو گئے اور انہوں نے اپنی حالت کی اصلاح کر لی اور اللہ تعالیٰ کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیا اور اللہ کے لیے اپنے دین کو خالص کر لیا تو ایسے لوگ اہل ایمان کے ساتھ ہوں گے۔ گویا ایمان لانے کے بعد دین کے فیصلوں میں تذبذب اور تشکیک یا ادھر ادھر دیکھنا یا کسی دوسرے انداز فکر ونظر کی کسی خوبی کو اجاگر کرنا جب کہ اس انداز فکر و نظر کا بیشتر حصہ اسلام کی مقدس تعلیمات کے منافی ہو، منافقانہ شعار ہے اور نفاق کی ایسی کسی روش کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔

Marfat.com

اسلام غیرت وحمیت کا مذہب ہے۔ وہ اپنے بارے میں اس حد تک متعصب ہے کہ اس کا کوئی پیروکار اپنی ظاہری شکل وصورت میں بھی کسی دوسرے مذہب کے طور طریقوں کو اپنانے کا مجاز نہیں ہے۔ اسلام ہرگز اس امر کا روادار نہیں ہے کہ مسلمان اپنی وضع قطع غیروں جیسی بنائے، نہ وہ یہ گوارا کرتا ہے کہ اس کا کوئی حلقہ بگوش بزم غیر کی زینت بنے۔ چنانچہ بعض احادیث میں یہ الفاظ ہیں:

﴿خالفوا الیھود والنصاریٰ﴾

''یہود ونصاریٰ کے خلاف طور طریقے اختیار کرو۔''

کا حکم ایسے بیسیوں احکام کے ضمن میں لسان نبوت ووحی سے صادر ہوا ہے جن میں یہود ونصاریٰ سے ادنیٰ مطابقت کا احتمال بھی ممکن تھا۔ قرآن حکیم نے بھی اس مضمون کو مختلف آیات میں بیان فرمایا ہے چنانچہ ایک مقام پر فرمایا:

﴿یاایھا الذین آمنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض، ومن یتولھم منکم فانه منھم، ان الله لا یھدی القوم الظالمین﴾ (مائدہ:۵۱)

''اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں تو ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے گا تو وہ بھی انہی کے زمرہ میں شمار ہوگا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

غیر قوموں کے نظریات سے وابستگی:

لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ مسلمان اپنے عقیدہ وعمل میں اس حد تک بے حسی کا شکار ہو چکا ہے کہ وہ غیر قوموں کے نظریات پر سر دھنتا ہے۔ غیر قوموں کے افکار کو دل وجان سے پذیرائی بخشتا ہے اور غیروں کے انداز اپنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ان کی تہذیب سے اس درجہ مرعوب ومتاثر ہے کہ اپنی تہذیب کا حسن ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے، ان کے اعمال کی نقالی میں اس قدر پیش پیش رہتا ہے کہ اپنی اصلیت

Marfat.com

تک کو بھول گیا ہے۔اس کی وضع قطع پر مرٹتا ہے۔ان کے طور طریقوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پسند کرتا ہے۔ ان کے رسم و رواج کا شیدا ہے اور ان کے برخود غلط نظریات کا شکار ہو کر کھلم کھلا اسلام کا مضحکہ اڑاتا ہے۔اور کی برائیوں کو اپنے اندر لے کر یہ سمجھتا ہے کہ شاید ترقی کا زینہ یہی ہے۔مغربی ڈانس اور رقص و سرود کو اور عورتوں کے بال کٹانے، ننگا پھرنے اور کلبوں میں جانے ہی کو مغرب کی قوت و طاقت کا منبع اور ذریعہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ شاعر مشرق حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے جنہوں نے مغربی تہذیب و تمدن کو نہایت قریب سے دیکھا تھا اور اس کی خوبیوں اور ناخوبیوں سے وہ بڑی حد تک آشنا تھے، انہوں نے ان کی طاقت وقوت کا ذریعہ اور منبع ان کے علم وفن کو قرار دیا ہے جس سے ہم یک قلم محروم ہیں۔حضرت علامہؒ فرماتے ہیں ؂

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب
نے نہ سحر ساحران لالہ روست
نے زعریاں ساق و نے از قطع موواست
محکمی او را نہ از لادینی است
نہ فروغش از خط لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

اور اسی پر بس نہیں بلکہ ان اسلام دشمن نظریات کا پرچار کرنے کے لیے اپنی تمام توانائیوں کو صرف کر دیتا ہے، اور اس پر بھی خود کو مسلمان کہتا ہے۔ گھر دوسروں کے بھرتا ہے، کام غیروں کے آتا ہے، رونق میں ان کی اضافہ کرتا ہے، عادات و اطوار ان کے اپناتا ہے، حکم ان کے مان کر افغانستان اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں مسلمانوں کو توپ و تفنگ اور بموں کا نشانہ بناتا ہے یا نشانہ بنانے کا ذریعہ اور سبب بنتا ہے اور پھر بھی مسلمانوں کی فہرست میں اپنا نام لکھواتا ہے ؂

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

گذشتہ دو سو برس سے ان کی بے یقینی اور دل کی نامحکمی ایسے ہی گل کھلا رہی ہے اور وہ ہر چمک دار چیز کو سونا سمجھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور غیروں کی ہر فکری اور عملی گمراہی کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھ لیتا ہے۔ گذشتہ دو صدیوں سے اس پر خود فراموشی کی ایسی نحوست مسلط ہے کہ وہ یہ تک بھول گیا ہے کہ وہ اسلاف کے کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔

مغرب زدگی بلکہ عیسائیت زدگی:

مغرب زدگی بلکہ عیسائیت زدگی نے اس کے حواس کو اس درجہ مختل کر دیا ہے کہ وہ اپنی حقیقت سے آشنا نہیں رہا اور اسے یہ احساس تک نہیں رہا کہ وہ دوسروں کے نقش قدم کی پیروی کے لیے نہیں آیا بلکہ وہ تو خود اپنا نقش دوام ثبت کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ وہ دوسروں کے خوان نعمت کی زلہ ربائی کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ وہ تو دوسروں کو اپنے دست عطاء سے فیض یاب کرنے آیا تھا۔ مغرب کی فتنہ سامانیوں نے اس کے ہوش و خرد کو اس درجہ ماؤف کر رکھا ہے کہ وہ اپنے تمام دکھوں کا مداوا اور اپنے سارے دردوں کے درمان کے لیے اسی مغرب ہی کی جانب نظر چارہ گری سے دیکھتا ہے حالانکہ یہ سارے دکھ اور درد اسی مغرب نے اسے دیئے ہیں ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اسی مغرب سے اپنی بیماریوں اور مصائب کا علاج ڈھونڈتا ہے۔ اس کی اس سادگی نے اس پر ذلت و ادبار کی ایسی پھٹکار ڈال دی ہے کہ وہ اپنے برے بھلے کی تمیز کھو بیٹھا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ کیسی بلندی سے کس پستی پر اتر آیا ہے ؎

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ از بام بلند افتادہ است ایں

آخر وہ کون سی کمی ہے جس نے مسلمان کو اس کے اپنے دین و مذہب سے بیگانہ اور نا آشنا کر کے رکھ دیا ہے اور اسلام سے اس کی بیزاری بڑھتی جا رہی ہے اور اب محمد ﷺ کے بجائے اس کا آئیڈیل (Ideal) ایک ملحد اتاترک ہو گیا ہے۔ اسلام کے

Marfat.com

کشکول میں وہ کون سی چیز ہے جو موجود نہیں ہے۔اور زندگی کا کون سا شعبہ ایسا ہے جس کے بارہ میں وہ انسان کی دست گیری نہیں کرتا اور کائنات کا وہ کون سا مسئلہ ہے جس کے متعلق وہ راہ نمائی سے دریغ کرتا ہے۔

اسلام ہی دنیا کا ایک ایسا مذہب ہے جو دین و دنیا کی جامعیت کی دلیل ہے جو قدم قدم پر زندگی کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے بارہ میں واضح ہدایات دیتا ہے جو اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی دونوں کی فلاح و بہبود کا ضامن اور کفیل ہے۔

اس کے نظریات، اس کے افکار، اس کے عقائد، اس کا فلسفۂ اخلاق، اس کا زاویۂ عمل غرضیکہ اس کے تمام مضامین میں تنوع بھی ہے، یک رنگی بھی ہے اور حالات و ضروریات سے مطابقت وہم آہنگی بھی، اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ سائنٹیفک اور اپ ٹو ڈیٹ (Up to Date) بھی ہیں اور ان سے عصر حاضر کے تمام تقاضوں کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی سکت بھی موجود ہے، اور یہ وہ امتیاز ہے جو دنیا کے کسی اور دین اور مذہب کو حاصل نہیں ہے۔اس پر بھی اگر اسلام کے پیروکار اس کو چھوڑ کر کسی اور جانب ملتفت ہوں تو اسے ان کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

اسلام اور نظام اقتصاد:

اسلام نے جن انسانی مسائل کے بارہ میں ہدایات دی ہیں، اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے بارہ میں اس نے ہدایات نہ دی ہوں، ان میں ایک اہم مسئلہ جو انسانی زندگی سے براہِ راست متعلق اور معاشرہ کے بناؤ یا بگاڑ میں مؤثر کردار کا حامل ہے، معیشت و اقتصاد کا مسئلہ ہے، اور اس بارہ میں دو رائیں ہرگز نہیں ہو سکتیں کہ تمدن و معاشرت کا سارا نظام اسی معیشت و اقتصاد کے متوازن نظام پر استوار ہے، اور اگر یہ معاملہ توازن سے محروم ہو جائے تو انسانی سوسائٹی زیروزبر اور درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو توازن پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے اور بار بار اپنے ماننے والوں کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ وہ توازن کو برقرار رکھیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا:

"اے ایمان والو! عدل و انصاف کو بڑی سختی سے قائم کرنے والے

Marfat.com

بن جاؤ، اللہ کے لیے گواہی دینے والے خواہ وہ اپنے خلاف ہو یا اپنے والدین اور عزیز واقارب کے خلاف ہو، اگر کوئی دولت مند ہے یا بے نوا ہے تو اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے معاملات کی بہتر دیکھ بھال کر سکتا ہے، اور اگر تم عدل وانصاف کرو یا ہیر پھیر سے کام لو تو اللہ کو تمہاری ہر بات کی پوری طرح خبر ہے۔'' (النساء:۱۳۵)

معاملہ خواہ دین کا ہو یا دنیا کا، سیاست کا ہو یا مذہب کا، تجارت کا ہو یا زراعت کا، محنت کا ہو یا اجرت کا، سرمایہ کاری کا ہو یا مستاجری کا، اقتصاد کا ہو یا انفاق کا، ہر معاملہ میں توازن کی راہ پر گامزن ہونا ایک سچے مسلمان کا شعار ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم نے اس توازن کے قیام کے لیے مختلف اسلوب تحریر سے مسلمانوں کو ہدایات دیں اور افراط وتفریط سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ خوردونوش کے مسئلہ میں ''اسراف'' کی ممانعت کر دی گئی اور متوازن غذا کھانے کا حکم دیا گیا۔ روپے پیسے کے خرچ کے سلسلہ میں ''تبذیر'' و ''اسراف'' سے منع کیا گیا۔ زندگی کے عام معاملات میں بھی میانہ روی کی تلقین کی گئی یہاں تک کہ چال میں بھی میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی۔ سورۃ لقمان میں فرمایا:

''اور لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر (لقمان:۱۸) اور نہ زمین پر اترا کر چل کیونکہ اپنی اتراہٹ سے نہ تو تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں کی بلندی تک تیرا قدم لمبا ہو سکتا ہے۔'' (الاسراء:۳۷)

مقصد یہ کہ اگر تم آپے میں نہیں رہو گے اور اپنی اوقات سے تجاوز کرو گے تو کون سا تیر مار لو گے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ توازن کے ساتھ لوگوں سے پیش آؤ۔ بول چال میں بھی اسی توازن، میانہ روی اور قصد کا حکم دیا گیا اور آواز کو بالکل پست کر کے بات کرنے یا گلا پھاڑ کر چلانے سے روکا گیا۔

ظاہر ہے کہ جو شریعت زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ معاملہ میں توازن واعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتی ہو اور بے اعتدالی کی ہر صورت کو خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبہ سے متعلق ہو، دیکھنا گوارا نہ کرتی ہو، وہ رزق اور وسائل رزق اور وسائل معیشت اور اسباب اقتصاد میں عدم توازن کو کیوں کر پسند کر سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں اہل ایمان اور

Marfat.com

"عباد الرحمن" کی جو خاص صفات اور علامات بیان فرمائی ہیں، ان میں بطور خاص اس صفت کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے کہ:

﴿والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما﴾ (الفرقان:۶۷)

"اور یہ اللہ کے نیک بندے جب خرچ کرتے ہیں تو حد سے تجاوز نہیں کرتے اور نہ ہی ہاتھ کو روکتے ہیں۔"

توازن واعتدال پر مزید کچھ کہنے سے قبل "اسراف"، "تبذیر" اور "تقتیر" کی وضاحت کرنا ضروری ہے کیونکہ تبذیر کے بارہ میں بڑی سخت تہدید آئی ہے کہ وہ شیطان کے بھائی ہیں (کانوا اخوان الشیاطین) گویا انفاق کو تین شرطوں کے ساتھ مشروط کیا۔ ایک یہ کہ "اسراف" نہ ہو اور دوسری یہ کہ "تبذیر" نہ ہو اور تیسری یہ کہ "تقتیر" نہ ہو۔ علامہ ماوردیؒ نے "اسراف" اور "تبذیر" کے باہمی فرق کے بارہ میں بحث کرتے ہوئے فرمایا:

"کمیت یعنی مقدار خرچ میں حد سے تجاوز کرنا "اسراف" ہے اور یہ ثبوت ہے ان عائد شدہ حقوق کی مقدار سے جہالت کا جو اس کے ذمہ ہیں۔ اور کیفیت یعنی مواقع صرف اور خرچ میں حد سے تجاوز کا نام "تبذیر" ہے، اور یہ شہادت ہے ان مواقع صرف سے نادان بننے کی جو صحیح اور حق مواقع ہیں۔" (تفسیر روح المعانی:۱۵/۵۹)

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک جائز کام جو ایک سو روپیہ خرچ کرنے سے بھی بخیر وخوبی انجام پا سکتا ہے اس پر ہزار روپیہ خرچ کرنا "اسراف" ہے اور ایک ایسا کام جس کا کرنا ہی شریعت اسلامیہ میں جائز نہیں ہے، اس کے کرنے کے لیے مال خرچ کرنا شریعت اسلامیہ میں "تبذیر" کہلاتا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے "تبذیر" کی تفسیر میں لکھا ہے:

"اور خدا کا دیا ہوا مال فضول بے موقع مت اڑاؤ۔ فضول خرچی یہ ہے کہ معاصی اور لغویات میں خرچ کیا جائے یا مباحات میں بے سوچے سمجھے اتنا خرچ کر دے جو آگے چل کر تفویت حقوق (عائد

Marfat.com

شدہ) اور ارتکاب حرام کا سبب بنے۔'' (فوائد عثمانی: ص ۳۶۸)

قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ عدل وتوازن کی یہ روح ساری کائنات میں جاری و ساری ہے حتیٰ کہ تخلیق کائنات میں بھی ''تسویہ'' کو ملحوظ رکھا گیا (الذی خلق فسویٰ) گویا ''تسویہ'' کے ساتھ ''عدل'' ایک لازمہ ہے (فسواک فعدلک) اور یہ پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے، بلکہ قرآن حکیم نے تو یہاں تک بھی کہا کہ خود اس کائنات کا خالق و مالک اور اس نظام ارضی و سماوی کا مؤسس اپنے تمام امور میں ''عدل وتوازن'' کی حکمت عملی پر کاربند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جن لوگوں کو دین فطرت کی ذمہ داری سونپی ان کا یہ ایک خاص وصف قرار دیا کہ وہ ایک معتدل اور متوازن امت کے افراد ہیں (امۃً وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس)

اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کائنات اس امر کی مقتضی ہے کہ وہ عدل کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو اور اس میں حد سے تجاوز کا کوئی شائبہ موجود نہ ہو۔ وہ اعتداء اور تعدی کے ہر مظاہرہ پر قدغن عائد کرتا ہے اور اس سے بڑی سختی سے روکتا ہے۔ اسلام نے افراط وتفریط سے بچنے اور اعتدال وتوازن کی راہ پر گامزن رہنے کی جو ہدایات دیں اور بار بار تاکید کے لب ولہجہ میں اس پر زور دیا، وہ صرف دنیوی اور مادی امور ہی سے متعلق نہ تھا بلکہ خود دین کے معاملہ میں بھی اسی توازن کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ اعتدال وتوازن کے سلسلہ کی جتنی آیات ہم نے ان اوراق میں پیش کی ہیں ان میں اگرچہ طرز تعبیر مختلف ہے اور اسلوب بیان میں تنوع ہے، لیکن سب آیات میں قدر مشترک کے طور پر جو بات کہی گئی وہ یہی ہے کہ جب تک زندگی میں توازن واعتدال کی صفت پیدا نہیں کرو گے، کامیاب زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکو گے۔

بے اعتدالی اور عدم توازن کو کہیں ''اسراف'' سے تعبیر کیا گیا اور کہیں ''تبذیر'' سے، کہیں ''اعتداء'' کا نام دیا گیا اور کہیں ''تعدی'' کا، کہیں اسے ''غلو'' کہا گیا اور کہیں اسے ''فساد فی الارض'' کا نام دیا گیا۔ مقصد سب آیات کا ایک ہی ہے۔ اسی طرح ''عدل وتوازن'' کو کبھی ''قسط'' کے نام سے پکارا گیا اور کبھی اسے ''قصد'' سے یاد کیا گیا، کبھی اس پر ''عدل'' کا اطلاق ہوا اور کبھی اسے ''بین ذالک سبیلا'' یعنی میانہ روی

Marfat.com

سے تعبیر کیا گیا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے

﴿خير الامور اوسطها﴾

''میانہ روی کا معاملہ سب سے بہتر ہے۔''

ایک اور حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے خاص طور پر اقتصادیات کے بارہ میں ایک جامع بات ارشاد فرما کر پورے علم الاقتصاد کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ فرمایا:

﴿الاقتصاد فى النفقة نصف المعيشة﴾ (بیہقی)

''نفقہ میں میانہ روی نصف معیشت ہے۔''

Marfat.com

نظام سرمایہ داری کی چند جھلکیاں

قبل اس کے کہ ہم اسلامی اقتصاد کے بارہ میں راہ نما اصول بیان کریں، سب سے پہلے یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی اقتصاد و معیشت ہے کیا؟ لغت میں تو قصد و اقتصاد میانہ روی اور اچھے چلن کو کہتے ہیں، لیکن علم الاقتصاد میں ایسے وسائل کی دریافت کو کہتے ہیں جو دولت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے اور اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اس کی ہلاکت اور تباہی کے حقیقی اسباب بتا سکیں۔ علم الاقتصاد ان وسائل سے بحث کرتا ہے۔

انسان کے اقتصادی اور معاشی مسائل زمین پر اس کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آ گئے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی ضروریات اور احتیاجات اس کی فطرت کا جزو لاینفک ہیں، لہٰذا اس احتیاجات کو پورا کرنے کے لیے انسان کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ فطرت کے ان خزانوں تک اپنی جدوجہد سے رسائی حاصل کرے جو اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ البتہ اس میں انسانوں کی آزمائش ہے کہ وسائل زیست کے حصول کی جدوجہد میں کون اپنے مالک و خالق کی رضا کو ملحوظ رکھتا ہے، کیونکہ جدید معاشیات و اقتصادیات میں مغرب کے مادہ پرستانہ اور خدا ناآشنا بلکہ بے خدا ماحول میں اللہ کی رضا کا تصور ختم ہو چکا ہے اور اکثر و بیشتر لوگوں کی رگوں میں افادیت پسندی (Utilitarianism) کا زہر سرایت کر گیا ہے۔ ایک طرف معاشی وسائل کی قلت اور دوسری طرف زیادہ سے زیادہ مادی منفعت کے حصول کو اپنا نصب العین بنانے کی وجہ سے انسان ایک ہمہ وقتی خود غرضانہ کش مکش کے سمندر میں اتار دیا گیا ہے، اس کے نتیجہ میں اگرچہ چند زور آور افراد جائز و ناجائز طریقہ سے ساحل مراد تک پہنچ جاتے ہیں لیکن انسانوں کی غالب اکثریت اور اکثر و بیشتر لوگ غربت و افلاس کے گرداب میں پھنس کر

خود غرضی اور مادہ پرستی کے اس بحر بیکراں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ مغربی فکر و نظر نے موجود انسان کو ایک ایسے ویرانے میں دھکیل دیا ہے جہاں اسے اپنی منزل کا راستہ نہیں ملتا اور بے اطمینانی اور غیر سکونی کے محیط میں ایسا غرق ہوا ہے کہ سکون واطمینان اس کے لیے سراب بن کر رہ گئے ہیں، اور بے اطمینانی، بدامنی، عدم تحفظ اور ظلم و ناانصافی کے ہولناک تصادم کی وجہ سے لطف حیات سے یک قلم محروم ہو کر رہ گیا ہے۔

جب سے انسان عالم وجود میں آیا اس کی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف معاشی نظام رائج رہے، لیکن وہ قریباً سارے کے سارے فطرت انسانی کے خلاف تھے۔ چنانچہ جدید وقدیم دور میں کوئی بھی اقتصادی نظام ایسا نہیں بتایا جا سکتا جس نے انسانی زندگی خوش عیشی اور رفاہیت اور عدل وانصاف کو باہم ملا کر امن وسلامتی کا علم بلند کیا ہو، اور انسانی زندگی کے مقصد توحید یعنی اللہ اور اس کے بندوں کے مابین رشتہ کو مضبوط اور مستحکم کیا ہو کیونکہ اسی رشتہ کی مضبوطی اور استحکام سے ایک انسان کی انسانیت اجاگر ہوتی ہے اور وہ اخلاق کریمانہ کی رفعتوں اور بلندیوں کو پہنچتا ہے۔ اگر اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان یہ رشتہ مضبوط نہ ہو تو انسان قعر مذلت اور بداخلاقی بلکہ درندگی کی پستیوں میں جا گرتا ہے۔ افلاطون اپنے زمانے کا ایک بہت بڑا دانشور، فلسفی اور حکیم تھا۔ اس نے اپنی شرۂ آفاق کتاب ''جمہوریہ'' لکھی جس میں انسانی نظام اقتصادیات پر بحث کی لیکن اس نے انسانی وحدت کو قائم کرنے اور انسان کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے کے بجائے انسانوں کے آزاد اور غلام دو طبقے ضروری قرار دیئے۔ گویا انسانی وحدت کو طبقات میں تقسیم کر کے انتشار وافتراق کی فضا پیدا کی اور اس طرح اس نے خدا کی آقائی کی جگہ بندوں کی آقائی کو دعوت دی اور زیر دستوں پر زبردستوں کی قہرمانیت کے لیے دروازہ کھول دیا۔ صنفی تعلقات میں انارکی پیدا کی جس سے معاشرتی نظام تباہی اور بربادی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ موجودہ دور میں یورپ کی جمہوریت کا نظام بھی اسی دیو استبداد کی قبا اوڑھے ہوئے ہے ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

Marfat.com

یورپ کا یہ جمہوری نظام امیروں نے غریبوں کو Trap کرنے کے لیے بنایا جو عوام الناس اور جمہور کی خوش عیشی کے بجائے مال دار طبقوں اور فیوڈل لارڈز کی کفالت کرتا ہے اور ظلم واستبداد کو عدل وانصاف کا نام دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ جمہوری نظام سرمایہ داروں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کرتا ہے اور عوام الناس اور جمہور کو ان مقاصد واغراض کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بناتا ہے اور ان کو صرف الفاظ کے ذریعہ خوش کرنے کے لیے اس کا نام ''جمہوریت'' رکھ دیا گیا ہے۔ (جمہوریت کی اصل شکل دیکھنے اور اس کی اندرونی حقیقت جاننے کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''فتنۂ جمہوریت''۔)

ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک زمام حکومت اکثر وبیشتر امراء اور مال دار لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ ان سرمایہ داروں میں اپنے حکومتی اختیارات کو اپنے اور اپنے مال ودولت کے تحفظ اور اس میں اضافہ کے لیے استعمال کیا ہے اور ہر ممکن کوشش کی ہے کہ غریبوں کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر اپنی دادعیش کے لیے استعمال کیا جائے، اور غریبوں اور ناداروں کی کمائی کو لوٹ کر اپنی دولت وسرمایہ میں اضافہ کیا جائے، مزدوروں اور کسانوں کو ڈھور ڈنگر سمجھ کر ان سے دن رات کام لیا جائے تاکہ امراء اور مال دار لوگ زیادہ دادعیش دے سکیں اور ان کی خون پسینہ کی کمائی پر اپنے عیش وسکون کی عمارت تعمیر کر سکیں۔ ہر زمانہ میں یہی ہوتا آیا ہے اور آج بھی جمہوریت اور سوشلزم کے نام پر یہی ہو رہا ہے جس کی مثالیں تاریخ کے اوراق پر موجود ہیں۔

بعثت نبوی سے قبل دنیا کا نظام معیشت:

سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا کے ہر ملک پر ''جاہلیت اولیٰ'' کے بادل چھائے ہوئے تھے اور چھٹی صدی عیسوی تاریخ انسانی کا ایک سیاہ ترین اور پست ترین دور تھا۔ انسانیت دن بدن پستی اور نشیب کی طرف جا رہی تھی اور ساری دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو انسانیت کی اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیتی اور اسے ذلت وپستی کے گڑھے میں گرنے سے روکتی۔ اس خدا ناآشنا اور خدا فراموش معاشرہ میں ہر انسان مکمل

Marfat.com

طور پر خود فراموش تھا۔ اسی وجہ سے تمام انسانی قدروں کی جگہ حیوانی قدروں نے لے لی تھی۔ ایک انسان دیکھنے میں تو انسان نظر آتا تھا لیکن اس کے عادات واطوار اور اس کے اخلاق واحوال میں خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی انسانیت کا کوئی جراثیم نظر نہیں آتا تھا۔

انبیاء اور رسولوں کی دعوت کی آواز عرصہ سے دب چکی تھی۔ ان کی تعلیمات ایک مدت سے یا تو محرف ہو چکی تھیں یا انسانی ذہن انہیں کلیتاً فراموش کر چکے تھے۔ جن چراغوں کو ان حضرات نے اپنے خون دل سے روشن کیا تھا وہ اس جاہلیت کی آندھی میں یا تو بجھ چکے تھے یا اس طرح ٹمٹا رہے تھے کہ ان کی روشنی سے چند ایسے خدا شناس دل روشن تھے جو آبادی کو چھوڑ کر ویرانوں میں اور دیر وکلیسا کو چھوڑ کر صحراؤں اور ریگستانوں کی تنہائیوں میں یا پہاڑوں کی غاروں کی خلوتوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو دین کا نام تو لیتے تھے لیکن انہوں نے وقت کے سلطانوں اور بادشاہوں اور اہل دنیا سے ساز باز کر لی تھی، اور جبر واستبداد، ظالمانہ نظام سلطنت اور ناجائز خواہشات میں ان کے دست راست بن گئے تھے اور ناجائز طریقہ سے لوگوں کا مال کھانے اور ان کی قوت و دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان کے شریک وسہیم بن گئے تھے۔

اس زمانہ میں دو سپر پاورز (Super Powers) تھیں۔ ایک رومی سلطنت اور دوسری ایرانی سلطنت۔ ان میں سے ایک مشرق کی اور دوسری مغرب کی قیادت کی اجارہ داری سنبھالے ہوئے تھی، لیکن دونوں سلطنتیں اجتماعی اور اخلاقی امراض کا آشیانہ بنی ہوئی تھیں۔ ان کی رعایا اور اعیان حکومت تعیش وتکلفات کے بحر بیکراں میں غرق تھے اور دونوں پر سیاسی اور اخلاقی زوال طاری تھا۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ میں ان کا ایک سرسری نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> ”جب ایرانیوں اور رومیوں کو مختلف اقوام پر حکومت کرتے صدیاں گذر گئیں اور انہوں نے دنیوی تعیش ہی کو اپنا مقصد زندگی اور مطمح نظر بنا لیا، اور وہ عیش وعشرت کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں کا ہر شخص مال ودولت، سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے لگا اور آخرت کے تصور کو یک قلم فراموش کر دیا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے

Marfat.com

مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین اکٹھے ہو گئے جو بے جا عیش پسندوں کو داد عیش دینے کے لیے عیش پسندی کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے اور ان کے لیے سامان عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب و غریب نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں مصروف نظر آنے لگے، اور قوم کے بڑے لوگ اس جدوجہد میں منہمک رہنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسروں پر سبقت لے جا سکیں اور ایک دوسرے پر فخر ومباہات کرسکیں۔ سرمایہ پرست علماء کا یہ حال ہوگیا تھا کہ جس کسی کے پاس ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا پٹکا یا کلاہ ہوتا تو اسے بخیلی اور کنجوسی کا طعنہ دیا جاتا۔

ایسے ہی انہوں نے عالی شان اور سر بفلک محل، اعلیٰ درجہ کے آبزن، نفیس حمام، نظر افروز پائیں باغ، سواری کے نمائشی جانور، خدمت کے لیے خوبصورت غلام اور حسین باندیاں اور کنیزیں اپنی زندگی کے لوازم بنا لیے اور مقصد حیات یہ سمجھ لیا کہ شام و پگاہ عیش و نشاط کی محفلیں ہوں جن میں طرح طرح کے کھانے وسیع دسترخوان پر چنے ہوں اور وہ لباس فاخرہ پہنے ان میں بیٹھے ہوں۔

بادشاہوں اور امیروں کی اس عیاشانہ زندگی سے بہت سے خطرناک معاشی اور معاشرتی امراض نے جنم لیا جو معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہو گئے۔ ان امراض سے نہ تو کوئی شہری محفوظ رہا اور نہ کوئی دیہاتی، نہ امیر اور نہ غریب۔ اس ہمہ گیر مصیبت کا سبب یہ تھا کہ یہ سامان تعیش کثیر زرو مال صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اور ظاہر ہے کہ یہ مال کثیر کاشت کاروں اور تاجروں پر نئے ٹیکس لگانے اور پہلے سے لگے ہوئے ٹیکسوں میں متدبہ اضافہ کیے بغیر حاصل نہ ہوسکتا تھا۔ پھر دوسری مصیبت یہ کہ گراں بار ٹیکس ادا نہ کرنے یا ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرنے پر ان کے خلاف فوجی کاروائی کی جاتی۔

اس معاشی اور اقتصادی بدحالی کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ٹیکس ادا کرنے اور اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے سوا لوگ کسی اور بات کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تھے چہ جائیکہ سعادت اخروی اور اپنی نجات کے بارہ میں کچھ غور وفکر اور سوچ بچار کریں۔ بسا اوقات پورے ملک میں ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر ہوتی۔ اس ''فاسد معاشی نظام'' کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنعتوں پر نظام عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثر و بیشتر یک قلم متروک ہو گئیں، اور امراء ورؤساء کی مرضیات وخواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ شمار ہونے لگا۔''

''جمہور کی یہ حالت تھی (جیسا کہ آج کل کی جمہوریت میں جمہور کی ہے) کہ ان کی تمام زندگی بداخلاقیوں کا نمونہ بن گئی اور ان میں سے اکثر و بیشتر کا گذارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا۔''

''خلاصہ یہ کہ اس معاشرہ میں کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بہت بڑی جماعت چاپلوسی، خوشامد، چرب زبانی اور درباداری کو ذریعۂ معاش بنانے پر مجبور ہو گئی تھی، اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکار عالیہ اور ذہنی نشوونما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست وارذل زندگی گزارنے پر قانع کر دیا تھا۔ جب یہ فاسد مواد وبا کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو ان کے نفوس دنائت وخست سے بھر گئے، اور ان کی طبائع اخلاق صالحہ سے نفرت کرنے لگیں .... یہ سب کچھ اس معاشی اور اقتصادی نظام کی وجہ سے پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کارفرما تھا۔''

(حجۃ اللہ البالغہ، باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم: ۱/۱۰۴)

ایران کی حالت زار:

مشرقی دنیا کی قیادت کی اجارہ داری ایران کے ہاتھ میں تھی جو اپنے کو آریائی نسل میں سے سمجھتے ہوئے فوق الانسان (Super Human) سمجھتے تھے۔ متمدن دنیا کے انتظام میں اگرچہ ایران روم کا شریک وسہیم نہ تھا لیکن شومی قسمت سے وہ انسانیت کے دشمن افراد کی سرگرمیوں کی دیرینہ آماجگاہ تھا۔ زمانہ دراز سے اس کی اخلاقی بنیادوں میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ ایرانیوں کو ان فطری اور مقدس رشتوں سے کراہت اور نفرت تھی جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات کو متمدن علاقوں کے باشندے ہمیشہ ناجائز اور غیر قانونی سمجھتے رہتے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ایران پر یزدگرد دوم کی حکومت تھی۔ تاریخ نے اس حقیقت کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہوا ہے کہ اس نے اپنی حقیقی بیٹی کو اپنی زوجیت میں رکھا۔ اور پھر اسے قتل کر دیا۔ (طبری: ۱/ ۵۰۹) بہرام چوبین ایران کا مشہور فرماں روا تھا اس نے اپنی سگی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا (طبری: ۱/ ۵۰۹) مشہور چینی سیاح ہوشن سیانگ کا بیان ہے کہ ایرانی قانون و معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لیے کسی رشتہ کا بھی استثناء نہ تھا، گویا کہ ماں، بہن، بیٹی سب سے زادواجی تعلقات قائم کرنا ایرانی طرز معاشرت کا ایک اصول تھا۔ (ایران بعہد ساسانیاں: ص ۴۳۰) پروفیسر آرتھر کرسٹن کے بیان کے مطابق اس قسم کا ازدواجی رشتہ ایران میں ناجائز اور حرام تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک کار ثواب سمجھا جاتا تھا۔ گویا ذہن وفکر میں اس قدر انقلاب آچکا تھا کہ حلال وحرام کا تصور ذہنوں سے بالکل ختم ہو گیا تھا۔

محرمات سے نکاح زردشتیوں کا مذہب تھا، لیکن ان کو دیکھ کر عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکار جو ایرانی سلطنت میں بستے تھے، انہوں نے بھی اس فعل بد کو اپنا لیا چنانچہ پروفیسر آرتھر لکھتا ہے:

> ''ایران کے عیسائیوں نے بھی زردشتیوں کی دیکھا دیکھی محرمات کے ساتھ شادی کرنے کے فعل بد کو اپنا لیا حالانکہ ان کی شریعت میں یہ فعل حرام تھا۔'' (ایران بعہد ساسانیاں: ص ۵۷۱)

Marfat.com

پھر ساسانیوں میں یہ رواج بھی عام تھا کہ وہ اپنی عورتیں دوسروں کو استعمال کے لیے دے دیتے تھے اور ان سے جو اولاد پیدا ہوتی وہ اس شوہر کی سمجھی جاتی تھی جو اپنی عورت دوسرے کو استعمال کے لیے دیتا تھا۔"

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ایران بعہد ساسانیان: ص ۴۳۶)

۴۸۷ء میں ایران میں ایک شخص مزدک پیدا ہوا۔ اس نے یہ دعوت دی کہ تمام انسان یکساں پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی تفریق نہیں، لہٰذا زن، زر اور زمین سب کی مشترک ہے۔ گویا یہ دنیا میں سب سے پہلا سوشلسٹ (Socialist) تھا جس نے ان تینوں کو ہر ایک کے لیے مشترک قرار دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ چونکہ مال اور عورت ہی دو ایسے عنصر ہیں جن کی حفاظت و نگرانی کا انسان اہتمام کرتا ہے، لہٰذا ان دونوں میں اشتراک اور مساوات سب سے زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ شہرستانی نے لکھا ہے:

"مزدک نے تمام عورتوں کو سب کے لیے حلال قرار دے دیا اور مال و زن کو آگ، پانی اور چارہ کی طرح سب کے لیے مشترک قرار دیا۔" (الملل والنحل: ص ۸۶)

مزدک کی اس دعوت میں بڑی جاذبیت تھی اس وجہ سے نوجوان نسل اور تعیش پسند امراء اور اعیان سلطنت نے اس تحریک اور دعوت کا پرجوش اور بھرپور خیر مقدم کیا اور یہ تحریک چند سالوں میں جنگل کی آگ کی طرح پورے ایران میں پھیل گئی۔ اس پر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ایرانی بادشاہ قباد نے اس تحریک کی سرپرستی کی بلکہ اس کی اشاعت و تشہیر میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سالوں میں (آج کل کے یورپ اور امریکہ کی طرح) پورا ملک جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا۔

مزدک کی اس تحریک نے جب مال و زر اور زن کے مشترک ہونے کا اعلان کیا تو اس نے ملک کی اخلاقی حالت کو اور زیادہ تباہ و برباد کر دیا اور ملک کا نوجوان طبقہ عورتوں سے تمتع اور لطف اندوزی کے لیے کھلے عام میدان میں آ گیا اور ملک میں عریانی، فحاشی اور بے باکی کا دور دورہ ہو گیا۔ جاگیر دار اور امراء کا طبقہ تعیّشات زندگی حاصل کر کے غریب عوام کو ان کی غربت کا احساس دلاتا۔ چنانچہ ملک کے مفلس اور نادار عوام ہر رات

Marfat.com

امراء کی بزم عیش وطرب کا سن کر حسرت کی آہ بھر کر رہ جاتے۔ ان کے زرو جواہر اور اشرفیوں کے ڈھیر دیکھ کر یاس کے آنسو بھر لاتے۔ ان کے فلک بوس محلات، شاندار بنگلے اور کوٹھیاں دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتے۔ چنانچہ جب مزدکی تحریک نے ان کے سامنے جنسی زندگی کی ساری پابندیاں بالائے طاق رکھ کر زن اور زر کو مشترک کر دیا تو اب ایران کی ہر عورت ہر مرد کی ہوس کا نشانہ بننے لگی اور ملک اخلاقی انارکی اور بے راہ روی کا کلی طور پر شکار ہو گیا۔

ملک کی اخلاقی انارکی اور عوام کی ذلت وپستی کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روز مزدک نے کیقباد سے کہا (جو اس کا پیروکار ہو چکا تھا) کہ آج تیری بیوی جو نوشیروان عادل کی ماں تھی، میرے پاس رات بسر کرے گی۔ کیقباد ایران کا کلی حکمران تھا، لیکن مزدک کی صحبت نے اسے اتنا بے غیرت اور دیوث بنا دیا تھا کہ اس نے مزدک کی اس حیا سوز تجویز کو فوری طور پر قبول کر لیا اور اپنی بیوی ایک رات کے لیے مزدک کو دینے پر راضی ہو گیا۔ جب نوشیرواں کو باپ کی اس بے غیرتی کا پتہ چلا تو وہ بے چین ہو گیا، مگر وہ کر کچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ نہایت نیاز مندی کے ساتھ مزدک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے جوتے اتارے۔ پھر اس کے پاؤں کو بوسے دیئے، پھر نہایت لجاجت سے مزدک کی خدمت میں ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ اہل ایران کی مادر ملکہ اور خاتون اول کی آبروریزی نہ کرے اور اس مہربانی کے عوض وہ جو کچھ چاہتا ہے میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ نوشیروان کی اس لجاجت آمیز عرض داشت کو مزدک نے قبول کر لیا اور اس نے اس کی ماں کو چھوڑ دیا۔ (ابن اثیر: ۱/۴۱۳)

(مزدک نے ایران کے لوگوں کی جائدادیں اور عورتوں کی عصمتیں لوٹنے کا جو مظاہرہ کیا اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو The Age of Faith, P.144)

ابن اثیر نے ہی اپنی تاریخ الکامل میں لکھا ہے کہ بادشاہ کیقباد جب مزدک کا پیروکار ہو گیا تو اس نے اپنی سلطنت کے تمام گورنروں کو بھی اس تحریک میں شمولیت کی دعوت دی۔ حیرہ کے گورنر منذر نے بادشاہ کی اس دعوت کو ٹھکرا دیا۔ بادشاہ نے اس کو اس کی گورنری سے معزول کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب کیقباد مر گیا تو اس کے بعد اس کا بیٹا

Marfat.com

نوشیرواں تخت نشین ہوا۔نوشیرواں اپنے باپ کے عقیدہ کے سخت خلاف تھا۔نوشیرواں نے اپنے دربار میں لوگوں کو حاضری کا اذن عام دیا۔اتفاق سے دو شخصیتیں بھی اکٹھی دربار میں حاضر ہو گئیں۔ پہلے مزدک حاضر ہوا، پھر معزول شدہ گورنر حیرہ منذر بن ماء السماء۔ نوشیرواں ان دونوں کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا، اور کہا:

''میری زندگی کی دو آرزوئیں تھیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ دونوں پوری ہو گئی ہیں۔'' مزدک نے پوچھا: ''شہنشاہ! وہ کون سی دو آرزوئیں تھیں؟'' نوشیرواں نے جواب دیا: ''میری ایک آرزو تو یہ تھی کہ اس باغیرت شخص المنذر کو اپنے عہدہ پر بحال کر دوں جس نے تیری دعوت کو ٹھکرایا تھا، اور دوسری آرزو یہ تھی کہ میں ان زندیقوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں جنہوں نے ملک میں اخلاقی بے راہ روی پھیلا دی ہے اور زن اور زر کو سب کی مشترکہ چیز بنا دیا ہے۔''

مزدک کو معلوم تھا کہ ملک میں میرے ماننے والوں کی اکثریت ہے اور بادشاہ اس اشتراکی تحریک کو ختم نہیں کر سکتا، لہٰذا اس نے کہا: ''کیا تیرے بس میں ہے کہ ان تمام انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے جو اس تحریک کے رکن ہیں۔'' یہ جواب سن کر نوشیرواں ایک دم غصہ سے اچھل پڑا اور بے قابو ہو کر کہنے لگا:

''او زانیہ کے بیٹے! تو ابھی تک یہاں موجود ہے؟ بخدا! تیری جرابوں کی بدبو ابھی تک میری ناک میں موجود ہے جب میں نے اپنی ماں کی عصمت بچانے کے لیے تیرے بدبودار اور متعفن پاؤں کو بھوسہ دیا تھا۔''

چنانچہ نوشیرواں کے حکم سے اس کا سر قلم کر دیا گیا اور اس کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا گیا تا کہ لوگ اس کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ اس کے قتل کے بعد کچھ مزدکیوں نے ملک میں شورش برپا کرنے کی کوشش کی، لیکن نوشیرواں کے حکم سے ایک دن میں ایک لاکھ اشتراکیوں (مزدکیوں) کو قتل کر دیا گیا۔

ملک میں یہ جو اخلاقی انارکی اور بے راہ روی پھیلی ہوئی تھی، یہ سب اس

Marfat.com

اقتصادی اور معاشی نظام کا نتیجہ تھی جو اس وقت ملک میں رائج تھا کیونکہ جب ایک طبقہ بہت زیادہ امیر ہو جائے اور ملک کی اکثریت غربت کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہو تو سرمایہ دار طبقہ پھر فحاشی اور بدکاری کو ملک میں رواج دیتا ہے اور کسی کی عزت اور عصمت اس کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہتی۔ بلکہ فحاشی اور جنسی بے راہ روی کو ملک میں عام کر دیا جاتا ہے جیسا کہ امریکہ اور یورپی ممالک میں اس وقت ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت ایرانی معاشرہ میں عوام الناس کو سخت ممانعت تھی کہ وہ امراء کے طبقہ میں سے کسی کی جائیداد خرید سکیں۔ سوسائٹی میں مختلف طبقات میں ناقابل عبور فاصلہ تھا۔ ذات پات کا تصور عام تھا کوئی بڑا کام نچلی ذات کے آدمی کے سپرد نہیں کرتے تھے اور سوسائٹی میں ہر شخص کی ایک معین جگہ تھی اس وجہ سے کوئی شخص ترقی کر کے اوپر نہیں جا سکتا تھا۔

وطن پرستی اور قوم پرستی ایرانیوں کی گھٹی میں تھی۔ وہ ایرانی قومیت کو نہایت مقدس اور باعظمت سمجھتے تھے۔ چنانچہ موجودہ ایران میں بھی ایک شاعر اس بات پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اگر پرسی زکیش پور داؤد

غلام پارسی ایراں پرستد

ایرانی قومیت کی برتری ان کا عقیدہ تھا۔ اس عقیدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے گردو پیش کی قوتوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خسرو پرویز نے سرکار دو عالم ﷺ کے نامہ مبارک کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جو کہ توہین و تمسخر کی ایک زندہ مثال ہے۔

ایران کے معاشرتی حالات غلط نظام معیشت کی وجہ سے، نہایت خراب تھے۔ ایرانی معاشرہ مختلف طبقات میں منقسم تھا۔ سوسائٹی میں چھوٹے بڑے کا امتیاز اس قدر تھا کہ چھوٹے لوگ معاشرہ میں کوئی اونچا مقام حاصل کر لیں تو یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ وہ اپنا پیشہ تک تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں مذہبی طبقہ کی طرف سے یہ بات ڈالی جاتی تھی کہ تمہارے آباؤ اجداد نے جو پیشہ اختیار کیا تھا وہ خدا کے حکم کے تحت کیا تھا، لہٰذا اب انہیں پیشہ تبدیل کرنے کا حق نہیں ہے۔ ایران کی اعلیٰ سوسائٹی کی عمارت

Marfat.com

دو ستونوں پر قائم تھی۔ ایک نسب اور دوسرا مال و دولت۔ چنانچہ عوام اور خواص کے مابین لباس، سواری، مکان، باغ، عورتوں اور نوکروں کے لحاظ سے امتیاز تھا۔ خواص کی سواری کی شان وشوکت، لباس کی چمک دمک، عورتوں کے فیشن اور میک اپ، سر بفلک محلات، کلاہ اور امیرانہ ٹھاٹھ بھاٹھ ان کی اعلیٰ نسبی کا پتہ دیتے تھے۔ (ایران بعہد ساسانیان: ص ۴۱۷)

تعدد ازواج کا عام رواج تھا۔ ایک شخص کے لیے بیویوں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی۔ ہر شخص اپنی آمدنی کے مطابق بیویاں رکھ سکتا تھا، البتہ غریب آدمی کو صرف ایک بیوی پر قناعت کرنا پڑتی۔ جن لوگوں کی زیادہ بیویاں ہوتیں ان میں ایک بڑی بیوی ہوتی جس کو ''زن پادشاہی ہا'' کہتے۔ دوسری سب بیویاں اس کے ماتحت ہوتیں اور ان کے حقوق بڑی بیوی سے مختلف ہوتے اور یہ سب ''خدمت گار بیویاں'' کہلاتیں۔

(ایران بعہد ساسانیان: ص ۴۲۷)

خود خسرو پرویز کے بارہ میں طبری نے لکھا ہے کہ اس کی تین ہزار بیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ ہزار ہا لونڈیاں تھیں جو بادشاہ کی ہر طرح کی خدمت کرتی تھیں۔ تین ہزار خدمت گار، آٹھ ہزار پانچ سو گھوڑے (ابن اثیر نے پچاس ہزار لکھے ہیں۔) سات سو ساٹھ ہاتھی، بارہ ہزار خچر اور جواہرات اور سیم وزر کے برتنوں کا کوئی حساب نہیں تھا۔

(طبری: ۱/ ۲۶۰، ابن اثیر: ۱/ ۴۹۲)

کسریٰ کے تاج کے بارہ میں مختلف کتابوں میں مرقوم ہے کہ اس کا وزن کئی من تھا۔ یہ تاج طلائی (سونے کا) تھا۔ یاقوت و زبرجد اور دوسرے قیمتی جواہرات سے آراستہ تھا۔ وزنی ہونے کی وجہ سے بادشاہ اسے سر پر اٹھا نہ سکتا تھا، لہٰذا وہ تخت کے اوپر ایک طلائی زنجیر سے معلق تھا۔ کسریٰ تخت پر پردے میں جلوہ افروز ہو کر اس پر سر داخل کر دیتا۔ بعد میں وہ پردہ ہٹا دیا جاتا تو حاضرین اس کی ہیبت اور دہشت سے سجدہ ریز ہو جاتے۔

(السیرۃ النبویہ لابن کثیر: ۱/ ۴۳)

خسرو کے آذربائیجان کے گورنر کے پاس جو سامان اور پراپرٹی تھی، اس کی تفصیل کچھ اس طرح کتابوں میں لکھی ہے:

''ضرورت سے زائد بیس لاکھ دینار، پانچ لاکھ دینار کا سونے

Marfat.com

چاندی کا سامان، چھ لاکھ دینار کے جواہرات، خراسان، عرق، فارس اور آذربائیجان کا کوئی ضلع اور شہر ایسا نہیں تھا جس میں اس کی جاگیریں، مکانات، سرائیں اور زمینیں نہ ہوں۔ تیس ہزار خچر اور گھوڑے تھے۔ دولاکھ بھیڑیں، سترہ سو ترک، یونانی، اور حبشی غلام چودہ سو لونڈیاں۔" (ایران بعہد ساسانیان: ص ۵۰۳)

اس ایک گورنر کی جائیداد اور دولت وثروت سے دوسرے گورنروں کے مال و زر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ "قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔"

ان معاشرتی حالات سے ایران کے معاشی حالات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کیونکہ جب معاشرے کی ساری دولت اوپر کی سوسائٹی کے چند ہاتھوں میں اکٹھی ہو جائے تو عوام الناس، کاشتکار، مزدور اور دستکار قلاش اور مفلس ہو جاتے ہیں۔ پھر وہی حالت ہو جاتی ہے جس کا نقشہ کچھ یوں کھینچا گیا ہے

ملیں اس لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

جب دولت چند ہاتھوں میں رک جائے تو معاشرہ کی معاشی اور اقتصادی حالت روز بروز بگڑتی چلی جاتی ہے اور عوام کا کام صرف یہی رہ جاتا ہے کہ وہ اپنا خون پسینہ بہا کر بڑے لوگوں کی تجوریاں بھرتے رہیں اور ان کی عیش وعشرت کے لیے انہیں سامان بہم پہنچاتے رہیں۔ اس قسم کے نظام میں امیر روز بروز امیر تر ہوتا جاتا ہے اور غریب غریب تر۔ چنانچہ ایرانی معاشرہ میں بھی یہی صورت حال تھی۔ کاشت کار، مزدور، دست کار اور دوسرے لوگوں کے مقدر میں مفلسی، قلاشی اور محرومی کے سوا اور کچھ نہ تھا، اور ان کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ امراء، رؤسا، جاگیرداروں اور مراعات یافتہ فوجی جرنیلوں کے لیے دن رات کام کریں اور جو کچھ حاصل ہو وہ ان کے عیش و آرام کے لیے انہیں مہیا کریں۔ غریب عوام جو کچھ کماتے تھے وہ ٹیکسوں کی صورت میں ان سے چھین لیا جاتا تھا۔ ملک میں سات خاندان جن میں شاہی خاندان بھی شامل تھا، ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ امراء جن کو "العظماء" کہا جاتا تھا وہ بھی ہر قسم کے ٹیکس کی

Marfat.com

ادائیگی سے بری تھے۔ جو لوگ وسیع و عریض جاگیروں کے مالک تھے اور جن کے پاس دولت کے انبار تھے، انہیں ہر قسم کے ٹیکس کی مراعات حاصل تھیں اور ٹیکسوں کا سارا بوجھ نادار اور مفلوک الحال عوام پر ڈال دیا گیا تھا اور وہ شام و پگاہ جانوروں کی طرح کام کر کے حکومت کے خزانہ کو بھرتے تاکہ یہ بڑے بڑے اعیان سلطنت اس خزانۂ عامرہ سے داد عیش دے سکیں۔

ان ٹیکسوں سے جمع شدہ رقم سے رفاہ عامہ پر بہت کم خرچ کیا جاتا تھا۔ ملک کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ بادشاہ کے ذاتی خزانہ میں جاتا جو اس کی ذاتی ملکیت ہوتا۔ مال غنیمت کا سارا مال اور روپیہ بادشاہ کا ذاتی شمار ہوتا۔ ملک کی جاگیروں کی ساری آمدنی بھی اس کے ذاتی خزانہ میں جاتی۔ عید نوروز اور مہرگان کے موقع پر جبراً قیمتی تحائف لیے جاتے جو سارے کے سارے بادشاہ کے ذاتی خزانہ میں جمع ہوتے۔ اس بے پناہ آمدنی سے بادشاہ تکلفات زندگی تعیّشات اور سامان آرائش کی وہ بہتات اپنے گرد جمع کرتے کہ عقل ان کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو The Age of Faith P.145)

یہ تھے مختصر معاشی اور اقتصادی حالات اس زمانہ کی ایرانی سلطنت کے جب سرکار دو عالم ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے۔

رومی حکومت کی حالت:

دوسری طرف رومی سلطنت تھی جس کو بازنطینی حکومت بھی کہتے تھے۔ اس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا۔ یہاں کا نظام معیشت و اقتصاد بھی ایرانیوں سے مختلف نہ تھا۔ وہی سرمایہ دارانہ نظام تھا جس میں غریب دن بدن غریب اور امیر امیر تر ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں قومی تعصّبات اور بے قید سیاست نے انہیں پستی و ذلت کی انتہائی حد تک پہنچا دیا تھا۔ ان کی معاشرت ظالمانہ اور انسانیت کش قوانین پر مبنی تھی۔ سلطنت روما اس وقت دو بازوؤں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ مغربی بازو اور مشرقی بازو۔ مغربی بازو اخلاقی طور پر تنزل وانحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے:

"اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو

Marfat.com

بھی ان کی ہلاکت سلطنت کے مغربی بازو کو زوال اور تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی۔''

ایک اور مقام پر گبن نے لکھا ہے:

''رومن حکومت مخالفین کی نظر میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالم اور ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ کفایت شعاری جتنی ضروری ہوتی جا رہی تھی اسی قدر اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جا رہی تھی، اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔''

(The History of Decline and Fall of the Roman Empire Vol.II P.124)

اس سیاسی انارکی، غلط نظام معیشت اور اخلاقی انحطاط اور پستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی وحشی اقوام نے سلطنت روما کے مغربی بازو کو کچل کر رکھ دیا اور اپنے سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم کی وجہ سے رعایا کو پیس کر رکھ دیا۔

رومی حکومت کا اپنی رعایا کے ساتھ کوئی اچھا برتاؤ نہ تھا۔ ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ رعایا کے وسائل ترقی پر بندش تھی۔ ہر شخص حکومت کے ظلم وستم کے آہنی شکنجہ کے نیچے کراہ رہا تھا۔ اس سلسلہ میں الفرڈ بٹلر کا بیان رومی حکومت کے رعایا کے ساتھ معاملات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتا ہے۔

''مصر میں رومی حکومت کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ جس طرح ہو سکے رعایا سے مال لوٹ کر حکام کو فائدہ پہنچایا جائے۔ رعایا کی بہتری، خوش حالی اور اس کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کا خیال کبھی ان کے حاشیہ خیال میں نہیں آتا تھا۔ رعایا کے اخلاق کی درستی اور تہذیب کی بہتری اور ان کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ مصر میں ان کی حکومت پردیسیوں کی سی تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کرتے ہیں اور محکوم قوم کے ساتھ

Marfat.com

اظہار ہمدردی کرنے تک کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔"

(Alfred Butler: Arabs Conquest of Egypt and The Last Thirty Years of The Roman Dominion, P.42)

سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی وجہ سے ان دونوں حکومتوں (ایرانی اور رومی) کے اعلیٰ حکام کے سروں پر عیش پرستی اور شہوانی خیالات کا بھوت سوار تھا کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا یہی خاصہ ہے۔ ان دونوں حکومتوں میں مصنوعی تہذیب اور پرفریب زندگی کا ایک سیلاب امڈ آیا تھا جس میں ہر شخص گلے تک غرق تھا۔ عیش وعشرت کے سوا ان ہی حکومتوں کے امراء ورؤساء کو اور کوئی فکر نہ تھی۔ تکلفات زندگی اور سامان آرائش اور تعیشات کی ان کے ہاں وہ بہتات تھی جس کی قلم کو تاب نگارش نہیں۔ اہل ایران سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے وہ کئی کئی لاکھ کی ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنے خیال میں اپنا معیار زندگی اتنا بلند اور اونچا کرلیا تھا کہ ایک شخص اپنی ذات اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اتنا روپیہ صرف کرتا جس سے پوری بستی پرورش پا سکتی تھی۔ چنانچہ ہرمز کی ایک کلاہ کی قیمت ایک لاکھ تھی جس میں مختلف قسم کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ شاہ حیرا کسریٰ ایران کا ایک عزیز تھا اس کی کلاہ کی قیمت پچاس ہزار اور رستم جو کہ کسریٰ کا وزیر دفاع تھا، اس کی کلاہ کی قیمت ایک لاکھ تھی۔

اصل میں بات یہ ہے کہ ان دونوں حکومتوں میں بہیمانہ طبقاتی نزاع، خود غرضانہ گروہ بندی، ملت کش مفاد پرستی، ظالمانہ سیاست، معاشی ناہمواری اور نامساوات اور جبر واستبداد اپنے پورے عروج پر تھا اور ہر طرف وحشت اور بہیمیت کا دور دورہ تھا۔

مشرق خراب، مغرب ازان بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجو

یہ دونوں حکومتیں اگرچہ اپنے آپ کو متمدن اور مہذب کہتیں لیکن یہ تمدن اور تہذیب جنگل کے درندوں کی تھی نہ کہ شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والے انسانوں کی۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے اسے "جاہلیت" کا دورہ کہا ہے، اور یہ نظام جس دور میں بھی ہو وہ جاہلیت کا دور ہوگا خواہ اس دور کے انسان پرندوں کی طرح ہوا میں اڑیں یا مچھلیوں کی طرح سمندر میں تیریں۔

Marfat.com

تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ سلطنت رومہ کے معاشی حالات بھی ایران سے مختلف نہ تھے۔ یہاں بھی سلطنت کی آبادی دو طبقوں میں منقسم تھی۔ ایک امراء اور جاگیرداروں کا طبقہ اور دوسرا عوام اور غرباء کا طبقہ، اور ان دونوں طبقات میں بھی وہی کشمکش تھی جو ایک سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتی ہے۔ امراء اور رؤسا اقتصادی طور پر عام طبقہ سے بلند و بالا اور زرعی زمینوں کے وسیع و عریض قطعات کے مالک تھے، لہٰذا ان کی اکثریت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کو عیش و عشرت کے اسباب مہیا کرنے کے لیے غرباء کو ڈھور ڈنگروں کی طرح دن رات کھیتوں وغیرہ میں کام کرنا پڑتا تھا، اس وجہ سے وہ کئی نسلوں سے غربت و افلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وسائل رزق پر امراء کے طبقہ کا قبضہ تھا اس وجہ سے وہ دن بدن غریب سے غریب تر ہو رہے تھے۔ کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔

امراء اور خوش حال طبقہ کو زندگی کی ہر قسم کی سہولیات میسر تھیں جب کہ کاشت کار، دست کار اور عام آدمی ان تمام سہولیات سے یک قلم محروم تھے۔ اس وجہ سے امراء اور غرباء کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ البتہ غریبوں کا دل بہلانے کے لیے ملک میں جگہ جگہ سرکس، جنگی رتھوں کی دوڑ اور جنگی مقابلے ہوتے تھے جن میں شرطیں بھی لگتی تھیں اور وقتی خوشی میں غریب اپنا دل بہلا لیتا اور ہفتہ بھر کی معاشی دوڑ دھوپ کے رنج و غم کو کچھ وقت کے لیے بھول جاتا۔

معاشرتی نظام کا گہرا تعلق ملک کے معاشی نظام سے ہوتا ہے۔ جب معاشرتی نظام مختلف طبقات میں منقسم ہو تو معاشی نظام میں بھی نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ اگرچہ ملک کا معاشی اور اقتصادی نظام مخلوط قسم کا تھا لیکن اس زمانہ کی بڑی بڑی صنعتیں اور جاگیریں حکومت کے کنٹرول میں تھیں جس کی وجہ سے کاشتکار اور مزدور حکومت اور جاگیرداروں کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ملک میں نجی کاروبار کی بھی اجازت تھی لیکن نجی کاروبار کرنے والے بھی مختلف قسم کے ٹیکسوں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ حکومت کے ٹیکس ادا کرنے کے بعد ان کی حالت میں خوش حالی کی کوئی نوید نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں ہے کہ:

Marfat.com

''سلطنت کا مالیاتی نظام انتہائی حد تک خراب تھا۔ اگر حکومت عوامی اقتصادیات کے اصولوں سے آشنا ہوتی تو اپنی رعایا کی خوش حالی کو مجروح کیے بغیر اپنی آمدنی میں بہت کچھ اضافہ کر سکتی تھی۔ جو ٹیکس لگائے جاتے تھے ان کی شرح بہت زیادہ تھی۔ پھر اس کی وصولی کے لیے نہایت جبر و تشدد سے کام لیا جاتا تھا۔ حکومت تاجر پیشہ لوگوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ لوگوں سے زیادہ سے زیادہ بلکہ سارا مال چھین کر اپنا خزانہ بھر لے۔ زراعت آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ بازنطینی حکومت کے عہد میں زمین کے مالکوں پر اتنا بوجھ ڈالا جاتا رہا جو نہایت نامناسب تھا۔ زمین مالکان کا لگان زرعی پیداوار کے حساب کے مطابق نہیں لیا جاتا تھا بلکہ زمین کی مالیت اور مالک زمین کی حیثیت کے مطابق لیا جاتا تھا۔

''ٹیکس وصول کرنے کی ذمہ داری مجلس نمائندگان کے ارکان پر عائد تھی۔ ساتویں صدی تک یہی دستور رہا کہ مجلس نمائندگان کے ارکان ٹیکسوں کی وصولی کرتے اور پھر اس کو حکومت کے خزانہ میں جمع کراتے۔ جو لوگ لگان نہیں دیتے تھے ان کے حصے کا لگان اور ٹیکس ان نمائندگان کو اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس نمائندگان کے کئی ارکان بری طرح زیر بار ہو جاتے۔ کاشت کاروں پر اور بھی طرح طرح کی ذمہ داریاں ڈالی گئی تھیں جن میں سب سے زیادہ اہم ذمہ داری یہ تھی کہ حکومت کے ڈاک خانوں کے لیے گھوڑے، بگھیاں اور لڑکے مہیا کرنا تھا۔ چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی میں کاشتکاروں کو زمین کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا تھا۔ اگر پہلا مالک اپنی زمین فروخت کر دیتا تو خریدنے والے کو زمین کے ساتھ وہ کاشت کار بھی منتقل کر دیئے جاتے جو پہلے مالک کے

Marfat.com

وقت زمین میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ (گویا زمین کے ساتھ مزارع بھی فروخت ہو جاتے)۔'' (انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا:۱۹/۴۴۲)

ایک اور جگہ پر مقالہ نگار نے لکھا ہے:

''اگر کبھی ناگوار اور ناہموار موسموں کے باعث فصلیں تباہ و برباد ہو جاتیں تو اس کے باوجود لگانوں اور زرعی ٹیکسوں میں کمی نہیں کی جاتی تھی، اور جو شخص مالی تنگی کی وجہ سے لگان اور زرعی ٹیکس ادا نہیں کرتا تھا تو اس کی غیر منقولہ جائداد بحق سرکار ضبط کر لی جاتی تھی۔ ان مالی مجبوریوں اور مالی مظالم کے باعث کبھی کبھی لوگ بغاوت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک بغاوت ۵۳۲ھ میں ہوئی۔ اس میں صرف دارالسلطنت میں تیس ہزار نفوس کام آئے۔'' (انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا:۱۳/۲۱۱)

یہ تو عوام الناس کی خستہ حالی اور معاشی ناداری کی ایک نامکمل سی تصویر ہے، لیکن اس کے برعکس شاہی خاندان اور ملک کی بیوروکریسی، جاگیرداری اور رؤساء کی عیش کوشی اور لذت آفرینی کی داستانیں پڑھ کر آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان کے عالی شان اور سربفلک محلات، دیوان خانے، شراب نوشی کی مجالس اور عیش وعشرت کے ساز و سامان کی کوئی انتہاء نہ تھی۔ جب معاشرتی اور معاشی حالات ایسے ہوں تو اخلاقی حالت یقیناً زوال پذیر ہوتی ہے جیسا کہ آج کل یورپ اور امریکہ کے لوگوں کی اخلاقی حالت ہے، لندن کے ایک روزنامہ ''دی سن'' مورخہ ۱۶ جولائی ۲۰۰۳ء میں ایک عورت کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا جس کا عنوان تھا: I want my son back۔ جس عورت نے یہ اشتہار شائع کرایا اس کی عمر ۵۵ سال ہے اور اس کے اپنے سگے بیٹے کے ساتھ گذشتہ سات سال سے جنسی تعلقات ہیں، اور یہ اس کے دو بیٹوں کو جنم بھی دے چکی ہے۔ اس اشتہار میں جنس زدہ ماں اپنے بیٹے سے فریادی ہے کہ وہ ۵۵ سال کی عمر میں اسے اپنے دو بچوں کی ماں بنا کر تنہا نہ چھوڑ دے کیونکہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے، اور اس کی جدائی میں پریشان ہے۔ اخبار کے مطابق بیٹے نے ماں کے پاس واپس جانے

Marfat.com

سے یہ کہہ کر انکار کر دیا ہے کہ وہ ہر روز ایک نئی موت نہیں مر سکتا۔

برطانوی ماہر قانون مسٹر ہڈسن (Hudson) نے اس واقعہ کے بارہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> ''خدا ہم پر رحم کرے پتہ نہیں ہم اور کیا کچھ کریں گے۔ اس عورت کو مر جانا چاہیے تھا لیکن وہ نہایت ڈھٹائی سے اخبارات میں اپیلیں شائع کروا رہی ہے۔ اب تو ہم جنس پرستوں (Gays) کو قانونی تحفظ بھی مل گیا ہے لیکن پھر بھی یہ عورت اپنے بیٹے کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔''

جدید نظام سرمایہ داری:

سطور بالا میں نظام سرمایہ داری کے بارہ میں جو کچھ بتایا گیا وہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل کا نظام سرمایہ داری تھا جس کا چلن ایران اور رومہ کی سلطنتوں میں تھا۔ موجودہ زمانے کا نظام سرمایہ داری اس سے مختلف نہیں صرف فرق یہ ہے کہ انہوں نے اس نظام کو سائنٹیفک طریقہ سے کچھ ایسا چھپایا ہوا ہے کہ غریب سب کچھ جانتے اور محسوس کرتے ہوئے بھی اس سے بغاوت نہیں کرتا کیونکہ اس کی ضروریات کو کریڈٹ کارڈوں (Credit Cards) کے ذریعہ پورا کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ انسان کا معاشی مسئلہ اس کی آفرینش کے ساتھ ہی وجود میں آ گیا تھا لیکن اس کو ایک علم کی شکل میں مرتب کرنے کا سہرا آدم اسمتھ (Adam Smith) کے سر پر باندھا جاتا ہے اور اس کی مرتب کردہ کتاب ''دولت اقوام'' (The Wealth of Nations) کو علم معاشیات کا صحیفہ اول قرار دیا جاتا ہے جب کہ مسلمان دانشوروں اور مفکرین محمد بن حسن طوسی (۱۲۷۴ء) اور علامہ ابن خلدون (۱۴۰۶ء) کی تحریروں میں وہ تمام معاشی نظریات موجود ہیں جن کی ایجادات کا دعویٰ آدم اسمتھ کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صنعتی انقلاب اور یورپ میں احیائے علوم کی تحریک نے اقوام مغرب کو بلاد اسلامیہ پر جو فکری، سیاسی، علمی اور عسکری برتری دی ہے اس کی وجہ سے محکوم اقوام کا علمی سرمایہ ان کے سامنے نہ صرف ماند پڑ گیا ہے بلکہ

معدوم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے طوسی اور ابن خلدون تو گوشہ خمولت میں چلے گئے اور آدم اسمتھ کا نام دنیائے معاشیات میں چمکنے لگا، لیکن مغربی معاشیات جس کی بنیادوں پر نظام سرمایہ داری قائم ہے، اس میں اور اسلامی معاشیات میں بہت فرق ہے۔

1- کائنات کا تصور:

مغربی معاشیات کا سارا تانا بانا اس فکر سے تیار ہوا ہے کہ کائنات صرف ایک مادی وجود ہے اس وجہ سے مادہ کی تمام خصوصیات، محدودیت اور عدم فنا پذیری اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اسی تصور سے وسائل رزق کی محدودیت اور کمیابی نے جنم لیا۔ وسائل کی یہ کمیابی ہی معاشی مسئلہ کے وجود میں آنے کی اصل بنیاد ہے۔ چنانچہ ایک مغربی ماہر معاشیات ڈاکٹر رابنز نے کہا ہے کہ ''معاشیات وہ علم ہے جو انسان کے اس رویہ کا مطالعہ کرتا ہے جو ایک سے زائد طریقوں سے استعمال میں آنے والے کمیاب ذرائع اور کثیر مقاصد کے درمیان بطور ایک رابطہ کے ظاہر ہو۔''

وسائل کائنات میں یہ کمیابی کیوں ہوتی ہے؟ اس کا جواب ماہرین معاشیات نے یہ دیا ہے کہ یہ تصور جارحانہ خودغرضی، مسابقت اور باہمی کشمکش کی وجہ سے ہے۔ جس کے نتیجہ میں زر آور، مال دار اور بہتر وسائل سے بہرہ ور افراد تو اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ وسائل رزق سمیٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جب کہ مزدور، کاشت کار، ہاری اور دوسرے معاشی طور پر کمزور افراد اس معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اوقات زندگی روز بروز تلخ سے تلخ تر ہوتے جاتے ہیں۔ موجودہ معاشیات کا یہ تصور کائنات سراسر مادی ہے۔

اس کے برعکس اسلام میں معاشی اور اقتصادی زندگی کی بنیاد اس تصور پر قائم ہے کہ یہ کائنات کسی جاہل اور اجڈ ہستی نے نہیں بنائی اور نہ ہی یہ خود بخود پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کو ایک علیم و خبیر ذات نے تخلیق کیا ہے جو اپنی صفات ربوبیت، رزاقیت اور قدرت و قیومیت کے ساتھ اس کا انتظام اور اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس نے اس کائنات میں زمین کی تہوں، مٹی کے ذروں، سمندر کی لہروں اور افلاک کی پہنائیوں میں نہ صرف انسان کے

Marfat.com

لیے بلکہ پوری کائنات کے لیے رزق کے خزانے اور لامتناہی وسائل رزق پیدا کر رکھے ہیں۔ اس نے اپنی مخلوق جس کو حدیث میں "اللہ کا کنبہ" (الخلق عیال الله) کہا گیا ہے، رب العالمین ہونے کی حیثیت سے ان کی ضروریات اور پرورش کا تمام سامان مہیا کر رکھا ہے۔ وسائل رزق کی کمیابی کے تصور سے اس کی صفات عالیہ میں تنقیص کا پہلو نکلتا ہے جب کہ وہ ذات ہر قسم کے عیب ونقص سے یک قلم پاک ہے۔

2- تصورانسان:

کائنات کے تصور کی طرح انسان کا تصور بھی اسلامی اور غیر اسلامی معاشیات میں مختلف ہے۔ مغربی معاشیات میں انسان دوسرے جانوروں کی طرح ایک جانور اور حیوان ہے جو اپنے جبلی داعیوں کے تحت اعمال حیات انجام دیتا ہے۔ لہٰذا جو اصول و قوانین دوسرے حیوانات اور جانوروں پر لاگو ہوتے ہیں، وہی قوانین اس کی زندگی پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ ڈارون (Darwin) کے نزدیک بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کا جو قانون دیگر حیوانات میں لاگو اور کارفرما ہوتا ہے، نوع انسانی کے افراد میں بھی اس قانون کا اطلاق اسی طرح ہوتا ہے۔ انسان کے حیاتیاتی ارتقاء کے باوجود اس کی حیوانی سطح اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ معاشیات اور اقتصادیات کی نگاہ میں اس کا یہی حیوانی پہلو اصل اہمیت کا حامل ہے۔

لیکن اس کے برعکس اسلامی معاشیات میں انسان کے بارہ میں یہ تصور نہیں ہے کہ وہ دوسرے حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے بلکہ اسلام کے نظام معیشت میں انسان کے بارہ میں تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ یہ بندر جیسے حیوان سے ترقی کر کے انسان نہیں بنا بلکہ اللہ نے خاص اہتمام سے اس کو انسان ہی پیدا کیا اور اس کی فطرت میں اپنی پاکیزہ روح پھونکی (ونفخت فيه من روحي) اس وجہ سے اس کائنات ارضی میں اس کا مرتبہ اور مقام دوسری تمام مخلوق سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اسے دنیا میں اپنے خالق کی مرضیات اور احکامات نافذ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس لیے اسے روٹی اور روزی کے لیے ذلیل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی غلامی کی زنجیروں سے اسے جکڑا جا

Marfat.com

سکتا ہے، اس کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی جدوجہد کا وہی انداز اپنایا جا سکتا ہے جو اس کی شان کے شایاں اور رزق کریم کی فراہمی کا ضامن ہو۔

3- ایک معاشی انسان کا مفروضہ:

مغربی اور غیر اسلامی معاشیات میں جس کا موجودہ دنیا میں چلن ہے، حیوانی انسان کے اندر ایک معاشی انسان (Economic Man) کی موجودگی کا تصور دیتی ہے جس کی فطرت کا خمیر خود غرضی، حرص و آز اور خود پرستی سے تیار ہوا ہے۔ اپنی اس جبلت اور فطرت کی وجہ سے یہ معاشی انسان ہر معاملہ میں اپنے ذاتی مفاد کے لیے کوشاں اور اپنے وسائل سے زیادہ سے زیادہ تسکین حاصل کرنے اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے سرگرم اور بے قرار رہتا ہے۔ اس کے قوائے عملیہ جلب منفعت و مسرت اور دفع مضرت والم کے احساسات کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ تصور معاشرہ کے افراد میں خود غرضانہ، مفاد پرستانہ اور زیادہ سے زیادہ جلب منفعت کے احساسات کو جنم دیتا ہے اور ایثار، ہمدردی، رحم دلی اور باہمی معاونت کے جذبات سے ایک انسان کو یک قلم محروم کر دیتا ہے۔

جس نظام کے تحت انسان کے ان جذبات و احساسات اور اس کو معاشی اور حیوانی انسان سمجھتے ہوئے معاملہ کیا جائے، اس نظام کو سرمایہ دارانہ نظام کہا جاتا ہے۔ اس میں پیدائش دولت کے آلات و وسائل افراد کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں اور جو اشیاء و خدمات پیدا کی جائیں ان کی تقسیم و تبادلہ کا کام بھی ان ہی ہاتھوں سے انجام پاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نظام میں لوگوں کی معاشی جدوجہد بجز حکومتی قوانین کے ہر قسم کے اخلاقی قیود سے آزاد ہو۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظام

(1) ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت

(2) ذاتی منافع کے محرک

(3) اور اخلاقی حدود و قیود کی عدم موجودگی سے مرکب ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام ایک مخصوص نظریہ حیات کی پیداوار ہے اور اس نظریہ حیات

Marfat.com

کے بنیادی افکار و اقدار اس نظام کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں اور یہ اس نظام معیشت کو فکری بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ اس نظام کی فکری بنیادیں کیا ہیں؟

(1) مادہ پرستی:

سرمایہ دارانہ نظام حیات مادی فلسفہ حیات سے ماخوذ ہے۔ اس نظریہ کے تحت حیات و کائنات کی اصل مادہ ہے۔ مادہ کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں، اس لیے اس نظام میں ایک انسان کی ساری تگ و تاز اور جدوجہد مادی احتیاجات اور ضروریات کی تسکین میں ہوتی ہے۔ اس مادہ پرستی کو Materialism کہتے ہیں۔

(2) آزادروی:

اس کو معاشیات کی اصطلاح میں Librelism کہتے ہیں۔ یہ آزادروی ایک فرد کے ہر شعبہ زندگی میں جاری و ساری ہوتی ہے اور اس سے اس کو فکر و عمل کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے کسی بالاتر ہستی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ فرد کی آزادی پر کوئی پابندی اور قدغن لگائے۔ اس کامل آزادی کی موجودگی ہی میں ایک فرد اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ ریاست کے اقتدار اعلیٰ کا کام بھی ایک فرد کی آزادی کو محدود کرنا نہیں بلکہ اسے محفوظ کرنا ہے۔ یہ کامل آزادی ہی اس نظام کی خرابی کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔

(3) افادیت پسندی:

اس کو معاشیات کی اصطلاح میں Hedonism کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نظام میں فرد کی جملہ مساعی کا مقصود ذاتی مفاد کا حصول ہوتا ہے۔ جو شئی کسی فرد کے فائدہ، لذت و مسرت کا باعث ہو وہ بالکل درست اور حق ہے اور جو اس کے لیے نقصان، دکھ اور الم کا باعث بنے وہ ناحق اور باطل ہے۔ اجتماعی طور پر بھی وہی حکمت عملی معقول اور مستحسن ہے جو زیادہ سے زیادہ افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اور خوشی اور مسرت بہم پہنچائے۔

Marfat.com

ان فکری بنیادوں پر جو نظام معیشت تشکیل پائے گا، یقینی بات ہے کہ اس میں
افراد معاشرہ کے مابین وسائل معاش کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مسابقت 3
اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ کارفرما ہوگا۔ آزادی فکر وعمل نہ صرف اس جذبۂ مسابقت کو مہمیز لگا کر تیز کر دے گی بلکہ اس کا رخ بالادست طبقات کے حق میں بھی کر دے گی، اور افادیت پسندی ان بالادست طبقات کی استحصالی جدوجہد کو اخلاقی اعتبار سے سند جواز فراہم کر دے گی۔ ان عناصر کی موجودگی میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت واقتصاد استحصال (Exploitation) کے سم قاتل سے کسی صورت بھی پاک نہیں ہوسکتا۔

........❖❖❖........

Marfat.com

سرمایہ دارانہ نظام معیشت

انسانوں کا بنایا ہوا جو بھی قانون اور نظام ہے اس کی کچھ خصوصیات اور کچھ خامیاں ضرور ہوتی ہیں۔ اسی اصول کے تحت سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں بھی کچھ خوبیاں اور خصوصیات ہیں اور کچھ خامیاں اور نقصانات بھی ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں۔

خصوصیات:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت مندرجہ ذیل خصوصیات اپنے اندر لیے ہوئے ہے:

(1) نجی ملکیت کا استحقاق:

اس نظام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نظام میں افراد کے لیے نجی ملکیت کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ قانونی ذرائع سے جو دولت بھی حاصل کی جائے وہ اس فرد کی ملکیت سمجھی جائے گی جو اس کے حصول کے لیے کوشش کرے گا۔ جب وہ اس کی ملکیت ہوگئی تو اب وہ اس اپنی شخصی ضرورتوں، شخصی حاجات کی تسکین اور اس سے مزید دولت پیدا کرنے کے لیے مختلف منصوبوں میں سرمایہ کاری کر سکتا ہے۔ وہ سود اور اچھے اور برے دونوں کاموں میں اپنی مرضی سے اس دولت کو لگا سکتا ہے۔

(2) مسابقت:

جب دولت اور مال وزر کسی فرد کی ملکیت ہو سکتا ہے، اور اس دنیا میں دولت اور مال ہی سے شخصی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں اور ہر قسم کی عیش وعشرت اور اپنی حاجات اور مقابلہ ایک ضروری امر ہے۔ یہ مقابلہ صرف آجر اور مزدور، خریدار اور فروخت کنندہ ہی کے درمیان نہیں ہو سکتا بلکہ ان میں سے ہر فریق کے ارکان کے درمیان بھی آزادانہ اور مکمل

Marfat.com

صورت میں ہونا ضروری ہے تا کہ معاشرے کا ہر فرد اپنی ترقی اور بقا کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے اور اپنی صلاحیتوں کا معاشرہ کے سامنے اظہار کر سکے۔

(3) ذاتی منافع کا محرک:

افراد کی معاشی جدوجہد کا ایک محرک ذاتی منافع ہے اور یہ سب سے بڑا محرک ہے۔ چنانچہ جہاں کسی فرد کو زیادہ منافع کی توقع ہو گی وہاں وہ بے دھڑک اپنا سرمایہ لگائے گا اور زیادہ سرمایہ کے حصول کے لیے شبانہ روز کوشش کرے گا۔ اگر سرمایہ کاری میں ذاتی منافع کا محرک نہ ہو تو کوئی شخص بھی کسی جگہ اپنے سرمایہ کو صرف نہیں کرے گا۔

(4) معاشی آزادی:

اس نظام معیشت میں جہاں یہ ثابت ہو گیا کہ ہر فرد کو نجی ملکیت کا حق حاصل ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فرد کو معاشی جدوجہد میں بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ فرد (یا افراد) اپنے وسائل کو جس طرح چاہیں اپنی مرضی سے استعمال کر سکتا ہے۔ وہ اپنی شخصی ضروریات کو پورا کرنے کا جو انداز چاہیں اختیار کریں اور اپنی دولت میں اضافہ اور بڑھوتری کے لیے اپنی پسند کا کوئی بھی کام اور پیشہ اختیار کر لیں، ان پر کوئی قدغن اور پابندی نہیں۔ وہ پیشہ یا ذریعہ غلط ہو یا درست، اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی سب کو اختیار کر سکتا ہے بشرطیکہ یہ ریاست کے قوانین اور معاہدات کے خلاف نہ ہوں۔

(5) نظام اجرت:

اس نظام معیشت کے تحت مزدور اور محنت کار آلات پیدائش کے مالک نہیں ہوتے بلکہ وہ آجر کے پاس صرف اجرت پر کام کرتے ہیں، اس سے محنت کش روزگار اور شرائط روزگار کے لیے مکمل طور پر آجر کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آجر کے لیے محنت کشوں اور مزدوروں کا استحصال (Exploitation) آسان ہو گیا، اس کا ازالہ مزدور یونینوں (Workers Unions) کے قیام سے پورا کیا گیا۔ اگرچہ یونین لیڈرز بھی آجر سے مل کر مزدوروں کے استحصال میں مدد دیتے ہیں لیکن پھر بھی اس سے کافی فرق پڑا ہے۔

Marfat.com

(6) صارف کی حکمرانی:

اس نظام معیشت کے تحت چونکہ برتری آجر کو ہوئی ہے لیکن پیدائش دولت کی سرگرمیوں کا رخ متعین کرنے کے لیے صارف کو اہمیت حاصل ہے اور وہ پیدائش دولت کی سرگرمیوں کا رخ متعین کرتا ہے، کیونکہ اس کی طرف سے جن اشیاء اور خدمات کی طلب کا اظہار ہوگا آجر اپنے سرمایہ کو لگانے اور اس سے منافع کمانے کے لیے ان ہی کو پیدا کرنے پر مجبور ہوگا۔ اگرچہ موجودہ زمانہ میں میڈیا کے پراپیگنڈہ سے اور اجارہ دارانہ نوعیت کا اثر و رسوخ رکھنے والی کثیر القومی (Multinational) کمپنیوں کے ذریعے صارف کی طلب کو بھی متاثر کیا جانے لگا ہے، تاہم اس حقیقت سے انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ صارف کی ترجیحات پیدا کی جانے والی اشیاء کی نوعیت اور مقدار پر گہرا اثر ڈالتی ہیں، اور آجر اگر ان ترجیحات کو نظر انداز کردے تو اس کے لیے منافع کا حصول ممکن نہ ہوگا۔

(7) قیمتوں کی میکانیت:

اس نظام معیشت میں معاشی اور اقتصادی سرگرمیوں کا رخ متعین کرنے میں سب سے اہم اور مؤثر کردار قیمتوں کی میکانیت کا ہے۔ وہی چیزیں پیدا کی جاتی ہیں جن کی قیمتیں اتنی ہوں جو آجر کے لیے منافع کا باعث بن سکیں۔ گویا پیداواری وسائل کا رخ کن اشیاء اور پیشوں کی طرف ہوگا، اس کا فیصلہ قیمتیں ہی کرتی ہیں۔ قومی اور اجتماعی مفاد اس بارہ میں ثانوی اہمیت رکھتا ہے۔ اشیاء کی عاملین پیدائش کے معاوضوں اور تنخواہوں کا تعین بھی قیمتوں کی میکانیت کے تحت ہوتا ہے۔ جن عاملین پیدائش کی رسد ان کی طلب سے کم ہوگی ان کے معاوضے بھی کم ہوں گے اور جن کی طلب اس کی رسد سے زیادہ ہوگی ان کے معاوضے بھی زیادہ ہوں گے۔ جن عاملین کے معاوضے زیادہ ہوں گے ظاہر ہے کہ قومی آمدنی میں ان کا حصہ بھی زیادہ ہوگا۔

آجر اپنا منافع زیادہ سے زیادہ کرنے کے لیے عاملین پیدائش کا وہی اشتراک منتخب کرتا ہے جس پر اس کی لاگت اور خرچہ کم سے کم ہو۔ وہ ایک طرف تو اپنی لاگت یعنی مصارف پیدائش دیکھتا ہے اور دوسری طرف اشیاء کی قیمتوں پر نظر رکھتا ہے۔ اس سے نہ

Marfat.com

صرف اسے پیدا کی جانے والی اشیاء کی نوعیت بلکہ اس مقدار کا تعین کرنے میں بھی بڑی راہ نمائی حاصل ہوتی ہے۔ قیمتوں کی میکانیت کا یہ خود کار نظام سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں معاشی سرگرمیوں کو رواں دواں رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

(8) ریاست کی عدم مداخلت:

اس نظام معیشت میں ریاست فرد یا افراد کے کاروبار میں مداخلت نہیں کرتی۔ اس کا کام صرف امن وامان کا قیام ہے تا کہ اس فضا میں سرمایہ کاری عام ہو سکے اور عدل وانصاف کی فراہمی ہو۔ معاشی فیصلوں اور ان پر عمل درآمد کا کام کلیۃً افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ افراد اپنے مفاد کے بہترین محافظ ہوتے ہیں، اور ریاست کی مداخلت بعض ملکی مفاد کو نقصان پہنچاتی ہے۔

خوبیاں (Merits)

اس نظام میں کچھ خوبیاں بھی ہیں لیکن نقصانات کے مقابلہ میں یہ خوبیاں بہت کم ہیں۔

(1) وسائل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ:

اس نظام معیشت میں چونکہ نجی ملکیت، محرک منافع اور معاشی آزادی ہوتی ہے، اس وجہ سے افراد اپنی خداداد صلاحیتوں اور اہلیتوں کا بھرپور اور بہترین انداز میں مظاہرہ کرتے ہیں جس سے انہیں خود بھی فائدہ ہوتا ہے اور ریاست کو بھی ٹیکسوں کی صورت میں فائدہ پہنچتا ہے۔ افراد کو قدرتی اور انسانی وسائل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اشیاء وخدمات کثیر تعداد میں وجود میں پیدا ہوتی ہیں اور عوام کو اپنی ضروریات زندگی اور احتیاجات حیات کی تسکین کا سامان میسر آتا ہے۔

(2) ایجادات واختراعات:

ذاتی منافع کے محرک اور باہمی مسابقت کی موجودگی میں آجر اور کارخانہ دار ہر وقت اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ پیداوار کے بہتر سے بہتر طریقے ان کی

Marfat.com

دسترس میں رہیں۔ اس جذبہ محرکہ سے نت نئی ایجادات، کام کے نئے طریقے اور تنظیم کاروبار کے ایسے اسلوب ظہور میں آتے ہیں جو کثیر اور زود پیدا آوری کے ساتھ ساتھ پیداواری لاگت میں کمی کا باعث بننے والے ہوں۔

خامیاں (Demerits)

(1) فکری لغزشیں:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت مادہ پرستی، آزاد روی، افادیت پسندی کی جن فکری بنیادوں پر استوار ہے، ان سے کبھی بھی پرسکون اور عادلانہ معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا کیونکہ مادہ پرستی کی کوکھ سے خودغرضی اور خود پرستی جنم لیتی ہے جو معاشرہ سے ہمدردی اخوت اور خیر خواہی کے جذبات کو ختم کر کے باہمی کشمکش کا جہنم بھڑکا دیتی ہے۔ آزادروی کی پیدا کردہ بے قیدی اور بے راہ روی معاشرتی انضباط کی قدروں کو تہس نہس کر کے رکھ دیتی ہے۔ گردن توڑ مسابقہ (Cut Throat Competition) کے جذبہ کو فروغ ملتا ہے جس کی چکی میں کمزور افراد پس کر رہ جاتے ہیں۔ افادیت پسندی افراد کو اجتماعی مفاد سے بے نیاز کر کے خویش پروری اور لذت پرستی کا اسیر بنا دیتی ہے۔ ایسے خودسر، خود پسند اور خودغرض انسانوں سے تشکیل پانے والا معاشرہ کثرت وسائل کے باوجود معاشی مشکلات ومصائب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

(2) طبقاتی کشمکش:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں سرمایہ داروں کے ظالمانہ استحصال نے معاشرہ کو آجر اور اجیر، کارخانہ دار اور مزدور اور جاگیردار اور ہاری کے متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے جس سے معاشرہ کی ہم آہنگی اور سکون پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ سرمایہ اور محنت کی اس کشمکش نے سوشلزم اور فاشزم جیسے خون آشام نظریات کو جنم دیا ہے۔

(3) دولت کی غیر منصفانہ تقسیم:

یہ نظام اپنی فکری اساس کے زیر اثر چونکہ اخلاقی اقدار کی کارفرمائی سے یکسر

Marfat.com

عاری ہے اس لیے کاروباری حضرات زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی خاطر ہر جائز و ناجائز حربہ اختیار کرنے میں باک محسوس نہیں کرتے۔ دل کش اور دل فریب اشتہار بازی اور میڈیا کے پروپیگنڈہ کے ذریعہ مضر صحت اور مخرب اخلاق اشیاء فروخت کی جاتی ہے۔ احتکار اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ مصنوعی قلت پیدا وار کر کے زیادہ قیمتیں وصول کی جاتی ہیں اور مصنوعی اجارہ داریوں کے ذریعہ صارفین کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اغراق (Dumping) کے ذریعہ بیرونی منڈیوں پر قبضہ جمانے کے لیے تجارتی حریفوں کو میدان کار سے بھگا دیا جاتا ہے۔

(6) ریاست کی عدم مداخلت:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ریاست سرمایہ داروں کے معاملات میں حکومت کوئی مداخلت نہیں کرتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ریاست کی عدم مداخلت کی وجہ سے سرمایہ داروں کو کھل کھلینے کی چھٹی مل جاتی ہے۔ دوسرے جمہوریت جیسے نہایت مہنگے نظام حکومت نے سیاسی اقتدار بھی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے دیا ہے، کیونکہ جمہوریت بھی سرمایہ دارانہ نظام کی ایک فرع ہے۔ اس میں ریاست کے تمام امور کی زمام کار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جیسے امریکہ میں یہودی سرمایہ کار جس کو چاہتے ہیں صدر بناتے ہیں۔ کیونکہ سرمایہ داروں کے سرمایہ پر پارٹیاں الیکشن جیتی ہیں۔ پھر جمہوریت میں حکومت کا محور صرف معاشیات کو بنانا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی ارادہ (General Will) جو جمہوری ریاستوں کا مسجود اور طاغوت ہے، انفرادی ارادوں کے اجتماع سے وجود میں آتا ہے۔ اور افراد جب خدا کی عبادت اور بندگی سے آزاد ہوں تو ان کا منتہائے مقصود صرف نفس بدن کے مطالبات کو پورا کرنا ہوتا ہے جو معاشیات کا سرچشمہ ہے، بدیں وجہ ہر جمہوری حکومت معاشی مسائل کو اولیت کا درجہ دیتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ کو معاشیات کے تابع کر دینے کا لازمی نتیجہ وہ حیوانیت اور بہیمیت ہے جس کا مشاہدہ ہم مغربی جمہوری ممالک میں کر رہے ہیں۔ اخلاقی حس کی موت، خدا سے بے نیازی بلکہ بیزاری، مادہ پرستی کا غلبہ یہ سب چیزیں اسی شکم پرستی اور

Marfat.com

حرص و آز کے لازمی نتائج ہیں جن سے نجات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک جمہوریت کا عفریت دنیا میں باقی ہے اور جب تک معاشیات کے بت کی پرستش عالم میں جاری ہے۔ چنانچہ دنیا کے مشہور ملحد جوزف اسٹالن نے بالکل صحیح کہا تھا:

"لوگوں کو روحانیت اور مذہب سے بیگانہ اور متنفر کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان کو معاشیات کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کر دیا جائے۔"

نظری حیثیت سے تو ایک جمہوری ریاست میں ہر فرد کو حاکمیت کے حقوق حاصل ہوتے ہیں اور حکومت کے کار پردازان اس کے ترجمان ہوتے ہیں، لیکن عملاً حکومت ایک طبقہ کی ہوتی ہے اور اس طرح مملکت کے باشندوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کو حاکمیت سے یک قلم محروم کر کے ان پر اپنی خواہشات مسلط کر دیتا ہے، اور اس طبقہ کی حیثیت غلاموں جیسی بلکہ اس سے بدتر ہو جاتی ہے۔ حاکم طبقہ کی جو کہ سرمایہ داروں کا ترجمان ہوتا ہے، سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنے اور اپنے ہم نوا لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرے اور مخالفین کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے۔ پھر یہی سرمایہ دار طبقہ جو حکومت کی مسند پر براجمان ہوتا ہے پریس اور صحافت کی آزادی کو سلب کرتا ہے، عدلیہ کی آزادی کا گلہ گھونٹتا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں روزن برگ (Rosen Berg) کی سزائے موت کا کیس اس کا بین ثبوت ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھئے احقر کی کتاب فتنۂ جمہوریت)

(7) غربت کے سائے:

نظام سرمایہ داری میں جو انداز زندگی جنم لیتا ہے وہ بڑا مہنگا ہوتا ہے۔ خورد و نوش، علاج معالجہ اور تعلیم و تفریح کا جو معیار عملاً معاشرہ میں رائج ہوتا ہے وہ سرمایہ داروں کی پسند کے مطابق ہوتا ہے جس کی پشت پر ان کا مصنوعی وقار، معاشرتی تفاخر اور نام و نمود کا جذبہ ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ منافع کی ہوس اور سود کی موجودگی سے بھی مصارف پیدائش میں اضافہ ہو جاتا ہے جو اشیائے ضرورت کی گرانی کا باعث بنتا ہے اور معیشت

Marfat.com

افراط زر کے گرداب میں گھر جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشی خوش حالی کے ثمرات عملاً صرف چند سرمایہ داروں کا مقدر بن کر رہ جاتے ہیں جب کہ عوام کی غالب اکثریت غربت و افلاس کے محیط سائے میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ بڑی بڑی عالی شان عمارتیں، موٹر کاریں، حسی لذات کی تسکین اور عیش و عشرت کے خیرہ کن سامان اور راحت و آرام کی سہولتیں سب طبقۂ امراء کے محدود افراد کو نصیب ہوتی ہیں اور عوام کے لیے بنیادی ضروریات زندگی کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

ان خامیوں اور نقصانات کے علاوہ اور بھی بہت سی خرابیاں اور خامیاں اس نظام زندگی میں موجود ہیں جن کا تجربہ ہر روز عوام کرتے ہیں جو مہنگائی کی چکی میں پس رہے ہوتے ہیں۔

........❖❖❖........

Marfat.com

اشتراکی نظام معیشت

سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے مقابلہ میں اشتراکی نظام معیشت ہے جس کو سوشلزم بھی کہتے ہیں۔ یہ دراصل سرمایہ دارانہ نظام کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ اس نظام معیشت میں ذرائع پیداوار نجی ملکیت میں نہیں ہوتے بلکہ حکومت کی ملکیت میں ہوتے ہیں۔اس کو آج کل کی اصطلاح میں ''ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینا'' کہتے ہیں۔اس نظام میں ایک ادارہ بنایا جاتا ہے جو اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ کون کون سی اشیاء کس مقدار میں پیدا کی جائیں اور ان کو پیدا کرنے کا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینے کا تصور یوں تو سب سے پہلے افلاطون نے اپنی تحریروں میں پیش کیا،لیکن یورپ میں صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں معرض وجود میں آیا۔صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ نظام کے تحت مزدوروں کو جس ظالمانہ استحصال(Exploitation) کا نشانہ بننا پڑا اس کے ردعمل میں متعدد مفکرین اور دانشوروں نے یہ تصور پیش کیا کہ اس ظلم کا منبع چونکہ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کا وجود ہے،اس لیے ظلم واستحصال کے خاتمہ کی بس یہی ایک شکل ہے کہ نجی ملکیت کے ادارے کو یک قلم ختم کر کے وسائل پیداوار اجتماعی یا ریاستی تحویل میں لے لیے جائیں۔ یہ نظریہ جرمن مفکر کارل مارکس(Karl Marx) نے پیش کیا اور اس نے اجتماعی ملکیت کے نظام کو ایک مدلل فلسفہ اور قابل عمل نظام کی صورت میں پیش کیا۔

کارل مارکس (۱۸۱۸۔۸۳) فطرت سے غیر معمولی صلاحیت لے کر پیدا ہوا۔ جرمنی کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ آٹھ زبانیں جانتا تھا۔ یونانی، اطالوی، اسپینی، جرمن، انگریزی، فرانسیسی، ڈچ، فریشین، آخری عمر میں اس نے

Marfat.com

روسی زبان سیکھنا شروع کی لیکن تکمیل سے پہلے وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ وہ ساری عمر پڑھتا رہا۔ تاریخ، اقتصادیات اور فلسفہ سے لے کر ادب اور مذہب تک کوئی ایسا موضوع نہ تھا جس پر اس نے کافی مطالعہ نہ کیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں لائبریریاں کی لائبریریاں اتار ڈالیں، لیکن اس قدر لائبریریاں کھنگا لنے کے باوجود راز زندگی اس پر منکشف نہ ہو سکا۔

مارکس کی زندگی کے آخری ۲۵ سال اس طرح گزرے کہ لندن کے برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں صبح کو وہ سب سے پہلے داخل ہوتا تھا اور شام کو سب سے آخر میں نکلتا تھا، لیکن اس غیر معمولی جانفشانی کے باوجود اپنی عمر میں وہ اپنی کتاب ''سرمایہ'' کی صرف ایک جلد شائع کر سکا اور بقیہ جلدیں مکمل کرنے سے پہلے ایک روز وہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں آرام کرسی پر بیٹھا بیٹھا انتقال کر گیا۔ اس کی یہ مشہور کتاب جو مزدوروں کی ''بائبل'' کہی جاتی ہے اس کی دوسری اور تیسری جلدیں جن کا مسودہ وہ نا تمام حالت میں چھوڑ گیا تھا، اس کو انگلز اور کاٹسکی نے بعد میں مکمل کیا۔

یہ کتاب مارکس نے کیوں لکھی؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مارکس جس زمانہ میں پیدا ہوا، یہ زمانہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ بھاپ اور بجلی سے چلنے والی مشینوں کی ایجاد نے بے شمار انسانوں کو روزگار سے محروم کر کے صنعت و تجارت کا پورا میدان تھوڑے سے مل مالکوں اور کارخانہ داروں کے حوالہ کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چند لوگ سرمایہ دار اور باقی تمام لوگ ان کے خریدار بن کر رہ گئے ہیں۔ اس صورت حال نے یورپ کے ذہن کو شدید طور پر مضطرب اور متاثر کیا۔ اس کے حل کے لیے مختلف تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ کارل مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف یورپی ذہن کے ردعمل کو ایک فلسفہ کی شکل میں مرتب کر ڈالا۔ یہ فلسفہ دراصل استحصال کی ایک نئی شکل تھی جس کا مطلب خود مارکس کے لفظوں میں یہ تھا کہ بے دخل کرنے والے طبقوں کو بے دخل کر دیا جائے۔ (داس کیپٹل: ۱/۷۶۳)

اشتراکیت نے زندگی کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ یہ تھا کہ معاشی پیداوار کے ذرائع کو افراد کے قبضہ سے نکال کر پوری سوسائٹی کے قبضہ میں دے دیا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ دوسرے تمام مسائل اسی ایک

Marfat.com

مسئلہ کی شاخیں ہیں۔ اینگلس کا مشہور قول ہے:

"انسان کو سب سے پہلے کھانے کے لیے خوراک، پینے کے لیے پانی، رہنے کے لیے مکان اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ سیاست، مذہب، سائنس اور فنون لطیفہ میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ اس لیے طریق پیداوار وہ اصل بنیاد ہے جس پر سماجی زندگی تعمیر ہوتی ہے۔ وہی وہ اساس ہے جس پر ریاستی ادارے، قانونی تصورات، علوم وفنون حتیٰ کہ مذہبی معتقدات کی رفیع الشان عمارتیں اٹھائی جاتی ہیں۔" (مارکس کی قبر پر انگلس کی تقریر)

مارکسی تشخیص کے مطابق اس خرابی کی اصل جڑ دراصل نجی ملکیت کا قانون ہے جس کی وجہ سے انسان دولت کے خزانوں کو اپنی ملکیت بنا کر دوسروں کو اس سے محروم کر دیتا ہے اور اس طرح سماج کے اندر ایک ایسی حیثیت حاصل کر لیتا ہے جہاں سب کچھ اسی کے لیے ہو اور دوسروں کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ نجی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور رزق حاصل کرنے کے ذرائع کو سارے عوام کی ملکیت بنا دیا جائے۔ اس طرح رزق کے خزانوں پر چند افراد کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔

سوشلزم کی اس تحریک میں بھی وہی خرابیاں تھیں جو سرمایہ دارانہ نظام میں تھیں۔ سرمایہ دارانہ سماج میں پیداوار کے ذرائع کو حرکت دینے کا اختیار چند سرمایہ داروں کو حاصل ہوتا ہے اسی طرح اشتراکی سماج میں بھی ان ذرائع کو حرکت دینے کا اختیار چند کامریڈوں کو سونپ دیا جاتا ہے، لہٰذا اس کا صحیح نام اسٹیٹ کیپٹلزم (State Capitalism) ہے۔

کارل مارکس نے اپنے فکر وفلسفہ کی عمارت کو جن بنیادوں پر استوار کیا وہ یہ تھیں:

1- تاریخ کی مادی تعبیر
2- قدر زائد کا نظریہ
3- طبقاتی کشمکش
4- مزدوروں کی آمریت

Marfat.com

5- مذہب دشمنی

لیکن مارکس کی یہ تمام بنیادیں بڑی کمزور اور غیر حقیقی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظام آج دنیا میں ناقابل عمل ہو کر رہ گیا ہے۔ آمریت خواہ سرمایہ داروں کی ہو یا مزدور کی ہر لحاظ سے مذموم ہے۔ اس سے انسان کی آزادی فکر وعمل سکڑ کر رہ جاتی ہے اور وہ بالادست طبقات کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح مارکس کی مذہب دشمنی کا تصور بھی حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ مذہب انسان کا نجات دہندہ ہے۔ اس کی روح کی تسکین کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ مذہب امور دنیا میں بھی اسے ایک لائحہ عمل سے متعارف کراتا ہے جو پرامن، خوشحال اور منصفانہ معاشرہ کے قیام میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

محققین کے نزدیک سرمایہ داری اور اشتراکیت اپنے بنیادی فکر و فلسفہ کے اعتبار سے ایک ہی شجر خبیث یعنی مادہ پرستی کی دو شاخیں ہیں۔ اس لیے دونوں کے نتائج و ثمرات ایک سے ہیں۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ذاتی منافع کے حصول کی ہوس نے افراد کو اجتماعی مفاد سے بے بہرہ کر دیا اور اس نظام نے معاشی آزادی کے نام پر بڑے بڑے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور اجارہ داروں کو لوگوں کے معاشی استحصال کے لیے کھلی چھٹی دے دی ہے تو اشتراکی نظام معیشت میں اجتماعی ملکیت کے نام پر افراد سے ان کی املاک ہی نہیں بلکہ فکر و ضمیر کی آزادی بھی چھین لی ہے۔ گویا ان دونوں نظاموں نے عدل اجتماعی کو جو حقیقت میں انسانی افراد کے لیے سکون و راحت کا ضامن ہے، تہ۰۰ برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ عالمی سطح پر استعماری انداز فکر و عمل سرمایہ دارانہ مغربی ممالک اور اشتراکی ممالک دونوں کی پالیسیوں میں پوری طرح کارفرما ہے۔

اسلامی نظام معیشت اور دوسرے معاشی نظاموں میں فرق:

اسلام نے جو نظام معیشت دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ جدید و قدیم دنیا کے دوسرے معاشی نظاموں میں اگر باہمی موازنہ کیا جائے تو ان میں بہت اصولی اور بنیادی فرق نظر آئے گا۔ جدید معاشی نظاموں میں انسان کے معاشی مسئلہ کو انسانی زندگی کے مجموعی فریم ورک سے الگ کر کے اس کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جاتا ہے اور اسے حل کرنے کی

کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن وہ سارے معاشی بزرجمہر اس بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے کہ معاشی مسئلہ کے حل کی کوئی تدبیر انسان کی حیات اجتماعی کے دوسرے شعبوں پر کیا اثر ڈالتی ہے۔

اس کے برعکس اسلام انسان کے معاشی مسئلہ کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مجموعی تناظر میں رکھ کر اس کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے حل کی ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے جو نہ صرف معاشی مسئلہ کو حل کرتی ہیں بلکہ اس سے انسان کی اجتماعی زندگی پر مطلقاً کوئی برے اثرات مرتب نہیں ہوتے جیسے مروجہ معاشی نظاموں میں افراط آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کے لیے عموماً خاندانی منصوبہ بندی یعنی ضبط ولادت کے طریقوں کو اپنانے پر زور دیا جاتا ہے اور اس بات کو یک قلم نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے ملک میں بے حیائی، بدکاری اور فحاشی کو فروغ ملے گا۔ قوم کی اخلاقی اقدار برباد ہوں گی اور خاندانی نظام تباہ و برباد ہوگا، اور ضبط تولید ادویات کے کھانے سے قوم کی صحت بھی برباد ہوگی۔ اس کے برعکس اسلام کثرت آبادی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے آبادی کو مصنوعی طریقوں سے کنٹرول کرنے کے بجائے اشیاء اور خدمات کی پیداوار کو بڑھانے کا طریقہ اور ان میں اضافہ کی تدابیر تجویز کرتا ہے۔ اس سے معاشرہ افراط آبادی کے پیدا کردہ دباؤ سے محفوظ ہو جاتا ہے اور انسان کی معاشرتی زندگی کے دوسرے شعبے فساد واختلال کے اثرات سے متاثر نہیں ہوتے۔

اشتراکی نظام معیشت اور اسلام کے نظام معیشت میں فکر ونظر کا بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اشتراکی نظام مادیت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور اس کے نزدیک انسان کی مادی ضروریات ہی اس کی حقیقی ضروریات ہیں، اس لیے اس نظام میں انسان کو انہی ضروریات کی بجا آوری میں مصروف رکھا جاتا ہے اور انسان کو ایک حیوان سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاتی جب کہ اسلام میں اس مادی دنیا کے علاوہ ایک روحانی دنیا کا تصور بھی ہے جو ابدی اور دائمی ہے، اس لیے اسلامی نظام معیشت میں دنیا اور آخرت دونوں کی صلاح وفلاح کا لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے اور اس لائحہ عمل پر عمل کرتے ہوئے ایک انسان کی دنیا وآخرت دونوں سنورتے ہیں اور انسان اور حیوان میں ایک حد فاصل بھی قائم ہوتی ہے۔

اشتراکیت میں نجی ملکیت کا کوئی تصور نہیں بلکہ اس میں ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت کا تصور ہے۔ چنانچہ اس نظام کے تحت چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں، صنعتکاروں، سرمایہ داروں اور تاجروں کے وجود کو ختم کر کے تمام پیداواری وسائل کو حکومت کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے کثیر التعداد سرمایہ داروں کی جگہ ملک میں ایک بہت بڑا سرمایہ دار جنم لیتا ہے۔ حکومت کی پشت پناہی بھی اس سرمایہ دار کو حاصل ہوتی ہے اور سیاسی اور معاشی قوت کا مرکز بھی وہی سرمایہ دار ہوتا ہے۔ ہر فرد کی حریت فکر اور آزادی عمل یک قلم ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی دو وقت کی روٹی کے لیے کار پردازانِ حکومت کا دست نگر ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اسلامی نظریۂ معیشت میں حریت فکر اور ضمیر کی آزادی کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلام میں جہاں انسان کے معاشی مسئلہ کو حل کیا جاتا ہے وہاں اس کی فکر و نظر کی حریت اور فطری آزادی کو بھی فروغ اور جلا ملتی ہے۔ اسلام اگرچہ نجی ملکیت کی اجازت دیتا ہے، لیکن اس کے مضر پہلوؤں سے سماج کو محفوظ و مصئون رکھنے کے لیے چند اخلاقی اور قانونی پابندیاں عائد کرتا ہے۔

اشتراکیت کے اجتماعی نظام معیشت میں چونکہ ذاتی منافع کا کوئی محرک نہیں ہوتا اس لیے اس میں پیداواری اہداف کو پورا کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، لہٰذا ان پیداواری اہداف کو پہلے سے مقرر کر دیا جاتا ہے اور پھر افراد سے جبراً انہیں پورا کرایا جاتا ہے۔

اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں اگرچہ نجی ملکیت کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن اسلام کے نجی ملکیت کے تصور میں بہت فرق ہے۔ اسلام نے نجی ملکیت کا جو تصور دیا ہے اس میں املاک افراد کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہوتی ہیں اور امانت کا حصول خالق کائنات کی مرضی کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ حرام اور ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ دولت پر اسلام فرد کے حق ملکیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا، اور حلال ذرائع سے حاصل کردہ دولت میں تصرف بھی اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نظام معیشت میں معاشی ناہمواریاں، دولت کی نامنصفانہ تقسیم اور امیر و غریب کی طبقاتی کشمکش نہیں ہوتی۔ امیر و غریب کی تقسیم تو ہر نظام معیشت میں ہے یہاں تک کہ اشتراکی نظام معیشت بھی اس سے مبرا نہیں لیکن اسلامی نظام معیشت

Marfat.com

میں غریب کو اپنی غریبی کا احساس نہیں ہوتا جس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں احساس ہوتا ہے کیونکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک امیر کے کتے کا بھی ہسپتالوں میں علاج ہوتا ہے اور اس کا بچہ فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑ کر مرجاتا ہے تو اس وقت اس کو اپنی غریبی کا زبردست احساس ہوتا ہے۔

پھر اسلام نے اکتناز واحتکار کے تمام ذرائع ختم کر دیئے ہیں۔ زبردستی نہیں بلکہ اخلاقی طور پر۔ چنانچہ معاشی اجارہ داریاں قائم نہیں ہوتیں اور دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہوکر نہیں رہ جاتی، نہ ملکی سطح پر اور نہ بین الاقوامی سطح پر۔ اسلام نے دولت کو امراء کے ہاتھوں سے غرباء کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کے کئی ذرائع اختیار کیے ہیں۔ علاوہ ازیں اکتساب رزق کی جدوجہد کو حلال ذرائع کا پابند بنا کر دولت کو چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جانے کے امکانات کو بالکل محدود کر دیا ہے اسلام حصول دولت کے ان تمام اقدامات کی حوصلہ شکنی کرتا ہے جو معاشی اجارہ داروں کے معرض وجود میں آنے کا باعث بنیں۔ اسلام کے نظام اخلاق ومعیشت میں حصول زر کی ہوس کو نہایت کمزور اور نحیف کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ افراد کو رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر دولت کو حاجت مندوں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کرنے پر ابھارتا ہے اور زکوٰۃ وصدقات اور قانون وراثت کے ایک منظم طریق کار کے ذریعہ معاشرہ کے افراد کے درمیان دولت کی منصفانہ تقسیم اور دولت کی گردش کو یقینی بناتا ہے۔ استحصال کی ہر شکل کو ختم کر کے افراد کے اخلاق و کردار کو بہتر بناتا ہے تاکہ دولت کی منصفانہ تقسیم کی راہ میں ہر حائل ہونے والی رکاوٹ کو ختم کیا جاسکے۔

.... ❖❖❖ ....

Marfat.com

اسلامی معاش کے رہنما اصول

پیشتر اس کے کہ ہم اسلامی نظام معیشت واقتصاد پر بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے معاش سے متعلق راہ نما اصولوں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیا جائے۔

1- مالک الملک حق تعالیٰ شانہ ہے:

اسلامی کے معاشی اصولوں کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ زمین اور اس کی ساری اشیاء اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں۔ جائداد منقولہ وغیر منقولہ کا حقیقی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کے ہاتھ میں ساری دولت اور سارا مال ومنال امتحان اور آزمائش کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی آزمائش کرتا ہے کہ کون اچھے مقصد اور صحیح اصول کے مطابق اس کو صرف کرتا، تقسیم کرتا اور اس کی پیداوار کو بڑھاتا ہے۔ اجیر ہو یا مستاجر، مزدور ہو یا مل مالک، کارخانہ دار ہو یا دوکان دار ہر ایک کے پاس جو کچھ ہے یا ہر ایک کے ذمہ جو کام دیا گیا ہے، اس میں اسے اس طرح تصرف کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ خوش ہو، اس کی مخلوق امن چین سے زندگی بسر کرے اور دنیا اور آخرت دونوں جگہ ان کی محنتوں کا اچھا ثمرہ ہاتھ آئے۔ یہ تصور اسلامی اقتصادیات کا سنگ بنیاد ہے۔

2- ہر شخص کو اکتساب رزق کے مواقع میسر ہیں:

اس کے بعد اسلام ہر شخص کے لیے جدوجہد کا مساوی حق تسلیم کرتا ہے۔ اس کے لیے مساوی مواقع کا اعلان کرتا ہے اور ان مساوی مواقع کی اپنی پوری سیاسی طاقت سے حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ ان حقوق کو استعمال کر کے زمین کی کسی شی کو کارآمد بناتے ہیں، چاہے وہ کھیتی ہو، اسلام ان لوگوں کا حق تصرف تسلیم کرتا ہے اور ان کو ان کا

Marfat.com

مالک قرار دیتا ہے۔ اس طرح اسلام میں ایک انسان کے مقابلہ میں دوسرے انسان کو صرف اصطلاح کے مطابق ''حق ملکیت'' حاصل ہوتا ہے۔ اسلام ایک شخص کو جو محنت کر کے کچھ دولت کماتا ہے۔ اس دولت کا جائز مالک قرار دیتا ہے لیکن چونکہ ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے کا نظریہ بھی پیش کرتا ہے، اس لیے اسے اپنی ملکیت میں اپنی مرضی سے تصرف کا حق نہیں دیتا بلکہ جائز اور ناجائز، مفید اور نقصان دہ اور حلال وحرام کی قید لگا کر دولت کمانے کے متعدد ذریعوں پر پابندی لگا دیتا ہے۔ دولت کے صرف کو قابو میں رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ دولت صرف ایسے کاموں میں اور اس طرح صرف ہو کہ وہ مفید اور پیدا آور (Productive) بن جائے۔ غیر بار آور کاموں میں دولت کا صرف اسلام کے نزدیک اس کی تباہی کے مترادف ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز کوئی شخص اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا جب تک اللہ تعالیٰ کو پانچ سوالوں کا جواب نہ دے لے۔ ان میں سے دو سوال مال کے بارہ میں ہیں کہ: (تاریخ بغداد ۱۱/۴۴۲)

﴿من این اکتسبه وفیما انفقه﴾

''کہ یہ مال اس نے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام نے مال کے کمانے اور خرچ کرنے دونوں پر پابندی لگا دی ہے۔ نہ کوئی فرد اپنی مرضی کے مطابق مال کما سکتا ہے اور نہ ہی خرچ کر سکتا ہے۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے اسلامی معیشت میں اور غیر اسلامی معیشت میں۔ ہر غیر اسلامی نظام معیشت میں خواہ وہ اشتراکی نظام معیشت ہو یا سرمایہ دارانہ نظام معیشت، کسی فرد کے مال کمانے پر کوئی پابندی نہیں یہاں تک عورت اگر اپنی عصمت فروخت کر کے بھی مال کماتی ہے تو وہ مال اس کی ملکیت میں ہو جاتا ہے۔ جب کوئی جائز یا ناجائز طریقہ سے مال کماتا ہے تو اب اس کو خرچ کرنے کی بھی پوری پوری آزادی ہے۔ چاہے تو نائٹ کلب میں اس مال کو خرچ کرے یا کسی اور ناجائز اور اخلاق باختگی کے طریقوں سے اس کو صرف کرے کوئی اس کو روکنے والا نہیں۔ لیکن اس کے برعکس اسلام نے مال کے کمانے پر بھی مختلف پابندیاں لگائیں کہ وہ بلیک مارکیٹ سے مال نہیں کما سکتا۔ منشیات فروخت کر کے مال حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے قوم کی عملی صفات تباہ و برباد ہوتی ہیں۔ قوم نشہ

Marfat.com

کی عادی ہوکر تباہی و بربادی کے دہانہ پر پہنچ جاتی ہے۔ اور جب کوئی فرد اسلام میں جائز طریقے سے مال کمائے تو پھر اس کے خرچ پر بھی اسلام نے مختلف قدغنیں اور پابندیاں لگائی ہیں، لہٰذا کوئی شخص کسی ایسے کام میں مال خرچ نہیں کرسکتا جس سے قوم کے اخلاق برباد ہوں یا قوم میں کاہلی وسستی پیدا ہو۔ چنانچہ ہر اس طریقہ کو بھی اسلام نے ناجائز قرار دیا جس سے احتکار اور اکتناز پیدا ہو۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ "اجملوا فی الطلب" کہ طلب میں اجمال اختیار کرو یعنی صرف مال کمانے کی مشین نہ بن جاؤ بلکہ اتنا کماؤ جس سے تمہاری حاجتیں اور ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ یہ نہ ہو کہ فورڈ کمپنی، پیپسی کولا اور دوسری بڑی بڑی نیشنل اور انٹرنیشنل اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالکان کی طرح ارب پتی ہونے کے باوجود ہر روز سرمایہ میں اضافہ اور ترقی ہی کا خواہش مند رہتا ہو۔ کیونکہ طلب میں اجمال نہ ہونے کے باعث ارباب دولت وثروت تو دن بدن اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہیں گے لیکن انسانی آبادی کی اکثریت افلاس و احتیاج سے دوچار ہوتی رہے گی۔ اسلام نے ذرائع پیداوار پر اجارہ داری سے سختی سے روکا ہے اور بتایا کہ ذرائع پیداوار پر ہر فرد کا حق ہے۔ چنانچہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہ فرماتے ہیں:

> "جملہ اشیاء عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان "خلق لکم مافی الارض جمیعاً" تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں یعنی غرض خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس (انسان) ہے، اور کوئی شی فی حد ذاتہ کسی کی خاص مملوک نہیں بلکہ ہر شی اصل خلقت میں جملۂ ناس (تمام انسانوں) میں مشترک ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے، ہاں بوجہ رفع نزاع وحصول انتفاع قبضہ کو علت ملک مقرر کیا گیا، اور جب تک کسی شی پر ایک شخص کا قبضۂ تامہ مستقلہ باقی رہے اس وقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کرسکتا، ہاں خود مالک وقابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کردے کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

مال کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا، گو زکوٰۃ بھی ادا کردی جائے۔ اور انبیاء وصلحاء اس سے بغایت مجتنب رہے کیونکہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے بلکہ بعض صحابہؓ اور تابعین وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرمایا۔ بہر کیف غیر مناسب اور خلاف اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہی ہے کہ زائد علی الحاجت سے اس کی تو کوئی غرض متعلق نہیں اور اوروں کی ملک ''من وجہ'' اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکور ''من وجہ'' مال غیر پر قابض ومتصرف ہے، اور اس کا حال بعینہ مال غنیمت کا سا تصور کرنا چاہیے۔ وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصہ ہے کہ کل مال غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت وحصول انتفاع ''بقدر حاجت'' ہر کوئی مال مذکور سے منتفع ہوسکتا ہے، ہاں، حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے اس کا حال آپ کو بھی معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے (یعنی خائن شمار ہوگا)۔'' (ایضاح الادلہ: ص ۲۶۸)

3- تقسیم دولت:

تقسیم دولت میں بھی اسلام ایسے طریقوں کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جن سے کسی کی حق تلفی نہ ہو، لیکن وہ اساسی طور پر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ہر شخص جدا صلاحیتیں لے کر پیدا ہوا ہے اس لیے ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق ہی ملے البتہ عدم صلاحیت یا کم صلاحیت کی وجہ سے جو لوگ محروم رہ جائیں یا کم حصہ پائیں، ان کا حق ان لوگوں کی دولت پر قائم رہتا ہے جو زیادہ صلاحیت کی وجہ سے اپنی ضروریات سے زیادہ دولت کماتے ہیں۔ اس طرح اسلام بغیر کسی کشمکش کے ایسے راستے پیدا کر دیتا ہے جن کے ذریعہ زیادہ دولت کی مقدار خود بخود کم دولت والے حصوں تک پہنچ جاتی ہے انہیں بھی سیراب کر دیتی ہے۔ اس حق کے پیچھے بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں، لہٰذا جس کو صلاحیتیں زیادہ ملی ہوں اور وہ ان کی وجہ سے زیادہ

Marfat.com

کمانے کے لائق ہو گیا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی کمائی کا زائد حصہ کم صلاحیت کی وجہ سے کم پانے والے لوگوں تک منتقل کر دے۔ یہ محض بھیک یا خیرات کے طور پر نہیں بلکہ حق کے طور پر ہے۔

تقسیم دولت کے معاملہ میں اسلام کے ہاں ایک اور اصول بھی پیش نظر رہتا ہے، وہ یہ کہ قومی آمدنی مختلف عاملین پیدائش کی مشترکہ مساعی اور جدوجہد سے وجود میں آتی ہے اور یہی قومی آمدنی ان عوامل کے مابین ان کے معاوضوں کی شکل میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اگرچہ پیدائش دولت کا عمل معاشی ترقی اور فروغ کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن پھر بھی معیشت کے پائیدار استحکام اور معاشرہ کے افراد کی حقیقی خوش حالی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ پیدا شدہ دولت کی تقسیم کچھ اس انداز میں ہو کہ وسائل دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر نہ رہ جائیں اور معاشرہ کا ہر فرد باوقار طریقہ اور معقول معیار سے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے عاملین پیدائش کے معاوضوں کے تعین میں منصفانہ اصول بنائے جائیں تاکہ ہر عامل خوشی ومسرت کے ساتھ معاشی عمل کو رواں دواں رکھنے میں اپنا کردار نہایت اچھے طریقے سے ادا کر سکے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی ضروری ہے کہ جس معیشت میں نجی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہو، اس میں اس بات کا امکان موجود رہتا ہے کہ جائز حدود کے اندر رہ کر بھی دولت کا بہاؤ ضرورت سے زیادہ ایک جانب زیادہ نہ ہو جائے۔ اس وجہ سے اسلامی نظام میں دولت کی تقسیم کو بڑی اہمیت دی گئی ہے بلکہ پوری معیشت کی بنیاد ہی اس شعبہ کو مستحکم، مضبوط اور عادلانہ ومنصفانہ بنانے پر رکھی گئی ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کو کلیۃً رسد وطلب کی قوتوں کے سپرد نہیں کر دیا گیا بلکہ معاشرہ اور فرد دونوں کی معاشی فلاح کے حصول کو اصل ہدف قرار دیا گیا ہے اور اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ تقسیم دولت کا نظام عدل اور احسان کی بنیاد پر ہو اور معاشرہ کے ہر فرد کو وسائل زیست اور ضروریات زندگی باوقار اور معیاری طریقہ پر میسر ہوں اور اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

موجودہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت واقتصاد میں سرمایہ دار اپنے سرمایہ اور اس سے حاصل ہونے والے کثیر منافع کی وجہ سے اپنے کاروبار کو وسیع سے وسیع تر کرتے

Marfat.com

جاتے ہیں اور گروپ آف انڈسٹریز بنا لیتے ہیں جس کی وجہ سے غریب اور متوسط طبقات کی دولت ان کے ہاتھوں سے نکل نکل کر سرمایہ دار طبقہ کے پاس اکٹھی ہوتی جاتی ہے اس طرح دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا چلا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں آج کل سرمایہ داروں کو Magnet یعنی مقناطیس کہا جاتا ہے۔ جونسی بھی حکومت ہو ان کو یہ آتے ہیں کہ غریبوں اور متوسط طبقوں کی دولت کھینچ کھینچ کر ان کی تجوریوں میں چلی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ کے لوگ اور تنخواہ دار ملازمین اور غریب لوگ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں جس سے نہ صرف ملک کا معاشی نظام ابتر ہوتا ہے بلکہ قوم کا اخلاقی نظام بھی روبزوال ہوتا ہے اور ملک میں فحاشی اور بے حیائی کا عفریت ناچنے لگتا ہے کیونکہ چند ہاتھوں میں دولت کا ارتکاذ بے حیائی ور اخلاقی دیوالیہ پن کا باعث بنتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان جائز ذرائع سے حاصل کردہ دولت کو اپنی ذاتی ضروریات خریدنے پر صرف کرے یا کسی جائز کاروبار میں لگائے جس میں لوگوں کو ملازمت ملے یا پھر غرباء اور مساکین اور ضرورت مند حضرات کو دیدے تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس بارے میں کہ اسلامی نظام معاش کی بنیاد کائنات انسانی کی رفع حاجات وضروریات اور انفرادی واجتماعی احتیاجات کی تکمیل پر قائم ہے نہ کہ دولت مندوں اور سرمایہ داروں کے درمیان نفع کی دوڑ کا میدان بنانے کے لیے ہے۔ چنانچہ مولانا مرحوم فرماتے ہیں:

> ’’(اس نظام معیشت میں) بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے کیونکہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مومن زندہ ہی نہیں رہ سکتا، لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہوگا، اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی اتنی ہی زیادہ جماعت بہ حیثیت جماعت کے خوش حال ہوتی جائے گی۔ قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے، لیکن صرف اپنے ہی لیے نہیں کمائیں گے بلکہ تمام افراد قوم کے لیے کمائیں گے۔ یہ صورت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے

طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیام ہو جائے جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔" (ترجمان القرآن:۲/۱۳۲)

اسلام دولت کو چند ہاتھوں میں منجمد اور مرتکز نہیں ہونے دینا چاہتا بلکہ اس کی خواہش یہ ہے کہ دولت پورے معاشرے میں گردش کرتی رہے اور اس کی گردش میں کوئی موانع نہیں ہونا چاہیے۔ خون اگر سارے بدن میں گردش کرے تو پورا بدن صحت مند رہتا ہے اور اگر جسم کے کسی حصہ میں دورانِ خون رک جائے تو وہ عضو سوکھ جاتا ہے، بالکل اسی طرح دولت کی گردش پورے معاشرہ اور پوری سوسائٹی میں ہونی چاہیے اور اگر سوسائٹی کے کسی حصہ میں دولت کی گردش رک جائے تو وہ حصہ ایک تو سوسائٹی سے کٹ جائے گا اور دوسرے وہ غریب ہوتا جائے گا۔ اس لیے اسلام یہ چاہتا ہے کہ دولت معاشرہ کے ایک طبقہ میں گردش نہ کرے بلکہ معاشرہ کے تمام طبقات اس سے استفادہ کریں۔

علاوہ ازیں اسلام نے اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف معاشرتی، اداراتی، قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور یہ دولت پورے معاشرہ میں گردش کرتی رہے۔

قرآن حکیم نے ارتکاز دولت کے خاتمہ پر جو زور دیا ہے اس کی شدت کا اندازہ قرآن حکیم کے اس انداز بیان سے ہوتا ہے:

﴿والذین یکنزون الذهب الفضة ولا ینفقونها فی سبیل الله، فبشرهم بعذاب الیم، یوم یحمیٰ علیها فی نار جهنم فتکویٰ بها جباههم وجنوبهم و ظهورهم، هذا ماکنزتم لانفسکم، فذوقوا ماکنتم تکنزون﴾ (توبہ:۳۴۔۳۵)

"جولوگ سونے اور چاندی کے ذخیرے جوڑ کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو مژدہ سنا دو دردناک عذاب کا، اس روز جب سونے اور چاندی کے ان ذخیروں کو دوزخ کی آگ میں تاپا جائے گا، پھر ان (سرمایہ داروں) کی پیشانیوں، کروٹوں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور بتایا جائے گا) یہ وہ ہے جو

Marfat.com

تم نے خاص اپنے لیے جوڑا تھا، اب چکھو اس کو جو تم نے جوڑ کر رکھا تھا۔"

ایک اور مقام پر انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ولایحسبن الذین یبخلون بما اتاھم اللہ من فضلہ ھو خیراً لھم، بل ھو شرلھم، سیطوقون مابخلوا بہ یوم القیامۃ﴾

(آل عمران:۱۸۰)

"وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس (مال) میں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دیا ہے، وہ ہرگز ہرگز نہ سمجھیں کہ ان کا یہ فعل ان کے لیے بھلائی کی بات ہے، نہیں نہیں یہ ان کے لیے شر اور برائی کی بات ہے۔ عنقریب قیامت کے روز یہ مال ومتاع جس کے لیے وہ بخل کر رہے، ان کے گلوں میں (عذاب کا) طوق پہنایا جائے گا۔"

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ویل لکل ھمزۃ لمزۃ، الذی جمع مالاً وعددہ، یحسب ان مالہ اخلدہ، کلا لینبذن فی الحطمۃ﴾ (ہمزہ:۱۔۴)

"ہر طعنہ دینے والے غیبت کرنے والے کے لیے تباہی ہے جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا، وہ گمان کرتا ہے کہ وہ (مال) اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، ہرگز نہیں، وہ چورا چورا کرنے والی میں ضرور پھینک دیا جائے گا۔"

عام طور پر "ھمزہ" اور "لمزہ" کے معنی طعنہ دینے والے اور غیبت کرنے والے یا پھر چغل خور اور عیب جو کے کیے جاتے ہیں، لیکن ان معنوں کی اگلی آیت "الذی جمع مالا وعددہ" سے کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ "ھمزہ" کے معنی ہوس زر رکھنے والے شخص کے ہیں کیونکہ "ہماز" اس کتے کو کہتے ہیں جسے کچلہ دیا جائے اور قریب الموت حالت میں وہ بار بار اپنی زبان اپنے ہونٹوں پر پھیر پھیر کر اپنی پیاس بجھانے کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ اسی طرح جو چوہے سنکھیا (سم الفار) کھا کر پانی کی تلاش میں دوڑتے پھرتے

Marfat.com

ہیں انہیں بھی ''ہماز'' کہتے ہیں۔ ''ہماز'' ایک خطرناک زہریلے سانپ کو بھی کہتے جو اپنی زبان بار بار باہر نکال کر اپنے ہونٹوں پر پھرتا ہے۔ (سراج منیر) اور لمز کا معنی دھوکہ دے کر مفاد حاصل کرنا (الکوکب الدری) لہٰذا یہ تباہی جس کا ذکر ''ویل لکل ھمزۃ لمزہ'' میں ہے، ان لوگوں کے لیے ہے جو ہوس زر کے مرض میں مبتلا ہیں اور دھوکہ دہی سے مال حاصل کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں آیات میں جس شدت کے ساتھ ''حب زر'' کی مذمت کی گئی ہے وہ شدت شاید قتل وزنا کے معاملات میں بھی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ ارتکاز زر، بخل اور ہوس زر سب اسی ''حب زر'' کے شجر خبیثہ کی شاخیں ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام ''کسب زر'' کا مخالف نہیں ''حب زر'' کا مخالف ہے، اور حب زر ہی دولت کی گردش کو روکنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اسلام دولت کو سرمایہ داروں میں روکنا نہیں چاہتا بلکہ اس کا فرمان ہے:

﴿کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم﴾ (حشر:۷)

''(یہ حکم اس لیے دیا گیا) کہ مال تمہارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں شیخ الاسلام علامہ شبیر عثمانی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

''یہ مصارف اس لیے بتلائے کہ ہمیشہ یتیموں، محتاجوں بے کسوں اور عام مسلمانوں کی خبر گیری ہوتی رہے اور عام اسلامی ضروریات سرانجام پاسکیں۔ یہ اموال محض دولت مندوں کے الٹ پھیر میں پڑ کر ان کی مخصوص جاگیر بن کر نہ رہ جائیں جس سے سرمایہ دار مزے لوٹیں اور غریب فاقوں مریں۔'' (فوائد عثمانی: ص ۷۲۵)

اسلام طبقاتی امتیاز کا قائل نہیں:

اسلامی نظام معیشت میں ذرائع پیداوار کی تبدیلی سے انسان کی فطرت اور اس کے سوچنے کے طریقے نہیں بدل جاتے۔ اسی لیے اسلامی معاشیات کا مدار طبقاتی تصور پر

Marfat.com

نہیں رکھا گیا۔ اسلام انسانی سوسائٹی کو (اعلیٰ بورژوا) ''ادنی بورژوا''، ''اعلیٰ پرولتاریہ'' اور ''ادنیٰ پرولتاریہ''، ''سرمایہ دار'' اور ''غیر سرمایہ دار'' وغیرہ کے طبقات میں تقسیم نہیں کرتا۔ اس میں لوگوں کی دولت تقسیم کرنے، طبقاتی امتیازات کو ابھارنے، ان کو باہمی تصادم میں مبتلا کرنے، انہیں لڑانے اور حق دلانے کے بجائے آپس میں الفت و محبت کے جذبات کو فروغ دینے اور خود بخود ''حق بحقدار رسید'' پر عمل پیرا ہونے کے اصولوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چھوٹی بڑی حیثیتوں کو اسلام ختم نہیں کرتا، اس لیے کہ اس کے بغیر ایک دوسرے سے کام لینے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ جو نظام اس اختلاف مراتب اور فرق مدارج کا نظری طور پر انکار کرتے ہیں، وہ بھی عملاً اس کو قائم کرتے ہیں اور اس سے بدتر شکلیں قائم کرتے ہیں جن میں ایک جبری محنت کا بھیانک نظریہ بھی ہے۔

انسان.........خدا کا نائب اور خلیفہ:

اسلامی نظام میں انسان محض ایک بہترین پیداواری طاقت ہی نہیں ہے بلکہ وہ زمین میں خدا کا نائب اور خلیفہ بھی ہے۔ وہ زمین میں پیداواری قوتوں کو ایک خاص مقصد کی خاطر استعمال کرنے والا ہے۔ چنانچہ اسلام کے اقتصادی نظام پر اس تصور کا اثر یہ پڑتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بیل، بھینس، گھوڑے یا آئل انجن، موٹر کار یا سائیکل کی طرح محض کرایہ وصول کرنے کی چیز نہیں سمجھتا بلکہ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر اپنے آپ کو ان ادنیٰ چیزوں کے استعمال کا ایک بہتر دنیوی اور اخروی اجر کے لیے حق دار خیال کرتا ہے اور یہی سمجھتے ہوئے ہر کام کرتا ہے۔

اسلام.........توازن کا علمبردار:

اسلام کے اقتصادی اصولوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک بیچ کی راہ پر گامزن ہے۔ وہ نہ تو فرد کو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ہر قسم کی کھلی چھٹی دیتا ہے کہ جس طرح چاہے کمائے اور جس طرح چاہے صرف اور خرچ کرے، اور نہ وہ اشتراکی نظام معیشت کی طرح فرد کو مشین کا ایک پرزہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ نہ تو یہ کہتا ہے کہ تمام جائیداد کا مالک انسان ہے اور ہر فرد جس طرح چاہے اس

Marfat.com

میں تصرف کرسکتا ہے اور نہ وہ ملک کی تمام جائداد کا مالک اسٹیٹ کو قرار دے کر انفرادی سرمایہ داری کے بجائے ریاستی چور بازاری اور ریاستی ارتکاز واحتکار کو جنم دیتا ہے۔ اسلام دراصل تمام نظام ہائے زندگی کے محاسن کا ایک مرکب ہے جس سے ہٹ کر آگے اور پیچھے سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں۔

آج کل ہر لیڈر اور راہ نما بلکہ سربراہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ''زندگی کا معیار بلند کرو۔'' ہر وزیر، ہر لیڈر اور ہر سربراہ ہر جلسہ اور مجلس میں دن رات اسی فقرہ کو دہراتا ہے کہ ہمارے تمام ترقیاتی منصوبوں کا مقصد، اور ہماری صبح وشام کی تگ ودو کا مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ عوام کی زندگی کا معیار اونچا اور بلند ہو۔ اس فقرہ کو سن کر عوام الناس کے دل شاداں وفرحاں ہو جاتے ہیں، ان کا وقتی طور پر سیروں خون بڑھ جاتا ہے، ان کی سوکھی رگوں میں تری آ جاتی ہے اور امنگوں اور تمناؤں کی مرجھائی ہوئی کلیوں میں تازگی اور شادابی آ جاتی ہے۔ نفسیاتی طور پر اس فقرہ کا عوام پر اثر ضرور پڑتا ہے اور وقتی طور پر انہیں خوشی ومسرت حاصل ہوتی ہے، لیکن یہ فقرہ جہاں بھولے بھالے اور سادہ لوح عوام کو خوش کرنے کے لیے بولا جاتا ہے وہاں وزراء عالی مقام اس فقرہ کو بول کر اپنا معیار زندگی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عوام کے اذہان میں یہ شی بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری طرح غریب ہیں لیکن ہم پہلے تمہارا معیار زندگی بلند کریں گے بعد میں اپنا، لیکن معاملہ الٹ ہوتا ہے۔ عوام کا معیار زندگی تو گر جاتا ہے کیونکہ ملک کی مہنگائی ان کے منہ سے وہ نوالہ بھی چھین لیتی ہے جو وہ اس دل آویز فقرہ سننے سے قبل کھا رہے ہوتے ہیں، اور وزیر صاحب تو پہلے ہی بلند معیار کے تھے، اپنے علاقہ کے جاگیردار اور وڈیرے تھے، ملک کے انڈسٹریلسٹ اور سرمایہ دار تھے۔ ان کا معیار زندگی اپنے اس دور وزارت میں اور اونچا ہو گیا۔ دو دفعہ اسمبلی کے اراکین کی تنخواہ بڑھی ہیں جس کا فائدہ اراکین سے زیادہ وزراء کو ہوا۔ سفری بھتے بڑھ گئے۔ الاونس بڑھے اور اس کے علاوہ ادھر ادھر سے جو ہاتھ مار کر دولت اکٹھی کی اس کو سوائے اس کے اور کوئی دوسرا انسان نہیں جانتا۔

منسٹر صاحب نے جو دھاندلی کی اور جس طرح سے قومی دولت کو اپنے دور

Marfat.com

وزارت میں دونوں ہاتھوں سے لوٹا، اس سے عوام کا معیار زندگی تو اونچا نہ ہوا البتہ عوام میں لوگوں کو لوٹنے کی عادت پڑ گئی۔ کیونکہ عربی کا محاورہ ہے "الناس علیٰ دین ملوکھم" یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ جو عادات و اخلاق بادشاہوں میں ہوتے ہیں وہی ان کی پرجا اور رعایا میں منتقل ہوتے ہیں۔ عوام نے جب دیکھا کہ جن لوگوں کو ہم اپنے ووٹوں سے رکن بنا کر اسمبلی میں بھیجتے ہیں۔ پھر وہ وہاں اپنی سیاسی قلابازیوں سے وزارت کے اعلیٰ عہدہ پر پہنچ جاتے ہیں، اور دونوں ہاتھوں سے قومی دولت کو لوٹتے ہیں۔ اسمبلی میں جانے سے قبل وہ یوسف بے کارواں ہو کر بازاروں میں پھرتے تھے۔ اگر رکن اسمبلی ہونے سے قبل تو کوئی انہیں دو سو روپے معاوضہ پر وکیل کرنے کے لیے تیار نہ تھا، لیکن اب حالت یہ ہے کہ مرسیڈس کار کے علاوہ وہ کسی اور کار پر بیٹھتے نہیں۔ عوام بھی آخر اسی گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں جس گوشت پوست کے وزیر صاحب بنے ہوئے ہیں، تو عوام کے دل بھی للچاتے ہیں، لہٰذا وہ بھی وزیر صاحب کی سرپرستی میں لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور وڈیروں نے لوٹنے کے لیے ڈاکوؤں کی ایک کھیپ رکھی ہوئی ہے جو ان کی سرپرستی میں لوگوں کو یرغمال بنا کر تاوان کی شکل میں لوٹتے ہیں۔ اور وزیر صاحب نے بس ایک ہی فقرہ رٹا ہوا ہے کہ ہم نے اور ہماری حکومت نے عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا تہیا کر رکھا ہے۔ سرزمین پاکستان میں یہ فقرہ ہم گذشتہ اٹھاون سال سے سن رہے ہیں۔ فقرہ بہت دل آویز ہے۔ وقتی طور پر عوام خوش ہو جاتے ہیں۔ تالیاں بھی پیٹتے ہیں۔ نعرے میں لگاتے ہیں جس سے وزیر صاحب کا خون خوشی سے جوش بھی مارتا ہے، لیکن اس دل آویز فقرہ کے نتیجہ میں عوام کا معیار زندگی تو گرا ہے البتہ وزیر صاحب کا معیار زندگی بہت اونچا ہو گیا ہے۔

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے ملک کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

یہ نظام اس وقت پاکستان سمیت تمام دنیا میں رائج ہے اس کی کوکھ سے جس تہذیب نے جنم لیا ہے وہ تہذیب ایک مسرفانہ اور مترفانہ تہذیب ہے۔ یہ جب عیاشی کی طرف رخ کرتی ہے تو شراب نوشی اور رقص وسرود اس کا لازمی جزو بن جاتے ہیں۔ اس سوسائٹی میں کسی صاحب حیثیت شخص کا اس وقت تک کوئی وزن نہیں ہوتا جب تک وہ ایک دو داشتہ (Keep) نہ رکھتا ہو۔ آج کل کی داشتہ اکثر و بیشتر فلم ایکٹرس ہوتی ہیں جن کا نازونخرہ صرف وزیر ہی برداشت کر سکتے ہیں یا پھر کوئی بہت بڑا سرمایہ دار۔ بڑی بڑی رقمیں ان کی نذر کی جاتی ہیں۔

آج جب اونچے معیار کی زندگی کا لفظ کانوں میں پڑتا ہے تو کوٹھیوں اور بنگلوں کی زندگی نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ آراستہ کمرے، قالینوں کے فرش پر شاندار مسہری، صوفہ سیٹ، مخملی گدوں کی کرسیاں، دیواروں پر بہترین آرٹ کی مورتیاں، تصویریں، فوٹو، میز پر بہترین اور خوبصورت گل دان، تصویر نما پیپر ویٹ، چاندی اور سونے کے سگریٹ کیس، دیواروں پر ریشمی پردے، ملاقات کا کمرہ اس سے بھی زیادہ شاندار، اور پرتکلف کھانے کا کمرہ علیحدہ جس میں ایک لمبی میز کے چاروں طرف کرسیاں لگی ہوں، عمدہ پلیٹیں، خوب صورت پرچیں، چاندی اور سونے کی پالش کے چمچے، کانٹے، ڈونگے اور بہترین ڈنر سیٹ وغیرہ۔ طائر فکر کی پرواز لمبی ہوتی ہے تو وہ یورپ وامریکہ پہنچ جاتا ہے جہاں عالی شان اور اونچی اونچی بلڈنگیں، عظیم الشان ہوٹل ہیں جن کے سامنے پاکستان کے تمام تکلفات دیہاتیت کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ بیسیوں قسم کے کھانے جس میں ہر طرح کا گوشت۔ جام وسبو تو نہیں البتہ ڈنر کے ساتھ بیئر (Beer) کے ایک دو پیگ، محفل شراب کے بجائے کاکٹیل (Cocktail) خدمت کے لیے پری وش مسیں حاضر، نئے فیشن سے آراستہ جن کے سامنے عریانی بھی شرمانے لگے، رقص کے بجائے ڈانس، سرود کے بجائے میوزک وغیرہ۔ آج جب اسٹیج کی بلندی سے اونچے معیار کی زندگی کا شوق دلایا جاتا ہے تو کیا ہمارے لیڈر صاحبان اور وزراء سننے والے عوام کے جذبات و احساسات پر مہر لگا دیتے ہیں کہ وہ یورپ اور امریکہ کے عشرت کدوں کا رخ نہ کریں خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ لاکھوں پاکستانی یورپ اور امریکہ جاتے رہتے ہیں۔

Marfat.com

اس مسرفانہ اور مترفانہ تہذیب کے برگ و بار کو دیکھ کر اٹھارہویں صدی کے فیلسوف اسلام حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ بہت برہم ہیں کہ فیشن پرست ٹھاٹ کے متوالے اور شیدائی خوش حال لوگ اس رواجی کنبہ پروری پر بے شمار دولت خرچ کرتے ہیں، اور یہ نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ جو اللہ نے فرض کی ہے اس کو ادا کریں۔ اس طرز معاشرت اور اس تہذیب وفیشن کی بنیادیں اس زمانہ میں بھی اتنی گہری تھیں کہ خاندان کے خاندان ختم ہو گئے مگر یہ تہذیب اور فیشن ختم نہ ہوا، اور آج تک اس تہذیب کا تسلسل چلا آرہا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے اسلام کو ہماری بدحالی سے انسیت اور فاقہ مستی سے محبت نہیں۔ اسلام کے نزدیک خوش حالی اور دولت مندی کے حصول کے لیے کوشش کرنا قابل اعتراض نہیں ہے لیکن اس کے لیے ذرائع جائز ہونے چاہئیں۔ ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو اسلام مال غیر متقوم تسلیم کرتا ہے۔ آپ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو کام میں لائیں اور خوب محنت کریں جس سے قوم اور ملت کو فائدہ پہنچے اور قوم اور ملک کی دولت میں ترقی اور اضافہ ہو۔ اس کے صلہ میں جتنی بھی دولت آپ کو ملے وہ باعث مسرت ہے، لیکن نوع انسان اور انسانی سماج کی کمزوری یہ ہے کہ ایک وہ طبقہ ہوتا ہے جو خواب دیکھتا ہے محلوں اور بڑی بڑی بلڈنگوں اور فیکٹریوں کے اور محنت اتنی بھی نہیں کرتا کہ پھونس کی ایک جھونپڑی تیار کر سکے۔ ہم کام سے جان چراتے ہیں اور خواہش یہ رکھتے ہیں کہ دولت ان کے گھر کی لونڈی ہو۔ ہم میں سے اکثر و بیشتر کی آمدنی کے جائز ذرائع جب ان کی خواہش کو پورا نہیں کر سکتے تو پھر وہ ناجائز ذرائع سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ مارتے ہیں۔ شریف اور محنت کش شہریوں کے گھروں میں نقب لگا کر یا سرراہ اسلحہ کی نوک پر ان کی گاڑھے پسینہ کی کمائی اڑا لیتے ہیں۔ اگر دو چار ہم جنس ساتھی مل جائیں تو سرراہ ڈاکے ڈالتے ہیں۔

اگرچہ قانون کی دھمکی اس کے کانوں میں پڑتی رہتی ہے، لیکن برصغیر پاک و ہند میں تو قانون کی دھمکی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہاں تو قانون موم کی ناک ہے۔ دوسرے اس کا تصور یہ ہوتا ہے ع

Marfat.com

ساقیا امروز می نوشیم فردا کس بدید

اس طرح تن آسان عیش پسندوں کا گروہ وہ ہوتا ہے جو یہ ذلیل حرکتیں تو نہیں کرتا، لیکن محنت کے بغیر افراط زر کی ہوس اور حرص اس کو بھی ہوتی ہے۔ وہ سر عام لوگوں کو لوٹنے اور نفع اندوزی کے سائنٹیفک طریقے اختیار کرتا ہے۔ چور بازاری، خیانت، بددیانتی، غبن، رشوت، ملاوٹ اور اس طرح کی حرکتیں اس کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔

جوئے کو ہم مسلمان بہت برا سمجھتے ہیں بلکہ موجودہ قانون میں بھی اگر چند غریب لوگ کسی مکان پر جوا کھیلیں تو پولیس چھاپہ مار کر نہ صرف کھیلنے والے کو گرفتار کر کے پس دیوار زنداں کر دیتی ہے بلکہ جوئے کی تمام رقم بھی کھا جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے جوئے کی بہت سی قسمیں ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کا جزو بن گئی ہیں یہاں تک کہ اب حکومت نے بھی پچیس روپے کے ٹکٹ کے بدلے میں دو کروڑ کی رقم دے کر جوئے اور لاٹری کو قانونی جواز دے دیا ہے۔ لاٹری کی تمام قسمیں جوئے ہی کی دل فریب اور خوش نما صورتیں ہیں۔ معمہ بازی کا رواج بھی اسی کا ایک جزو ہے۔ انقلابات عالم اور تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جس سوسائٹی میں جوئے اور سٹے جیسی علتوں کا رواج ہوتا ہے، شراب بھی اس کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتی ہے۔ شائد اسی وجہ سے قرآن حکیم نے ان سب کا تذکرہ ساتھ ساتھ کیا ہے۔

جب اونچے معیار کی زندگی کو نصب العین بنا کر اس کی ترغیب دی جاتی ہے تو جس طرح نئے خون سے پیدا ہونے والے تازہ جذبات کا رخ یورپ اور امریکہ کی تہذیب وتمدن اور وہاں کی عیش پرستانہ اور مترفانہ معاشرت کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے وزراء اور حکومت کے ذمہ داران جب اونچے معیار کی زندگی کو نصب العین قرار دے کر اس کی تحریص اور ترغیب دیتے ہیں تو وہ قدرتی طور پر ان روحانی اور اخلاقی بیماریوں کے جراثیم میں جان ڈال دیتے ہیں، کیونکہ اس ترغیب وتحریص کے نتیجہ میں اگر ایک طرف نئے خون سے پیدا ہونے والے جذبات یورپ اور امریکہ کے تمدن اور عیش پرستانہ معاشرت کو منزل مقصود بناتے ہیں تو دوسری جانب نفع اندوزی کے حریص، کام چور اور عیش پرست طبقہ کو شہ ملتی ہے کہ وہ اپنے ہنر سے کام لے اور اونچی

Marfat.com

زندگی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرے۔ جب ترقی کی منزل اونچے معیار کی زندگی ہے اور سوسائٹی اس طرف قدم بڑھا رہی ہے تو جو لوگ چور بازاری، رشوت، خیانت، جوئے اور سٹے جیسے امراض کے مریض ہیں، ان کے امراض کی روک تھام بھی نہیں ہو سکتی بلکہ ان کے جراثیم میں جان پڑ جاتی ہے۔

یہ اونچے معیار کی ترغیب ہی کی برکت ہے کہ رشوت لینے والوں اور اسمگلنگ کرنے والوں کے دلوں سے نفرت نکل گئی ہے بلکہ بسا اوقات ہمدردی ہوتی ہے کیونکہ زندگی کا معیار جو ہم نے اختیار کر لیا ہے بلکہ بلند معیار زندگی کی ترغیب دے کر ہمیں اختیار کرایا گیا ہے، اس کو نبھانے کے لیے فاضل آمدنی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے اور لینے والے کو معذور سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم اونچے معیار کی زندگی کا راگ الاپتے ہیں تو گویا ہم اشارہ کرتے ہیں ع

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اور یہ معاشرے کے مجرم اس نصب العین کو اپنانے کے لیے اپنے جرائم کو عذر قرار دیتے ہیں۔

اسلام اس اونچے معیار زندگی کو بالکل پسند نہیں کرتا جس سے انسان کی اخلاقی اور روحانی قدریں تباہ و برباد ہو جائیں اور انسان مختلف معاشرتی جرائم کا مجرم بن کر رہ جائے۔ اسلام میں فرد، ریاست یا اجتماعی ادارہ کا کام محض دولت کمانا اور ملک کی پیداوار بڑھانا نہیں ہے بلکہ اس کا کام پوری سوسائٹی میں جذبہ خیر و صلاح کو ابھارنا اور اس کی آبیاری کرنا ہے۔ نیکیوں اور بھلائیوں کا پرچار کرنا ہے۔ افراد کے باہمی تعلقات کو ہمدردی، محبت اور خلوص کی بنیادوں پر ایک دوسرے کی نصیحت اور فہمائش کے ذریعہ استوار کرنا ہے۔ اسلام کی رو سے روپیہ کو ہر شخص کی زندگی کا مقصود بنا کر افراد کے نجی تعلقات کو جو اخلاقی اور روحانی قدروں پر استوار ہوتے ہیں، منقطع کر ڈالنا جرم ہے۔ اسلام کے نزدیک افراد کے باہمی تعلقات کو چاہے وہ خونی رشتہ کے باعث ہوں یا دوستی یا کاروبار کی وجہ سے، توڑ کر ان سب کو الگ الگ اسٹیٹ کے مقناطیس کے گرد چپکا دینا بھی

Marfat.com

درست اور صحیح نہیں ہے۔ جو نظام ریاست کو کاروباری ادارہ اور پنواڑی کی دوکان بنا دینا چاہتے ہیں، ان کا منشاء یہی ہوتا ہے کہ افراد کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں اور وہ سب کے سب ایک دقیانوسی صنم کدے کی دیو داسیوں کی طرح اس کے آستانے پر جھک جائیں۔ اسلام اس طریقۂ کار کو انسانیت کی توہین قرار دیتا ہے۔ وہ صرف ایسے طریقوں کو پسند کرتا ہے جو سب کی عزت نفس کا خیال رکھ کر بنائے گئے ہوں اور سب کے لیے یکساں فوز وفلاح کا سامان فراہم کرتے ہوں۔

مساوات انسانی کا ٹھوس نظریہ:

اسلام اقتصادی اور معاشی بنیادوں پر آدمی اور آدمی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک مختلف کام کرنے سے آدمی اور آدمی میں کوئی اہم فرق نہیں پیدا ہو جاتا۔ اسلام میں فرق صرف ایک ہی چیز سے پیدا ہوتا ہے، اور وہ ہے آدمی کا کردار اور اخلاق۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿لافضل لاحدٍ علیٰ احدٍ الا بدین و تقویٰ﴾

''کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں مگر دینداری اور پرہیزگاری کے اعتبار سے۔''

اسلام انسان کے معاشرتی اور سماجی نظم کی بنیاد اس تصور پر رکھتا ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک آدم کی اولاد ہیں اور اس لیے ان کے جملہ بنیادی حقوق میں کوئی امتیاز اور تفاوت بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔

خطبہ حجۃ الوداع میں سرکار دو عالم ﷺ نے ایک جم غفیر کے سامنے یہ اعلان فرمایا تھا:

''کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کی وجہ سے۔ تم سب آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے۔'' (بخاری:۲/۶۳۱، ابن ہشام:۲/۲۰۱، عیون الاثر:۲/۳۵۹)

Marfat.com

مساوات کا صحیح مفہوم:

یہ تو ہر شخص کہتا ہے کہ اسلام میں مساوات ہے لیکن مساوات کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ عرف عام میں مساوات سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ تمام انسان ہر لحاظ سے برابر ہیں، لیکن یہ کہنا خلاف حقیقت ہے۔ تمام انسان ہر لحاظ سے قطعاً برابر نہیں ہیں۔ اللہ جل جلالہ نے ان کی طبیعتوں، صلاحیتوں، میلانات، رجحانات اور فکر و نظر میں فرق رکھا ہے خود قرآن حکیم میں ہے:

﴿لایستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون﴾ (زمر:۹)

''جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔''

تاہم ان فطری اختلافات کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان مستقل نوعیت کی طبقہ بندی کا کوئی جواز نہیں کیوں کہ ان کی پیدائش میں انسان کی اپنی کسی کوشش کا کوئی دخل نہیں۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلمہ ہے کہ مساوات انسانی کا مسئلہ انسانی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے اور معاشروں اور سماجوں کے بناؤ اور بگاڑ میں اس کا فیصلہ کن کردار رہا ہے۔ یونانی، رومی اور ہندی تمدنوں میں انسانی مساوات کا کوئی تصور موجود نہیں رہا۔ جدید سرمایہ دارانہ معیشت نے انسانوں کے مابین معاشی فرق کی بنیاد فراہم کر دی ہے اور معاشی اور اقتصادی جدوجہد کو رواں دواں رکھنے کے لیے آجر اور اجیر، جاگیردار اور کاشت کار کے طبقات کی موجودگی کو ضروری اور لازمی قرار دیا گیا۔

اسلام نے مساوات انسانی کے مسئلہ کو اپنے مخصوص اور متوازن انداز میں قرآن و حدیث میں حل کیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿یاایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالاً کثیراً﴾ (النساء:۱)

''اے لوگو! اپنے پروردگار (کی مخالفت سے) ڈرو جس نے تم کو ایک جان دار (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا (کیونکہ سب آدمیوں کی اصل وہی ہیں) اور اس (ہی) جاندار سے اس کا جوڑا

Marfat.com

(یعنی ان کی زوجہ حواء کو) پیدا کیا، اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھلائیں۔''

اسی طرح سورۃ حجرات میں فرمایا:

﴿یاایھا الناس انا خلقنا کم من ذکرٍ وانثیٰ، وجعلنا کم شعوباً وقبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم، ان اللہ علیم خبیر﴾ (حجرات:۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم علیہ السلام اوران کی زوجہ حواء) سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے بنائے تاکہ تمہاری آپس کی پہچان ہو۔ بے شک اللہ کے ہاں عزت اسی کی بڑی ہے جو بڑا متقی ہو، بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے اور دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔''

ان آیات سے پتہ چلا کہ انسان ہونے کے ناطے تمام انسان برابر ہیں۔ ان کا مادۂ تخلیق اور طریق تخلیق ایک ہے، خواہ کوئی غریب کا بچہ ہو یا شہنشاہ کا، آجر کا ہو یا اجیر کا، انسان ہونے کی حیثیت سے ان کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں، البتہ اپنے خالق و مالک کی فرماں برداری اور نافرمانی ان کے درمیان فرق ضرور پیدا کر دیتی ہے، اور اس طرح سے انسان کے صرف دو طبقات بنتے ہیں، مسلم اور کافر۔

معاشی اعتبار سے مساوات:

اسلام نے انسان کے معاشی مسئلہ کے حل کے لیے جو نظام معیشت تجویز کیا، اس میں مساوات کی قدر کو بڑی اہمیت دی اور اس کے ذریعہ استحصال (Exploitation) کی بہت سی صورتوں کا سدباب کیا ہے جو کچھ اس طرح ہے:

1- اسلام کے نقطۂ نظر سے تمام انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، لہٰذا انسان ہونے کے ناطے وہ سب برابر اور مساوی ہیں۔

2- اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جو اشیاء اور نعمتیں پیدا کی ہیں، ان سے استفادہ کا تمام

Marfat.com

مخلوق کو مساوی حق ہے۔ دریاؤں اور چشموں کا پانی، جنگل کی لکڑی اور خود رو گھاس پھوس، قدرتی درختوں کے پھل، ہوا اور پانی، صحرا کے جانور اور زمین پر کھلی ہوئی کانیں وغیرہ تمام لوگوں کے فائدہ کے لیے ہیں۔ ان پر کسی قبضہ اور ملکیت جائز نہیں۔

3- بعض معاشی شعبوں کو کسی خاص گروہ یا طبقہ کے لیے مخصوص کر دینے کا اسلام میں کوئی جواز نہیں، اسی طرح معاشی میدان میں اجارہ داریاں بھی قائم نہیں جا سکتیں۔

4- تمام افراد معاشرہ کو حصول رزق کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ چنانچہ ایک اسلامی ریاست میں ہر شخص اپنی قابلیت، اہلیت اور طبعی رجحان و پسند کے مطابق روزی کمانے کا پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔ رنگ، نسل، ذات، زبان، علاقہ، صوبہ وغیرہ کی بنیاد پر معاشی جدوجہد کے معاملہ میں ان کے درمیان نہ تو کوئی فرق اور امتیاز رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی قدغن اور پابندی لگائی جا سکتی ہے۔

5- امتیاز قیمت (Price Discimination) یا اغراق (Dumping) جیسی پالیساں بھی اسلام کے تصور مساوات کے خلاف ہیں کیونکہ ان سے بہت سے معاشی مفاسد جنم لیتے ہیں۔

6- ایک اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تمام باشندگان کو معاشی ضروریات کی تکمیل اور حصول رزق کے یکساں مواقع فراہم کرے۔ ہر شہری کے لیے روٹی، کپڑے، مکان، علاج اور تعلیم جیسی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا انتظام کرے اور ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے مکمل تحفظ کا بھی بندوبست کرے وگرنہ وہ لوگوں سے ٹیکس اور لگان وغیرہ لینے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ ریاست کی زرعی، مالیاتی، تجارتی اور انتظامی پالیسیاں صرف متمول امیر طبقہ کے لیے نہ ہوں بلکہ غریب اور پس ماندہ لوگ بھی اس سے اتنا ہی فائدہ اٹھائیں جتنا امیر اٹھاتے ہیں۔ سرکاری اخراجات کے لیے غریب

Marfat.com

متوسط طبقہ کے علاقوں کو امراء کے علاقوں پر ترجیح دی جائے۔ امراء پر محصولات کا زیادہ اور غرباء پر کم بوجھ ڈالا جائے۔ اور ریاست اپنی پالیسیوں میں غریبوں کو غربت سے اوپر اٹھانے کی کوشش کرے نہ کہ غربت مکاؤ پروگرام کے عنوان سے غریبوں کو مکانا شروع کردے کیونکہ اس زمانہ لفظ کچھ بولا جاتا ہے اور معنی اس کے کچھ لیے جاتے ہیں۔

اس زمانہ میں لوگوں کے قول وفعل میں اس قدر تضاد پایا جاتا ہے کہ لوگ لفظ کچھ بولتے ہیں اور اس کا معنی کچھ کرتے ہیں۔ یہ لوگ جو غریبوں اور مزدوروں کے حامی ہونے کے جگہ جگہ نعرے لگاتے پھرتے ہیں اور لوگوں کو اپنی تقریروں میں خوف خدا، خدا پرستی اور اخلاص وللّٰہیت کی تلقین کرتے رہتے ہیں، خود ان کے سامنے خدا پرستی، خوف خدا اور اخلاص وللّٰہیت کے الفاظ زبان پر لانا بھی جرم ہے کیونکہ ان کے ذاتی اعمال ان تمام اوصاف سے عاری ہیں۔ غریبوں کی امداد، بھوکوں سے ہمدردی اور خلق خدا کی خدمت وغیرہ الفاظ کی حقیقت ان کے دلوں کے کسی گوشہ میں اس کا کوئی شمہ اور ریشہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ان راہنماؤں کے مونہوں سے ان الفاظ کا نکلنا قیادت کے فیشن کے طور پر ہے جب کہ ان کے دلوں کے تہہ خانے خودغرضی، خود پسندی، نفع اندوزی، نمود ونمائش، باہمی رقابت اور ہوس اقتدار کے انبار سے پٹے ہوئے ہیں۔ جن غریبوں کا یہ بار بار نام لے کر ان سے اپنی ہمدردی جتاتے ہیں، ان سے ان کو محبت کے بجائے نفرت ہے۔ ان کی عظمت شان کو یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ غریب ان کے پاس بیٹھ سکیں۔ ایسی زندگی جو تصور خدا سے ناآشنا، دل کی نرمی سے محروم، شان وشوکت کی دلدادہ، اقتدار کی حریص، خود پرست وخودنما ہو، اپنے سوا اور کسی کو نظر میں نہ لاتی ہو، قرآن حکیم میں اس کے لیے ''بطر'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی اپنے آپے سے باہر اترائی ہوئی زندگی۔ ان لوگوں کی زندگی جن کے قول اور فعل میں اتنا ہی اختلاف ہے جتنا تاریکی اور روشنی میں، رات اور دن میں، پتھر اور پانی میں، آگ کے انگاروں اور برف کے تودوں میں۔

ایک طرف افزائش دولت، افراط زر اور نفع اندوزی کے خلاف شور اور ہنگامے برپا کر کے اور جلسوں میں نعرے لگوا کر آسمان سر پر اٹھایا جائے، اور دوسری طرف اونچے

Marfat.com

معیار کی زندگی کی ترغیب دے کر افراط زر کو نصب العین اور بنیادی ضرورت بنا دیا جائے
بلند معیار زندگی کا شوق پیدا ہو اور افراط زر کی حرص فتنہ برپا نہ کرے، ناممکن ہے ع

ساز کو چھیڑ کے کہتے ہو کہ آواز نہ ہو

اس اونچے معیار کی زندگی کو جس کی مثال میں ہمارے وزراء اور لیڈر صاحبا امریکہ اور یورپ کی زندگی اور اس کے عشرت کدے پیش کرتے ہیں جس کو بد قسمتی سے نے اپنی کامیابی اور ترقی کا سامان سمجھ لیا ہے، اسلام کی نگاہ میں یہ ترقی کی شاہراہ نہیں بلکہ تنزل کی شاہ راہ اور تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

مسرفانہ اور مترفانہ زندگی جو اپنے آپے سے باہر خود فراموش اور خدا فراموش اترائی ہوئی اور بر خود غلط ہو، اسلام سب سے پہلے اس کو حرام اور خبیث قرار دیتا ہے۔ وہ تمام چیزیں جو اس کے لوازمات ہیں، ان کو ممنوع گردانتا ہے۔ وہ صرف شراب رقص و سرود ہی کو حرام نہیں کہتا جن کو بد قسمتی سے کچھ برگشتہ مزاج بدذوق فنون لطیفہ آرٹ قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ سونے چاندی کے برتنوں اور مردوں کے زربفت وزرد لباس اور ریشمی کپڑے کو بھی حرام قرار دیتا ہے کیونکہ وہ مترفانہ اور مسرفانہ زندگی کے لوازمات ہیں۔ جب نخل آرزو کی یہ جڑیں ہی کٹ گئیں تو قدرتی طور پر وہ طوفان پایا ہو جائے گا جو نفع اندوزی، غبن، رشوت، چور بازاری، خیانت، سود، جوا، سٹہ، لاٹری وغیرہ کا ہیجان برپا کیا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن حکیم نے اس مضمون کو متعدد پیراؤں اور اسلوبوں میں ادا فرمایا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وکم اھلکنا من قریة بطرت معیشتھا، فتلک مساکنھم لم تسکن من بعدھم الا قلیلاً، وکنا نحن الوارثین﴾ (قصص:۵۸)

”اور کتنی کھپا دیں ہم نے بستیاں جو اترا چکی تھیں اپنی گزران پر، اب یہ ہیں ان کے گھر (مثلاً لاہور کا شاہی قلعہ، قلعہ رہتاس وغیرہ) بسے نہیں ان کے پیچھے مگر تھوڑے دنوں، اور ہم ہیں ان سب سے بسنے والے۔“

یعنی بتایا یہ کہ دیکھتے نہیں کتنی قومیں گزر چکی ہیں جنہیں اپنی خوش عیشی پر غرہ ہو گیا تھا اور وہ اپنی معیشت کی خوش حالی پر اترانے لگی تھیں۔ جب انہوں نے تکبر اور سرکشی اختیار کی تو اللہ نے انہیں کس طرح تباہ و برباد کر ڈالا کہ آج صفحۂ ہستی پر ان کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ یہ کھنڈر ان کی بستیوں کے پڑے ہیں جن میں کوئی بسنے والا نہیں بجز اس کے کہ کوئی مسافر تھوڑی دیر ستا لے یا قدرت الٰہی کا عبرت ناک تماشہ دیکھنے کے لیے وہاں جا اترے۔ ان کا کوئی وارث بھی نہیں رہا۔ یہ لیڈر صاحبان خود تو مرسیڈس کاروں پر سوار ہیں اور قوم کی غالب اکثریت جو پیدل چل رہی ہے، اس کو اپنے ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ خود کار سے اتریئے اور ان غریبوں کے ساتھ چلئے، لیکن اگر آپ خود تو کار سے نہیں اترتے اور ان پا پیادہ غریبوں کو ہدایت فرماتے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلو تو یہ آپ کا ان غریبوں سے اظہار ہمدردی نہیں بلکہ سنگ دلی ہے، لہٰذا اونچے اور بلند معیار کی زندگی کے بجائے اس معیار زندگی کی تلقین کریں جس کو پوری قوم نہ سہی قوم کی غالب اکثریت اپنا سکے۔ اسلام نے گھٹنوں چلنے والے بچوں کو یہ فرمائش نہیں کی کہ ان کی تیز گامی اور تیز رفتاری کا ساتھ دیں بلکہ اپنی رفتار دھیمی کر کے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے جو ابھی چل بھی نہیں سکتے تھے۔

معاشرہ کا اصل مرض:

اصل بات یہ ہے کہ معاشی اور سیاسی بزرجمہروں نے مرض کی تشخیص غلط کی ہے۔ ایک شاعر تھے جن کا تخلص احمق تھے، لیکن وہ اصل میں احمق نہیں تھے۔ بڑے اچھے شاعر تھے ان کا ایک شعر ہے ؎

مریض ہے کہ بیچارے کا اٹھ گیا ہے خمیر
اور حکیم ہے کہ خمیرے چٹائے جاتے ہیں

مریض غلط تشخیص کی وجہ سے جان بلب ہے اور سیاسی حکیم اس کی غلط تشخیص کر کے اور اس کو موت کی وادی میں دھکیل رہے ہیں۔ اس غلط تشخیص کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک امیر آدمی ہے۔ دولت کی گنگا اس کے ہاں جاری ہے۔ جب صبح کو اپنی فیکٹری میں وہ

Marfat.com

جاتا ہے تو ایک جگہ راستہ میں غریبوں کی دو چار جھونپڑیاں اس کو نظر آتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک روز خیال آیا کہ کیوں نہ ان جھونپڑیوں کو زمین بوس کر کے یہاں ایک بلند و بالا پلازہ بنایا جائے۔ چنانچہ وہ پولیس اور قبضہ گروپ کی مدد سے ان جھونپڑیوں کو گرا کر وہاں پلازہ بنا لیتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایک اور امیر شخص ہے جس کی کوٹھی بھوکوں ننگوں کی پناہ گاہ ہے جس کی دولت سے بہت سی بیوہ عورتوں کے گھروں کا ماہانہ خرچ چلتا ہے، بہت یتیم بچے پلتے ہیں، بہت سے غریب خاندانوں کے ماہانہ وظیفہ لگے ہوئے ہیں۔ قومی کاموں میں وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، بہت سے طلبہ اس کے وظیفوں سے اپنی تعلیمی زندگی میں اونچی اونچی منزلیں طے کرتے ہیں۔

اگر یہ سنگ دلی، غریب کشی دولت کی وجہ سے ہے تو اس دولت مند میں دولت کی صفات کیوں نہیں پائی جاتیں؟ یہ دولت ہونے کے باوجود غریب پروری کیوں کرتا ہے؟ سیاسی کھلاڑیوں نے جب یہ دیکھا کہ ایک دولت مند اور سرمایہ دار نے غریبوں کی جھونپڑیوں کو زمین بوس کر کے وہاں ایک پلازہ بنا لیا ہے تو انہوں نے دولت کے خلاف نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا، حکومتوں کو تہ و بالا کر دیا، فیکٹریوں پر قبضہ کر لیا، امیروں کے خلاف نفرت کے انگارے اگلنے شروع کر دیئے۔ امیروں کی دولت کو چھین لیا گیا لیکن غریبوں کی جھونپڑیاں جیسی تھیں ویسی ہی رہیں، ان کا دلدّر دور نہ ہوا۔ غریب کو پہلے وقت کھانا ملتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے کھاتا تھا، اب اس کو ایک وقت کھانا ملنے لگا، اور وہ بھی قطار میں گھنٹوں کھڑے ہونے کے بعد، پہلے دس روپے میں اس کو دو وقت کا کھانا ملتا تھا، اب غریبوں کی حکومت میں اس کو بیس روپے کا ایک وقت کا کھانا ملنے لگا۔ مزدور کو اس کو جتنی پہلے ملتی تھی اب اس سے بیس روپے زیادہ ملنے لگی لیکن بازار میں چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، لہٰذا تنخواہ میں بیس روپے ماہوار کی زیادتی اس کے لیے اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوئی۔ وہ اب ہر وقت یہی سوچنے لگا کہ جب سرمایہ داروں کی حکومت تھی اس وقت میری معاشی حالت اس سے بہت بہتر تھی۔ اب تو حکومت میرے نام پر حاصل کی گئی ہے، مزدوروں کے نام پر، ہاریوں کے نام پر

Marfat.com

کاشتکاروں کے نام پر، غریبوں کے نام پر لیکن میری حالت تو پہلے سے بھی بدتر ہو گئی۔
سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا ع

مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی

مرض کو بڑھنا نہیں چاہیے تھا۔ اب تو دولت کے خلاف انقلاب برپا کیا گیا ہے جس میں کئی غریبوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا، لیکن سیٹھ صاحب تو پہلے سے بھی زیادہ بڑے سیٹھ ہو گئے، بلکہ اب تو ہمارے ووٹ لے کر پہلے اسمبلی کے ممبر اور پھر وزیر ہو گئے اور وہ بھی وزیر محنت لیکن محنت کش ہی رہے۔ ان کی زندگی میں ترقی کی کوئی کرن دکھائی نہ دی، بلکہ ان کی زندگی تاریک سے تاریک تر ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی بزرجمہروں نے تشخیص غلط کی ہے۔ طبیب نادان نے علامات کو مرض سمجھا۔ اس لیے دوا مفید ثابت نہ ہوئی بلکہ مرض میں اضافہ ہوا۔

ان نادان طبیبوں کو یہ پتہ نہ چلا کہ اصل مرض دولت کی بہتات نہ تھا بلکہ اصل مرض وہ تھا جس نے دولت میں اضافہ اور ارتکاز پیدا کیا جس کی وجہ سے چور بازاری، خیانت، رشوت اور سود کی رقم کو اس نے شیر مادر کی طرح اپنا حق سمجھا۔ یہ ہے اصل مرض یعنی حب دولت، ہوس زر، کنجوسی، انفاق فی سبیل اللہ کا فقدان، حرص و آز۔ جنہوں نے دولت کی بہتات کو اصل مرض سمجھا۔ انہوں نے قانون بنا کر سرمایہ داری اور جاگیرداری کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ قانون بن گیا وہ بہت خوش ہوئے کہ ہم نے سرمایہ داری ختم کر دی حالانکہ قانون بنانے والے بھی سرمایہ دار تھے۔ انہوں نے اپنے خیال میں افراط زر اور نفع اندوزی کے راستے مسدود کر دیئے۔ سونے پر پابندی لگا دی، لیکن جب ملک کا بجٹ بنا تو اربوں کا خسارہ تھا، غریبی کے دامن پہلے سے زیادہ پھیل گئے اور عوام کی مصیبت میں افاقہ ہونے کے بجائے اضافہ ہو گیا۔ سرمایہ دار بلیک کا عادی تھا۔ اس کو چور بازاری کا چسکا پڑ چکا تھا اس نے بلیک اور چور بازاری کے دوسرے راستے نکال لیے، اور ان لوگوں کے لیے چور بازاری کا راستہ نکالنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ قانون ان کے لیے موم کی ناک ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کے انسپکٹروں کو پتہ چلا کہ فلاں سرمایہ دار بلیک مارکیٹ کرتا ہے، اس نے منشیات کا دھندا شروع کر رکھا ہے یا فلاں شعبہ تجارت میں اس کی

Marfat.com

اجارہ داری ہے۔ انسپکٹر صاحبان نے چھاپا مارا لیکن سیٹھ صاحب کی طرف سے نوٹوں کی ایک جھلک نے ان کو چوکڑی بھلا دی۔ وہ سیٹھ صاحب کو گرفتار کرنے آئے تھے خود ان کی دولت کے اسیر ہو گئے اور حکومت کو سب اچھا کی رپورٹ دے دی۔ پہلے صرف سیٹھ صاحب چور بازاری کرتے تھے اب انسپکٹر صاحبان بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اگر اصل مرض دولت تھا تو دولت تو صرف سیٹھ صاحب کے پاس تھی انسپکٹر ان کیوں اس مرض میں مبتلا ہو گئے، ان کے پاس تو دولت نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ مرض نہ زر ہے اور نہ بے زری بلکہ اس کا سبب وہ ذہنیت ہے جو دولت کی بہتات پیدا کرتی ہے اور وہ حرص زر۔ اور حرص زر کا منبع دل ہے، لہٰذا اسلام کہتا ہے کہ اصل بیماری دولت نہیں بلکہ اصل بیماری دلوں کی بیماری ہے۔ اگر سماج کی درستی چاہتے ہو تو دلوں کو درست کرو، دلوں کو مانجھو اور قلوب کا تزکیہ کرو۔ جب دلوں میں انقلاب آئے گا تو معاشیات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں خود بخود انقلاب آئے گا۔ قرآن کہتا ہے:

﴿فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور﴾ (حج:۴۶)

"آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔"

یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے وہی حقیقت ہے۔ جو نظر نہیں آتا اس کا کوئی وجود نہیں۔ یہ غلط ہے بیج کا پودا اور پودے کا پھل اب نظر نہیں آتا لیکن ان کا ہونا یقینی ہے۔ بیج بوئیں گے تو یہ دونوں چیزیں وجود میں آئیں گی اگرچہ اب ہمیں نظر نہیں آ رہیں۔ اس کا نام ہے ایمان بالغیب۔ ہمیں وہ ذات نظر نہیں آ رہی جو ہر دم ہمیں دیکھ رہی ہے۔ وہ ہمارے ایک ایک عمل کو دیکھ رہی ہے جس طرح بلاتشبیہ کیمرہ کی آنکھ ہمیں دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم اس کو نہیں دیکھ رہے ہوتے۔ یہی ایمان ہے اور یہی تقویٰ، پہلی منزل یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس بات کا یقین دل میں بیٹھ جائے کہ ہم جو اچھا یا برا عمل کر رہے ہیں وہ حق تعالیٰ دیکھ رہے ہیں اور ہر برے عمل کا مواخذہ ہوگا اور نیک عمل کی جزا ملے گی۔ جب یہ یقین دل میں پیدا ہو جائے تو نہ صرف انسان بلکہ پورا

Marfat.com

ماحول تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر نہ کوئی چور بازاری کرتا ہے اور نہ ہی کوئی کسی سے بددیانتی کرتا ہے۔ امیر اپنی دولت اپنے ہاتھوں سے خوشی اور مسرت کے ساتھ غریبوں میں تقسیم کرتا ہے اور غریب اگر اس کو ضرورت نہ ہو تو وہ امیر کی دولت کو قبول نہیں کرتا کیونکہ اس کے دل سے مال کی حرص ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ پھر پورے معاشرہ میں دولت کی گردش شروع ہو جاتی ہے۔ ہر غریب کی جیب تک مال پہنچتا ہے اور پورا معاشرہ دولت کی گردش سے خوش حال اور فارغ البال ہو جاتا ہے۔

تزکیۂ قلب کی ضرورت:

گذشتہ صفحات کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل مرض دولت کی بہتات نہیں ہے بلکہ وہ جذبۂ حرص زر ہے جو قلب میں کروٹیں لیتا رہتا ہے اور ایک سرمایہ دار میں حرص وآز، چور بازاری اور بلیک مارکیٹ کے جراثیم پیدا کر کے ارتکاز دولت کا سبب بنتا ہے۔ سچی بات یہ ہے غریبوں کے نام نہاد ہمدردوں نے دلوں کے مندروں میں خود غرضی کی مورتیاں اس طرح سجا رکھی ہیں کہ یہ لوگ اس کی پوجا کر رہے ہیں، غریبوں کی ہمدردی کے تمام دعوے زبانی جمع خرچ کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ اسلام دلوں میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ دلوں میں تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ دل و دماغ پر اس ذمہ داری کا وہ احساس چھایا رہے جو اللہ رب العالمین کا نائب اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہم پر لازم ہے۔ ہر ضرورت مند کی ضرورت ہمارے دل کی ٹیس اور چبھن ہو۔ چنانچہ اس چبھن کو دور کرنے کے لیے ہم ضرورت مند کی امداد کریں اور اس کے ساتھ تعاون کریں۔ یہ امداد اور تعاون اپنی پارٹی کی شہرت کے لیے نہ ہو بلکہ اللہ رب العزت کی خوشنودی کے لیے ہو۔ اپنی شان میں قصیدے پڑھوانے اور اپنی خدمت میں سپاس نامے پیش کرنے کے لیے نہ ہو بلکہ اس لیے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کی امداد کی جائے:

﴿انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاءً ولا شکوراً،
انا نخاف من ربنا یوم عبوساً قمطریراً﴾ (الدھر:۹۔۱۰)

”ہم تمہارے لیے خوراک کا انتظام اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ ذمہ

Marfat.com

داری پوری کر سکیں جو اللہ نے ہم پر لازم کی ہے۔ ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ ہمارا معاملہ اللہ سے ہے اور خود اپنا مستقبل ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں خوف اس کا ہے کہ اپنے رب کی طرف سے کہیں وہ دن نہ دیکھنا پڑے جو نہایت سخت اور نہایت تلخ ہوگا۔“

مذہب کی زبان میں اس احساس اور جذبے کو اخلاص کہتے ہیں جب کہ قلب و ذہن میں یہ ہو کہ یہ فرض حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہے۔ جب کوئی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کسی غریب اور نادار کے اعانت کرے گا تو اس کی شہرت بھی لازمی طور پر ہوگی کیونکہ لوگ اس کے اس کارخیر کو سن کر ایک دوسرے سے بات کریں گے اور لوگوں کے درمیان اس کا چرچا اور شہرت ہوگی۔ لیکن یہ شہرت ناقابل التفات شی ہونی چاہیے، اگر کسی نے اس شہرت اور ناموری کو نصب العین بنا لیا تو اس نے من کے مندر میں سجائی ہوئی مورتی کی پوجا شروع کر دی جو کہ شرک کی ایک فرع ہے۔ اور اگر اس نے کسی غریب کی مدد کر کے اس سے کوئی اپنا ذاتی مقصد حاصل کیا، یا اس کو اپنا کوئی احسان جتایا یا اس کی امداد نام ونمود کے لیے کی تو یہ غریب نوازی اور خدا پرستی نہیں بلکہ یہ خود غرضی اور خود پرستی ہے۔ اس سے نیکیوں کا ذخیرہ برباد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے بارہ میں سورۃ بقرہ آیت ۲۶۱۔۲۶۶ میں ذکر کیا گیا ہے۔

اسلام میں زندگی کا تصور:

اسلامی نظام حیات کے مختلف شعبوں کو سمجھنے میں اصل دشواری یہ پیش آرہی ہے کہ لوگوں نے زندگی کے اس نقطۂ نظر کو سمجھے اور مانے بغیر اس کے مختلف شعبوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں یہ لوگ بری طرح ناکام رہے۔ ظاہر ہے کہ اس الٹی ترتیب سے وہ اسلامی نظام حیات سے کچھ اور بھی دور جا پڑے۔ اسلامی نظام معیشت کے اصول اور اس کی تفصیلات بھی اسی صورت میں سمجھ میں آئیں گی جب ہم زندگی کے اس نقطۂ نظر کو قبول کر لیں۔ قرآن حکیم نے جو اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ اور تمام اسلامی افکار وقوانین کا منبع ومصدر ہے، بڑے خوبصورت اور جامع الفاظ میں اس نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے

Marfat.com

۔فرمایا:

''مرغوبات کی محبت لوگوں کو بہت بھلی لگتی ہے، عورتیں ہوں، لڑکے ہوں، سونے چاندی کے ڈھیر ہوں، عمدہ نسل کے گھوڑے ہوں، جانور، کھیتی باڑی ہو، یہ سب دنیا کی زندگی کا سروسامان ہے، اور اچھا ٹھکانہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ آؤ میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتاؤں ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ سدا اس میں رہیں گے، اور پاک باز بیویاں ہیں اور اللہ کی خوشنودی ہے، اور اللہ اپنے بندوں کے حالات کو خوب دیکھ رہا ہے۔'' (آل عمران:۱۴۔۱۵)

ان آیات نے زندگی اور اس کے سازوسامان کے بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور ان چیزوں کی جن پر معاشیات کی اساس ہے، اصل حیثیت متعین کر دی ہے کہ یہ سب دنیا کی چندروزہ زندگی کا سروسامان ہے۔ اور یہ جملہ قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو چیزیں ہمیں اپنی عارضی اور چندروزہ دنیوی زندگی میں استعمال کرنے کے لیے دی گئی ہیں، وہ ہرگز ہماری زندگی کا مقصد اور مطمح نظر نہیں بن سکتیں۔ مقصد زندگی یقیناً کوئی دوسری ہی چیز ہو سکتی ہے۔ وہ دوسری چیز کیا ہے؟ وہ ہے رضائے الٰہی کا حصول۔ یہی وہ مقصد ہے جسے انسان اپنی تمام جدوجہد اور تگ و تاز کا محور بنا کر اس کی روح سے آشنا ہو سکتا ہے۔ جنت کا حصول بھی رضائے الٰہی کے حصول کی ایک دل نشین اور دل کش تعبیر ہے۔

قرآن حکیم نے بار بار اہل ایمان کو اس امر کی تلقین کی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں رضائے الٰہی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنائیں۔ ''ابتغاء وجه ربهم'' (اپنے پروردگار کی خوشنودی کی خاطر) جو لوگ اپنے ہر عمل کو اللہ کی خوشنودی کی خاطر انجام دیتے ہیں اور اس کسوٹی پر اپنے کردار کو پرکھتے ہیں وہی لوگ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں

Marfat.com

شادکام اور بامراد ہوں گے۔اس لیے قرآن حکیم نے "رضوان من الله اکبر" (اللہ کی تھوڑی سی رضا بھی بہت بڑی ہے) کہہ کر اس امر کی وضاحت کر دی کہ آخرت کی تمام سرفرازیوں سے بڑھ کر اگر کوئی چیز ہے جس کی تمنا ایک مسلمان کو ہونی چاہیے تو وہ خدائے قدوس اور اللہ عظیم و برتر کی رضا اور اس کی خوشنودی ہے، اور اسے "الفوز العظیم" ایک بہت بڑی کامیابی قرار دیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ نقطۂ نظر جس پر ایمان لائے بغیر اسلامی معیشت کو سمجھنا اور اسلام کے فلسفہ اقتصاد کی تہ تک پہنچنا ممکن نہیں، اور اسے کسی اسلامی مملکت کے چوکھٹے میں فٹ کرنا بہت دشوار ہے۔ مقصد زندگی اور معاشیات کے اس اصل الاصول کو جان لینے اور مان لینے کے بعد اس مسئلہ پر سوچنے کا انداز ان لوگوں کے مقابلہ میں یک قلم تبدیل ہو جاتا ہے جو اس دنیا کے بعد کسی اور دنیا اور وہاں کے حساب و کتاب پر یقین نہیں رکھتے اور جن کے نزدیک موت انسانی زندگی کے ڈرامہ کا ڈراپ سین ہے، اور اس کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور بھی ان کے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔ زندگی کے مقصد اور مطمح نظر اور معاشی اقدار کی قرار واقعی حیثیت کا تعین اسلام کے دستور حیات میں وہ بنیادی پتھر ہے جس کے بغیر اسلام کی معاشی عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی۔

........❖❖❖........

Marfat.com

معاشی ناہمواری اور اقتصادی عدم مساوات

دنیا میں عہد قدیم سے لے کر آج تک انسانوں کے درمیان معاشی ناہمواری کا سلسلہ قائم ہے اور یہ بالکل قدرتی اور فطری امر ہے۔ انسانوں کے مابین بہ لحاظ رزق یہ تفاوت حق جل وعلا شانہ نے خود پیدا فرمایا ہے، اور وہی ہے جس نے بعض انسانوں کو بعض دوسرے انسانوں پر جو بدرجہا فوقیت عطا کی ہے، اور بعض کو بعض کے مقابلہ میں اقتصادی برتری کی نعمت سے ہمیشہ نوازتا رہتا ہے۔

یہ بات اگرچہ تلخ ہے اور ہر سچی بات تلخ ہوتی ہے لیکن اپنی جگہ یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے جس سے گریز اور مفر کی کوئی صورت موجود نہیں ہے ؎

میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا ہوں
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تیری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنت شکیبائی

حقائق سے آنکھیں موند لینا کوئی حکمت و دانش کی بات نہیں ہے، اور واقعات و تجربات اور مشاہدات و حالات سے نظریں چرانا عقل مندی میں شمار نہیں ہوتا۔ بدو تخلیق کائنات سے یہ ریت چلی آ رہی ہے اور اسے ''سنۃ اللہ'' کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اس نے ہمیشہ اپنے بندوں میں طبقاتی امتیاز روا رکھا ہے خواہ اسے کوئی خدا ناآشنا شخص ''رجعت پسندی'' کہے یا ''فرسودہ نظری''، مگر یہ صورت اپنی جگہ موجود ہے اور اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں اس بات کا تذکرہ خالی از فائدہ نہیں کہ چودہ سو برس کے بعد بعض برخود

Marfat.com

غلط متجددین اسلام کی تعبیر اس انداز میں کرنے کی ناپاک جسارت کر رہے ہیں کہ اسلام نسل آدم و حوا کے درمیان ہر قسم کے طبقاتی امتیاز کو ختم کرنے کے لیے منت کش ظہور ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا دعویٰ بلا دلیل اور ایسی پادر ہوا بات ہے جس کا ثبوت نہ تو قرآن حکیم ہی سے ملتا ہے اور نہ خود شارع علیہ السلام کے فرمودات اس کی تائید کرتے ہیں، اور گزشتہ چودہ صدیوں میں کسی عالم دین، کسی عارف و عامی، کسی فقیہ و محدث اور کسی مفسر و ادیب نے اس نظریہ کی بابت ایک لفظ تک نہیں کہا ہے۔ کیا اس طویل عرصہ میں امت مسلمہ میں ایک بھی ایسا باضمیر اور صاحب کردار عالم پیدا نہیں ہوا جس نے اس راز کو آشکارا کیا ہو اور اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہو۔ یہ سعادت اس دور کے جہل پیشہ اور بے بصیرت لوگوں کو میسر آئی جو عربی زبان سے نابلد اور قرآن و سنت سے کورے ہیں۔ اقبال نے ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں کہا ہے ۔

ز اجتہاد عالمان کم نظر
اقتداء بر رفتگاں محفوظ تر

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے اور دنیا کی تاریخ، تجربہ، عقل، مشاہدات اور واقعات سب اس پر گواہ ہیں کہ انسانوں کے درمیان جو معاشی عدم مساوات پائی جا رہی ہے وہ خود انسان کی پیدا کردہ نہیں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں بھی اللہ کے کسی نیک، عادل اور منصف بندے نے اسے قابل اعتراض نہیں سمجھا اور نہ انہوں نے مصنوعی طور پر معاشی مساوات پیدا کرنے کی کوئی سعی کی۔ اس ناقابل تردید اور ناقابل انکار دلیل کے علاوہ بحیثیت مسلمان کے ہمارے لیے سب سے بڑی حجت اور سب سے بڑا برہان قرآن حکیم ہے جو بآواز بلند اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ رزق اور وسائل رزق میں یہ تفاوت اور فرق اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور معاشی ناہمواری اور اقتصادی عدم مساوات اسی کی قائم کردہ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے

﴿هو الذی جعلكم خلائف فی الارض ورفع بعضكم فوق بعض درجات لنبلوكم فی ما اتاكم﴾ (انعام:۱۶۵)

”وہ اللہ ہے جس نے تمہیں زمین میں اپنا نائب بنایا اور تم میں سے

Marfat.com

بعض کے درجات کو بعض سے زیادہ کر دیا تا کہ جو کچھ اس نے
تمہیں عطا کیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کر سکے۔"

قرآن حکیم کی آیت کے اس ٹکڑے میں ایک حقیقت ثابتہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ انسان دنیا میں خدا تعالیٰ کا نائب اور اس کا خلیفہ ہے۔ دوسری بات جس پر زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نائبین کے درمیان درجات کا فرق ہے۔ یہ آیت انسانوں کے درمیان بہت ساری چیزوں کے لحاظ سے عدم مساوات پر دلیل شرعی اور نص قطعی ہے، مثلاً انسانوں کے درمیان عقل و تمیز، فکر و تدبر اور معاشی اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے عظیم تفاوت ہے۔ اسی طرح ان کے درمیان مال و دولت، رزق و اسباب رزق اور جاہ و منصب کے اعتبار سے بھی بہت بڑا فرق ہے، اور یہ فرق حق تعالیٰ شانہ کا پیدا کردہ ہے۔ اس ارشاد میں معاشی ناہمواری کا ایک سبب بھی واضح کر دیا اور وہ یہ کہ عقل و دانش اور تدبر کے اعتبار سے دنیا کے تمام انسان یکساں نہیں ہیں، اس لیے اقتصادی مساوات بھی ان میں ممکن نہیں ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ انسانوں کو جو کچھ دیا گیا ہے، آزمائش اور امتحان کے طور پر دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿والله فضل بعضكم علىٰ بعضٍ في الرزق، فما الذين
فضلوا برادي رزقهم علىٰ ماملكت ايمانهم فيه سواء،
أفبنعمة الله يجحدون﴾ (النحل:۷۱)

"اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت اور برتری دی
ہے، پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کو زیادہ روزی دی گئی ہے، وہ اپنی
روزی کو اپنے زیر دستوں پر لوٹا دیں کہ اس روزی میں وہ سب کے
سب برابر ہو جائیں۔ پھر کیا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر
نہیں ہو رہے ہیں۔"

سورۃ انعام کی آیت میں انسانوں کے درمیان عدم مساوات کے مجموعہ میں معاشی ناہمواری کا ضمناً تذکرہ کیا گیا تھا۔ سورۃ النحل کی اس آیت میں اس کو واضح طور پر الگ سے ظاہر کر دیا اور یہ بات کھول کر کہہ دی گئی کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے غربت و

Marfat.com

امارت کا تضاد پیدا فرمایا۔ ایک کو زیادہ دیا ایک کو کم دیا، ایک کو تابع بنایا اور ایک کو متبوع ٹھہرایا۔ ایک کو مالک بنایا اور دوسرے کو مملوک قرار دیا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ سورۃ النحل آیت ۷۱ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''یعنی خدا کی دی ہوئی روزی اور بخشش سب کے لیے برابر نہیں، بلحاظ تفاوت استعداد واحوال کے اس نے اپنی حکمت بالغہ سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ کسی کو مال دار اور بااقتدار بنایا جس کے ہاتھ تلے بہت سے غلام اور نوکر چاکر ہیں جن کو اسی کے ذریعہ روزی پہنچتی ہے۔ ایک وہ غلام ہیں جو بذات خود ایک پیسہ یا ادنیٰ اختیار کے مالک نہیں۔ ہر وقت آقا کے اشاروں کے منتظر رہتے ہیں۔ پس کیا دنیا میں کوئی آقا گوارا کرے گا کہ غلام اور نوکر چاکر جو بہر حال اسی جیسے انسان ہیں، بدستور غلام کی حالت میں رہتے ہوئے اس کی دولت، عزت، بیوی وغیرہ میں برابر کے شریک ہو جائیں۔ نیز جس طرح روزی وغیرہ میں حق تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی، سب کو ایک درجہ میں نہیں رکھا۔ اگر علم وعرفان اور کمالات نبوت میں کسی ہستی کو دوسرے سے فائق کر دیا تو خدا کی اس نعمت سے انکار کرنے کی بجز ہٹ دھرمی کے کیا وجہ ہوسکتی ہے۔'' (فوائد عثمانی: ص ۳۶۴)

ایک اور مقام فرمایا:

﴿نحن قسمنا بينهم معيشتهم في الحياة الدنيا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات، ليتخذ بعضهم بعضاً سخرياً، ورحمت ربك خير مما يجمعون﴾ (زخرف:۳۲)

''ہم نے ان کے درمیان دنیا کی زندگی میں روزگار سے اسباب کی تقسیم فرما دی ہے اور بعض کو بعض پر وسائل معیشت میں فوقیت دی ہے تاکہ ایک دوسرے کو تابع کر سکے، اور تیرے پروردگار کی رحمت اس سرمایہ سے زیادہ بہتر ہے جسے وہ اکٹھا کرتے ہیں۔''

یہاں ایک لطیف نکتہ بھی ساتھ ہی بیان فرما دیا کہ یہ طبقاتی اونچ نیچ، یہ معاشی عدم مساوات اور یہ اقتصادی ناہمواری اگر اسی کو زندگی کی تمام سوچوں کا منتہیٰ بنا لیا جائے تو اس سے کچھ بھی تو حاصل نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہ تو تقدیر کا لکھا ہے جو ہو کر رہا۔ تمہارے فکر ونظر کا اصل محور اور مدار تو پروردگار کی رحمت اور اس کا فضل وکرم ہونا چاہیے کہ کائنات میں وہی ایک شی ہے جس کی تمنا ہر انسان کے دل میں ہونی چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی عمومیت تو امیر وغریب کا فرق نہیں دیکھتی۔ وہ تو ہوا کی طرح ساری کائنات کو محیط ہے، پانی کی طرح بیکراں ہے، آفتاب کی شعاعوں کی طرح ارزاں اور وافر ہے اور اس تک ہر شخص کی رسائی ہوسکتی ہے بشرطیکہ اس کا کوئی جویا اور متلاشی ہو ؎

رحمت حق بہانہ می جوید
رحمت حق بہا نمی جوید

دراصل معاشی ناہمواری کا مسئلہ تقدیر خداوندی کا مسئلہ ہے اور تقدیر خداوندی کا معاملہ سراسر ایک اعتقادی اور نظری معاملہ ہے۔ ایک مسلمان یا ایک مذہبی شخص خواہ وہ کسی بھی دین اور عقیدے کا پیروکار ہو، تقدیر کے عقیدہ سے منحرف نہیں ہوسکتا۔

تقدیر الٰہی کا عقیدہ کیا ہے؟ اگر اس کا اجمالی جواب چاہیے تو صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ "والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ" برا بھلا جو کچھ انسان کو پیش آتا ہے اور نیک وبد کی جن صورتوں سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے اور نفع ونقصان کی جن حالتوں سے وہ دوچار ہوتا ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔

اور اس کا تفصیلی جواب وہ ہے جو قرآن حکیم نے دیا ہے اور جس کی توضیح و تشریح سرکار دوعالم ﷺ نے فرمائی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"زمین میں جو افتاد آتی ہے یا خود تمہاری جانوں پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے وہ سب ہم نے ایک کتاب میں اس کائنات کی تخلیق سے قبل ہی لکھ دی تھی، اور یہ بات اللہ کے لیے بہت آسان ہے تاکہ تمہیں ان محرومیوں پر افسوس نہ ہو، اور جو کچھ مل گیا ہے اس کی خوشی میں حد سے باہر نہ ہو جاؤ۔ اللہ کو مغرور اور اترانے والا شخص

Marfat.com

بالکل پسند نہیں ہے۔" (الحدید:۲۲-۲۳)

مقصد یہ کہ عیش و تنعم یا عسرت و فلاکت تمہارے اپنے بس کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو ازل کی سرنوشت ہے جس کے تم پابند ہو۔ یہ فیصلے تو اس وقت کیے گئے تھے جب ابھی یہ کائنات معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔

پیش از من و تو بررخ جاں ہا کشیدہ اند
طغرائے نیک بختی و نیل بد اختری

ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں

﴿اللھم لامانع لما اعطیت، ولا معطی لما منعت، ولا رادّ لما قضیت، ولا ینفع ذاالجد منک الجد﴾

"اللہ تعالیٰ! جسے تو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں، اور جس سے تو روک لے اسے کوئی دینے والا نہیں، اور تیرے فیصلوں کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں ہے، اور تیرے مقابلہ میں کسی کی کوشش بارآور نہیں۔"

اس دعا کا آخری فقرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کسی شی کا حصول یا کسی شی سے محرومی انسانی کوششوں کی مرہون منت ہرگز نہیں ہے۔ اگر کوئی چاہے بھی تو جدوجہد کے ذریعے یا اپنے بخت وطالع کے زور سے خدا کے فیصلوں کو بدل نہیں سکتا۔ اس لیے جو لوگ معاشی مساوات کے نظریہ کا پرچار کرتے ہیں وہ گویا تقدیر الٰہی کی نفی کرتے ہیں اور خدا کے فیصلوں کو اپنے کھوکھلے نعروں سے بدلنا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ کے فیصلوں کو بدلنے کی تاب کسی میں نہیں ہے۔

دنیا جب سے معرض وجود میں آئی ہے اور جب سے یہ کارخانۂ ہستی قائم ہے روئے زمین کے کسی گوشہ میں ایسی کوئی سوسائٹی آج تک متشکل نہیں ہوسکی جو تمام امور میں مساوات اور یکسانیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو اور اس کا کوئی پہلو افراط و تفریط کا شکار نہ ہوا ہو۔ ابتلاء وآزمائش کا فطری چکر چلتا رہتا ہے اور نظام زیست ہمیشہ تغیر کی زد میں ہے۔ کسی کو سربلند کرنا اور کسی کو قعر مذلت میں گرانا روزمرہ کا دستور ہے

Marfat.com

تخریب کے ساتھ تعمیر اور بناؤ کے ساتھ بگاڑ اس دھرتی کا خاصہ اور وطیرہ ہے اور اس کو بدلنا ان لوگوں کے بس میں نہیں ہے جو ہر دم خود تغیر کی زد میں ہیں۔ تقدیر الٰہی کی کارفرمائیوں کے جو لوگ منکر ہیں انہیں اپنا جینا، مرنا، اٹھنا، بیٹھنا اور چلنا پھرنا ان کے اپنے حیطۂ اختیار میں نہیں ہے تا بدیگراں چہ رسد۔

اس وسیع کائنات پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ذرا اپنے گردوپیش کے حالات پر نظر دوڑائیے۔ ایک ہی گھر میں، ایک ہی ماں اور باپ کی اولاد میں جو فرق نظر آئے گا وہ ان کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہوگا۔ دو سگے بھائیوں کی شکل و شباہت میں، رنگ روپ میں، قد کاٹھ میں، ذہانت و فطانت میں، سمجھ بوجھ میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ جذبات و نظریات میں تضاد ہوگا، کردار و عمل میں تفاوت ہوگا اور کوئی باپ اپنی محبت کے صدقہ میں اور کوئی ماں اپنی ممتا کا سہارا لے کر ان کی قسمتوں کے اس فرق کو مٹانے میں آج تک کامیاب ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔

اور صرف انسانوں ہی کا معاملہ کیوں لیں؟ کائنات ارضی و سماوی میں بے حدو حساب ایسی چیزیں ہیں کہ جنس و نوع کے اعتبار سے ایک ہیں مگر خاصیت و صلاحیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ آم کا پودا ایک ہی آب و ہوا میں پروان چڑھتا ہے مگر آم کا ہر درخت اپنے پھل کے ذائقہ کے اعتبار سے دوسرے درخت سے مختلف ہے۔ گائے بھینسوں کو دیکھ لیجیے۔ کسی کا قد چھوٹا ہے تو کسی کا بڑا، کوئی ناٹے قد کی ہے تو کوئی دیوہیکل، کوئی کم دودھ دیتی ہے تو کوئی زیادہ، کسی کے سینگ لمبے اور نوک دار ہیں تو کسی کے چھوٹے اور ٹیڑھے میڑھے، اور کسی کے سر پر سینگ سرے سے ہی غائب ہیں۔ شیر بھی جنگل کا جانور ہے اور لومڑ بھی جنگل ہی میں رہتا ہے۔ ایک صید ہے دوسرا صیاد، ایک نخچیر ہے اور دوسرا استمگار۔ اسی تنوع کا نام تو دنیا ہے اور اسی اختلاف ہی سے کائنات کا حسن برقرار ہے۔

گل ہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

پھر اگر کائنات میں اس عدم مساوات کو ہر کوئی ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتا

Marfat.com

ہے اور اسے قدرت کا ایک ناگزیر فیصلہ سمجھ کر ماننے پر مجبور ہے تو صرف انسانوں
اقتصادی حالت ہی کے امتیاز کے باب میں کیوں اس قدر پیچ وتاب کھایا جارہا ہے۔

معاشی مساوات کے داعی ممالک:

کیا ان ملکوں میں جہاں معاشی مساوات کے نظریہ کو مملکت کے اساس قرار
گیا ہے۔ وہاں سچ مچ لوگ اس مساوات سے بہرہ مند ہو رہے ہیں؟ کیا وہاں انس
معاشرہ میں اونچ نیچ بالکل مفقود ہو چکی ہے؟ کیا وہاں حاکم ومحکوم کا امتیاز اٹھ چکا ہے؟
وہاں کے ایک مزدور یا کاشت کار کو وہی مراعات حاصل ہیں جو وہاں کے برسر اقتدار
کو میسر ہیں؟ کیا وہاں ضروریات زندگی کی اتنی ہی فراوانی ہے کہ ہر شخص مساوی طور پر مت
ہو رہا ہے؟

اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو آخر آپ د
کے برتے پر فریب دینے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟

ہم تک جو اعداد وشمار ان ملکوں کے پہنچے ہیں جو معاشی مساوات کے نظریہ کے ع
بردار بنے پھرتے ہیں، ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے عوام کو وہ ابتدائی سہولتیں بھ
نصیب نہیں ہیں جو سرمایہ دار ملکوں کے عوام کو حاصل ہیں۔ اشیائے صرف بے حد گرا
ہیں، ضروریات زندگی بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں، تنخواہیں کم ہیں اور قیمتیں زیاد
اجرتیں محدود ہیں اور محنت ومشقت کے کاموں کا تناسب کہیں بڑھ کر ہے۔ دراصل یہ لوگ
جو معاشی مساوات کا پرچار کرتے ہیں اور اقتصادی ناہمواری کو ختم کرنے کا خواب دیکھ
ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ دنیا ان کی بنائی ہوئی نہیں ہے اور اس دنیا کا نظم ونسق ان
مرتب کردہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی ہستی کا بنایا ہوا ہے جس تک ان کے عقول واذہان
رسائی نہ ہوئی ہے اور نہ ہوگی، اور وہ لاکھ جتن کر کے دیکھ لیں، اس کائنات کی باگ ڈور
کے ہاتھوں میں نہیں آسکتی، اس لیے کہ جس بالا وبرتر ہستی نے انہیں کتم عدم سے نکال
وجود کا لباس پہنایا اور جو ہستی ایسی توانا اور طاقت ور ہے کہ جب چاہے ان کے رشتۂ حیا
کو منقطع کر دے، وہ اپنے مقرر کیے ہوئے نظام میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتی

Marfat.com

بہر حال سورت زخرف کی محولہ بالا آیت نے اس باب میں کوئی شبہ باقی نہیں چھوڑا کہ انسانوں کے درمیان معیشت اور وسائل معیشت کے لحاظ سے عدم مساوات اسی ذات بے ہمتا کی پیدا کردہ ہے جو خالق ارض وسماء ہے۔ یہ ناہمواری کسی انسان کی پیدا کردہ نہیں ہے، لیکن اس کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ مال دار لوگ غریبوں کو بیگار میں پکڑ لیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کے تعاون سے دنیا کا کاروبار درست ہو اور انسان ایک دوسرے کی ضرورت محسوس کریں اور یوں ان کے درمیان اجتماعیت کی فضا ہموار ہو۔

اس زمانہ میں بہت سے وہ لوگ بھی جو مسلمان ہیں، اس اصول کی حکمت سمجھ نہیں پائے اور ان کے دلوں میں یا تو اس کی طرف سے شک وتردد کا کانٹا کھٹکنے لگتا ہے یا وہ اسے سرے سے اسلامی اصول ماننے ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کا پہلا اور آخری سبب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ پورے اسلام کا بحیثیت ایک نظام کے گہرا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ اس دین کا مزاج سمجھے بغیر اس کے اصول یا دیگر معاشی اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ زمانہ کی ہوا اور اس کی چلتی ہوئی رو سے متاثر و مرعوبیت ہو جاتے ہیں اور انہیں ہر ایسی چیز کھٹکنے لگتی ہے جو اس رو کے خلاف ہو۔ گویا ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ ”زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز۔“ حالانکہ ایک مسلمان کا نظریۂ زندگی یہ ہونا چاہیے ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

ذہنی مرعوبیت بلکہ ذہنی غلامی ہی وہ سب سے بڑا فتنہ ہے جس کے بطن سے ہر روز ایک نیا فتنہ جنم لیتا ہے اور مسلمانوں کے ناپختہ ذہنوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ انگریز کے دو سو سالہ دور اقتدار میں اور اس کے بعد اب تک بھی مغربی افکار اور یورپی تہذیب کے اثرات بدنے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کو اپنے استعماری آقاؤں کے نظریہ سے اس درجہ مرعوب اور متاثر کیا کہ یہ بات ان کے ذہنوں سے نکل گئی کہ وہ خود بھی اپنا ایک نیا فلسفہ فکر ونظر رکھتے ہیں۔ سر سید احمد خان کی ذہنی مرعوب اسی ذہنی غلامی کا ثمرہ

Marfat.com

تھی (اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں ہماری کتاب ''اسلام کا نظام عدل
مقدمہ) جس نے ان کو انکار معجزات اور عقلیت پرستی کی غلط راہ پر ڈالا اور قرآن حکیم
معنوی تحریف کے وہ گل کھلائے کہ ناطقہ آج تک سر بگریباں ہے، سر سید ہی پر کیا موقو
ہے۔ ذہنی مرعوبیت ہی کا ایک مظاہرہ وہ تھا جو دوسری صدی ہجری میں معتزلہ نے یو
فلسفہ کے سامنے خود سپردگی کے انداز میں کیا اور اسلام کی صاف اور سادہ تعلیمات
روئے تاباں پر دہ گرد و غبار اڑایا کہ صدیوں تک اس کے اثرات کا ازالہ نہ ہو سکا۔ یہ
کے بعد اس کے راستہ پر بے شمار لوگ چل نکلے اور انہوں نے اس ذہنی غلامی کے ا
ایسے بھونڈے مظاہرے کیے کہ بصیرت و فراست دنگ رہ گئی اور عقل و خرد کی سٹی گم ہو
اور ایمان و دین کا جنازہ نکل گیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی، چوہدری غلام احمد پرویز اور ا
ان کے بے شمار پیروکار جو اسلام کو روشن خیال اور اعتدال پسند کہتے ہیں، یہ استعمار کی ذ
غلامی کا ثمر خبیثہ ہیں۔ اور استعمار نے بھی اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ان لوگوں کی پش
پناہی کی اور خوب ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن بھی اسی منحوس درخت کا ایک تلخ ثم
تھا جسے سر سید احمد خان اور اس کی روحانی ذریت نے لگایا تھا۔

سطور بالا میں زندگی کے بارے میں اسلام کا جو نقطۂ نظر، اس کا جو مقصد
معاشیات کی جو حیثیت پیش کی گئی ہے اگر کوئی شخص اسے بغور پڑھے تو وہ اس نتیجہ پر پ
گا کہ انسانوں کے درمیان معاشی عدم مساوات ضرور ہونی چاہیے۔ بظاہر یہ بات عجی
معلوم ہوتی ہے لیکن فی الواقع اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں بلکہ یہ عین مقتضائے عق
کے مطابق ہے۔

اسلام نے زندگی کا جو نقطۂ نظر ہمیں دیا ہے وہ یہ ہے کہ خالق کائنات نے ا
دنیا میں انسان کو امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس نے انسانوں کو زندگی کی نعمت بخش
بہترین جسمانی ساخت اور ہیکل عطاء کی۔ اعلیٰ ترین دماغی اور ذہنی صلاحیتیں مرحم
فرمائیں، اچھے اور برے صفات کا حامل بنایا، بے شمار نعمتیں اور وسائل دیئے اور ان
تصرف کا اختیار عطا کیا۔ یہ سب کچھ دے کر اس نے اپنے پیغمبروں اور اپنی کتابوں
ذریعہ یہ بات واضح کر دی کہ مقصد تخلیق انسان کی آزمائش ہے۔ حق تعالیٰ شانہ یہ د

Marfat.com

چاہتے ہیں کہ انسان زندگی کے مختلف مراحل اور مختلف حالات وکوائف میں کس طرح کا مثبت اور منفی کردار اور رویہ اختیار کرتا ہے۔

صبر، شکر، فیاضی، ہمدردی، شرافت، مرحمت، مواسات، ایثار و مروت، کرم و جود وعطاء، رفاہ عامہ اور دیگر امور خیر و صلاح میں امداد و تعاون ہمیشہ سے انسانیت کے اعلیٰ اور پسندیدہ اخلاق وصفات شمار کیے گئے ہیں، اور حق تعالیٰ نے بھی انہیں نظر استحسان اور پسندیدگی سے دیکھا ہے۔ اسی طرح بے صبری، ناسپاسی، ناشکرگزاری، کنجوسی، سنگ دلی، تنگ دلی، خودغرضی، بے مروتی، امن عامہ میں خلل اندازی، فساد انگیزی، شورش پسندی کو ہمیشہ سے گھٹیا اور بُرے اخلاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی انہیں ہمیشہ نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھا ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو کچھ دیا ہے وہ اصلاً صرف دو بڑی قسموں میں منقسم ہے۔ جان اور مال۔ اب خود فرمایئے کہ انسانیت کے اعلیٰ اور پسندیدہ اور ادنیٰ اور ناپسندیدہ اخلاق وصفات میں انسانوں کی آزمائش کے لیے مالی اور معاشی مساوات مناسب ہے یا عدم مساوات؟ اسی طرح معیشت اور وسائل معیشت کے اعتبار سے زندگی کے حالات وکوائف کا اختلاف مناسب ہے یا ان کی یکسانیت؟

جو شخص بھی زندگی کے آزمائشی نقطۂ نظر پر ایمان رکھتا ہے اس کی عقل کبھی بھی معاشی اور مالی مساوات اور حالات کی یکسانی کو مناسب قرار نہیں دے سکتی کیونکہ اس طرح انسان کی آزمائش ادھوری اور ناقص رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مفلسی اور فقر و احتیاج کی حالت میں انسان کے صبر اور ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ خدا یہ دیکھتا ہے کہ اس حالت میں میرا بندہ زندگی کی مشکلات برداشت کر کے حصول رزق کے ان ذرائع پر ثابت قدم رہتا ہے جو میں نے اس کے لیے حلال قرار دیئے ہیں، یا حالات سے گھبرا کر وہ ان ذرائع کی طرف قدم بڑھا دیتا ہے جو میں نے اس کے لیے حرام قرار دیئے ہیں۔ نیز یہ کہ اس حالت میں میرا بندہ مجھ سے راضی رہتا ہے یا ناراض ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دولت مندی اور فارغ البالی کے عالم میں انسان کے شکر و استقامت کا امتحان ہوتا ہے۔ خدا یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے مال سے مفلسوں، قلاشوں محتاجوں اور غریبوں کا حق نکالتا ہے یا

Marfat.com

خودغرضی اور بخل و امساک کی روش اختیار کر کے اس مال و دولت کو صرف اپنی ذات اور اپنے خاندان کے آرام وآسائش پر صرف کر دیتا ہے۔ نیز یہ کہ دولت کی ریل پیل میں میرا بندہ انہیں لذائد پر اکتفا کرتا ہے جو میں نے اس کے لیے حلال کیے ہیں یا ان لذائذ کے حصول کی طرف لپکتا ہے جو میں نے اس لیے حرام کر دیئے ہیں۔

اگر سب کے سب مال دار ہوں تو صبر و ایمان کی جانچ کیسے ہو، اور اگر سب کے سب محتاج اور تنگ دست ہوں تو شکر و استقامت کا امتحان کیونکر ہو۔ اللہ رب العزت نے اپنے وسیع تر علم وحکمت کی بنا پر خوب جانتا ہے کہ کس بندے کا امتحان کس چیز میں لیا جائے۔ غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی جب تک محتاج و غنی دونوں موجود نہ ہوں، امتحان ناقص اور نامکمل ہوگا۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام نے انسانی زندگی کا جو اعلیٰ مقصد اور مطمح نظر رضائے الٰہی کا حصول قرار دیا ہے وہ اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے۔ جب انسان ہمہ جہتی آزمائش میں کھرا ثابت ہو اور یہ ہمہ جہتی آزمائش معاشی مساوات کی صورت میں ہرگز ممکن نہیں۔

اب اگر بفرض محال تمام انسانوں کے درمیان مصنوعی طور پر معاشی مساوات قائم کر دی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان اپنے مقصد زندگی کے حصول میں ناکام ہو جائے۔ بفرض محال کا لفظ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ خدا نے یہ دنیا انسانوں کی آزمائش کے مقصد سے بسائی ہے۔

﴿خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا﴾

(الملک:۲)

''اس نے موت اور زندگی کو پیدا فرمایا تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون کردار کے اعتبار سے بہتر ہے۔''

اور یہ مقصد بہر طور پورا ہو کر رہے گا۔ کسی انسانی طاقت کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ تمام انسانوں کے درمیان معاشی مساوات پیدا کر کے انسان کی ہمہ جہتی آزمائش کو روک دے۔

Marfat.com

معاشی عدم مساوات کی حکمت:

اوپر کی بحث تو اس پہلو سے تھی کہ آزمائش کے نقطۂ نظر سے معاشی عدم مساوات ہی مناسب ہے۔ اب ایک اور پہلو سے اس مسئلہ کا جائزہ لیجیے۔ چونکہ رزق انسان کی بنیادی ضرورت ہے جس پر اس کی زندگی کی بقاء کا انحصار ہے، اس لیے اس پہلو پر مختلف پہلوؤں سے قرآن حکیم نے روشنی ڈالی ہے تاکہ ایک مومن پوری طرح مطمئن ہو جائے۔

قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ رزق کی تنگی و فراخی اور معاشی اور اقتصادی عدم مساوات بندہ کی مصلحت کلی اور متعدد حکمتوں پر مبنی ہے۔ اس حقیقت کو اس نے مجملاً متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک آیت میں ہے:

﴿ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر، انه کان بعباده خبیراً بصیراً﴾ (اسراء:۳۰)

''بے شک تیرا رب رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے خوب آشنا ہے۔''

"انه کان بعباده خبیراً بصیراً" یعنی وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔ آیت کا یہ ٹکڑا اس مصلحت کلی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان تقسیم رزق میں کمی بیشی فرمائی ہے۔ وہ خالق ہے اور مخلوق کا علم اس سے بہتر کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر ہر بندے کے بارہ میں الگ الگ یہ جانتا ہے کہ کس کے لیے رزق کی کشادگی مناسب ہے اور کس کے لیے رزق کی تنگ دامانی ضروری ہے کیونکہ

''زمین و آسمان کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، وہ ہر بات کا علم رکھتا ہے۔'' (الشوریٰ:۱۲)

اس آیت میں پہلی بات تو یہ کہی گئی کہ تقسیم رزق کی کنجیاں صرف اسی کے

Marfat.com

ہاتھوں میں ہیں۔ اس معاملہ میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ کہی گئی کہ بلاشبہ وہ ہر شی کا علم رکھتا ہے کہ رزق کی تقسیم الل ٹپ نہیں کہ جس کو جتنا چاہا دے دیا، بلکہ یہ تقسیم اس کے وسیع علم پر مبنی ہے۔ اس حقیقت پر ایمان رکھنے والا شخص نان شبینہ کا محتاج ہو کر بھی اپنے رب سے ناراض نہیں ہوتا:

''کیا یہ لوگ جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ رزق کو کشادہ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ بھی وہی کرتا ہے۔ اس میں اہل ایمان کے لیے نشانیاں ہیں۔'' (روم:۳۷)

اس آیت کا آخری ٹکڑا قابل غور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رزق کی کمی بیشی کرنے میں متعدد نشانیاں اور بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں، لیکن ان حکمتوں تک انہیں کی رسائی ہوتی ہے جو ایمان دار ہیں۔ سگانِ دنیا ان حکمتوں اور نشانیوں تک نہیں پہنچ سکتے، مثال کے طور پر جو لوگ معاشیات کی حیثیت کو جانچنے اور دنیوی نعمتوں کی حقیقت سے آشنا ہیں، وہ کبھی بھی مال کی کمی اور زیادتی کو خدا کی بارگاہ میں مقبول و نامقبول ہونے کا معیار نہیں سمجھتے لیکن جو لوگ اس سے ناواقف ہیں وہ دولت کی فراوانی سے سخت دھوکا کھا جاتے ہیں۔ قرآن حکیم کے ایک اور مقام پر اللہ نے بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ ارشاد فرمایا:

''اور اگر لوگ ایک امت واحدہ نہ ہوتے تو ہم خدائے رحمٰن کے منکروں کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں جن پر چڑھ کر وہ ان پر جاتے وہ بھی چاندی کی بنا دیتے، اور ان گھروں کے دروازے اور ان کے تخت بھی چاندی کے تیار کر دیتے، لیکن یہ سب کچھ کیا ہے بجز متاع دنیوی کے، اور آخرت کا اجر و ثواب تیرے رب کے پاس صرف تقویٰ شعار لوگوں کے لیے ہے۔''

(زخرف:۳۳۔۳۵)

اس آیت کی تفسیر میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

''اللہ کے ہاں اس دنیوی مال و دولت کی کوئی قدر نہیں، نہ اس کا دیا

Marfat.com

جانا کچھ قرب و وجاہت عنداللہ کی دلیل ہے۔ یہ تو ایسی بے قدر اور حقیر چیز ہے کہ اگر اس کی خاص مصلحت مانع نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافروں کے مکانوں کی چھتیں، زینے، دروازے، چوکھٹ، قفل اور تخت چوکیاں سب چاندی اور سونے کی بنا دیتا، مگر اس صورت میں لوگ یہ دیکھ کر کہ کافروں ہی کو ایسا سامان ملتا ہے، عموماً کفر کا راستہ اختیار کر لیتے (الا ماشاء اللہ) اور یہ چیز مصلحت خداوندی کے خلاف ہوتی۔ اس لیے ایسا نہیں کیا گیا۔ حدیث میں ہے کہ اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر ایک مچھر کے بازو کے برابر ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی کا نہ دیتا۔ بھلا جو چیز خدا کے نزدیک اس قدر حقیر ہو اسے سیادت و وجاہت عنداللہ اور نبوت و رسالت کا معیار قرار دینا کہاں تک صحیح ہو گا۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''کافر کو اللہ نے پیدا کیا، کہیں تو اس کو آرام دے، آخرت میں تو دائمی عذاب ہے، کہیں تو آرام ملتا، مگر ایسا ہو تو سب وہ ہی کفر کا راستہ پکڑ لیں۔''

(فروائد عثانی: ص ۶۵۳)

انفرادی ملکیت:

اسلامی معاشیات کا دوسرا اہم اصول انفرادی ملکیت ہے۔ اسلام کے معاشی قوانین پر ایک سرسری نظر بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ اس کا پورا ڈھانچہ ''انفرادی ملکیت'' پر قائم ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم نہ کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے معاشی قوانین بے کار ہو کر رہ جائیں گے بلکہ دین اسلام کا ایک رکن زکوٰۃ بھی عملاً غیر ضروری قرار پائے گی۔ اسی طرح اس کا دوسرا رکن حج بھی کروڑوں افراد کے لیے عملاً ختم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ معاشی قوانین کا عظیم الشان مسئلہ میراث بھی باقی نہ رہے گا۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے معاشی قوانین انفرادی ملکیت کی اساس پر قائم ہیں۔ اسی لیے اس اصول پر الگ سے کسی دلیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زکوٰۃ اور میراث کے متعلق آیات،

Marfat.com

انفاق فی سبیل اللہ کے بارہ میں آیات قرآنیہ، قرض اور خرید و فروخت سے متعلق آیات، خلع اور مسئلہ رضاعت کے احکام پر مشتمل آیات، نیز ان مسائل اور دیگر مسائل سے متعلق کثیر التعداد احادیث سب کی سب انفرادی ملکیت کے دلائل و براہین ہیں۔ اسی طرح کم ناپنے تولنے کی ممانعت، چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا، غصب اور رہزنی کی سزا، کسی کا مال تلف کر دینے پر تاوان ادا کر دینے کی سزا اور اس طرح بیسیوں مسائل پر جو آیات و احادیث موجود ہیں، وہ سب انفرادی ملکیت کے دلائل و براہین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل اور اپنی کتابوں کے واسطے سے اپنے ہر ہر بندے پر جو حقوق و فرائض عائد کیے ہیں، جن اخلاقی اقدار کو تسلیم کرنے اور ان کی نگہ داشت کرنے کا پابند کیا ہے، اور جس نوع کی زندگی بسر کرنے کا مطالبہ کیا ہے، وہ اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک اس کی حاصل کی ہوئی چیزوں پر اس کے مالکانہ حقوق تسلیم نہ کیے جائیں۔

فی الواقع انفرادی ملکیت کے حق کی نفی اس نقطۂ نظر کی نفی ہے جو اسلام نے زندگی کے بارہ میں عطا کیا ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اس نقطۂ نظر کو ماننے سے انکار کر دے، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ اسے صحیح بھی تسلیم کرے، اس پر ایمان کا مدعی بھی ہو اور پھر انفرادی حق ملکیت کے حق سے انکار بھی کرے، کیونکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی اس طرح ضد ہیں جیسے سیاہی اور سفیدی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اس بات میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں کچھ ایسی احتیاجات رکھ دی ہیں جن کی تسکین و تکمیل کے لیے وہ ہر وقت بے قرار رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس نے یہ احتیاجات انسان کی فطرت میں رکھیں اس نے خارج میں ایسے وسائل اور انسان کے داخل میں ایسے قوائے علم و عمل پیدا فرما دیئے جن سے کام لے کر وہ اپنی ان احتیاجات کی تسکین و تکمیل کا سامان پیدا کرتا ہے۔ اس وجہ سے پیدائش کا عمل انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ ایک مسلمان معاشی اعتبار سے آسودہ حال رہے اور وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر وسائل کائنات سے استفادہ کرنے کے لیے جدوجہد کرے تو وہ انہیں رزق و دولت سے نوازتا ہے۔ اگر تلاش رزق کرنے والے یہ

Marfat.com

ہاتھ اہل ایمان اور اہل تقویٰ کے ہوں تو اللہ رب العزت کی رزق رسانی کی سنت کامل ترین انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

> ''یعنی اگر بستیوں والے ایمان اور تقویٰ کی روش پر گامزن رہتے تو ہم آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے ان پر کھول دیتے، لیکن انہوں نے تکذیب کی (اور اللہ کے پیغمبروں کو جھٹلایا) پس ہم نے ان کے (برے) اعمال کی وجہ سے انہیں پکڑا۔'' (الاعراف:۹۶)

اسلام علوم وفنون میں ایک مسلمان کی دلچسپی اور ترقی کرنے کو نہ صرف نظر استحسان سے دیکھتا ہے بلکہ اس پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس جدوجہد کا ایک مقصد تو معرفت الٰہی کا حصول ہے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ انسان ان وسائل وآلات تک رسائی حاصل کر لے جو زود پیداواری اور کثیر پیداواری کا باعث بن کر اس کی نہ صرف ضروریات کو پورا کرے بلکہ اس کی احتیاجات کی لذتوں سے بھی اسے شادکام کرے۔ انسان کا اپنے علوم وفنون اور اپنی جسمانی اور ذہنی کدوکاوش کو ذریعہ معاش بنانا اسلام میں عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''کسب الحلال فریضة بعد الفریضة'' یعنی کسب حلال فرض عبادات کے بعد سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اس کی خاطر نماز تہجد جیسی عظیم عبادت میں تخفیف کر دی گئی۔

انسان یہ سب جدوجہد اس وجہ سے کرے گا کہ جو کچھ وہ اپنے محنت سے کمائے وہ اس کی ملکیت میں ہو۔ اگر اس کی محنت کا نتیجہ اور ثمرہ کوئی دوسرا لے جائے تو کبھی بھی محنت وکاوش میں دلچسپی نہیں لے گا۔ اس وجہ سے اسلام نے فرد کو حق ملکیت عطا کیا ہے، لیکن وہ ایسا حق ملکیت نہیں ہے جو سرمایہ دارانہ نظام نے دیا ہے۔

ملکیت کی حقیقت:

ملکیت کی حقیقت جان لینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملکیت سے کیا مراد ہے اور ملکیت کہتے کس کو ہیں؟ ملکیت سے مراد کسی مال یا شئی پر کسی فرد کا قبضہ اور اس شئی یا مال کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کا حق ہے۔ علامہ مقدسیؒ کے مطابق ملکیت

Marfat.com

انسان اور شی کے مابین وہ خصوصی تعلق ہے جو شرعاً دوسروں کے لیے اس شی یا مال سے استفادہ میں رکاوٹ اور اس انسان کے تصرف اور استعمال کے لیے وجہ جواز بنتا ہے البتہ اگر کوئی مانع ہو تو یہ الگ بات ہے جیسے جنون وغیرہ۔ علامہ ابن نجیمؒ نے لکھا ہے کہ "ملکیت کسی شی میں تصرف پر وہ قدرت اور حق ہے جو کسی انسان کے لیے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ثابت کرنے سے ابتدائی طور پر ثابت ہوتا ہے مگر یہ کہ کوئی مانع موجود نہ ہو۔"

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں انسان کو یہ حق ملکیت حقیقی ہے لیکن اسلام میں یہ حق ملکیت عارضی ہے، کیونکہ اسلام میں کائنات کی ہر چیز کا مالک درحقیقت اللہ تعالیٰ ہیں جیسا کہ قرآن حکیم کی مختلف آیات میں بیان کیا گیا ہے:

﴿لله مافی السماوات وما فی الارض﴾ (بقرہ:۲۸۴)

"آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔"

اس آیت میں قرآن حکیم کی دوسری آیات کی رو سے اصل مالک تو ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے انسان کو اشیاء کے حقوق ملکیت اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں اور اس کی حیثیت ایک مقدس امانت کی ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ان اشیاء میں تصرف کا حق رکھتا ہے لیکن اس سلسلہ میں اسے مالک حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی رضا اور اس کا منشاء ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ایک نائب خدا ہونے کی حیثیت سے انسان کے ذمہ دنیا و آخرت کی فلاح و صلاح کا حصول ہے، اور اس کائنات کی ہر شی کا مقصد وجود انسان کو اپنے مقصد اور تگ و تاز زندگی میں کامیابی کے مواقع فراہم کرنا ہے، اس لیے حق ملکیت کا حصول انسان کا مقصد زندگی نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿اموالکم التی جعل الله لکم قیاماً﴾ (النساء:۵)

"(اگر یتیم کم عقل ہوں تو تم ان کم عقلوں کو) وہ مال مت دو جن کو اللہ تعالیٰ نے (ایسے کام کا پیدا کیا ہے کہ ان کو) تمہارے (سب کے) لیے مایۂ زندگی بنایا ہے۔"

Marfat.com

آیت کے اس ٹکڑے میں ایک طرف تو مال کی اہمیت بتائی اور واضح کیا کہ انسانی معاش میں اس کا بڑا دخل ہے، لہٰذا اس کی حفاظت کا داعیہ قلوب میں پیدا کیا گیا۔ نہ صرف داعیۂ حفاظت پیدا کیا بلکہ اس کی حفاظت کو ضروری قرار دیا اور اس کا ضیاع گناہ قرار دیا۔ اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے اگر کوئی شخص مقتول ہو جائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ جان کی حفاظت کرتے ہوئے مقتول ہونے پر شہادت کا اجر موعود ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے جو شخص مقتول ہو جائے وہ شہید ہے۔ (بخاری:۱/۳۳۷، مسلم:۱/۸۱)

ایک اور روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: ''نیک آدمی کے لیے اس کا اچھا اور پاکیزہ مال بہترین متاع حیات ہے۔'' (مشکوٰۃ: ص ۳۲۶)

چونکہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک ہی وحدت کی اکائیاں ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بھی چند افراد یا کسی ایک طبقہ کی ملک نہیں ہونی چاہئیں بلکہ تمام افراد انسانی کو استفادہ کا موقع ملنا چاہیے، اور محروم افراد کے ساتھ ہمدردی اور اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہ انہیں بھی اس مال سے استفادہ کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ پسندیدہ شخص وہ ہے جو اس کے عیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔'' (مشکوٰۃ: ص ۳۲۴)

انسان کو اگرچہ مال اور دیگر اشیاء پر ملکیت کے اختیارات دیئے گئے، لیکن یہ اختیارات بطور آزمائش اور امتحان دیئے گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ آزمائش اسی صورت میں ہوتی ہے جب انسان کو اختیار اور اپنی پسند و ناپسند کے مطابق عمل کی آزادی حاصل ہو۔ البتہ اس اختیار کو اس طرح محدود کیا گیا کہ اس کی آزادئ ملکیت سے دوسرے افراد کی آزادی مجروح نہ ہو اور اس آزادی سے معاشرہ میں فساد اور فتنہ برپا نہ ہو، قرآن وسنت کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اموال و املاک پر افراد کو نجی ملکیت کا حق حاصل ہے ورنہ قانون وراثت، نظام زکوٰۃ، عشر وصدقات، نظام نفقات اور قانون وصیت وغیرہ سب بیکار ہو جائیں۔ کیوں ان تمام احکام پر عمل اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب اموال و

Marfat.com

املاک انسان کی ذاتی ملکیت میں ہوں۔ تاہم یہ مالکانہ حقوق مطلق نہیں بلکہ مشروط ہیں۔

اسلام نے انسان کو نجی ملکیت پر جو حقوق دیئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(1) ہر انسان اپنی زیر ملکیت شی کو اپنے یا دوسرے انسانوں کے فائدے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ ان اشیاء میں ترمیم اور اضافہ عمل پیدائش (Production) کے ذریعہ کر سکتا ہے۔ اس کا یہ حق منقولہ و غیر منقولہ، ذی روح اور غیر ذی روح ہر طرح کی املاک اور اشیاء پر ہوتا ہے۔ انسان نئی ٹیکنالوجی اور علم کی بنیاد پر ان اشیاء میں جدت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

(2) جو اشیاء یا جائداد انسان کی نجی ملکیت میں ہیں، ان میں اضافہ کرنا اور نفع کمانا انسان کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائداد کو وہ کرایہ پر دے سکتا ہے۔ وہ ذاتی مال سے ذاتی کاروبار کر سکتا ہے تاکہ اس سے وہ نفع کمائے۔ بعض مفکرین انسان کی ذاتی ملکیت کا حق تو تسلیم کرتے ہیں لیکن نفع حاصل کرنے کی غرض سے اس کو کاروبار میں لگانے کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ ایک کم عقلی کی بات ہے۔ کاروبار میں نفع و نقصان دونوں کا رسک (Risk) ہے۔ نقصان کی صورت میں صاحب مال اپنے مال اور محنت دونوں سے یک قلم محروم بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر مال خرچ کر کے اور شبانہ روز محنت کر کے اسے نفع ہو تو یہ بھی اس کا حق بنتا ہے۔

پیداوار کا عمل ایک مفید عمل ہے جس کے ذریعہ ہماری مختلف ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ عمل اسی صورت میں برقرار رکھا جا سکتا ہے اگر فرد اس عمل کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے فائدے اور منافع کا مالک بن سکے۔

(3) اپنے اس مال سے ہر شخص شراکت کے ذریعہ بھی نفع کما سکتا ہے۔ شراکت سے مراد ایسا پیداواری یا کاروباری عمل ہے جس میں دو یا دو سے زائد افراد متعین سرمایہ کے ساتھ نفع کے حصول اور نقصان کی ذمہ داری برداشت کرنے کے لیے اکٹھے ہوں اور نفع و نقصان کی شرح کا تعین حصہ داران کے لیے پہلے سے طے ہو۔

مال سے نفع کمانے کا تیسرا طریقہ مضاربت ہے۔ مضاربت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا سرمایہ کسی دوسرے کاروباری شخص کے حوالہ کر دے۔ مضاربت میں ایک شخص صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے جب کہ دوسرا فریق صرف کاروباری جدوجہد اور سعی و کوشش کرتا ہے۔ نفع کی صورت میں باہمی طے شدہ نسبت سے منافع تقسیم ہوگا جب کہ نقصان کی صورت میں صاحب سرمایہ کا مال نقصان ہوگا دوسرے کی محنت۔

کسی شی کا مالک اپنی چیز کسی دوسرے کو کرایہ پر دے کر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کرایہ ''کسی شی کے استعمال کے فائدوں کی قیمت کو کہتے ہیں۔ اس میں چیز تو اصل مالک کی ملکیت ہی میں رہتی ہے لیکن اس کے فوائد کرایہ پر لینے والے کی ملکیت بن جاتے ہیں۔ نقد سرمایہ کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا کیونکہ نقد سرمایہ کو خرچ کیے بغیر اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ وہ خود باقی رہتے ہوئے اپنے فوائد استعمال منتقل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ سرمایہ کو کرایہ پر دینا سود کہلاتا ہے جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

مالک کو اپنی ملکیت میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، لہٰذا اس کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زیر ملکیت چیز دوسرے شخص کو منتقل کر دے۔ خواہ قیمت کے عوض ملکیت منتقل کرے یا بلاعوض کے۔ چنانچہ چیزوں اور جائیداد کی خرید و فروخت، ہبہ، وصیت اور وقف وغیرہ ملکیت کی منتقلی کی مختلف شکلیں ہیں۔

اسلام نے ایک فرد کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ بعض حدود کے اندر رہتے ہوئے مال جمع کر سکتا ہے۔ مال کو جمع کرنا اسلام میں اسی صورت میں ناپسند کیا گیا ہے جب اس سے سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہو، یعنی آدمی بخل سے کام لے، مال کی ہوس پیدا ہو جائے، دوسروں کے حقوق کو پامال کرے اور ہر جائز اور ناجائز طریقہ سے مال اکٹھا کرے۔

اسلام نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ اپنی اور اپنے عزیز و اقارب کے مستقبل کی ضروریات کے لیے، یا اچھے مقاصد کے لیے، یا اپنے ورثاء کے لیے ترکہ چھوڑنے کی غرض سے مال جمع کرے۔ خواہ وہ پراپرٹی کی صورت میں ہو یا زر نقد کی صورت میں، وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

''اپنے اہل و عیال کے لیے مال چھوڑ کر مرنا اس سے بہتر ہے کہ آدمی ان کو

Marfat.com

مفلس اور بے سہارا چھوڑ کر مرے۔'' (بخاری) معلوم ہوا کہ ورثا کے لیے ترکہ چھوڑ جا
ایک اچھی بات ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں جو سیدنا کعب بن مالکؓ سے مروی
ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی:

''یا رسول اللہ! میں نے توبہ کرتے وقت یہ بھی طے کیا ہے کہ میں اپنے سارے مال سے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے لیے صدقہ کے طور پر دست بردار ہو جاؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے مال کا ایک حصہ اپنے پاس روک لو کیونکہ یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔'' میں نے عرض کی: ''مجھے خیبر میں جو حصہ ملا ہے اسے میں روک لیتا ہوں۔'' (بخاری، باب لاصدقۃ الاعن ظہر غنی)

بعض روایات میں ہے کہ بعض حضرات میں مال جمع کرنے کے خلاف کچھ ان
پسندانہ رجحانات پیدا ہو گئے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ دنیا چونکہ ایک عارضی قیام گا
ہے لہٰذا اس میں مال جمع کرنے کا کیا فائدہ؟ چنانچہ ان کو اعتدال کی تلقین کی گئی۔ جیسا ک
امام بخاری نے الادب المفرد میں روایت نقل کی ہے کہ ایسے لوگوں کی طرف سیدنا عمرؓ
خط لکھا کہ:

''اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو کچھ عطا کیا ہوا ہے اسے سنبھال کر رکھو کیونکہ زندگی کا یہ معاملہ کافی مدت کی گنجائش رکھتا ہے۔''

(الادب المفرد: ص٦٩)

اسلام کے مال جمع کرنے کی اسی اجازت کی روشنی میں آپ کے بعض جلیل
القدر صحابہ کرامؓ جیسے سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ نے ا
وفات پر بہت مال چھوڑا جو ان کے وارثان میں شریعت کے مطابق تقسیم کیا گیا۔ ا
زندگی میں بھی ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں بہت مال خرچ کیا، لیکن پھر
وفات پر بہت سا مال ترکہ میں چھوڑا، بخاری میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ جب
مکرمہ میں سریر آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے اپنی واجب الاحترام خالہ سیدہ عا
کی خدمت کرنے کے لیے بہت سا مال بھیجا، لیکن خالہ محترمہ اپنی عادت کے مطابق ا

ل کو خرچ کر ڈالتی تھیں۔ کیونکہ خالہ کو وہی شان نبوی پسند تھی کہ ایک وقت کھائیں
ر دوسرے وقت فاقہ کریں۔ ایک روز سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ نے یہ کہہ دیا کہ ''خالہ! یہ غیر
عمولی خیرات بند کریں، ورنہ اس پر قانونی پابندی لگا دوں گا۔'' سیدہ عائشہؓ کو جب معلوم
ا کہ بھانجے نے یہ کہا ہے تو قسم کھالی کہ میں ابن زبیرؓ سے بات نہیں کروں گی۔''

سیدنا عبداللہؓ نے خالہؓ کی یہ ناراضگی کی بات سنی تو سخت بے چین ہوئے اور
عافی کی درخواست کی لیکن درخواست رد کر دی گئی۔ بالآخر با اثر بزرگوں کو درمیان میں
ال کر منت سماجت کی اور معافی ہوئی اور خالہؓ نے بھی قسم ختم کر دی۔ قسم تو ختم ہو گئی لیکن
ں کے ساتھ سیدہؓ کو ایک عجیب پریشانی لاحق ہو گئی کیونکہ قسم میں انہوں نے جو الفاظ کہے
تھے وہ یہ تھے:

﴿لله علی نذر ان لا اکلم ابن الزبیر﴾

''اللہ کے لیے میرے ذمہ نذر ہے کہ میں ابن زبیرؓ سے بات نہیں کروں گی۔''

یہ الفاظ مبہم تھے۔ نذر کی تصریح نہیں تھی کہ نذر کس بات کی؟ اس کے لیے
پالیس غلام آزاد کر دیئے، پھر بھی روتی تھیں کہ خدا جانے کہ اس غیر معین نذر کا کفارہ ادا
وا یا نہیں۔ (بخاری: ۲/ ۸۹۷)

اتی ملکیت کے حدود:

جیسا کہ سطور بالا میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو جو ملکیت کا اختیار دیا گیا ہے وہ
طلق نہیں ہے بلکہ محدود ہے۔ مالک حقیقی تو حق تعالیٰ شانہ ہیں۔ انہوں نے انسان کو جو
لکیت کا اختیار دیا ہے وہ چند حدود و قیود کا پابند ہے۔

﴿وابتغ فیما اتاک الله الدار الآخرة، ولا تنس نصیبک من الدنیا و احسن کما احسن الله الیک، ولاتبغ الفساد فی الارض﴾ (قصص: ۷۷)

''اور یہ جو مال اللہ نے تجھے دے رکھا ہے اس سے آخرت کا گھر

Marfat.com

(بنانے) کی فکر کر، اور دنیا سے (بھی) اپنا حصہ فراموش نہ کر، اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی اوروں کے ساتھ احسان کر، اور ملک میں فساد (برپا کرنے) کا خواہاں نہ ہو۔"

1- اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ جو کچھ انسان کو دیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اس کا ذاتی نہیں۔

2- انسان کو اللہ کے عطا کیے ہوئے مال کو اس طرح صرف کرنا چاہیے کہ اس کا مقصد رضائے خداوندی اور حصول آخرت ہو۔

3- اللہ کا عطا کیا ہوا مال انسان کے پاس امانت کے طور پر ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی مرضی کے مطابق اسے اس مال کو خرچ کرنا چاہیے۔

4- انسان کو اپنے مال وزر کا ایک حصہ دوسروں کو دینا چاہیے، اس لیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا ہے وہ اس کا احسان ہے، لہٰذا اس کو بھی دوسرے انسانوں کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

5- حق تعالیٰ شانہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تمہیں مال خرچ کرنے سے روک دے جہاں اسے خرچ کرنا پسند نہیں ہے۔ چنانچہ منشائے خداوندی یہ ہے کہ زمین میں فساد یا برائی پھیلانے کے لیے مال کو ہرگز خرچ نہیں کرنا چاہیے۔

مال کے حق استعمال کے حدود:

اسلام نے جہاں فرد کو حق ملکیت دیا وہاں اس کے استعمال اور تصرف کے حدود بھی مقرر کر دیئے۔ چنانچہ اسلام نے اس کے پانچ حدود مقرر کیے۔

1- مال کو ضائع کرنے کی ممانعت:

اسلام نے جہاں فرد کو ملکیت کا حق دیا وہاں اسے اپنی ملکیت کو ضائع کرنے کی ممانعت بھی فرما دی، کیونکہ مالک حقیقی چونکہ حق تعالیٰ ہیں اور یہ مال انسان کے پاس اللہ کی امانت ہے اور ایک امین کو امانت میں خیانت کا کوئی حق نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں مال کے ضیاع کو فساد کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

Marfat.com

''اور جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں اس لیے دوڑ دھوپ کرتا پھرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ و برباد کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔'' (البقرہ:۲۰۵)

بعض حضرات نے ''تولی'' کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے اس کا معنی ''حکومت'' لیا ہے۔ اس معنی سے مطلب یہ ہوگا کہ جب اس کو ملک میں اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہ اس بات کی سعی و کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے۔ کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے۔

حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے صراحت سے فرمادیا کہ ''مال کو ضائع کرنا ممنوع ہے۔'' (بخاری، الادب المفرد: ۴۵)

سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تین چیزوں کو ناپسند فرمایا ہے:

﴿قیل و قال، و اضاعة المال، و کثرة السوال﴾ (بخاری و مسلم)

''قیل و قال کرنا، مال ضائع کرنا اور کثرت سے سوال کرنا۔''

محدثین نے مال کو ضائع کرنے کا معنی یہ لکھا ہے:

''اضاعت مال سے مراد مال کو غیر شرعی طور پر صرف کرنا اور بے جا تلف کرنا ہے۔ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاشرہ میں بگاڑ اور فساد پیدا کرنے کے مترادف ہے اور حق تعالیٰ شانہ فساد پیدا کرنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب کوئی شخص اپنا مال ضائع کردے گا تو پھر وہ کسی دوسرے کے مال پر قبضہ کرنے کی فکر میں لگ جائے گا۔ (نووی شرح مسلم)

جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے ''تمہارے مال جن کو اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔'' (النساء:۴) معلوم ہوا کہ مال ایک نہایت مفید شی ہے۔ اس سے بہت سے دینی کام ہو سکتے ہیں، مفید اشیاء کو ضائع اور تلف کرنا انسانیت کا مشترکہ نقصان

Marfat.com

ہے۔اس لیے مال کے ضائع کرنے سے سختی سے منع کیا گیا۔اس وجہ سے جنگ کے موقع پر بھی تلف مال سے سختی سے روکا گیا، لیکن اگر حالت جنگ میں دشمن کی طاقت توڑنے کے لیے مال تلف کرنا ضروری اور ناگزیر ہو جائے تو پھر اس کی اجازت دی گئی ہے۔

اسلام کے بالمقابل سرمایہ دارانہ نظام میں ملکیت کا مطلق تصور دیا گیا جو حدود و قیود سے ناآشنا ہے، لیکن اسلام میں جو تصور ملکیت ہے وہ محدود اور مقید ہے۔ اس میں مال کو ضائع اور تلف کرنے مطلق اجازت نہیں، اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اس سے حکومت وقت سے بھی پرسش ہوگی اور روز قیامت بھی سوال ہوگا کہ ہماری امانت میں خیانت کیوں کی اور ہماری نعمت کو کیوں ضائع کیا؟ سرمایہ دارانہ نظام اور ان ممالک میں جن میں یہ نظام معیشت رائج ہے وہاں اموال تجارت اور صنعتی اور زرعی پیداوار کو بجائے غرباء کو دینے یا انہیں سستا فروخت کرنے سے منع کرتے ہیں تا کہ مجموعی منافع میں اضافہ ہو جائے۔اسلام میں اس طرح مال کو ضائع کرنے سے روکا گیا ہے۔

2- غیر شرعی مصارف میں صرف کرنے کی ممانعت:

اسلام میں جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ترمذی کی حدیث کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ اسلام نے مال کمانے پر بھی پابندی عائد کی ہے اور مال خرچ کرنے پر بھی پابندی لگائی ہے۔ چنانچہ ہر وہ کام جو معاشرہ اور اخلاق کے لیے تباہ کن ہو وہاں مال خرچ کرنے سے روکا گیا اس لیے شراب خوری، زنا کاری، جوابازی، سٹہ بازی اور دوسرے تمام محرمات میں مال خرچ کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ان کاموں میں مال صرف کرنے کو قرآن حکیم میں ''تبذیر'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔اور جائز مقاصد میں حد اعتدال سے زیادہ مال صرف کرنے کو ''اسراف'' کہا گیا، اور ان دونوں کی اسلام میں ممانعت کی گئی، لیکن ''تبذیر'' کی ممانعت زیادہ شدید اور سخت ہے۔قرآن حکیم میں ہے:

﴿ولا تبذر تبذيراً، ان المبذرين كانوا اخوان الشياطين﴾ (الاسراء:۲۵-۲۶)

''اور مال کو ادھر ادھر نہ پھینکو، بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔''

Marfat.com

اور ''مبذرین'' کا معنی ہے''الـذین ینفقون فی غیر حق'' وہ لوگ جو ناحق مصارف میں مال خرچ کرتے ہیں۔

3- اسراف کی ممانعت:

قرآن حکیم نے اسراف سے بھی روکا۔اسراف کا اطلاق ہر ایسے طرز عمل پر ہوتا ہے جو انسانی اور اسلامی طرز عمل سے ہٹا ہوا ہو۔اس کا مطلب مفسرین اور محدثین نے یہ بھی کیا ہے کہ جس غرض کی تکمیل مال کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدہ کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے، اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''اسراف'' نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا معیار کے اعتبار سے زائد از ضرورت مال صرف کرنے کا۔سہولت، آرام اور زیب وزینت کے لیے مال صرف کرنا اسراف نہیں بشرطیکہ اعتدال ملحوظ رکھا جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

> ''کھاؤ، پیو اور اسراف نہ کرو، بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (اعراف:۳۱)

ایک اور مقام پر فرمایا:

> (اللہ کے بندے وہ ہیں) جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں، بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ (الفرقان:۶۷)

قرآن حکیم نے اپنی جائز اور حلال کمائی کو خرچ کرنے کو دو شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیا ایک ''اسراف'' اور دوسری تبذیر۔علامہ ماوردی نے ''اسراف'' اور ''تبذیر'' کے باہمی فرق پر فرمایا ہے:

> ''کمیت یعنی مقدار خرچ میں حد سے تجاوز کرنا ''اسراف'' ہے اور یہ ثبوت ہے ان عائد شدہ حقوق کی مقدار سے جہالت کا جو اس کے ذمہ ہیں، اور کیفیت یعنی مواقع صرف میں حد سے تجاوز کا نام

Marfat.com

''تبذیر'' ہے، اور یہ شہادت ہے ان موانع صرف سے نادان بننے کی جو صحیح اور حق مواقع ہیں۔'' (تفسیر روح المعانی:۱۵/۵۹)

احادیث میں بھی اسراف کی مذمت اور ممانعت کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کھاؤ، پیو، پہنو اور صدقہ کرو مگر اس میں اسراف اور گھمنڈ نہ ہو۔ سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اسراف اور گھمنڈ سے احتراز کرتے ہوئے جو جی چاہے کھاؤ اور جو جی چاہے پہنو۔'' (بخاری، ابن ماجہ)

ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک لوگ ایسے مکان نہ بنانے لگیں جن کو وہ منقش کپڑوں کی مثل (آراستہ) کریں گے۔''

(الادب المفرد، بخاری: ص ۶۷)

اسی کتاب میں ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے ایام خلافت میں اپنے گورنروں کو ایک خط لکھا

﴿ان لاتطیلوا بنائکم فانه من شر ایامکم﴾ (الادب المفرد:۶۶)

''بلند و بالا عمارتیں نہ بناؤ کیونکہ یہ طرز زندگی بدترین زمانہ کی نشانی ہے۔''

معلوم ہوا کہ اسراف کی ممانعت کا مقصد انسان کو صرفِ مال میں ایک معتدل اور متوازن طرز زندگی پر قائم رکھنا ہے۔ اسراف کے تین مختلف پہلو ہیں:

- مقدار یا وصف کے اعتبار سے حد اعتدال سے تجاوز
- اہم ترین ضروریات کو نظر انداز کر کے غیر اہم امور پر مال خرچ کرنا
- اجتماع کے عام معاشی حالات کے لحاظ سے فضول اخراجات

اسلام میں اسراف کی ان تینوں قسموں کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ مال کے صرف کرنے میں اسراف اور تبذیر معیشت فاسدہ کی علامات ہیں، اس لیے اقتصاد اور میانہ روی اختیار کرنا ضروری ہے، مثلاً عام حالات میں

Marfat.com

خرچ آمدنی سے بڑھنا نہیں چاہیے ایسا نہ ہو کہ ضرورت اور حاجت کے وقت دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے بلکہ حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان تمام اجتماعی حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ جو ''غنی'' ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کیے ہیں، اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات کے لیے کچھ نہ کچھ پس انداز ہونا چاہیے۔ نیز بخل اور تقتیر کو بھی کام میں نہیں لانا چاہیے کیونکہ خود اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے حق تعالیٰ کی عطاء کے باوجود معیشت کو تنگ کرنا کوئی اچھا کام نہیں ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة﴾ (کنز العمال عن ابن عمرؓ)

''(آمد وصرف میں) میانہ روی معاشی زندگی کی خوش گواری کا نصف حصہ ہے۔''

امام فخر الدین رازیؒ نے ''والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا الخ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''اسراف'' اور ''تقتیر'' کے بارہ میں مفسرین نے مختلف وجوہ بیان کی ہیں۔ ان میں سے قوی تر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ وہ معیشت کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرتے ہیں، نہ بے جا غلو کرتے ہیں اور نہ بے محل بخل برتتے ہیں، اسی لیے قرآن حکیم میں دوسری جگہ نبی اکرم ﷺ کو اس طرح مخاطب کیا: ''اور آپ اپنے ہاتھ کو نہ اپنی گردن کے ساتھ ہی باندھ لو (یعنی بخل نہ کرو) اور نہ بالکل ہی کھول دو (یعنی اسراف نہ کرو۔) اور آیت ''وکان بین ذالک قواما'' میں قوام سے اعتدال اور میانہ راہ مراد ہے یعنی میانہ روی ان کا شعار ہے۔''

4۔ عیش کوشی کی ممانعت:

اسلام نے انسان کو حق ملکیت دینے کے ساتھ ساتھ اس پر جو پابندیاں

Marfat.com

لگائیں، ان میں ایک یہ ہے کہ وہ تنعم اور عیش کوشی کی زندگی بسر نہ کرے کیونکہ ایک با مقصد اور ذمہ دارانہ زندگی میں اس طرز عمل کی گنجائش نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اعتدال سے تجاوز کے بعد عیش و آرام اور اس کی خاطر کسب مال ہی عملاً زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ اور قرآن وحدیث کی رو سے مال و دولت قیام حیات کے لیے ہیں مگر خود قیام حیات کے بھی کچھ مقاصد ہیں، اور وہ مقاصد بہت بلند تر ہیں لہٰذا آدمی کو فاضل مال املاک کو ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہیے نہ یہ کہ اپنی دولت کو عیش کوشی اور لذت اندوزی میں صرف کر کے اصل مقاصد زندگی کو گلدستۂ طاق نسیان بنا دے۔ اسی وجہ اسلام نے ایسی زندگی بسر کرنے سے روکا ہے جو لذات دنیا میں منہمک، مبالغہ کی حد تک آرام وسہولت کی طلب اور عیش وعشرت میں غرق ہو جانے والی ہو۔ چنانچہ حدیث میں سیدنا معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن بھیجا تو فرمایا:

﴿ایاک والتنعم! فان عباد الله لیسوا بالمتنعمین﴾

(مشکوٰۃ باب فضل الفقراء، مسند احمد جلد ۵ ص ۲۴۳)

''خبردار! عیش وعشرت اور تنعم کی زندگی سے اجتناب کرنا کیونکہ اللہ کے اچھے بندے عیش کوش نہیں ہوتے۔''

ایک بار سرکار دو عالم ﷺ نے دیکھا کہ ان کے کمرہ میں دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ آپ نے ان کو اتار دیا اور فرمایا:

﴿ان الله لم یأمرنا ان نکسوا الحجارة والطین﴾

(مسلم، ابوداؤد)

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم نہیں دیا کہ پتھر اور مٹی کو کپڑے پہنائیں۔''

بات دراصل یہ ہے کہ دنیا کی لذتوں میں انہماک ایک انسان کو آخرت کی زندگی سے غافل اور اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے بے پروا بنا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے جو شخص عیش کوشی اور تنعم کی زندگی میں محو اور مستغرق ہو جاتا ہے وہ اپنی دولت مقاصد زندگی میں خرچ نہیں کرتا بلکہ ادھر ادھر خرچ کر کے مال کو ضائع کرتا ہے۔ اسلام میں اگرچہ ہر لذت کی گنجائش ہے لیکن اسی حد تک کہ وہ انسان کو اخروی اور دنیوی ذمہ

ریوں سے یک قلم غافل نہ بنا دے بلکہ ان مقاصد اور ذمہ داریوں کے حصول میں
دگار اور معاون ثابت ہو۔ آرام و آسائش، تزئین و آرائش اور جمال آفرینی انسان کے
زاج اور اس کے اخلاق و عادات پر اچھا اثر ڈال سکتی ہیں بشرطیکہ ان امور میں اعتدال کی
اہ اختیار کی جائے۔ اگر آدمی حد اعتدال سے تجاوز کر گیا تو پھر دنیا اور آخرت دونوں کی
مہ داریوں کے بارے میں سبک دوش ہونے سے محروم ہو گیا۔

مختصر یہ کہ اسلام ہم سے ترک لذات کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اعتدال اور توازن کا
طالبہ کرتا ہے، لیکن بعض اشیاء جو فی نفسہ جائز نہیں ہے، ان کے استعمال سے نہایت سختی
سے روکا جیسے ریشم کے کپڑوں اور سونے کے زیورات کا استعمال اسلام میں مردوں کے
لیے جائز نہیں ہے۔ ایسے شراب، شہوانی موسیقی اور رقص و سرود کو اسلام میں حرام قرار دیا
گیا ایسے ہی مردوں کے لیے شوخ رنگین اور بھڑک دار کپڑوں کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا
گیا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ریشم و دیباج کے کپڑے نہ پہنو، سونے اور چاندی کے برتنوں
میں پانی نہ پیو، نہ ان سے بنے ہوئے بڑے بڑے پیالوں میں کھانا
کھاؤ۔ یہ سب دنیا کی زندگی میں ان دنیا پرستوں کے لیے ہیں۔''

(مسلم، بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

5- ملکیت کے نقصان دہ استعمال کی ممانعت:

انفرادی ملکیت کے ایسے استعمال سے بھی اسلام نے روکا ہے جس سے دوسرے
افراد یا معاشرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿لا ضرر فی الاسلام﴾ (کتاب الخراج یحیٰی بن آدم قرشی:۶۸)

''اسلام میں مضرت رسانی جائز نہیں ہے۔''

اور ابن ماجہ وغیرہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ

﴿لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام﴾ (ابن ماجہ، مؤطا امام مالک)

''مضرت رسانی جائز نہیں ہے نہ ابتداً اور نہ جواباً۔''

Marfat.com

ایک اور روایت میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ملعون، من ضار مومناً أو مكر به﴾ (ترمذی)

”جو کسی مومن کو نقصان پہنچائے یا اس کو دھوکہ دے وہ ملعون ہے۔“

مضرت رسانی صرف منقولہ جائداد ہی سے نہیں ہوسکتی بلکہ غیر منقولہ املاک سے بھی واقع ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مکان کی تعمیر میں اس بات کا لحاظ رکھے کہ اس سے پڑوسیوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ شریعت میں پڑوسی کا بہت زیادہ حق بتایا گیا ہے۔ چنانچہ سیدنا معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے ایک مرتبہ دریافت کیا: یا رسول اللہ! پڑوسی کا کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

”اگر وہ تم سے قرض مانگے تو اسے قرض دو، تم سے مدد کا طلب گار ہو تو اس کی مدد کرو، ضرورت مند اور محتاج ہو تو اسے کچھ دو، بیمار پڑ جائے تو اس کی عیادت کرو، مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ جاؤ، اگر اسے کوئی فائدہ ہو تو اس کی تمہیں بھی خوشی ہو اور تم اسے مبارک باد دو، اس پر کوئی مصیبت آن پڑے تو تمہیں بھی دکھ ہو اور تم اس کی تعزیت کرو، اسے اپنی ہنڈیا کی خوشبو سے پریشان نہ کرو الا یہ کہ اس پکوان میں سے اس کے لیے بھی حصہ نکالو، اپنی عمارت اس کے مقابلہ میں اتنی اونچی نہ بناؤ کہ اس کے گھر میں جھانک سکو، نہ اپنی عمارت سے اس کے گھر کی ہوا روکو الا یہ کہ تم نے اس سے اجازت حاصل کر لی ہو۔ اگر تم نے کوئی پھل خریدا ہو تو اس میں سے اس کو بھی تحفہ بھیجو ورنہ چھپا کر لاؤ، ایسا نہ ہو کہ اس میں سے تمہارے بچے کچھ لے کر باہر نکلیں اور اس کے بچوں کو احساس محرومی کی وجہ سے غم و غصہ میں مبتلا کریں۔ میں جو بات تم سے کہہ رہا ہوں کیا اسے تم پوری طرح سمجھ رہے ہو؟ پڑوسی کا حق بس

Marfat.com

تھوڑے ہی لوگ ادا کر سکیں گے جن پر اللہ نے رحم فرمایا ہو۔"

(لن یودی حق الجار الا القلیل من رحم اللہ)

(تفسیر قرطبی: ۵/۱۸۸)

امام زیلعیؒ نے بھی اس ضمن میں بڑی پتے کی باتیں لکھی ہیں۔ فرماتے ہیں:

"واضح رہے کہ ہر آدمی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اپنی ملکیت میں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق ہر قسم کا تصرف کر سکے جب تک کہ اس سے دوسروں (یعنی پڑوسیوں وغیرہ) کو کھلا ہوا نقصان نہ پہنچ رہا ہو۔ چنانچہ اس کے لیے جائز ہے کہ اپنے گھر میں حمام تعمیر کرے کیونکہ اس سے پڑوسیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

"اگر وہ اپنے گھر میں روٹی تیار کرنے کے لیے اسی طرح کا تنور گاڑنے کا ارادہ کرے جیسا کہ دکان میں ہوتا ہے، یا آٹا پینے کی چکی لگائے، یا دھوبیوں کے لیے گھاٹ بنائے تو ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ اس سے پڑوسیوں کو کھلا ہوا (ضرراً جاھراً فاحشاً) ضرر پہنچے گا۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ایسا کرنا بھی جائز ہو کیونکہ یہ سب مالکانہ تصرف میں داخل ہے، لیکن اس معاملہ میں مصالح کی رعایت سے استحسان کے طور پر قیاس کو ترک کر دیا گیا ہے۔"

(تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق: ۴/۱۹۶)

Marfat.com

ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے

اسلامی معاشیات کا تیسرا راہ نما اصول یہ ہے کہ اس دھرتی پر جو بھی رزق محتاج ہے اس کو رزق بہم پہنچانے کی کفالت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے:

﴿ومامن دابة فی الارض الا علی الله رزقها، ویعلم مستقرها ومستودعها کل فی کتاب مبین﴾ (ہود:٦)

''اور زمین پر چلنے والا کوئی جانور ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور وہ اس کا ٹھکانہ اور اس کی واپسی کی جگہ سے بھی واقف وآشنا ہے۔ اور سب کچھ کھلی کتاب میں موجود ہے۔''

اس آیت میں تمام محتاج رزق جانداروں کی کفالت اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے اپنے ذمہ لی ہے۔ اس دنیا میں جو بھی جاندار پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روزی اپنے ساتھ لاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کی روزی کا سامان یہاں سے مہیا فرما دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ انسان یا جانور پیدا تو ہو جائیں لیکن ان کے رزق کا حصہ یہاں موجود نہ ہو۔

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا:

''کتنے ہی جانور ہیں کہ اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ہی ہے جو ان کو رزق مہیا فرماتا ہے اور تمہیں بھی، اور وہ سنتا اور جانتا ہے۔''

اس آیت میں جانوروں کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر انسانوں کو مطمئن کیا جا رہا ہے کہ اصل روزی رساں اور حقیقی رازق اللہ جل مجدہ کی ذات ہے، اس لیے تمہیں اس کے احکام کی اطاعت اور فرماں برداری کرتے ہوئے رزق اور وسائل رزق کے بارہ میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ کہا گیا ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس دھرتی پر کتنے ہی جانور

ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھوں پر لادے نہیں پھرتے لیکن وہ جہاں بھی جاتے ہیں اللہ انہیں وہیں روزی پہنچا دیتا ہے۔ پھر تم اپنے بارے میں اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اس بدگمانی میں کیوں مبتلا ہو کہ خدا تمہیں روزی نہیں دے گا۔ کیا تمہارا روزی رساں کوئی اور ہے؟ قتل اولاد سے منع کرتے ہوئے بھی یہی بات کہی گئی کہ روزی رساں اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے تم فقر وافلاس سے ڈر کر اپنے بچوں کو قتل نہ کرو۔ تمہیں بھی وہی رزق دیتا ہے اور انہیں بھی وہی رزق دے گا۔ پھر تم قتل جیسے گناہ عظیم کا ارتکاب کیوں کرو؟

ایک حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے رزق کی فراہمی کے بارہ میں وضاحت فرماتے ہوئے فرمایا:

> ''یاد رکھو! کوئی متنفس اس وقت نہیں مرے گا جب تک کہ وہ اپنا رزق پورا نہ کرے، پس اللہ سے ڈرتے رہو اور اچھے طریقوں سے رزق طلب کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات پر بھروسہ اور توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے، اور اس سے مغفرت طلب کرو، وہ اولاد اور مال سے تمہاری امداد کرے گا۔''

اس معاشی اصول سے چند قاعدے بلا تامل ثابت ہوتے ہیں:

1- اس نظریہ کا حامل طلب رزق میں اپنے آپ کو کسی کے سامنے ذلیل وخوار نہیں کرے گا۔ وہ اپنی خودی اور خودداری کی حفاظت کرے گا اور صرف اپنے رب کے سامنے دست سوال دراز کرے گا۔

2- وہ حصول معاش کے لیے ایسے ذرائع اور وسائل اختیار نہیں کرے گا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اس بات کا یقین کہ وہی اس کے رزق کا ذمہ دار ہیں، اسے اکل حرام سے محفوظ ومصئون رکھے گا۔

3- وہ فقر سے ڈر کر دوسروں کی حق تلفی نہیں کرے گا کیونکہ اسے اپنے اللہ پر بھروسہ اور توکل ہوگا۔ یہ معاشی اصول وہ ہے کہ اگر دنیا اسے تسلیم کرے تو ضبط ولادت (Birth Control) کی ملحدانہ تحریک اپنی موت آپ مرجائے۔

Marfat.com

کسب رزق میں تقویٰ اختیار کرنا:

جب اس بات کا یقین قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں بیٹھ جائے کہ ہمارے رزق کا ذمہ دار اللہ رب العزت ہے۔ ہماری ساری جدوجہد صرف اور صرف ایک سبب اور وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ رزق اتنا ہی ملے گا جتنا مقدر میں ہے، تو وہ کسب رزق میں کبھی بھی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرے گا بلکہ وہ تقویٰ اور پرہیز گاری سے کام لیتے ہوئے اپنا رزق جائز طریقوں سے حاصل کرے گا، اور ہر ممکن طریقہ سے اللہ کی رضا کو حاصل کرے گا۔ شریعت میں اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔ تقویٰ سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور اس کی ناراضگی سے اجتناب اور بچنا ہے۔ تقویٰ کسی ایک دائرے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمہ گیر، ہمہ جہت اور ایک ہمہ وقتی کیفیت ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے چھوٹے بڑے معاملات اس کے دائرہ اثر میں ہیں۔ زندگی کی خاردار پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے معصیت کے کانٹوں سے اپنے دامن کو بچا کر رضائے الٰہی کی منزل کی طرف رواں دواں رہنا ہی تقویٰ کا نصب العین ہے۔ قرآن حکیم میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔ تمام عبادات کا مقصود اسی کو بنایا گیا ہے۔ آخرت اور دنیا میں معیار عزت یہی ہے اور یہی افراط رزق کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ (الاعراف:۹۶) یہی تقویٰ اخروی نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ (القلم:۳۴) اور دین و دنیا کی فلاح اور کامیابی کی ضمانت بھی یہی تقویٰ ہے۔

انسانی اعمال میں تقویٰ کی کیفیت کا ظہور مثبت اور منفی دو جہتوں سے ہے۔ اثباتی جہت میں ان امور کو اختیار کرنا تقویٰ ہے جو اللہ کی رضا کا ذریعہ ہیں اور منفی پہلو میں تقویٰ یہ ہے کہ ان کاموں کو یک قلم ترک کر دیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو تقویٰ مطلوب، ومقبول ہے وہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت تقویٰ ہے جو زندگی کے ہر گوشہ اور ہر معاملہ کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ انسان کی معاشی زندگی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ انسان کی معاشی جدوجہد کو صحیح خطوط پر استوار رکھنے اور بے اعتدالیوں سے محفوظ رکھنے میں تقویٰ کا ایک نہایت مؤثر کردار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں حلال اور طیب قسم کی جو اشیائے رزق پیدا کی ہیں انہیں حاصل کیا جائے اور

Marfat.com

پھر انہیں اپنی احتیاجات کی تسکین کے لیے ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔ اور جو چیزیں حرام اور غیر طیب ہیں ان کے حصول سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے۔ اکتساب رزق کے باب میں اسلام کا یہ راہ نما اصول ہے:

''اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔'' (الجمعہ:۱۵)

اس آیت کی روشنی میں تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ:

1- ترک دنیا کے بجائے تلاش رزق کے لیے مقدور بھر کوشش کی جائے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے امکانی حد تک اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے۔

2- اکتساب رزق کے لیے صرف اور صرف حلال اور پاکیزہ ذرائع ہی استعمال کیے جائیں۔

3- تلاش رزق کے دوران احکامات الٰہی کو ہر لمحہ اور ہر لحظہ یاد رکھا جائے۔

4- حصول رزق محض مادی احتیاجات کی تسکین کے لیے نہ ہو بلکہ اس کا مقصود حقیقی اخروی فلاح سے ہم کنار ہونا ہو۔

یہ تو مثبت پہلو تھے۔ اب معاشیات میں تقویٰ کے جو منفی پہلو ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

1- حصول رزق کے حرام بلکہ تمام مشتبہ ذرائع سے بھی اجتناب کیا جائے، مثلاً سود، سٹہ، جوا، چوری، عصمت فروشی اور بلا اجازت کسی کی املاک میں تصرف کرنا خواہ کوئی قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

2- ضرر اور غرر کے لین دین سے اجتناب کیا جائے۔

3- ضرر سے مراد کاروبار کے وہ طریقے ہیں جن سے دوسروں کی جان، مال اور عزت وشہرت کو بالواسطہ یا بلا واسطہ نقصان پہنچے۔ اس میں گندگی، غلاظت اور آلودگی (Pollution) کا باعث بننے والے طریقے بھی شامل ہیں۔ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، اجناس کو دانستہ تلف کرنا اور مصنوعی طور پر قیمتوں میں اضافہ کرنا

Marfat.com

بھی ''ضرر'' میں داخل ہے۔

دھوکہ، فریب اور تنازعات اور لڑائی جھگڑے کا باعث بننے والے تمام معاملات غرر میں داخل ہیں۔ جھوٹی قسموں کے ذریعہ دولت پیدا کرنا اور پر فریب اشتہار بازی کے ذریعہ سادہ لوح افراد کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا بھی اس میں شامل ہے۔

4- شرف انسانی کے منافی کاموں سے اجتناب کرنا مثلاً طفیلی پن، مسخرہ پن، گداگری اور ذلیل وخوار بن کر روزی کمانے کے تمام طریقے اور دھندے تقویٰ کے منافی ہیں۔

تبادلۂ دولت اور تقویٰ:

تبادلۂ دولت انسانی زندگی میں ایک ناگزیر عمل ہے کیونکہ کوئی بھی انسان اپنی ضرورت کی تمام اشیاء وخدمات خود پیدا نہیں کرسکتا۔ پیدائش دولت کا عمل تقسیم محنت کے اصول پر ظہور میں آتا ہے جو اشیاء وخدمات کے تبادلہ کو ناگزیر بنا دیتا ہے۔ اس بارہ میں اسلام کا راہ نما اصول یہ ہے:

﴿ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم﴾ (نساء:۲۹)

''اور ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ سوائے اس کے کہ تجارت ہو باہمی رضامندی سے۔''

اس آیت کی رو سے تبادلۂ دولت کے سلسلہ میں تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ:

1- اشیاء کا تبادلہ باہمی رضامندی سے ہو

2- تبادلہ احکامات خداوندی کے مطابق ہو

3- تبادلہ اشیاء لین دین کے مسلمہ معروف اصولوں کے مطابق ہو۔

اس بارہ میں تقویٰ کے منفی پہلو حسب ذیل ہیں:

1- تبادلہ اشیاء کے سلسلہ میں جھوٹ، دھوکہ اور فریب جیسے تمام باطل طریقوں سے

Marfat.com

یک قلم اجتناب کیا جائے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من غشنا فلیس منا﴾

''جس نے ہم سے دھوکہ کیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

2- ناپ تول میں کمی نہ کی جائے

3- جھوٹی قسموں کو تبادلہ اشیاء کا ذریعہ نہ بنایا جائے

4- تبادلہ میں ظلم اور جبر واکراہ سے کام نہ لیا جائے۔

کسب معاش اسلام میں ضروری ہے:

جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا ہے کہ کسب معاش بھی اسلام میں عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''کسب الحلال فریضة بعد الفریضة'' حلال روزی کمانا فرض عبادت کے بعد ایک فرض ہے۔ اس لیے اسلام نے جہاں نماز روزہ کی تلقین کی وہاں کسب معیشت اور ''ابتغاء رزق'' (رزق کی تلاش) کی ترغیب بھی دی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہر فرد کو اپنی استعداد کے مطابق معیشت کے لیے جدوجہد کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ یہ دنیا عمل کا میدان ہے لہٰذا یہاں جمود وخمود موت کے مترادف ہے، اس کارگاہ ہستی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رزق کے سامان کے ذخیرے جمع کر دیئے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ انسان تلاش وجستجو کرے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿فاذا قضیت الصلوٰة فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل الله﴾ (جمعہ:۱۵)

''جب نماز ادا ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (رزق) کو تلاش کرو۔''

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وآخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل الله﴾ (مزمل:۲۰)

''اور کتنے اور لوگ ہیں جو زمین میں پھرتے ہیں اللہ کے فضل

Marfat.com

(روزی) کو تلاش کرتے۔"

ایک حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا صلیتم الفجر فلاتنوموا عن طلب ارزاقکم﴾

(کنز العمال:۲/۱۴۲)

"جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنے رزق کی جدوجہد کے بغیر نیند (آرام) کا نام نہ لو۔"

ایک اور روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من الذنوب ذنوباً لایکفرھا الاالھم فی طلب المعیشۃ﴾ (الاوسط للطبرانی وحلیۃ الاولیاء)

"بعض گناہوں میں سے ایسے گناہ جن کا کفارہ صرف طلب معیشت کی فکر اور جدوجہد میں کاوش ہی سے ہو سکتا ہے۔"

امام غزالیؒ نے سیدنا فاروق اعظمؓ کا ایک قول نقل فرمایا ہے کہ آپ فرماتے تھے:

﴿لایقعد احدکم عن طلب الرزق﴾ (احیاء العلوم:۲/۵۷)

"تم میں سے کوئی شخص بھی طلب رزق کی جدوجہد میں پست ہمت ہو کر نہ بیٹھ جائے۔"

سیدنا عمرؓ کے اس قول کی تشریح میں سید مرتضیٰ زبیدی نے فرمایا ہے:

"ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ معیشت کے جائز اسباب میں سے کسی سبب اور وسیلہ کو ضرور اختیار کرے جس سے وہ رزق کو حاصل کر سکے۔" (اتحاف السادۃ:۵/۲۱۷)

ابتغاء رزق اور کسب معاش کو ضروری قرار دینے کے بعد اسلام یہ چاہتا ہے کہ فرد حصول معیشت میں جو طریقہ اختیار کرے وہ ایسا نہ ہو جو نظام معیشت کو فاسد کر دے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ کسب معیشت میں ہمیشہ دو اصول پیش نظر رکھے جائیں۔ ایک یہ کہ جو حاصل کیا جائے وہ "حلال" ہو اور جن طریقوں سے وہ رزق حاصل کیا جائے وہ "طیب" ہوں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا گیا۔ فرمایا:

Marfat.com

﴿یاایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً ولا تتبعوا خطوات الشیطان، انه لکم عدوٌ مبین﴾ (بقرہ:۱۶۸)

''اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال طیب کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

ایسے ہی قرآن حکیم کی اور بھی کئی آیات میں حلال اور طیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ سورۃ المومنون میں رسولوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''اے رسولو! تم پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، بے شک میں جو تم عمل کرتے ہو اس کا جاننے والا ہوں۔'' (مومنون:۵۱)

قرآنی آیات میں جہاں حلال وطیب کی تاکید فرمائی وہاں اس بات کی بھی تاکید کی گئی کہ ''شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ کھانے پینے اور دیگر تمام اشیاء کے استعمال کرنے میں اور آمدنی کے تمام وسائل آمدنی اور اسباب معیشت کی روح یہ ہے کہ ایک مسلمان کو ان تمام اشیاء سے اجتناب اور احتراز کرنا چاہیے جن سے شیطان خوش ہوتا ہے اور جن کی ترکیب ان عناصر سے کی گئی ہو جو جسمانی امراض کا سبب بنتے ہوں یا قوائے حیوانی کو مشتعل اور برانگیختہ کر کے ان کو اعتدال طبعی سے نکال کر روحانی اور اخلاقی امراض کا باعث بنتے ہوں، اور ان تمام اشیاء سے بھی احتراز اور اجتناب ضروری ہے جو خودنمائی، تکبر، غرور وفخر، بے جا تعیش اور جابرانہ کبر ونخوت کا سبب بن کر، مساوات اور مواسات باہمی کے رشتوں کو منقطع کر کے خودغرضی، ظلم اور بداخلاقی کی جانب دعوت دیتے ہوں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری اور لازمی ہے کہ جو شئی کسب معیشت میں حاصل کی گئی ہو وہ اپنی ذات میں بھی اور حصول کے طریقوں میں بھی نفس کو پاک رکھتی اور خباثت نفس سے بچاتی ہو۔ علاوہ ازیں اس سے افراد امت کے لیے کوئی معاشی تنگی پیدا نہ ہو۔ ظلم و جبر اور سرکشی اور معاشی دست برد کے وہ جراثیم نہ پھیلتے ہوں جن سے سرمایہ دارانہ ذہنیت فروغ پاتی ہے اور عام انسانوں کو فلاکت و مسکنت کے قعر ہلاکت میں ڈالتی ہے۔ پس اگر آمدنی اور وسائل آمدنی میں ان تمام امور کا لحاظ رکھا جائے تو اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے ''طیب'' کہا جاتا ہے۔ مفسرین نے طیب کی یہی تفسیر کی

Marfat.com

ہے۔ چنانچہ علامہ رشید رضا نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

''طیب سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کے ساتھ غیر کا حق متعلق نہ ہو، اس لیے کہ نص قرآنی نے جن اشیاء کو حرام قرار دیا ہے ان کی حرمت تو ذاتی ہے، اور اس لیے مضطر کے علاوہ کسی حالت میں کسی کے لیے ان کا استعمال درست نہیں۔ اور ان کے علاوہ جن اشیاء کی حرمت ان اشیاء کی حقیقت اور ذات میں نہیں پائی جاتی بلکہ باہر کے اسباب سے حرمت آتی ہے، ان کی ممانعت ''طیب'' کہہ کر کر دی گئی۔ پس جو شی ناحق لی گئی اور صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کی گئی بلکہ سود، رشوت، جوا، ظلم، غصب، دھوکا، خیانت اور چوری جیسے ناپاک ذرائع سے حاصل کی گئی ہے وہ بھی حرام ہے، اس لیے کہ طیب نہیں ہے۔ پس ہر خبیث شی حرام ہے خواہ وہ خبث باہر کے اسباب و ذرائع سے اس میں آیا ہو اور خواہ اس کے اندر موجود ہو جیسا کہ کھانے پینے کی اشیاء میں سڑ کر بو آ جانا۔ (جو کہ جسمانی امراض کا سبب بنتا ہے۔)

(تفسیر المنار: ۱/ ۸۷، بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا حفظ الرحمٰنؒ)

........❖❖❖........

Marfat.com

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت

اسلامی معاشیات کا چوتھا رہنما اصول یہ ہے کہ تمام معاشی معاملات میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی کی جائے اور کوئی معاملہ ایسا نہ کیا جائے جو قانون اسلام کے خلاف ہو۔ یہ ہمہ گیر اصول اسلامی معاشیات کو وہ اعتدال بخشتا ہے جو دنیا کے کسی نظام معیشت کو حاصل نہیں ہے۔ معاشی قوانین میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کس درجہ ضروری قرار دی گئی ہے اس کا اندازہ سود کی حرمت والی آیت سے ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور بقیہ سودی لین دین کو ختم کر دو اگر تم ایمان دار ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے، اور اگر تم باز آ گئے تو اصل سرمایہ تمہارا حق ہے۔ نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم ہو۔''
>
> (بقرہ:۲۷۸)

یہ آیت کریمہ جب نازل ہوئی تو سودی کاروبار مملکت اسلامیہ کی حدود میں ایک فوجداری جرم بن گیا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اسلامی حکومت میں ہر جگہ اعلان کرا دیا کہ جو قبیلہ سودی کاروبار کرے گا اس سے جنگ کی جائے گی۔ اس کے علاوہ اب جس قبیلہ یا جس قوم نے بھی اسلامی حکومت سے صلح کرنی چاہی تو صلح نامے کی ایک دفعہ یہ قرار پائی کہ سودی کاروبار نہیں کرنا ہوگا۔ اگر کسی نے اس دفعہ کی خلاف ورزی کی تو صلح ختم ہو جائے گی اور اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے گا۔ اس شدت کی وجہ یہ ہے کہ کسی قوم یا کسی ملک کی معاشیات کو غارت کرنے والی لعنتوں میں سب سے بڑی لعنت سود

Marfat.com

ہے، اور اللہ جل وعلا شانہ کی عادلانہ حکومت مخلوق پر اس ہولناک ظلم کو کسی طرح برداشت نہیں کرتی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقہ وخیرات کو بڑھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کافر گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔'' (بقرہ:۲۷۶)

اسی مقام پر ایک اور آیت میں سود کی مذمت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چھو کر بدحواس کر دیا ہو، یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی سود ہی کی طرح ہے جب کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا۔ پھر جس شخص کے پاس حق تعالیٰ کی طرف سے نصیحت آ جائے اور وہ سودی کاروبار سے رک جائے تو اس کے گذشتہ اعمال صاف ہو جائیں گے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو گا، مگر جو پھر بھی یہ حرکت کرے گا وہ جہنمیوں کے زمرہ میں شمار ہو گا اور ہمیشہ اسی میں رہے گا۔'' (بقرہ:۲۷۵)

ان چار راہ نما اصولوں پر اسلامی معاشیات کی جو عمارت تیار ہوتی ہے وہ صاف ستھری، مضبوط و مستحکم اور سادہ و دیر پا ہوتی ہے۔ اس کے سایہ میں امیر وغریب، قوی و ضعیف، تاجر وخریدار، آجر ومستأجر اور زمیندار و کاشت کار سبھی امن وچین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے مقاصد زندگی اور مطمح نظر کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ حکومت ان اصولوں سے مستنبط قوانین کی نگران ہوتی ہے۔ وہ اپنے تمام ذرائع اور وسائل ایک طرف تو معاشی لوٹ کھسوٹ اور جبر وستم کو مٹانے پر لگائے رکھتی ہے اور دوسری طرف زندگی کے اسلامی نقطۂ نظر پر ایمان رکھنے والوں کو ان کے مقاصد زندگی کے حصول کی طرف متوجہ رکھتی ہے، اور ان تمام چیزوں کو دور کرنے کی سعی کرتی رہتی ہے جو انسان کو دنیا پرستی کی طرف مائل کرتی ہیں۔

اسلام ایک شہری کو دوسرے شہری پر کسی قسم کے ظلم و جبر اور زیادتی کا حق نہیں دیتا۔ وہ سب کو اپنی حدود میں رکھتا ہے اور اپنی اپنی حدود میں آزادانہ عمل کا اختیار دیتا

ہے۔اسلامی نظام معیشت ہر ہر فرد کے حق کی حفاظت کرتا ہے۔ اس نظام میں ایک بے اثر سے بے اثر آدمی بھی اس لیے با اثر ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کا کوئی حق چھین نہیں سکتا۔ اسلامی نظام معیشت تمام شہریوں کی طبعی ضروریات کا کفیل ہے۔ وہ اگر چہ معاشی مساوات کا چنداں قائل نہیں ہے مگر معاشرتی مساوات کا اس حد تک علمبردار ہے کہ حکومت کی خاص خاص آمدنیاں بلا امتیاز تمام شہریوں پر مساوی طور پر خرچ کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔حکومت اس بات کا خاص خیال رکھتی ہے کہ جو کچھ عوامی فلاح و بہبود اور رفاہ عامہ کے کاموں کے سلسلہ میں اس کے خزانہ (بیت المال) میں جمع ہوا ہے اس کا حصہ سب تک ٹھیک ٹھاک پہنچ جائے۔ کسی طبقہ، گروہ یا فرد کو زیادہ نہ ملے اور نہ ایسا ہونے پائے کہ کوئی اس سے محروم رہ جائے۔اس مقصد کے لیے وہ اپنے انتظامی ڈھانچہ کو خاص انداز میں مرتب کرتی ہے۔

اسلامی نظام معیشت میں انسانی طاقت کا استعمال بھی جائز حدود میں کیا جاتا ہے۔حکومت اپنے کارکنوں پر کوئی بوجھ ان کی طاقت سے زیادہ نہیں ڈالتی نہ وہ کسی دوسرے فرد یا طبقہ کو اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی محنت کا ناجائز استحصال کریں۔

"لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا" اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتا، کا اصول صرف عبادات ہی کی حد تک نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں اس کا یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ اسلام کے ہاں جبری محنت کا طریقہ جرم ہے اور "اتوا کل ذی حق حقہ" (ہر حق دار کو اس کا حق دو) کی ہدایت اسی نظریہ کی مظہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا کوئی نظام ہو یا ہزاروں برس پہلے کا، ہر نظام میں انسانیت دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جس کے پاس طاقت ہوتی ہے، اس کو قانون بنانے کا اختیار ہوتا ہے۔ اس کے پاس سرمایہ ہوتا ہے جس سے وہ انسانی صلاحیتوں کو خرید سکتا ہے اور کاروبار کو اپنی مٹھی میں لے سکتا ہے۔اور دوسرا طبقہ جس میں آبادی کی اکثریت شامل ہوتی ہے، حکومت اور دولت کی طاقت سے محروم ہوتا ہے۔ یہ کیفیت ابتداء سے ہر انسانی نظام میں پائی جاتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس کے ہاتھ

Marfat.com

میں سرمایہ اور طاقت ہوتی ہے وہ اس طبقہ کا استحصال شروع کر دیتا ہے جس کے پاس سرمایہ اور طاقت نہیں ہوتی، اور اس طرح دو طبقے پیدا ہوتے ہیں جن کو اشتراکی اصطلاح میں بورژوا طبقہ اور پرولتاری طبقہ کہا جاتا ہے۔ اشتراکی مفکرین نے اس صورت حال کا علاج یہ سوچا کہ ذرائع وسائل کے اوپر سے افراد کی ملکیت ختم کر کے اسے پوری آبادی کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ مگر جب تمام لوگوں سے ان کی ملکیتیں چھین لی گئیں تو اب اس کے انتظام اور ان کی دیکھ بھال کا سوال پیدا ہوا۔ یہ انتظام کمیونسٹ پارٹی کے حوالہ کر دیا گیا اور پھر وہی پہلی والی صورت پیدا ہوگئی کہ ایک طرف ایک ایسا طبقہ تھا جو حکومت کے اختیارات کے علاوہ سارے ملک کے کاروبار پر تنہا قابض تھا اور دوسری طرف عام آبادی تھی جس کے لیے زندگی کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی کہ پہلا طبقہ جو انتظام کرے اس کے تحت وہ ملازمت قبول کرے۔ چنانچہ بہت جلد پھر وہی دو طبقات معرض وجود میں آگئے جن کو مٹانے کے لیے اشتراکیت میدان میں آئی تھی۔ اس مشکل کا علاج صرف اور صرف یہ ہے:

(1) یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کر دی جائے کہ دنیا کی زندگی محض ایک امتحان ہے۔ اصل زندگی مرنے کے بعد شروع ہونے والی ہے جہاں اس دنیا کی کارگزاری کے مطابق ہر شخص کو مستقل بدلہ دیا جائے گا۔ وہیں کی کامیابی اصل کامیابی ہے اور وہیں کی ناکامی اصل ناکامی۔

(2) دوسرے یہ کہ معاشی معاملات کی تنظیم آدم اسمتھ اور کارل مارکس کے نظریات کے بجائے خدائی ہدایات کے مطابق کی جائے۔ کوئی شخص اتنا علم نہیں رکھتا کہ وہ انسان کی نفسیات اور اجتماعی زندگی کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ یہ اہلیت صرف اسی کو ہے جس نے انسان کو تخلیق کیا ہے۔ جس طرح دنیا میں زندہ رہنے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ فطرت کے قوانین معلوم کر کے ان پر عمل کیا جائے اسی طرح تمدنی اور اجتماعی زندگی کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ قاعدے مقرر کر دیئے ہیں اور ضروری ہے کہ ان پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے ورنہ زندگی کے جس معاملہ میں بھی اس سے

Marfat.com

انحراف کیا جائے گا بجائے سنوار کے بگاڑ کی صورت نمودار ہو جائے گی۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ دونوں اصول معاشی مسئلہ کی اس پیچیدگی کو کس طرح حل کرتے ہیں کہ دولت ایک مخصوص طبقہ میں سمٹنے کے بجائے عام آبادی میں گردش کرنے لگے اور سب کی خوش حالی کا باعث ہو۔

یہ نظریہ آدمی کے اندر اور باہر دونوں طرف سے اثر کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ ایسا ذہن بناتا ہے جس کے بعد دنیا کی اہمیت اس کی نظروں میں کم ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ روزی دینے والا اصل میں وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کے انتظام کے تحت زمین سے غلہ اگتا ہے۔ اس نے اگر صبح مجھے روزی دی ہے تو شام کو بھی ضرور دے گا، اور شام کو دی ہے تو صبح کو بھی وہی دینے والا ہے۔ پھر میں آخر کیوں دولت کے انبار لگاؤں۔ وہ دنیا میں اپنے آپ کو مسافر سمجھنے لگتا ہے جو موت کے بعد آنے والی زندگی کی طرف بڑھ رہا ہو۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ مسافر خانہ کے اس چند روزہ قیام کے لیے کیا سامان اکٹھا کرے۔ سامان تو دراصل آخرت کی زندگی کے لیے جمع کرنا چاہیے جہاں مستقل طور پر رہنا ہے۔ یہ نظریہ دنیا کی نعمتوں کو اس کی نظر میں بالکل ہیچ بنا دیتا ہے۔ جو کچھ اسے حاصل ہے اس کو وہ خرچ کرنے میں تامل نہیں کرتا اور جو کچھ حاصل نہیں ہے اس کے لیے کوئی حرص اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ پھر یہ نظریہ اس کو بدعنوانیوں سے بچاتا ہے کیونکہ اس کے خداوند جمہور نہیں ہوتے جن کو ساری بدعنوانیوں کے بعد محض ایک بیان کے ذریعہ مطمئن کیا جا سکتا ہو۔ نہ وہ محض انسانی پولیس کو اپنا نگران سمجھتا ہے جس کو رشوت دے کر چپ کرایا جا سکتا ہو۔ وہ ایسے خدا پر یقین رکھتا ہے جو زبردست طاقتوں کا مالک ہے اور آدمی کے تمام کھلے اور چھپے حالات کا جاننے والا ہے۔ خدا کی گرفت کا ذکر اسے ناجائز نفع کمانے سے روکتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ دوسروں کا حق مارنے کے بجائے لوگوں کا حق انہیں پہنچائے۔

دنیا کی بے ثباتی اور بے مائیگی:

سرکار دو عالم ﷺ نے عملی طور پر بھی اور اپنے ارشادات عالیہ کے ذریعہ بھی اس نظریہ کو مسلمانوں کے قلوب میں راسخ کرنے کی کوشش فرمائی، اور قرآن حکیم نے بھی

Marfat.com

اس نظریہ پر سارا زور بیان صرف کیا ہے، اور بتایا کہ سکون و اطمینان، خوش حالی و فارغ البالی کی خاطر یا دولت کے انبار لگانے، عیاشی، تن آسانی کے لیے جھوٹ، فراڈ اور غلط طریقوں سے دولت اکٹھی کرنی ایک جرم ہونے کے علاوہ ایک بے حقیقت اور فرد مایہ کام ہے۔ اتراف، تعیش پسندی اور تن آسانی کے لیے اپنا دن رات صرف کرنا اور دنیوی زندگی میں منہمک ہو جانا جس کو قرآن و حدیث نے ''حب الدنیا'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اپنی زندگی کو فضول کاموں میں ضائع کرنا ہے کیونکہ یہ دنیا جس کو بنانے کے لیے ہم سارا دن ڈھور ڈنگروں کی طرح مصروف رہتے ہیں، صرف چند روزہ ہے۔ ادھر سانس کی ڈوری ختم ہوئی ادھر انسان کا رشتہ اس دنیا سے ایسا منقطع ہوتا ہے جیسے نہ کبھی وہ اس دنیا میں آیا تھا اور نہ کوئی تعلق اس کا اس دنیا سے رہا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ نے فرمایا:

> ''اے لوگو! دنیا ایک وسیع و عریض ساز و سامان کا نام ہے۔ اس میں سے نیک و بد دونوں کھاتے ہیں، اور آخرت کا وعدہ سچا ہے۔ جس روز انصاف کرنے والا اور قادر و توانا بادشاہ فیصلہ کرے گا، وہ حق کا اثبات کرے گا اور باطل کو غلط ثابت کر دکھائے گا۔ آخرت کے فرزند بنو، دنیا کے بیٹے نہ بنو (کونوا من ابناء الاخرۃ ولا تکونوا من ابناء الدنیا) کیونکہ جو جس ماں کا بیٹا ہوگا وہ اس کے پیچھے چلے گا۔'' (حلیۃ الاولیا لابی نعیم: ۱۲۶/۴)

ایک اور روایت میں ارشاد فرمایا:

> ﴿کن فی الدنیا کانک غریب أو عابر سبیل﴾
>
> ''دنیا میں اس طرح رہو جیسے پردیسی ہو یا راستے سے گزرنے والا مسافر ہو۔''

سرکار دو عالم ﷺ کا اپنا عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ مشہور صحابی اور سنت نبوی کے سب سے بڑے عالم سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت ایک چٹائی پر استراحت

Marfat.com

فرما رہے تھے جس کے نشانات آپ کے پہلوؤں پر نمایاں تھے۔ میں نے (یہ نشان دیکھ کر) عرض کی: ''یا رسول اللہ! ہم آپ کے لیے ایک گدا نہ بنا دیں؟'' آپ نے ارشاد فرمایا: ''میرا دنیا سے اور دنیا کا مجھ سے کیا تعلق؟ میں تو اس اونٹ کے سوار کی مانند ہوں جو کسی درخت کے نیچے ستانے کے لیے رکا اور پھر چھوڑ کر چل دیا۔'' (ترمذی)

اس نظریہ کو ماننے کا نتیجہ تھا کہ قرون اولیٰ کے مسلمان اپنی دن بھر کی کمائی شام کو یا تو خرچ کر دیتے تھے یا پھر اسے فقراء و مساکین پر صدقہ کر دیتے تھے، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ جس نے آج دیا ہے وہی کل بھی دے گا۔ ان کی نظروں میں دنیا اتنی ہیچ ہوگئی تھی کہ اس کے سمیٹنے کو وہ وقت ضائع کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ اگر ان کے پاس زیادہ دولت ہو جاتی تھی تو وہ پریشان ہو جاتے تھے کہ کہیں یہ آخرت کی طرف سے غافل نہ کر دے، اور انہیں اطمینان اس وقت ہوتا تھا اور چین اس وقت آتا تھا جب وہ اس دولت کو دوسروں میں بانٹ کر ختم کر دیتے تھے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ان کے پیش نظر تھی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاکیزہ سیرت کے نقوش ابھی تک ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے تھے۔ ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور نبی اکرم ﷺ رات کو بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور نہایت بے چینی سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ میں نے پریشانی خاطر کا باعث پوچھا تو ارشاد فرمایا:

''سات دینار کے سبب سے جو ہمارے پاس شام کو آئے تھے۔
رات ہوگئی ہے اور ہم انہیں خرچ نہیں کر پائے۔''

سرکار دو عالم ﷺ کے تربیت یافتہ لوگوں کا یہ مقدس گروہ جن کو قرآن حکیم نے ''کنتم خیر امۃ'' کا خطاب دیا اور ''رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ'' کی سند عطا فرمائی۔ اور جن کے بارہ میں فرمایا:

﴿اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقویٰ﴾ (الحجرات:۳)

''اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب کا امتحان کر لیا تھا تقویٰ کے معیار پر یعنی ان کے قلوب کو پرکھ لیا تھا اور یہ اس امتحان میں کامیاب و کامران نکلے۔''

پھر انہی کے بارہ میں ''الراشدون'' بھی کہا گیا یعنی وہ رشد و ہدایت کے پیکر تھے جن کی اتباع سے ہدایت نصیب ہوتی تھی بلکہ یہ لوگ ہدایت کی روشنی کے مینار تھے۔ ان کو دیکھ کر لوگ اپنی ہدایت کی راہیں منتخب کرتے تھے۔ پھر ان کے لیے ''فوز عظیم'' مژدہ بھی سنایا۔ اس مقدس اور راشد گروہ کا ہر فرد سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے اس ارشاد گرامی کا حقیقی مصداق ہے:

''جو شخص کسی کی پیروی کرنا چاہے اسے چاہیے کہ وہ فوت شدہ لوگوں کی پیروی کرے کیونکہ زندہ کو فتنہ سے محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ فوت شدہ حضرات اصحاب محمد ﷺ ہیں جو اس امت میں سب سے افضل تھے، ان کے دل نیک تھے، ان کا علم گہرا تھا وہ تکلف سے بہت دور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی کی صحبت اور اس کے دین کی اقامت کے لیے چن لیا تھا۔ ان کی فضیلت کو پہچانو۔ ان کے نقش پا کی پیروی کرو اور جہاں تک ہو سکے ان کے اخلاق اور ان کی عادات سے سند پکڑو۔ بے شک وہ سیدھی راہ پر تھے۔

(مشکوٰۃ: ص۳۲)

یہ لوگ حرام سے تو خیر بچتے ہی تھے مشتبہات سے بھی اپنے دامن کو آلودہ نہیں ہونے دیتے تھے، اس لیے کہ ان کے محبوب راہ نما اور معلم انسانیت ﷺ نے انہیں سختی سے اس سے روک دیا تھا آپ نے فرمایا تھا:

''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جن سے اکثر لوگ آشنا نہیں۔ پھر جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچا رہا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا، اور جو ان مشتبہ چیزوں میں پڑ گیا وہ حرام کا شکار ہو گیا جیسے چرواہا جو سرکاری چراگاہ کے قریب اپنا ریوڑ چرا رہا ہو تو ہر وقت یہ خطرہ رہتا ہے کہ اس کے جانور چراگاہ میں چلے جائیں گے۔ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور زمین میں اللہ کی چراگاہ اس کے

Marfat.com

محرمات ہیں۔ یاد رکھو، جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ اگر وہ درست ہو گیا تو سارا جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور یاد رکھو وہ دل ہے۔ (بخاری ۱/۴۱)

یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ دوسروں کی حق تلفی اور ناجائز انتفاع اور رشوت کے کسی دنیٰ طور طریقے سے بھی سخت اجتناب واحتراز کرتے تھے کیونکہ انہیں یہ ڈر دامن گیر رہتا تھا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچ سکیں گے، اور آخرت کی زندگی میں جو مستقل اور دائمی ہے، ان کا کہیں ٹھکانا نہیں رہے گا۔ وہ تاجر ہوتے تھے تو دیانت دار تاجر ہوتے تھے، وہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر نفع کمانے کا تصور تک بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کو حکومت ملتی تھی تو وہ بڑی بڑی تنخواہیں اور الاؤنس نہیں لیتے تھے بلکہ عام انسانوں کی طرح ان کے درمیان بالکل انہی کے انداز میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جب انہیں کسی آبادی کا حکمران بنایا جاتا تو وہ یہ نہیں کرتے تھے کہ لوگوں سے ٹیکس وصول کر کے اپنے لیے عظیم الشان محل تعمیر کروائیں، گورنمنٹ ہاؤس بنوائیں اور اس طریقہ سے ٹیکسوں کی ساری رقم صرف کر دیں بلکہ عوام سے وصول کی ہوئی دولت کو وہ عوام ہی کی طرف واپس کر دیتے تھے۔ ان واقعات سے صحابہ کرام کی زندگی کی کتاب بھری پڑی ہے۔

سیدنا طلحہ بن عبیداللہؓ کو اللہ تعالیٰ نے بہت مال و دولت سے نوازا تھا لیکن وہ اس کے ساتھ اقلیم سخاوت کے بھی شہنشاہ تھے۔ فقراء و مساکین اور اہل حاجت کے لیے ان کے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ قیس بن حازمؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے طلحہؓ سے زیادہ کسی کو بے طلب کی بخشش میں پیش پیش نہیں دیکھا۔ (فتح الباری: ۷/۶۶)

یہی بات قبیصہ بن جابرؒ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں سیدنا طلحہؓ کی صحبت میں رہا

﴿فما رایت اعطی الجزیل مال من غیر مسئلة منه﴾

(طبقات ابن سعد: ۳/۱۵۷، حلیۃ الاولیاء: ۱/۸۸، الاصابہ: ۵/۲۳۵)

ایک مرتبہ آپ نے اپنی جائداد کا کچھ حصہ سات لاکھ درہم میں فروخت کیا اور وہ ساری رقم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں تقسیم کر دی۔ ایک مرتبہ آپ کی اہلیہ محترمہ نے فرمایا

Marfat.com

کہ ایک روز سیدنا طلحہؓ گھر آئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت غمگین اور مضطرب ہیں
پوچھا: ''کیا ہوا؟'' آپ اس قدر اداس کیوں ہیں؟ کیا مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوگئی؟
فرمایا: ''نہیں، تم تو نہایت اچھی بیوی ہو، اصل بات یہ ہے کہ میرے پاس بہت سا مال
ہوگیا ہے، اسی کی فکر تھی کہ کیا کروں؟'' میں نے کہا: ''اس میں فکر کی کون سی بات
آپ اسے غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دیں۔'' میرے منہ سے یہ بات سن کر اسی وقت
خادمہ کو بلایا اور چار لاکھ کی رقم غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دی۔

(معجم کبیر طبرانی رقم: ۱۹۵، حلیۃ الاولیاۃ: ۱/ ۱۸۸، طبقات ابن سعد: ۳/ ۱۵۷، مجمع الزوائد: ۹/ ۸

روایات میں ہے کہ سیدنا طلحہؓ بنی تیم کے تمام تنگ دست خاندانوں کی کفالت
فرماتے تھے اور اگر کوئی مقروض ہوتا تو اس کا قرض ادا فرماتے۔ چنانچہ صبیحہ التیمی پر تیس
ہزار کا قرض تھا جو آپ نے اپنی جیب خاص سے ادا کیا۔ (طبقات ابن سعد: ۳/ ۱۵۷)

آپ کے صاحبزادے موسیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرموت سے
آپ کے پاس سات لاکھ درہم آئے۔ آپ نے پوری رات کروٹیں بدلتے گزاری
آپ کی اہلیہ نے پوچھا: ''کیا بات ہے؟ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' کہا: ''اللہ کی
بندی! میں تو رات سے پریشان ہوں کیونکہ اس بندہ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کیا کہیں گے
جس کے گھر میں رات بھر اتنا مال رہے؟'' آپ کی اہلیہ نے کہا: ''اس میں فکر کی کون سی
بات ہے؟'' آپ اس کو غرباء اور فقراء میں تقسیم فرما دیں۔'' آپ نے فرمایا: ''تو بڑی
نیک ہے اور نیک شخص کی بیٹی ہے (آپ کی یہ اہلیہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی ام
کلثومؓ تھیں) تو نے تو میری پریشانی دور کر دی۔'' چنانچہ جب صبح ہوئی تو آپ نے تھیلے
بھر بھر کر مہاجرین اور انصار میں اس مال کو تقسیم کر دیا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ نے کہا:
''ہمارے لیے اس مال میں سے کچھ نہیں؟'' فرمایا: ''اللہ کی بندی! تو سارا دن کہاں تھی
اب صرف یہی کچھ بچا ہے۔'' آپ کی اہلیہ فرماتی ہیں کہ آپ نے مجھے ایک تھیلی دی جس
میں ایک ہزار درہم تھے۔'' (سیر اعلام النبلاء: ۱/ ۳۱)

بعض روایات میں ہے کہ ایک پہاڑ کے ایک طرف ایک کنواں تھا اور وہاں
بکرے اور دوسرے جانور ذبح کر کے لوگوں کو کھانا کھلایا۔ کنواں خرید کر وقف کر دیا

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے یہ عمل دیکھ کر فرمایا: "انت طلحة الفياض"

(مجمع الزوائد: ۹/ ۱۴۸، الاستیعاب: ۵/ ۲۳۵، الاصابہ: ۵/۲۳۲)

سیدنا زبیر بن العوامؓ بھی نہایت فیاض اور سخی تھے اور انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ویسے تو ہر صحابی فیاضی اور انفاق فی سبیل اللہ میں پیش پیش تھا، لیکن سیدنا زبیرؓ کی اس صفت میں ایک خصوصیت تھی۔ آپ کے پاس ایک ہزار غلام تھے۔ وہ روزانہ اجرت پر کام کر کے ایک بہت بڑی رقم لاتے تھے لیکن تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ اس مال میں سے آپ نے ایک حبہ بھی اپنی ذات پر اور اپنے اہل وعیال پر کبھی صرف نہ کیا تھا بلکہ جو کچھ آتا وہ اسی وقت اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کر دیا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ آپ نے اپنا مکان چھ لاکھ میں فروخت کیا۔ کسی نے کہا کہ آپ نے زیادہ قیمت لی ہے۔ فرمایا ہرگز نہیں اور ساری کی ساری رقم اللہ کے راستے میں خرچ کر دی۔

(سیر اعلام النبلاء: ۱/ ۵۷)

سیدنا عثمان بن عفانؓ نے غزوہ تبوک میں ایک تہائی فوج کے جملہ اخراجات تنہا برداشت کرنے کا ذمہ لیا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے نو سو اونٹ، ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار نقد دیئے۔ ایک ہزار دینار جب آپ ﷺ کی جھولی میں سیدنا عثمانؓ نے ڈالے تو راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ بہت خوش ہوئے۔ آپ ان دیناروں کو اپنے ہاتھوں میں اچھالتے اور خوشی وانبساط سے فرماتے: "آج کے بعد عثمانؓ کو کوئی کام نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔" پھر فرمایا: "اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہو گیا تو بھی اس سے راضی ہو جا۔" (فتح الباری: ۷/ ۴۴، زرقانی: ۳/۱۶۴)

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ عشرہ مبشرہ کے صحابی تھے۔ آپ کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ مکہ مکرمہ میں بھی آپ تجارت کرتے تھے اور جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہاں بھی تجارت ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کاروبار میں بڑی برکت دی تھی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں اگر پتھر بھی اٹھاتا ہوں تو اس کے نیچے سے بھی سونا نکل آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خیبر میں ایک وسیع جاگیر بھی عطا

Marfat.com

فرمائی تھی۔ آپؓ نے خود بھی قابل زراعت زمین خریدی اور کاشت کاری شروع کر دی تھی۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ ضرف "جرف" کے کھیتوں میں بیس اونٹ آب پاشی کا کام کرتے تھے۔ (الاستیعاب:۲/۴۰۳)

اللہ تعالیٰ نے ڈھیروں دولت دی تھی اور ڈھیروں ہی انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کی جو کہ آپ کی سخاوت اور فیاضی پر دال ہے۔ ایک مرتبہ ان کا تجارتی قافلہ مدینہ طیبہ آیا۔ اس میں سات سو اونٹوں پر صرف گیہوں، آٹا اور دوسری اشیائے خوردنی لدی ہوئی تھیں (سبع مأة راحلة تحمل البر والدقيق والطعام) جب وہ عظیم الشان قافلہ مدینہ طیبہ میں داخل ہوا تو پورے مدینہ میں اس کا شور وغل پڑ گیا۔ جب ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا کو اس قافلے کا علم ہوا تو فرمایا: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

﴿عبدالرحمن لا يدخل الجنة الا حبواً﴾
"عبدالرحمٰن جنت میں رینگتے ہوئے جائیں گے۔"

جب سیدنا عبدالرحمٰن کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو سیدہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی:

﴿يا امه! اشهدك انها بأحمالها واحلاسها فى سبيل الله﴾
"اے اماں! میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ اونٹوں کا پورا قافلہ مع اسباب وسامان بلکہ اونٹ اور کجاوہ تک اللہ کے راستہ میں وقف کرتا ہوں۔"

(مسند احمد بن حنبل:۶/۱۱۵، حلیۃ الاولیاء:۱/۹۸، طبقات ابن سعد:۳/۹۳، اسد الغابہ:۳/۳۱۶)

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف نے سرکار دو عالم ﷺ کے عہد مبارک میں نصف مال چار ہزار درہم اللہ کے راستے میں صدقہ کیے۔ پھر چالیس ہزار دینار صدقہ کیے اور پانچ سو گھوڑے مع سامان اور پانچ سو اونٹ اللہ کے راستہ میں تقسیم کیے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ "كان عامة ماله من التجارة" آپ کا عام مال تجارت کی وجہ سے تھا۔

Marfat.com

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ایک مرتبہ سیدنا عثمانؓ کو چالیس ہزار دینار میں ایک قطعہ اراضی فروخت کیا اور وہ ساری رقم بنوزہرہ کے فقراء اور مہاجرین و انصار اور امہات المومنینؓ میں تقسیم کر دی۔ مسورؓ کہتے ہیں کہ میں سیدہ عائشہؓ کا حصہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سیدہ عائشہؓ نے پوچھا: ''یہ رقم کس نے بھیجی ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے۔'' سیدہؓ نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے: ''میرے بعد وہی لوگ تم پر مہربانی کریں گے جو صابر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ابن عوفؓ کو جنت کے چشمہ سلسبیل سے پانی پلائے۔

(مسند احمد: ۴/۱۰۴، مستدرک حاکم: ۳/۳۱۰)

عروہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبدالرحمٰنؓ نے پچاس ہزار دینار اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کی وصیت فرمائی اور ہر ایک آدمی کو ایک ہزار دینار دیا گیا۔

زہریؒ کہتے ہیں کہ سیدنا عبدالرحمٰنؓ نے اصحاب بدر کے لیے وصیت فرمائی۔ اس وقت سو بدری صحابی مدینہ طیبہ میں موجود تھے جن میں سے ہر ایک کو چار چار سو دینار ملے۔ سیدنا عثمان بن عفانؓ بھی ان میں سے ایک تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱/۹۰)

ازواج مطہرات کی خدمت کو وہ اپنا سرمایۂ زندگی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ازواج مطہرات کے لیے ایک باغ کی وصیت فرمائی جو چار لاکھ میں فروخت کیا گیا۔

(مستدرک حاکم: ۳/۳۱۱، ترمذی روایت نمبر: ۳۷۵۰)

اس سے قبل بھی ازواج مطہرات کو بڑی بڑی رقوم پیش کیں۔ ایک دفعہ ایک جائداد امہات المومنینؓ کو پیش کی جو چالیس ہزار دینار میں فروخت ہوئی۔

یہ صرف چند صحابہ کرامؓ کے انفاق فی سبیل اللہ کے واقعات ہم نے ذکر کیے۔ ان واقعات پر تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے قلوب سے مال کی محبت نکال ہی دی ہوئی تھی۔ ان میں کسب مال تو تھا حب مال نہ تھا کیونکہ حب مال ہی ہر گناہ کی جڑ ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر صحابہ کرامؓ نے ڈھیروں مال کمایا لیکن ڈھیروں ہی غرباء اور فقراء پر خرچ کر دیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مدینہ میں کوئی شخص زکوٰۃ قبول کرنے والا نہیں تھا۔ یہی حال اسلامی ریاست کے دوسرے حصوں میں تھا۔

Marfat.com

چنانچہ ایک حدیث میں سیدنا عدیؓ بن حاتم فرماتے ہیں کہ میں سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ دفعتاً ایک شخص آیا اور اس نے بارگاہ رسالت میں تنگ دستی اور قلاشی کی شکایت کی۔ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے رہزنی اور راستوں کے غیر مامون ہونے کی شکایت کی۔ ان دونوں کی شکایات سن کر سرکار دو عالم ﷺ نے سیدنا عدیؓ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: ''تم نے حیرہ دیکھا ہے؟'' سیدنا عدیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی: ''دیکھا تو نہیں البتہ اس کے حالات سنے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ ایک ہودج نشین عورت حیرہ سے چل کر مکہ آئے گی اور یہاں کعبہ کا طواف کرے گی اور سوائے اللہ تعالیٰ کے اس کے دل میں کسی اور کا ڈر و خوف نہ ہو گا۔ سیدنا عدیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا کہ قبیلہ طے کے ڈاکو جنہوں نے شہروں میں لوٹ مار کی آگ لگا رکھی ہے یہ بھلا کہاں چلے جائیں گے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم زندہ رہے تو تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے۔ میں نے ازراہ تعجب پوچھا کہ ''کسریٰ بن ہرمز بادشاہ کے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں کسریٰ بن ہرمز کے۔'' پھر فرمایا کہ اگر تم نے کچھ اور طویل زندگی پائی تو دولت کی فراوانی کا وہ دور بھی دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر کر سونا یا چاندی اس نیت سے لے کر نکلے گا کہ کوئی اس کو قبول کرلے لیکن کوئی اسے قبول کرنے والا نہ ملے گا۔''

سیدنا عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے ارشاد فرمودہ پیش گوئی سے میں نے امن کا وہ دور دورہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مقام حیرہ سے ہودج نشین عورت سفر کر کے آتی ہے اور کعبہ کا طواف کر کے واپس چلی جاتی ہے اور راستہ میں اس کو اللہ کے سوا کسی اور کا خوف نہ ہوتا۔ اور کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کرنے والوں میں تو میں خود بھی شریک تھا۔ اور اگر تمہاری عمر ہوئی یعنی جو لوگ زندہ رہیں گے وہ تیسری بات جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی، وہ بھی دیکھ لیں گے یعنی مال کی وہ کثرت ہوگی کہ آدمی اپنی مٹھی بھر سونا یا چاندی لے کر گھر سے چلے گا تو اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ ملے گا۔

(بخاری: ۱/۵۰۷، البدایہ والنہایہ: ۶/۱۸۸، شرح السنہ: ۴۵)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ مال کی اس قدر کثرت والی پیش گوئی

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد خلافت میں پوری ہوگئی۔'' (الجواب الصحیح:۴/۱۴۳)

مطالعہ دنیا کی اصل علت

صحابہ کرامؓ کے جو واقعات سطور بالا میں ذکر کیے گئے ہیں یہ ظاہری نگاہ میں نہایت عجیب وغریب نظر آتے ہیں کیونکہ موجودہ دور میں اور اس سے پہلے بھی جس قدر لوگ غریبوں کی حمایت میں اٹھے انہوں نے لوگوں (یعنی طبقہ امراء) سے دولت چھین چھین کر غریبوں کو تو نہیں دی البتہ ان چند لوگوں کے حوالے کی جنہوں نے بعد میں بہت بڑے سرمایہ دار کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن صحابہ کرامؓ نے اپنی مرضی اور خوشی سے، کسی کے دکھلاوے کے نہیں بلکہ اللہ کی رضا کے لیے اپنی دولت دونوں ہاتھوں سے غرباء اور مساکین میں تقسیم کی اور دولت کے احتکار واکتناز کے بجائے اس کو پوری سوسائٹی میں منتشر کیا اور دولت کی گردش سے سوسائٹی میں خوش حالی آئی اور اب کوئی خیرات وزکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ دولت کی فراوانی تو آج بھی بہت ہے لیکن یہ چند ہاتھوں میں آکر رک گئی ہے، پھر اتنی دولت ہونے کے باوجود ابھی بھی ان کے دلوں میں سیری کے جذبات نہیں پیدا ہوئے اور آج بھی اگر کوئی اعلان کر دے کہ میں نے اپنی زکوٰۃ تقسیم کرنی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے سرمایہ دار جو زکوٰۃ کے قطعاً مستحق نہیں ہے وہ بھی زکوٰۃ لینے والوں کی قطار میں جا کر کھڑے ہو جائیں گے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دولت کی ہوس کا جذبہ اپنے پورے شباب پر ہے اور اتنی دولت ہونے کے باوجود بھی دلوں میں سیری پیدا نہیں ہوئی۔ حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کا ملفوظ ہے۔ فرماتے ہیں کہ دولت کی ہوس سمندر کا پانی پینے کے مترادف ہے۔ سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے جتنا پیو اتنی ہی زیادہ پیاس لگتی ہے۔ پیاس ختم نہیں ہوتی۔ اسی طرح جن دلوں میں حب دنیا کا جذبہ اٹھکیلیاں لیتا ہے، ان کے پاس جتنا بھی مال آجائے وہ کم ہوتا ہے۔ ان کی سیری نہیں ہوتی۔ وجہ یہی ہے کہ دلوں کی دنیا سنوری نہیں۔ وہ اپنے مالوں میں صرف اپنا حق سمجھتے ہیں، غرباء اور مساکین کا حق نہیں سمجھتے اور قرآن کہتا ہے:

''جو لوگ رات کو بہت کم سوئیں، اوقات سحر میں اپنے گناہوں کی

معافی مانگتے رہیں، جن کے مالوں میں سائل کا بھی حق ہے اور اس کا بھی جو محروم ہے (مگر سوال نہیں کرتا)'' (ذاریات: ۱۷-۱۹)

ایک اور مقام پر فرمایا:

''جو یتیم، مسکین اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ایسی حالت میں کہ جب کھانا خود ان کو محبوب ہو (وہ خود ضرورت مند ہوں اور نیت یہ ہو کہ) ہم صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ تم سے (بھوکوں اور ضرورت مندوں سے) نہ اس کا کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔'' (الدھر: ۹)

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ بخل اور سخاوت فطرت انسانی کی دو خصلتیں اور دو وصف ہیں۔ ان کی کچھ خصوصیات اور کچھ لوازم و تاثیرات ہیں۔ بخل کے لیے حرص، طمع، تنگ نظری، خود غرضی، بزدلی، بے رحمی اور سنگ دلی لازمی صفات ہیں، جن کے نتیجے میں ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، رشوت، خیانت اور سود و قمار جیسے زہریلے اور انسانیت کش جراثیم پیدا ہوتے ہیں جو عوام کی خوش حالی اور انسانیت کو ڈستے ہیں اور ان میں بے اطمینانی اور پریشان حالی کا زہر پھیلا دیتے ہیں، بخل کے مقابلہ میں سخاوت اور فیاضی جو دل کی بہادری اور حوصلہ کی بلندی چاہتی ہے۔ طبیعت میں بے نیازی پیدا کرتی ہے دوسروں کی ضرورتوں کا احساس ان کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا سخاوت اور جود و کرم کی اصل روح ہے۔ یہ روح جب کارفرما ہوتی ہے تو ہمدردی، غم خواری، رحم، خدمت خلق کے جوہر جلوہ گر ہوتے ہیں یعنی انسانیت کا جوبن نکھرتا ہے، شرافت کا جھنڈا بلند ہوتا ہے، میل ملاپ اور محبت کی فضا ہموار ہوتی ہے۔ سخاوت اگر کارفرما ہو تو طبقاتی جنگ کی نوبت ہی نہیں آتی کیونکہ دولت مند طبقہ غرباء اور مساکین کا ہم درد و غم گسار ہے اور غریب و نادار اس کے وفادار اور جانثار ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح ایک ایسا نظم و ضبط قائم ہو جاتا ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہوتا ہے اور جو معاشرہ اور سماج کو اطمینان کی دولت بخشتا ہے جس سے ایک دوسرے سے نفرت اور بغض نہیں بلکہ محبت باہمی اعتماد کی نعمت میسر آتی ہے۔ اور جب محبت اور اعتماد و تعاون کی کلیاں چٹختی ہیں

Marfat.com

معاشرہ اور سماج رواداری اور شریفانہ اخلاق کا گلدستہ بن جاتا ہے۔ اسلام ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ جس طرح بخل کے نتائج یعنی ذخیرہ اندوزی، افراط زر کی ہوس اور سود وغیرہ انسانوں کی خوش حالی کو ڈستے ہیں تو اس کا اثر یہی ہوگا کہ وہ سرمایہ جو بخل کا معمل ہے، خود ایک اژدہا بن جائے گا جو صاحب دولت کے گلے کا طوق بن کر اس کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیری دولت،

دولت کے سمٹاؤ کا اصل محرک یہ ہے کہ آدمی زندگی کی کامیابی اسی کو سمجھتا ہے کہ اس کے پاس کوٹھی، جائداد اور بنک بیلنس ہو۔ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا کوئی مصرف اس کے سوا اسے معلوم نہیں ہوتا کہ دنیا کے لذتیں حاصل کرنے میں اسے لگایا جائے۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ کسی کے پاس سرمایہ اکٹھا ہو جاتا ہے تو اس کے خرچ کرنے کو وہ نقصان کا باعث سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک فائدہ کی صورت صرف یہ ہے کہ سرمایہ کو مزید سرمایہ اکٹھا کرنے کا ذریعہ بنائے۔ اس طرح سے تقسیم دولت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور دولت کی گردش رک جاتی ہے۔ جو محروم رہ جاتا ہے وہ دن بدن اور زیادہ محروم ہوتا چلا جاتا ہے، اور جو خوش حال ہوتا ہے وہ اور زیادہ خوش حال ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ کچھ لوگوں کے پاس تو بے حساب دولت اکٹھی ہو جاتی ہے اور اکثر و بیشتر آبادی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی معمولی ضروریات بھی فراہم نہیں کر سکتی۔

دولت کے سمٹاؤ کو صرف یہ نظریہ روک سکتا ہے کہ آدمی اس دنیا کے بعد آنے والی زندگی پر یقین کرے اور اس احساس کے ساتھ زندگی گزارے کہ یہ دنیا اکٹھا کرنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ آخرت کے لیے خرچ کرنے کی جگہ ہے۔ اسلامی تاریخ اس قسم کی بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن ملکوں میں اسلامی نظام قائم ہوا وہاں سے غریبی کا نام ونشان مٹ گیا یا کم از کم غریبی کا احساس ختم ہو گیا۔

Marfat.com

اسلامی معیشت کا اجتماعی نظام

گذشتہ صفحات میں اسلام کے اجتماعی معیشت واقتصاد کے بارہ میں جو بحث کی گئی ہے وہ انفرادی معیشت کے بارہ میں ہے۔ اجتماعی نظام معیشت کے بارہ میں اسلام نے جو خاکہ پیش کیا ہے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصہ جس کا تعلق اسلامی ریاست سے ہے اور دوسرا وہ حصہ جو پبلک سیکٹر اور جماعت کے اعمال کے ذریعہ اسلامی ریاست سے متعلق ہے۔

جس حصہ کا تعلق ایک اسلامی ریاست سے ہے اس کے عنوانات درج ذیل ہیں:

1- بیت المال کا قیام
2- اعداد وشمار کا انتظام
3- وسائل معیشت کی توسیع
4- وظائف کا تقرر
5- انفرادی ملکیت کی تحدید
6- سرمایہ اور محنت میں توازن کے اصول
7- زمین سے متعلق احکام

اور جس حصہ کا تعلق پبلک اور جماعت کے ذریعہ ایک اسلامی ریاست سے ہے وہ یہ ہیں:

1-	صدقات نافلہ	2-	اوقاف	3-	ہبہ
4-	وصیت	5-	قرض حسنہ	6-	عاریت
7-	امانت				

بیت المال:

بیت المال ایک اسلامی ریاست کا نہایت اہم ادارہ ہے۔ یہ ادراہ حکومت کے آمدوخرچ اور عوام کی معاشی خوش حالی کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ جس طرح ایک اسلامی ریاست میں حاکمیت کا تصور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے اور اسلامی ریاست کا صدر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے یہی تصور بیت المال پر بھی لاگو ہوتا ہے کہ بیت المال کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور صدر ریاست اسلامی اس کا امین اور کسٹوڈین ہوتا ہے اور وہ ایک امین کی حیثیت سے اس امانت کی حفاظت اور نگہداشت کرتا ہے اور اس میں سے جو اخراجات کیے جاتے ہیں ان کو بھی نہایت سوچ سمجھ کر خرچ کرتا ہے تا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو ہو سکے۔

بیت المال کا لفظی معنی تو ''دولت کا گھر'' ہے لیکن شریعت کی اصطلاح میں یہ اسلامی ریاست کے خزانہ کو کہتے ہیں۔ ایک اسلامی ریاست میں ''بیت المال'' کا وجود نہایت ضروری ہے۔ چونکہ اس میں مال جمع ہوتا ہے لہٰذا اس کا کسی محفوظ مقام پر ہونا ضروری ہے۔ کبھی کبھی بیت المال کا اطلاق ایک اسلامی ریاست کے پورے مالی نظام پر بھی ہوتا ہے لیکن عام اصطلاح میں یہ ایک مرکزی خانہ ہوتا ہے جس کو موجودہ اصطلاح میں اسٹیٹ ٹریژری (State Treasurey) یا اسٹیٹ بنک کہا جا سکتا ہے۔ مرکزی بیت المال کی صوبہ وار شاخیں بھی ہوتی ہیں اور ضلعی ضروریات کے لیے ضلعی شاخیں ہونا بھی ضروری ہیں۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کے لیے بیت المال کا ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ حکومت کا کوئی کام خزانہ کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اسی وجہ سے جب مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس کے ساتھ ہی بیت المال بھی قائم ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب زمام خلافت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ میں آئی اور سلطنت کی حدود میں وسعت اور پہنائیوں میں اضافہ ہوا اور مال غنیمت میں عراق اور شام سے ڈھیروں دولت آنا شروع ہوئی تو بیت المال میں بھی اضافہ ہوا۔

Marfat.com

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایک اسلامی حکومت آمدنی کے حساب کے مطابق خرچ کرتی ہے جب کہ غیر اسلامی حکومت خرچ کا تخمینہ پہلے لگاتی ہے اور آمدنی کا بعد میں۔ چنانچہ آمدنی اگر کم ہو تو پھر ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور لوگوں کا خون نچوڑ کر ملک کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور بعض دفعہ غریب لوگ ان ٹیکسوں کے بار گراں سے کراہ اٹھتے ہیں اور کارکنان حکومت اپنی عیاشیوں کے لیے ان کی جیبوں سے مقناطیس کی طرح مال کھینچتے رہتے ہیں۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ جو اسلامی ریاست کے رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے پہلے سربراہ تھے، انہوں نے اپنا وزیر خزانہ سیدنا ابوعبیدہؓ کو بنایا۔ سیدنا ابوعبیدہؓ بیت المال کی کل آمدنی اور اس کے تمام اخراجات کا پورا پورا حساب رکھتے تھے۔ چنانچہ سیدنا ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد سیدنا عمرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے وزیر خزانہ کو بلا کر بیت المال کی آمدنی کے بارہ میں پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ دو لاکھ دینار سیدنا ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں آئے جو سارے کے سارے خرچ کر دیئے گئے، اور اب صرف ایک دینار بیت المال میں موجود ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۳/۱۳۶)

بعض روایات میں ہے کہ سیدنا ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں بیت المال آپ کے مکان میں ہوتا تھا جو ''سخ'' کے مقام پر تھا جہاں آپ کی رہائش تھی، اور اس کا کوئی محافظ نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ سے کہا گیا: ''اے خلیفہ رسول! آپ بیت المال پر محافظ کیوں مقرر نہیں کر دیتے؟'' فرمایا: ''کوئی خطرہ نہیں۔'' پوچھا گیا: ''کیوں؟'' فرمایا: ''اس میں تالا لگا ہوا ہے۔'' بیت المال میں جو کچھ ہوتا تھا آپ اسے تقسیم فرما دیتے تھے یہاں تک کہ کوئی شی باقی نہ رہ جاتی۔ جب کاروبار خلافت بڑھا تو سیدنا ابوبکرؓ ''سخ'' سے مدینہ منورہ منتقل ہو گئے تو بیت المال کو بھی مدینہ لے آئے۔ (کنز العمال: ۵/۶۱۴)

سیدنا عمرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اپنے عہد خلافت میں بیت المال کو حقیقی طور پر ایک ادارہ بنایا اور اس کے لیے صحابہ کرامؓ کے مشورہ کے بعد ایک عمارت بھی تعمیر کی گئی اور سیدنا عبداللہ بن ارقمؓ اس کا مہتمم یا وزیر خزانہ بنایا گیا۔ سیدنا عمرؓ کا دور فتوحات کا دور تھا۔ سیدنا ابوعبیدہ بن جراحؓ، سیدنا خالد بن ولیدؓ، سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ اور

Marfat.com

دوسرے جرنیل شہر پر شہر فتح کر رہے تھے، اس وجہ سے ہر سمت سے دولت کے انبار مدینہ منورہ آرہے تھے۔ اس وجہ سے سیدنا عمرؓ نے ۲۰ھ میں ''دیوان'' کا ایک محکمہ بھی تشکیل دیا۔ سیدنا عمرؓ نے مختلف صوبوں میں بھی بیت المال قائم کیے لیکن مرکزی بیت المال مدینہ منورہ ہی میں رہا۔

بعض روایات میں ہے کہ دارالخلافہ میں بیت المال قائم کرنے کے بعد آپ نے ہر صوبہ اور ڈویژن کے سربراہوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے صوبوں میں بیت المال بنائیں اور ان کے حساب کتاب کے لیے ماہر اکاؤنٹنٹس (Accountants) اور دیانت دار لوگ رکھیں تاکہ حساب کتاب شفاف اور ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہو۔ چنانچہ اصفہان میں خالد بن حارثؓ کو اور کوفہ میں سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کو خزانے کا افسر مقرر کیا گیا۔ اس طریقہ سے تمام صوبوں اور ڈویژنوں میں افسرانِ خزانہ مقرر کر کے بیت المال کا الگ محکمہ مقرر کر دیا گیا۔

مدینہ منورہ میں ملک کا مرکزی خزانہ تھا۔ اس کی نگرانی اور آمد وخرچ کے حساب کتاب کے لیے ایک افسر خزانہ (Treasury Officer) کی ضرورت تھی جو نہایت قابل بھی ہو اور دیانتدار بھی۔ آپ نے نہایت غور وفکر کے بعد مشہور صحابی رسول سیدنا عبداللہ بن ارقمؓ کو لکھنے پڑھنے کی اہلیت اور حساب کتاب کا نہایت ماہر ہونے کی بناء پر افسر خزانہ مقرر فرمایا۔ کام چونکہ زیادہ تھا اس وجہ سے آپ نے عبدالرحمٰن بن عبیدؓ اور معقیبؓ کو ان کی ماتحتی میں دے دیا۔ یہ دونوں حضرات مدینہ منورہ میں اکاؤنٹس میں بڑے ماہر اور دیانت دار تھے۔ سیدنا معقیبؓ کو جناب رسول اللہ ﷺ کے انگشتری بردار ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔

بیت المال کی آمدنی کے ذرائع:

ایک اسلامی ریاست میں بیت المال کی آمدن کے ذرائع درج ذیل ہیں:

(1) زکوٰۃ (2) عشر (3) جزیہ (4) خراج

(5) صدقات (6) فئے (7) خمس (8) ضرائب

(9) لگان (10) عشور (11) اوقاف (12) اموال فاضلہ

ان مدات کی اجمالی تشریح حسب ذیل ہے:

1- زکوٰۃ:

زکوٰۃ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے اور کسی خلیفہ کے لیے اس کی وصولی کے معاملہ میں سستی دکھانا درست نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی ادائیگی سے انکار کر دے تو خلیفہ وقت ایسے لوگوں کے خلاف جنگی کاروائی کرے گا۔ ایسے لوگوں کا شمار کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے، باغی اور امیر کی اطاعت سے نکل بھاگنے والوں میں سے ہوگا۔ اور اس وجہ سے سیدنا ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی تھی اور ایک مشہور فقرہ ارشاد فرمایا تھا کہ ''اللہ کی قسم! جو شخص بھی نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے جنگ کروں گا، اس لیے کہ زکوٰۃ مال میں اللہ کا حق ہے۔ بخدا! اگر یہ لوگ مجھے بکری کا ایک بچہ بھی زکوٰۃ میں دینے سے انکار کر دیں جسے وہ رسول اللہ ﷺ کو دیتے آئے تھے تو میں اس کے لیے بھی ان سے جنگ کروں گا۔''

(بخاری، مسلم، موطا امام مالک، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۳۱/۱ مصنف عبدالرزاق: ۴۳۴، محلی لابن حزم: ۲۷۲/۵)

گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ سرکار دو عالم ﷺ اور سیدنا ابوبکرؓ نے نہیں لی تھی، البتہ سیدنا عمرؓ نے ان کی زکوٰۃ نفلی صدقہ کے طور پر لی تھی نہ کہ مقررہ فرض کے طور پر چنانچہ اس کے ذیل میں یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ شام کے کچھ متقی لوگ امیر شام سیدنا ابوعبیدہ بن جراحؓ کے پاس آ کر کہنے لگے: ''ہمارے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ لیجیے۔'' انہوں نے انکار کیا اور سیدنا عمرؓ کو مدینہ منورہ لکھا۔ انہوں نے بھی انکار کیا۔ اس پر وہ لوگ سیدنا عمرؓ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا: ''گھوڑے اور غلام ہی ہمارے اموال ہیں، اس لیے ان کی زکوٰۃ لیجیے۔'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا:

> ''میں تم سے وہ چیز نہیں لے سکتا جو مجھ سے قبل دونوں حضرات یعنی سرکار دو عالم ﷺ اور سیدنا ابوبکرؓ نے نہیں لی۔ پھر آپ نے صحابہ

Marfat.com

کرامؓ سے اس بارہ میں مشورہ کیا۔ سیدنا علیؓ نے کہا: ''اگر وہ اپنی خوشی سے اپنے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ دیں تو ٹھیک ہے بشرطیکہ یہ جزیہ کی شکل اختیار نہ کرلے کہ آپ کے بعد بھی ان سے وصول کی جاتی رہے۔''

(مصنف عبدالرزاق: ۷/۳۵، موطا امام مالک: ۱/۲۷۷، محلی لابن حزم: ۵/۲۲۷، کتاب الاموال: ۴۶۵، بدائع الصنائع: ۲/۳۴)

زکوٰۃ کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

2- عشر:

یعنی پیداوار کا دسواں حصہ مسلمانوں کی ان زرعی پیداوار سے لیا جائے گا جو بارش کے پانی سے سیراب ہوئی ہو یا جس کی سیرابی تالاب، چشمہ، دریا یا نہروں کے ذریعہ اس طرح ہوئی ہو کہ کاشتکار کو اس پر ناقابل لحاظ مصارف اٹھانے پڑے ہوں اور نہ ہی کوئی سخت محنت کرنی پڑی ہو۔ اسے صرف اتنا کرنا پڑا ہو کہ دریا یا نہر سے ایک نالی کے ذریعہ پانی اپنے کھیت تک لے آئے۔ ایسی زمینوں کی پیداوار سے عشر یعنی کل پیداوار کا دسواں حصہ بیت المال کو دینا ہوگا، لیکن اگر کاشت کار نے زمین کو اپنی محنت سے سیراب کیا ہو یعنی کنویں وغیرہ سے پانی کھینچ کر سیراب کیا ہو تو پھر زکوٰۃ کی شرح پانچ فی صد یعنی کل پیداوار کا بیسواں حصہ (نصف عشر) دینا ہوگا۔

3- اجارہ:

اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی قطعہ اراضی کسی شخص کو کاروبار کے لیے دے اور شرط یہ ہو کہ اس کاروبار کے منافع میں سے ایک مقررہ رقم بیت المال میں داخل کرے گا۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے بنو متعان کے ایک شخص ہلال کو ایک وادی جس کا نام ''سلبہ'' تھا شہد کی مکھیاں پالنے کے لیے اس شرط پر دی کہ وہ شہد کا عشر بیت المال میں جمع کرائے گا۔ سیدنا عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں گورنر طائف سفیان بن وہب کو لکھا تھا کہ ''اگر یہ شخص شہد کا عشر اب بھی اسی طرح ادا کرے جس طرح وہ رسول اللہ ﷺ کے عہد

Marfat.com

میں ادا کرتا تھا تو یہ وادی اس کے لیے مخصوص رہنے دو، ورنہ پھر اس وادی کی مکھیاں جنگل کی دوسری مکھیوں کی طرح ہوں گی اور جو شخص چاہے اس کا شہد لے سکتا ہے۔''

4- خراج:

یہ اسلامی ریاست کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے جو اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ خراج مال یا زمین کی پیداوار کی اس معین مقدار کو کہتے ہیں جو مفتوحین کی زمین پر بطور محصول عائد کردی ہو۔ چنانچہ زمین دو قسم کی ہوتی ہیں۔ عشری اور خراجی۔

1- عشری زمین وہ ہیں جن کے مالک ان پر قابض رہتے ہوئے بغیر جنگ کے اسلام لائے ہوں یا جن کو امام یا خلیفہ نے غنیمت میں حصہ کے طور پر کسی فرد کی ملکیت میں دیا ہو، یا جو پہلے افتادہ (موات) رہی ہوں، لیکن اب احیاء کے ذریعہ یا خلیفہ کے بطور جاگیر عطا کرنے پر کوئی فرد ان کا مالک ہوا ہو۔ ان زمینوں کی پیداوار میں سے عشر یا نصف عشر واجب ہے۔ (کتاب الاموال:۵۱۲)

2- خراجی زمینیں وہ ہیں جن کے غیر مسلم مالکوں سے صلح کر لی گئی ہو یا جن کو بزور قوت فتح کرنے کے بعد خلیفہ نے ان کے سابق مالکوں کے قبضہ میں رہنے دیا ہو۔ ان زمینوں پر ان شرحوں کے مطابق محصول (خراج) وصول کیا جائے گا جو ازروئے معاہدہ طے پائی ہوں یا جو خلیفہ نے مقرر کردی ہوں۔

(کتاب الاموال:۵۵، ۶۸)

خراج کی آسان لفظوں میں یہ تعریف ہے کہ خراج اس کرایہ کا نام ہے جو اسلامی ریاست اپنی مملوکہ زمین پر وصول کرتی ہے۔ (الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ:۱۵۶)

کرایہ دار کی حیثیت عام کرایہ داروں جیسی بھی ہوسکتی ہے اور موروثی کاشت کاروں جیسی بھی۔ جو غیر مسلم کاشت کار اپنی زمینوں کے مالک نہ ہوں بلکہ اسلامی حکومت کی مملوکہ زمین پر کرایہ دار یا موروثی کاشت کار کی حیثیت سے کاشت کررہے ہوں، ان سے حکومت اس زمین کا کرایہ وصول کرے گی جسے خراج کہا جاتا ہے۔ اس کرایہ کی کوئی شرح شریعت نے متعین نہیں کی ہے بلکہ مختلف زمانوں میں زمین کی کیفیت کے لحاظ سے

حکومت خراج کی مختلف شرائط طے کر سکتی ہے، البتہ اس شرح کے تعین میں کاشت کار کی ضروریات اور زمین کی کیفیت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

جو غیر مسلم فوجی کشمکش کے بعد اسلامی اقتدار کے تحت آئے ہوں ان کی زمینیں ان کی ملکیت نہیں رہ جاتیں بلکہ اسلامی ریاست کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہیں۔ خراج کا تعلق اصلاً ایسی ہی زمینوں سے ہے۔

(کتاب الاموال: ۲۸، ۷۹، ۲۷، الخراج فی الدولۃ الاسلامیۃ: ۱۱۱، ضیاء الدین الریس)

اور جو غیر مسلم پرامن معاہدہ کے ذریعہ اسلامی ریاست کے زیر اقتدار آئے ہوں اور ریاست نے ان کو ان کی مملوکہ زمین کا مالک تسلیم کیا ہو وہ اپنی زمینوں کے مالک ہوتے ہیں، اور ان پر خراج اسی شکل میں عائد کیا جا سکتا ہے جب کہ ایسا کرنا ازروئے معاہدہ طے کر لیا گیا ہو۔ (کتاب الخراج یحیٰی بن آدم: ۵۴، کتاب الاموال: ۱۴۳)

چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے جب خیبر فتح کیا تو وہاں کے یہودیوں نے کہا کہ ہم ان زمینوں کے مالک ہیں، ان کو کاشت کرنا ہم تم لوگوں سے زیادہ بہتر جانتے ہیں، لہٰذا تم ان کو ہمارے قبضہ ہی میں رہنے دو اور ہمارے ساتھ بٹائی پر معاملہ کر لو۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی اور نصف پیداوار پر معاملہ طے ہو گیا۔ اسی طرح فدک کے لوگوں نے بھی بٹائی پر آپ سے معاملہ طے کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ کا ان سے یہ معاملہ مزارعت کی قسم کا ہے جسے اہل مدینہ "مساقات" کہتے ہیں۔ سیدنا جابرؓ فرماتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن رواحہؓ نے خیبر کی پیدوار کا تخمینہ چالیس ہزار وسق لگایا تھا۔

(ایک وسق ۲۳ من کے برابر ہے) (کتاب الاموال: ۲۰۸، کتاب الخراج لابی یوسف: ۵۰)

سیدنا ابوبکرؓ نے بھی اپنے عہد خلافت میں ان لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا

(کتاب الخراج لابی یوسف: ۵۰)

آپ کے عہد خلافت میں عراق اور شام کے جو علاقے فتح ہوئے ان پر سرسری طور پر کچھ رقم مقرر کر دی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی زمینوں پر دونوں طرح سے معاملہ ہو سکتا ہے۔ بٹائی کے ذریعہ سے بھی اور ایک مقدار معین کر کے بھی، لیکن یہ حکم اسی صورت میں ہے جب زمین بزور شمشیر فتح کی گئی ہو اور وہ مسلمانوں کے مابین تقسیم نہ کی گئی ہو۔

Marfat.com

5- جزیہ:

ذمیوں (اسلامی ریاست کے غیر مسلموں) سے ان کی جان و مال کی حفاظت ایک ٹیکس وصول کیا جاتا ہے جس کو ''جزیہ'' کہتے ہیں۔ یہ جزیہ صرف ایسے مردوں پر لگ جاتا ہے جو فوجی خدمت کے قابل ہوں، اس لیے عورتیں، بچے اور بوڑھے اس سے مستثنیٰ ہیں، اور وہ تمام لوگ جیسے مسکین، غریب اور اپاہج وغیرہ بھی جو مال نہیں رکھتے وہ بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ نادار اور مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ یہ ٹیکس لوگوں کی حیثیت کے لحاظ سے لگایا جاتا ہے۔

جزیہ پر غیر مسلمانوں کی رضامندی کا اظہار اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے علاقہ پر اسلام کی سیادت کو تسلیم کر لیا ہے، لیکن اگر انہوں نے جزیہ دینے سے انکار کر دیا تو ان کے خلاف جنگ جائز ہوگی۔ سیدنا ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں فرمایا تھا ''جو لوگ تمہیں جزیہ دیں ان سے جزیہ قبول کرو اور جو لوگ جنگ پر اتر آئیں ان سے جنگ کرو۔'' (سنن سعید بن منصور: ۲/۲۶۴)

یہ ٹیکس (جزیہ) اور خراج دونوں غیر مسلموں سے وصول کیے جاتے ہیں، لیکن ان دونوں میں فرق ہے۔ خراج زمین کا ٹیکس ہے، چنانچہ بعد میں اگر مالک زمین اسلام بھی قبول کر لے پھر بھی اس کی زمین خراجی ہی رہتی ہے، لیکن جزیہ فرد کا ٹیکس ہے جو اس کی جان اور مال کی حفاظت کے عوض لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جزیہ ادا کرنے والے ذمی کو فوجی خدمت سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، لیکن اگر ذمی فوجی خدمت کے لیے تیار ہوں اور ریاست ان پر اعتماد کر سکتی ہو تو ان کو جزیہ سے بری کیا جا سکتا ہے۔ (الخراج والدولۃ الاسلامیہ: ۱۱۱)

اگر کوئی ذمی مسلمان ہو جائے تو جزیہ اس سے ساقط ہو جائے گا جب کہ خراج ساقط نہیں ہوگا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ خراج سنت سے ثابت ہے قرآن حکیم میں اس کا کوئی ذکر نہیں جب کہ جزیہ کا ذکر خود خداوند قدوس نے قرآن حکیم میں کیا ہے:

''اہل کتاب میں سے جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے نہ روز آخرت پر، اور نہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو

Marfat.com

حرام قرار دیتے ہیں اور نہ ہی وہ دین حق کے تابع ہوتے ہیں، ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو تا آنکہ وہ ماتحتی قبول کرتے ہوئے خود آ کر جزیہ دیں۔ (۲۹:۹)

جزیہ کی اسلام میں کوئی شرح متعین نہیں، اس لیے وہ سربراہ مملکت یا فوج کے سربراہ کی صواب دید پر ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں بھی اس کی کوئی شرح متعین نہ کی گئی تھی۔ چنانچہ عہد صدیقی میں حیرہ صلحاً فتح ہوا، اس لیے خراج تو نہ لگا البتہ سیدنا خالد بن ولیدؓ نے ان لوگوں سے فی کس درہم کے حساب سے جزیہ وصول کر کے مدینہ روانہ کر دیا۔

(کتاب الاموال: ۲۷)

اور نبی اکرم ﷺ نے اہل یمن پر ان کی مالی حالت کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک دینار فی کس جزیہ مقرر فرمایا کیونکہ وہ لوگ خوش حال اور مال دار تھے۔ (کتاب الاموال: ۲۷)

بہر حال اس کی شرح ذمیوں کی مالی حالت دیکھ کر ہی متعین کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ذمیوں کے مالوں میں سے اتنا ہی لیا جائے گا جو ان کی ضرورت سے زائد ہو۔"

(کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۲۳)

6- غنیمت اور فئے:

ایک اسلامی ریاست کی آمدنی کا بڑا ذریعہ غنیمت اور فئے بھی ہے۔ غنیمت وہ مال ہے جو حالت جنگ میں مخالف فوج سے حاصل ہو۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے یا جنگ ختم ہو جانے کے بعد دشمن سے جو مال (خراج وغیرہ کے طور پر) حاصل ہو اسے غنیمت قرار نہیں دیا جاتا۔ علامہ ابو عبیدہؒ لکھتے ہیں:

"غنیمت اور فئے میں یہی فرق ہے کہ جو کچھ اہل شرک سے جبراً چھین لیا جائے، اس وقت جب کہ جنگ عملاً قائم ہو، وہ غنیمت ہے جس کا پانچواں حصہ (خمس) الگ کر کے باقی سارا مال مخصوص طور پر انہی فوجیوں کو دے دیا جاتا ہے، دوسرے لوگوں کو نہیں ملتا۔ جو

Marfat.com

مال جنگ بند ہونے کے بعد اور اس ملک کے اسلامی ملک بن جانے کے بعد مفتوح لوگوں سے حاصل ہو وہ فئے ہے جو سارے لوگوں کے لیے ہوتا ہے اور جس میں سے پانچواں حصہ الگ نہیں کیا جاتا۔ یہی نوعیت اس مال کی ہے جو جنگ شروع ہونے سے قبل دشمن سے مل جائے۔'' (کتاب الاموال:۲۵۴)

اہل حرب سے غنیمت کے علاوہ جو مال حاصل ہو اسے فئے کہتے ہیں۔ جنگ شروع ہونے سے قبل اور جنگ ختم ہونے کے بعد جو اموال حاصل ہوں یا جو مال بلا جنگ اور فوج کشی کے حاصل ہو جائیں، وہ اموال فئے قرار پاتے ہیں۔ صلح کے نتیجہ میں مفتوح ملک سے حاصل ہونے والا مال بھی فئے میں شامل ہے۔ نیز مفتوحہ ممالک کی وہ ساری زمینیں جن کے مالک جنگ سے پہلے اسلام نہیں لا چکے تھے، فئے میں داخل سمجھی جاتی ہیں۔ فئے کا حکم قرآن حکیم کی سورۃ الحشر آیت ۶ تا ۱۰ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ آیات مدینہ طیبہ کے ایک یہودی قبیلے بنونضیر کی جلاوطنی کے موقع پر نازل ہوئی تھیں۔ ان کی بدعہدی اور فتنہ انگیزی کے نتیجہ میں اسلامی فوج نے ان کا محاصرہ کرلیا۔ بنونضیر نے محاصرہ کی تاب نہ لاتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے اور جنگ کی نوبت نہ آئی۔ نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کی جلاوطنی کا فیصلہ فرمایا۔ ان لوگوں نے جو مال و املاک چھوڑے ان کے بارہ میں سورۃ حشر کی ان آیات میں یہ حکم نازل ہوا کہ ان کو اسلامی ریاست اپنی تحویل میں لے لے۔ چنانچہ یہ مال محاصرہ کرنے والوں کے درمیان تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ پورے کا پورا مال جس میں غیر منقولہ املاک، اشیائے استعمال اور نقد وغیرہ شامل تھا، بیت المال میں داخل کرلیا گیا۔ جب شام وعراق کے ممالک فتح ہوئے تو ان کی زمینوں کے بارہ میں سیدنا عمرؓ نے اس طریقہ پر عمل کیا کہ مفتوحہ ممالک کی ساری زمینیں اور فتح کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی غیر منقولہ املاک ریاست کی ملکیت قرار دی گئیں خواہ فوج کشی کی وجہ سے فتح حاصل ہوئی یا جنگ کے بعد ہوئی یا بغیر جنگ کے ہوئی۔

7- جاگیریں:

اسلامی ریاست کی آمدنی کا ایک ذریعہ جاگیر بخشی بھی ہے۔ عہد نبوت میں بھی

Marfat.com

اس کا رواج تھا۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کسی شخص کو زمین کا ایک ٹکڑا اس شرط پر ادا فرماتے تھے کہ وہ اس کو آباد کرے گا اور اس کی آمدنی کا ایک حصہ بیت المال (سرکاری خزانہ) میں داخل کرے گا۔ (کتاب الاموال: ۲۷۲)

چنانچہ امام ماوردیؒ نے احکام سلطانیہ میں سرکار دو عالم ﷺ کی ایک جاگیر بخشی کا ذکر کیا ہے کہ آپ نے قبیلہ مزینہ کے جن لوگوں کو ایک جاگیر عطا فرمائی ان لوگوں نے اسے قابل کاشت بنانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دوسرے لوگوں نے اس پر کاشت کاری کر لی۔ اب مزینہ والوں نے اس زمین کو پھر واپس لینا چاہا۔ معاملہ سیدنا فاروق اعظمؓ کے پاس پیش ہوا۔ آپ نے جو فیصلہ فرمایا وہ یہ تھا کہ ''جو شخص تین برس تک زمین کو یونہی چھوڑے رکھے تو پھر کوئی دوسرا آدمی اس کو آباد کر دے تو یہ دوسرا شخص جس نے اس کو آباد کیا ہے، وہی زمین کا زیادہ حقدار ہوگا۔''

(الاحکام السلطانیہ: ۱۵۱، کتاب الخراج یحییٰ بن آدم: ۹۱، کتاب الخراج لابی یوسف: ۷۷)

سیدنا ابوبکرؓ نے بھی اپنے عہد خلافت میں اس طریقہ کو اسی طرح قائم رکھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم نے یمامہ کے ایک شخص مجاعہ کو اس کی درخواست پر اپنے ایک خصوصی فرمان کے ساتھ یمامہ کی کچھ زمینیں عطا فرمائی تھیں اور اس فرمان میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''اگر کوئی شخص تم سے جھگڑا کرے تو میرے پاس آنا'' سرکار دو عالم ﷺ کے اس دنیا سے انتقال کے بعد مجاعہ بن مرارہؓ سیدنا ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مزید ایک قطعہ زمین کی درخواست کی تو سیدنا ابوبکرؓ نے خضرامہ نامی زمین اس کو عطا فرما دی۔ (کتاب الاموال: ۲۸۱)

سیدنا ابوبکرؓ نے ایک مرتبہ سیدنا طلحہ بن عبید اللہؓ کو ایک جاگیر عطا فرمائی۔ وہ جاگیر کا قبالہ لے کر سیدنا عمرؓ کے پاس آئے اور ان سے اس پر دستخط کرنے کے لیے کہا۔ سیدنا عمرؓ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: ''کیا اور لوگوں کو چھوڑ کر یہ ساری زمین تم ہی کو ملے گی؟'' طلحہؓ کو سیدنا عمرؓ کے منہ سے یہ کلمات سن کر غصہ آ گیا۔ اسی حالت میں سیدنا ابوبکرؓ کے پاس واپس آ کر کہا: ''بخدا! میں نہیں جانتا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ؟'' سیدنا ابوبکرؓ نے فرمایا: ''خلیفہ تو عمرؓ ہی ہیں لیکن انہوں نے اسے (منصب خلافت) قبول نہیں کیا۔''

(کتاب الاموال: ۲۷۲، المغنی لابن قدامہ: ۵/۵۶۷)

Marfat.com

اسی طرح اور بھی کئی جاگیروں کا پتہ کتابوں سے چلتا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ عہد نبوت اور خلفائے راشدین کے عہد میں جو جاگیریں یا بڑے بڑے قطعات اراضی لوگوں کو دیئے جاتے تھے وہ ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کے دینے مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ ان کو قابل کاشت بنا کر یا اگر وہ پہلے ہی قابل کاشت ہیں تو ان پر کاشت کاری کر کے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور اس کی آمدنی یا پیداوار کا ایک حصہ بیت المال میں بھی جمع کرائیں تا کہ دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن اگر کوئی ان زمینوں کو بے کار چھوڑ دیتا تھا تو وہ اس سے واپس لے لی جاتی تھیں اور کسی اور کو دے دی جاتیں۔ ابو عبیدؒ نے اس بارہ میں اپنی کتاب الاموال میں تفصیل سے لکھا ہے۔

8-دفینے:

زمین میں جو دفینے مدفون ہوں ان کے ملتے ہی ان کا پانچواں حصہ (خمس) بیت المال میں داخل کیا جائے گا۔ ان کے خمس کے بارہ میں حدیث میں ہے کہ یہ خمس رسول اللہ ﷺ نے خود مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿فی الرکاز الخمس﴾ (کتاب الاموال: ۳۳۶، متفق علیہ)

''رکاز یعنی دفینہ میں پانچواں حصہ واجب ہے۔''

9-عطایا اور اوقاف:

اسلامی ریاست کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ اس کے افراد کے عطیے ہیں۔ ایک طرف تو افراد اسلام کی ہدایات کے مطابق اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اور مختلف اجتماعی کاموں مثلاً دفاع، جہاد فی سبیل اللہ، اشاعت اسلام اور دوسرے کارہائے خیر کے لیے اسلامی ریاست کو مالی امداد بہم پہنچاتے رہتے ہیں اور دوسری طرف وقت کی ضرورت پر ریاست کے افراد سے اپیل کر کے بھی مال جمع کرتے ہیں۔ نقد رقوم کے علاوہ دوسرے اموال واملاک بھی ہبہ، وصیت اور وقف کے ذریعہ ریاست کو منتقل ہو سکیں گے۔

سرکار دو عالم ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے اور آپ نے معاشرہ کی معاشی تنظیم شروع کی تو سب سے اہم مسئلہ مکہ سے آنے والے مہاجرین

آبادکاری کا تھا۔ انصار مدینہ نے بڑی فراخ دلی سے مدینہ کی تمام قابل تعمیر خالی زمینیں آپ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ آپ چاہیں تو ہمارے رہائشی مکانات بھی حاضر ہیں، لیکن آپ نے مکانات لینا پسند نہ فرمایا۔ آپ ﷺ نے انصار کے دیئے ہوئے قطعات اراضی اور مدینہ طیبہ کی افتادہ اور غیر مملوکہ زمینوں پر مہاجرین کو مکان بنانے اور آباد ہونے کا موقع دیا۔ (انساب الاشراف:۱/۲۷۰)

10-ضرائب.

جنگ کے زمانہ اور قحط سالی میں رفاہ عام اور عوام کی بے روزگاری دور کرنے کے لیے زکوٰۃ وصدقات کے علاوہ جو ٹیکس اہل ثروت حضرات پر حکومت کی جانب سے لگائے جاتے ہیں، شریعت میں ان کو ضرائب کہتے ہیں۔ یہ بھی بعض دفعہ اسلامی حکومت کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ بنتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ٹیکس جبراً وصول کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں۔

"اگر بیت المال اور مال فئے فقراء اور اہل حاجت کی معاشی حاجتوں اور اقتصادی ضروریات کو پورا نہ کرسکیں تو خلیفۂ اسلام اہل ثروت اور اغنیاء پر مزید ٹیکس عائد کر کے ان ضروریات کو پورا کرسکتا ہے، اور اگر اہل ثروت اور اہل دولت ان کے مانع ہوں تو ان سے بالجبر بھی وصول کیا جاسکتا ہے۔ (ویجبرھم السلطان علیٰ ذالک)

(المحلی لابن حزم:۶/۱۵۵)

علامہ ابن حزمؒ نے اس بارہ میں مزید لکھا ہے کہ

"ہر ملک کے مال دار لوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریب لوگوں کی کفالت کریں۔ اگر زکوٰۃ کی آمدنی اور سارے مسلمانوں کی فئے اس کے لیے کافی نہ ہو تو سربراہ مملکت ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ ان (غریبوں) کے لیے اتنے مال کا انتظام کیا جائے گا جس سے وہ بقدر ضرورت غذا حاصل کرسکیں، اور اس طرح سردی

Marfat.com

اور گرمی کا لباس اور ایک ایسا مکان جو انہیں بارش، گرمی، دھوپ اور راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکے۔''

(المحلی لابن حزم: ۱۵۶/۶)

اس بارہ میں امام شاطبیؒ نے بھی مزید محاصل عائد کرنے کے جواز پر لکھا فرماتے ہیں:

''اگر ہم یہ مان لیں کہ ایک ایسے امام کو جس کی اطاعت واجب ہے، وسیع وعریض ملک کے دفاع اور سرحدوں کی ناکہ بندی کے لیے لشکر میں اضافہ کی ضرورت ہے اور بیت المال (سرکاری خزانہ) خالی ہے اور فوج کی ضریات اتنی زیادہ ہیں کہ موجودہ مال اس کے لیے کافی نہیں تو امام کو اس بات کا اختیار حاصل ہے بشرطیکہ وہ عادل ہو کہ مال دار لوگوں پر اتنے ٹیکس عائد کرے جس کی آمدنی اس وقت کی ضرورت کے لیے کافی ہو۔ تا آنکہ بیت المال میں مال آجائے۔ سربراہ مملکت کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ محاصل پیداوار اور پھلوں پر عائد کیے جائیں تاکہ کسی مخصوص طبقہ پر محاصل عائد کرنے کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ یہ لوگ متنفر ہو جائیں۔ یہ محاصل بہت سے لوگوں سے تھوڑا تھوڑا لینے کے اصول پر وصول کیے جائیں تاکہ کسی پر بھی ناقابل برداشت بار نہ پڑے اور مقصد حاصل ہو جائے۔'' (الاعتصام، شاطبی: ۲۹۵/۲)

اسی سلسلہ میں علامہ ابن حزم اندلسیؒ نے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا ایک قول بھی نقل فرمایا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا:

﴿فی مالک حق سوی الزکوٰۃ﴾ (محلی لابن حزم: ۱۸۵/۶)

''تیرے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں (جو ٹیکسوں اور صدقات نافلہ کی صورت میں ادا کیے جا سکتے ہیں'')

Marfat.com

11- عشور (Import Duty)

محصول یا کسٹم ڈیوٹی کو فقہ کی اصطلاح میں ''عشور'' کہتے ہیں۔ یہ وہ محصول ہے جو دارالحرب اور دارالاسلام کے درمیان تجارتی کاروبار جاری رکھنے والوں سے لیا جاتا ہے، خواہ وہ تاجر مسلمان ہو یا ذمی یا کافر حربی۔ اس محصول میں مسلمان، ذمی اور کافر حربی کے درمیان مقدار میں فرق ہے۔ یہ محصول مسلمان کے مال تجارت سے چالیسواں حصہ لیا جاتا ہے، ذمی کے مال سے بیسواں حصہ اور حربی کے مال سے دسواں حصہ لیا جاتا ہے۔

(کتاب الاموال: ۵۳۴، کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۳۲)

ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان تجارت لے کر جانے والے تاجروں سے حکومت جو کچھ وصول کرتی ہے وہ تجارتی عشر ہوتا ہے۔

(المغنی لابن قدامہ: ۸/ ۵۱۷)

عشور اگرچہ عشر کی جمع ہے لیکن واحد بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع عشورات بھی آتی ہے۔

اسلامی دور حکومت میں سب سے پہلے عشور (تجارتی عشر) سیدنا عمرؓ نے عائد کیا۔

(کتاب الاموال: ۵۳۴، مصنف عبدالرزاق: ۱۰/ ۳۳۴)

اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ اہل منبج اور بحر عدن کے اس پار کے لوگوں نے سیدنا عمرؓ کو لکھا کہ وہ اپنا سامان تجارت لے کر سرزمین عرب میں داخل ہوا کریں گے اور مسلمانوں کو عشر (یعنی کل سامان کا دسواں حصہ) دیا کریں گے۔ اس پر سیدنا عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا اور سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ چنانچہ اس طرح سے سیدنا عمرؓ نے یہ تجارتی عشر وصول کیا۔ (مصنف عبدالرزاق: ۶/ ۹۷، ۱۰/ ۳۳۵) لیکن اس مشورہ کے باوجود سیدنا عمرؓ نے یہ جاننا چاہا کہ مسلمان تاجر جب غیر مسلم ریاستوں میں برائے تجارت داخل ہوتے ہیں تو ان سے کتنا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ جب پوچھا گیا تو مسلمان تاجروں نے بتایا کہ غیر مسلم حکومتیں ان کے سامان تجارت کا دسواں حصہ (عشر) ان سے لے لیتی ہیں۔ چنانچہ آپ نے فیصلہ فرمایا کہ جو کچھ وہ ہم سے لیتے ہیں وہی کچھ ہم ان سے لیں گے۔ (کتاب الاموال:

Marfat.com

۵۳۴) ایک روایت میں بجائے اہل حرب کے ایسے غیر ملکی تاجروں کا لفظ ہے جو ذمی نہ ہوں اور ملکی ضرورت کے پیش نظر اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی، مثلاً سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں گیہوں اور زیتون کا تیل مکہ یا مدینہ درآمد کرنے والوں پر یہ ٹیکس دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں نصف کر دیا گیا تھا۔ (تفسیر قرطبی: ۸/۱۱۳، کتاب الاموال: ۵۳۳) ایسا اس لیے کیا گیا کہ مدینہ طیبہ میں یہ اشیاء افراط سے پہنچتی رہیں۔

زریق مولیٰ بن فرازہ سے مروی ہے کہ سیدنا عمرؓ نے انہیں لکھا تھا کہ جو ذمی تاجر تمہارے پاس سے گزریں ان سے ان کے اموال ظاہرہ پر یعنی ان مالوں پر جن سے وہ تجارت کرتے ہیں، ہر بیس دینار پر ایک دینار وصول کریں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/ ۲۱۸)

اموال ظاہرہ کہنے سے یہ مراد ہے کہ اگر تاجر اپنا کوئی مال چھپالیں تو عشر وصول کرنے والا اس کی تفتیش نہ کرے۔ چنانچہ زیادہ بن عدیر سے مروی ہے کہ مجھے سیدنا عمرؓ نے عشور کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ میں کسی کی تفتیش نہ کروں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/ ۱۳۲۸، کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۴۴)

مختلف روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سیدنا عمرؓ مسلمان تاجروں سے اور ذمی تاجروں سے وہ مقدار وصول نہیں کرتے تھے جو اہل حرب کے تاجروں سے وصول کرتے تھے کیونکہ جو کچھ اہل حرب سے لیا جاتا تھا وہ اپنے مزاج کے لحاظ سے اس سے مختلف تھا جو مسلمان اور ذمی تاجروں سے لیا جاتا تھا۔

زیاد بن عدیرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا عمرؓ کو لکھا کہ اہل حرب کے لوگ اسلام کی سرزمین میں آ کر قیام کرتے ہیں تو سیدنا عمرؓ نے مجھے لکھا کہ اگر وہ چھ ماہ قیام کریں تو ان سے عشر لو اور اگر وہ ایک سال قیام کریں تو ان سے نصف عشر وصول کرو۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۹/ ۲۱۰، کتاب الخراج یحییٰ: ۱۷۲) کیونکہ مسلمانوں کے علاقے میں ایک سال رہنے کی بنا پر وہ ذمی بن جائیں گے اور ذمیوں پر نصف عشر ہے۔

سیدنا عمرؓ نے عشر لینے کا نصاب بھی مقرر فرمایا۔ چنانچہ آپ نے حکم دیا کہ جس مال کی مجموعی قیمت دس درہم نہ ہو اس پر عشر نہ لیا جائے۔ زریق مولیٰ بنو فرازہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمرؓ نے انہیں لکھا کہ ذمی تاجر کے ظاہری مال سے ہر بیس دینار پر ایک دینار

Marfat.com

لے لو اور جو اس سے کم ہو اس میں سے اسی حساب سے وصول کرو یہاں تک کہ دس دینار تک پہنچ جائے۔ پھر جب تین دینار سے کم ہو تو چھوڑ دو اور اس پر کچھ نہ لو۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۱۳۸)

یہ شی بھی ذہن میں رہے کہ عشور سال میں صرف ایک مرتبہ وصول کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اگر تاجر عشر وصول کرنے والے کے پاس سے گزرے اور اس کے پاس مثلاً ایک ہزار دینار کی قیمت کے بقدر تجارتی سامان ہو تو اس پر عائد ہونے والا عشر لے لیا جائے گا۔ پھر جب وہ اسی سال کے دوران دوبارہ گذرے اور اس کے پاس دو ہزار دینار کا سامان تجارت ہو تو اس سے صرف اس ایک ہزار دینار کا عشر وصول کیا جائے گا جو پہلے ہزار سے زائد ہے۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا کہ ان سے سال میں صرف ایک ہی مرتبہ عشر لو۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج یحییٰ: ۶۸، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۱۳۸، کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۶۲، المغنی لابن قدامہ: ۵/۲۷۶)

12- لقطہ:

اس سے مراد وہ مال ہے جس کا مالک نہ مل سکے۔ اس میں گری پڑی چیزوں کے علاوہ وہ تمام اموال بھی شامل ہیں جو کبھی مملوکہ رہے ہوں، لیکن اب ان کے مالک لاپتہ ہوں۔ جس شخص کے ہاتھ میں ایسا کوئی مال آئے اس کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کے مالک کا پتا لگانے کی کوشش کرے اور اس کے بعد مناسب طریقہ پر اعلان کرے۔ پانے والے کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس کا مالک بن بیٹھے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لقطہ حلال نہیں لہٰذا جو کوئی کسی شی کو اٹھالے اسے چاہیے کہ ایک سال تک اس کا اشتہار کرے۔ اب اگر اس کا مالک آجائے تو یہ مال اس کے حوالہ کر دے اور اگر نہ آئے تو اسے صدقہ کر دے۔ (بدائع الصنائع، کاسانی: ۶/۲۰۲)

امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اسے بیت المال میں داخل کر دے۔

(بدایۃ المجتہد: ۲/۳۰۶)

علماء نے لکھا ہے کہ ہر وہ مال جو کسی مسلمان مالک کا ہو لیکن اب اس کے مالک

Marfat.com

یا اس کے ورثاء کا پتہ نہ چل سکے تو اسے ریاست کی ملکیت میں داخل کرلیا جائے گا۔
(السیاسۃ الشرعیہ فی احوال الراعی والرعیۃ، تقی الدین ابن تیمیہ: ۴۰)

البتہ اگر وہ شخص خود اتنا غریب ہو کہ اس پر صدقہ کیا جا سکتا ہو تو وہ اس شی کو خود لے سکتا ہے، لیکن:

> ”غنی کے بارہ میں فقہاء مختلف الرائے ہیں کہ کیا اس کے لیے گنجائش ہے کہ سال پورا ہونے کے باوجود اگر مالک کا پتہ نہ چلے تو اسے خود لے سکتا ہے یا نہیں؟ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ اسے اس کا حق ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اسے سوائے صدقہ کر دینے کے اور کسی بات کا حق نہیں۔ یہی بات سیدنا علیؓ، سیدنا ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی مروی ہے۔ اور امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر مال کثیر ہو تو وہ اسے بیت المال میں داخل کر دے۔“ (بدایۃ المجتہد: ۲/۳۰۶)

بینکوں میں جمع ان رقوم کے سلسلہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جن کے مالک یا وارث کا پتہ نہ چلے۔ ایک مناسب عرصہ اشتہار اور انتظار کے بعد ان کو ریاست کے خزانہ اور بیت المال میں داخل کر لینا چاہیے۔ اسی طرح عاریتاً دیا ہوا یا امانت کے طور پر رکھا ہوا وہ سامان جن کے مالک کا پتہ نہ چلے، اسے بھی سرکاری خزانہ میں جمع کر لینا چاہیے۔ وہ غیر منقولہ جائدادیں جن کے مالک کا پتہ نہ چلے بہر صورت اسلامی ریاست کی ملکیت قرار پائیں گی۔ (السیاسۃ الشرعیہ: ۴۰۔۴۱)

اس سلسلہ میں علامہ ماوردیؒ نے ایک عام اصول بیان کیا ہے جس کا اطلاق لقطہ اور دوسرے لاوارث ترکوں پر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ”ہر وہ مال جو مسلمانوں کا حق ہو لیکن اس کا مالک متعین نہ ہو، وہ بیت المال کا حق ہے۔“ (الاحکام السلطانیہ: ۱۸۷)

13-لاوارث ترکے:

ایسے تمام ترکے جن کا کوئی شرعی وارث نہ موجود ہو، نہ مالک نے وصیت کی

Marfat.com

ذریعہ انہیں کسی کی طرف منتقل کیا ہو، اسلامی ریاست کی ملکیت قرار پاتے ہیں۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿انا وارث من لا وارث له ارثه واعقل عنه﴾

(کتاب الاموال:۲۲۱)

''یعنی جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث میں ہوں، میں اس کا ترکہ پاؤں گا اور اس کی طرف سے دیت ادا کروں گا۔''

سیدنا عمرؓ کے ایک اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی اصول پر عمل کرتے تھے کہ لاوارث ترکے بیت المال میں داخل کر دیتے تھے۔ چنانچہ ابن عبدالحکم نے لکھا ہے کہ:

''سیدنا عمرو بن عاصؓ گورنر مصر نے سیدنا عمر بن خطابؓ کو مصر کے ایسے راہبوں کے بارہ میں لکھا جو بغیر کوئی وارث چھوڑے مر جاتے ہیں۔ سیدنا عمرؓ نے انہیں جواب میں یہ لکھا کہ ان میں سے جس کے پیچھے ان کی نسل میں سے کوئی ان کا وارث ہو تو اس کی میراث اس کے حوالہ کر دی جائے، اور جس کے پیچھے اس کی نسل میں سے کوئی نہ ہو اس کا مال مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر دیا جائے کیونکہ اس کی ولایت مسلمانوں کو پہنچتی ہے۔'' (فتوح مصر واخبارہا:۹۰)

14- ضبطی:

سنت میں سزا کے طور پر مجرم کے مال کا ایک حصہ ضبط کر لینے کی نظیریں بھی ملتی ہیں، چنانچہ اسلام سے مرتد ہو جانے والے کا مال بھی بحق ریاست ضبط کر لیا جائے گا۔

''ارتداد کی ذیلی سزا مرتد کے مال کی ضبطی ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی رائے اور امام احمد کے مسلک میں راجح رائے یہ ہے کہ مرتد کا سارا مال ضبط کر لیا جائے گا۔'' (التشریع الجنائی، عبدالقادر عودہ:۶۶۲)

سنن ابی داؤد میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''چرنے والے اونٹوں میں سے ہر چالیس اونٹوں پر اونٹ کا ایک ایسا بچہ جو دو سال پورے کر چکا ہو،

Marfat.com

واجب ہے۔ اونٹوں کو زکوٰۃ کا حساب بگاڑنے کے لیے ادھر ادھر نہیں کیا جائے گا، ابن العلا نے کہا ہے کہ جو اس کے ذریعہ اجر آخرت حاصل کرنے کی خاطر اسے دے گا اسے اس کا اجر ملے گا، اور جس نے اس کے ادا کرنے سے گریز کیا تو ہم اس سے وصول کر کے رہیں گے اور اس کے آدھے اونٹ اور لے لیں گے۔ یہ ہمارے پروردگار کا قطعی فیصلہ ہے۔'' (ابوداؤد، باب فی زکوٰۃ السائمۃ)

جو شخص سرکاری چراگاہ کی گھاس کاٹتے ہوئے پایا جائے اس کو مارو اور اس کے پاس جو کچھ ہے وہ چھین لو۔'' (فتوح البلدان:۲۳)

چنانچہ سیدنا عمرؓ کے زمانہ میں اس پر عمل بھی کیا گیا اور انہوں نے اپنے دو بیٹوں عبداللہؓ اور عبیداللہؓ کے آدھے اونٹ صرف اس بنا پر ضبط کر لیے کہ انہوں نے ان کے لیے سرکاری چراگاہ کو استعمال کیا تھا۔ (سراج الملوک:۱۱۶، ابوبکر محمد بن محمد طرطوسی)

سیدنا ابوہریرہؓ کو سیدنا عمرؓ نے بحرین کا گورنر مقرر کیا تھا۔ جب وہ وہاں سے واپس آئے تو سرکاری مال کے علاوہ دس ہزار درہم خود اپنا مال بھی ساتھ لائے۔ سیدنا عمرؓ نے جواب طلب کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ مال ان کی اپنی کمائی کا ہے۔ لیکن ان کے جواب سے سیدنا عمرؓ مطمئن نہ ہوئے اور آپ نے ان کا یہ تمام مال بحق سرکار ضبط کر لیا۔
(فتوح مصر، ابن عبدالحکم:۱۴۸)

اسی طرح اسی بنیاد پر آپ نے سیدنا عمرو بن عاصؓ اور سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کا آدھا مال بحق سرکار ضبط کر لیا۔

(فتوح مصر:۱۴۶، کتاب الاموال:۲۶۹، طبقات ابن سعد:۲۸۲/۴، ۳۰۷

یہ ہیں ریاستی بیت المال کے چند ذرائع جن کی آمدنی سے ایک اسلامی ریاست کا خزانہ بھرتا ہے اور لوگوں کی بہتری اور بہبودی کے لیے مال اکٹھا ہوتا ہے۔

حکومت کے مصارف:

سطور بالا میں تو اسلامی ریاست کی آمدنی کی تفصیل تھی کہ ان ذرائع سے سرکاری آمدنی ہوتی ہے۔ اس آمدن سے خلیفہ کے اختیار اور اس کی رائے سے حکومت کے تمام شعبوں

میں خرچ کی جاتی ہے۔ تمام کارکنان حکومت کی تنخواہیں، خود خلیفہ کی تنخواہ، فوج کا سامان رسد، آلات حرب وضرب اور دیگر معاشرتی کاموں کی تکمیل بیت المال سے کی جاتی ہے۔

1- کفالت عامہ:

کفالت عامہ سے مراد یہ ہے کہ دارالاسلام اور اسلامی ریاست کے حدود کے اندر بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، اور یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہیے کہ کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج شامل ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

> ''جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ رہا، اللہ تعالیٰ بھی اس (نگران) کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔''
>
> (ابوداؤد، باب مایلزم الامام من امر الرعیۃ)

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

> ''جو امام (سربراہ مملکت) ضرورت مندوں، فقراء اور مساکین پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات، فقر اور مسکینی پر آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔''
>
> (ترمذی، باب ما جاء فی امام الرعیۃ)

ایک اور حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''جس بندہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی رعایا کا راعی (حکمران) بنایا اور اس نے اس کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ کی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔'' (بخاری، باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح)

رعایا کی خیر خواہی سے مراد اس کی ضروریات زندگی کی تکمیل کا انتظام واہتمام ہے جو ایک اسلامی ریاست کے سربراہ پر شریعت نے لازمی قرار دیا ہے۔ چنانچہ اسی خیر

Marfat.com

خواہی کی بابت ایک اور روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

''جو امیر مسلمانوں کے امور کا نگران ہو اور پھر ان کی بھلائی اور بہتری کے لیے سعی وکوشش نہ کرے اور ان کی خیر خواہی نہ کرے وہ ان کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔'' (مسند ابی عوانہ: ۱/۳۲)

اگر ایک حکمران رعایا کی دل کی گہرائیوں اور خلوص نیت کے ساتھ خیر خواہی نہیں کرتا اور خیر خواہی کا اولین تقاضا یعنی ان کی بنیادی ضروریات زندگی پوری نہیں کرتا اور صرف وعدوں پر ٹال دیتا ہے اور زبانی جمع خرچ کر کے ان کو سنہری الفاظ سے ٹال دیتا ہے اور ریڈیو ٹیلی ویژن اور دوسرے میڈیا کے ذریعہ انہیں یہ کہتا ہے کہ ''حکومت نے تمہاری امداد کا تہیہ کر رکھا ہے یا ان کو بارہ بارہ کلوں اور روٹی، کپڑا اور مکان کے حسین خواب دکھاتا ہے اور عملی طور پر ان کے لیے کچھ نہیں کرتا تو وہ نہ صرف ان کی خیر خواہی نہیں کرتا بلکہ اپنے جھوٹے وعدوں سے انہیں دھوکا دے رہا ہے۔ اس دھوکہ دہی کا عذاب اسے الگ ہوگا۔ شریعت نے تو سربراہ مملکت کو تمام رعایا کا ولی بنایا ہے اور اس کی ولایت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مملکت کے افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ (ترمذی، ابوداود ابواب النکاح)

ایک روایت میں آپ نے رسول اور سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے ایک نو مسلم قبیلہ کے سردار زرعہ بن ذی یزن کے نام ایک خط میں اس کے قبیلہ حمیر کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اے اہل حمیر! میں تمہیں اچھا طریقہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں، نہ تو خیانت کرنا اور نہ ہی مخالفانہ روش اختیار کرنا۔ اللہ کا رسول تمہارے مال دار اور غریب لوگوں کا سرپرست ہے (ان رسول اللہ مولیٰ غنیکم وفقیرکم) اور صدقہ کا مال محمد (ﷺ) اور ان کے گھر والوں کے لیے جائز اور حلال نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ ہے جسے تم (اپنی پاکیزگی کے لیے) غریب مسلمانوں کے لیے نکالتے ہو۔'' (کتاب الاموال لابی عبید: ۲۰۲)

ایک سربراہ ریاست کے لیے ضروری بنیادی ضروریات کی تکمیل کرنا

Marfat.com

ضروری نہیں ہے بلکہ افراد مملکت کی دوسری ضروریات کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جب فتوحات کے بعد کافی مال بیت المال میں جمع ہونے لگا تو سرکار دو عالم ﷺ نے اعلان فرما دیا کہ جو لوگ مقروض ہوں اور وہ وفات پا جائیں، ان کے قرضے اسلامی ریاست کے خزانے سے ادا کیے جائیں۔ (بخاری باب من ترک کلا اوضیاعا فالی)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے نہایت واضح طور پر فرمایا:

"متوفی جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو ذمہ داریاں (یعنی قرض وغیرہ) چھوڑ کر مرے وہ اللہ کے ذمہ، اور کبھی یہ فرمایا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذمہ ہیں۔ امام ابو عبیدؒ فرماتے ہیں کہ "اس سے مراد ہمارے نزدیک وہ تمام افراد ہیں جن کی کفالت متوفی کے ذمہ ہو اور بچے بھی اس میں شامل ہیں۔"

(کتاب الاموال: ۲۳۷)

رسول اللہ ﷺ کی انہیں ہدایات نے آپ ﷺ کے بعد آنے والے سربراہانِ مملکت کو اس بارہ میں ہوشیار اور خبردار کر دیا اور وہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے کہ ان کی سلطنت کے حدود و ثغور میں نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں کو بھی کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے بلکہ ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام ہوتا رہے چنانچہ سیدنا عمرؓ کا مشہور جملہ ہے کہ

"اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی بکری بھی (ایک روایت میں اونٹ کا لفظ ہے) بے سہارا ہونے کی وجہ سے مر جائے تو مجھے گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس بارہ میں مجھ سے ضرور باز پرس کرے گا۔" (سیرت عمر بن خطاب لابن جوزی: ۱۶۱)

ایک مرتبہ سیدنا عمرؓ نے اپنی ذمہ داریاں گناتے ہوئے ایک عام خطبہ میں یہ فرمایا تھا:

﴿ایها الناس! ان الله قد کلفنی ان اصرف عنه الدعاء﴾

(قواعد الاحکام فی مصالح الانام: ۱/ ۱۴۸، لعز الدین بن عبد السلام)

Marfat.com

"اے لوگو! مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں۔"

اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ سربراہ ریاست ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے تا کہ ان کے ہاتھ انصاف کی طلب میں آسمان کی طرف نہ اٹھیں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات زندگی اور حاجتیں پوری کرے تا کہ انہیں اللہ سے ان کی تکمیل کی دعا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔

عام رمادہ میں سیدنا عمرؓ کی حالت دیدنی تھی۔ آپ نے قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لیے اس زمانہ میں وہ کچھ کیا جو کسی اور بادشاہ سے ممکن نہ تھا، آپ نے مصر، شام اور دوسرے علاقوں سے غلہ، آٹا، چربی اور تیل وغیرہ اشیائے ضرورت منگوائیں اور ہزاروں کی تعداد میں مویشی اور اونٹ باہر سے منگوا کر ذبح کیے۔ آپ نے دن رات ان انتظامات کی نگرانی کی اور کام کرتے کرتے آپ کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ بعد میں لوگ یہ کہہ اٹھے:

"اگر اللہ تعالیٰ عام الرمادہ میں قحط دور نہ کر دیتا تو ہمیں خطرہ تھا کہ عمرؓ مسلمانوں کے اس مسئلہ کی فکر کرتے کرتے اس دنیا سے انتقال ہی نہ کر جائیں۔"

یہ تو سیدنا عمر بن خطابؓ کی کفالت عامہ کے بارہ میں اپنی ذمہ داری کا احساس تھا لیکن تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ کفالت عامہ کی اس ذمہ داری کو ہر نیک سربراہ ریاست نے محسوس کیا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ تو کفالت عامہ کی اس گراں بار ذمہ داری کا خیال کر کے اکثر و بیشتر روتے رہتے تھے کہ کہیں قیامت کے روز عدالت خداوندی کے کٹہرے میں نہ کھڑے ہونا پڑے۔ چنانچہ آپ کی اہلیہ محترمہ فاطمہؒ کہتی ہیں کہ میں ایک دن آپ کے کمرہ میں گئی۔ آپ جائے نماز پر تھے اور آنسوؤں سے آپ کی ریش مبارک تر تھی۔ میں نے پوچھا: کیا کوئی نئی بات ہو گئی ہے؟ فرمایا:

"میں نے پوری امت محمدیہ کی ذمہ داری لے لی ہے، لہٰذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، غریب

Marfat.com

الدیار قیدیوں، بہت بوڑھے افراد اور ان لوگوں کے بارہ میں غور و فکر کر رہا تھا جو بکثرت اہل و عیال والے ہیں مگر مال دار نہیں ہیں اور مختلف علاقوں میں اسی قسم کے لوگوں کے بارہ میں متفکر تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مجھ سے ان کے بارہ میں پوچھے گا اور اللہ کے حضور میرے مقابلہ میں ان لوگوں کے وکیل سرکار دو عالم ﷺ ہوں گے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ جرح میں میری بات پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ سکے گی تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا۔"

(کامل ابن اثیر: ۵/۲۴، کتاب الخراج: ۱۰، سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن محمد عبداللہ بن عبدالحکم: ۱۷۸)

انہی عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد خلافت میں زبردست قحط پڑا۔ قحط زدہ علاقہ سے کچھ لوگ ایک وفد کی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ ان کے رئیس وفد نے کہا:

"امیر المؤمنین! ہم ایک شدید ضرورت کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہمارے جسم کی چمڑی سوکھ گئی ہے کیونکہ اب ہڈیاں بھی میسر نہیں آتیں، اور ہماری مشکل کا حل صرف بیت المال کے ذریعہ ممکن ہے۔ آپ کے اس حکومتی خزانہ کی حیثیت تین میں سے ایک ہوسکتی ہے۔ یا تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، یا بندگانِ خدا کے لیے یا پھر آپ کے لیے۔ اگر یہ اللہ کے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ بندگانِ خدا کے لیے ہے تو اسے انہیں دے دیجئے، اور اگر آپ کا ہے تو صدقہ کے طور پر ہمیں عطا فرما دیجئے۔ اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا۔"

یہ سن کر سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، اور آپ نے فرمایا اس کی حیثیت وہی ہے جو تم نے بیان کی۔ آپ نے اسی وقت حکم دے دیا کہ ان لوگوں کی ضروریات زندگی بیت المال سے پوری کی جائیں۔"

(التبر المسبوک فی نصائح الملوک، امام غزالی: ۶۱ علیٰ ہامش سراج الملوک)

Marfat.com

معاشی ترقی:

کفالت عامہ کی طرح ملک کی معاشی تعمیر و ترقی بھی اسلامی ریاست کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ کسی ملک کی معاشی ترقی اس ملک کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کی بنیاد بھی ہے اور اس کے سیاسی استحکام کی لازمی شرط بھی۔ اسی وجہ سے قرآن وحدیث میں اسلامی ریاست کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کے استحکام پر بہت زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا:

﴿واعدوا لهم مااستطعتم من قوة ومن رباط الخيل﴾

(انفال:٦٥)

”اور اپنے دشمنوں کے لیے جتنی طاقت تم میں سے ممکن ہو سکے تیار رکھو اور پلے ہوئے گھوڑوں سے۔“

رسول اللہ ﷺ اپنے زمانہ میں فوجی تیاریوں، گھوڑ سواری، اسلحہ کی فراہمی اور گھوڑوں کی فراہمی پر صحابہ کرامؓ کو برابر ترغیب دیتے رہتے تھے۔ آپ ﷺ کے انتقال کے بعد سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے بھی اپنے عہد خلافت میں کفالت عامہ کے ساتھ ساتھ ملک کی معاشی تعمیر و ترقی اور ملک کے لیے فوجی طاقت اور دفاعی قوت کے استحکام کے لیے وہی کچھ کیا جو رسول اللہ ﷺ اپنے زمانہ میں کیا کرتے تھے۔ آج کی فوجی تیاریاں اور دفاعی قوت کے ذرائع اس زمانہ سے بہت مختلف ہیں۔ آج اسی حکم اور ارشاد خداوندی کا منشاء یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے معیار کے مطابق فوجی تیاریاں کی جائیں اور دفاعی قوت پیدا کی جائے۔ ایٹم بم، میزائل، ایٹمی توانائی بنیادی صنعتوں کے فروغ اور دفاع کے لیے انتہائی ضروری ہیں، اس لیے ان تمام چیزوں کا اہتمام بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ فقہاء نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی شرعی فریضہ کی ادائیگی کسی مباح کام پر موقوف ہو تو وہ مباح کام بھی فرض ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ آمدیؒ نے لکھا ہے:

”ہمارے اصحاب اور معتزلہ دونوں اس اصول پر متفق ہیں کہ جس چیز کے بغیر واجب کی تکمیل اور تعمیل ممکن نہ ہو اور وہ شی مکلّف کے بس

میں ہوتو بھی واجب ہو جاتی ہے۔" (اصول الاحکام، آمدی:۱/۸۵)

یہی بات علامہ قرطبیؒ نے بھی لکھی ہے۔ (تفسیر قرطبی:۶/۵۸)

ایک اسلامی ریاست کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ ملک کی تعمیر و ترقی کا پورا پورا اہتمام کرے۔ چنانچہ قرآنی آیت "ھو الذی انشاء کم من الارض استعمر کم فیھا" (ہود:۶۱) کی تفسیر میں امام ابوبکر جصاص نے لکھا ہے کہ

"تم کو حسب ضرورت اس کے آباد کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ زمین کو زراعت، باغبانی اور تعمیر مکانات کے لیے درست کرنا واجب ہے۔" (احکام القرآن:۳/۱۶۵)

رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث قدسی منقول ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

﴿عمروا ابلادی فعاش فیھا عبادی﴾ (المبسوط، سرخسی:۲۳/۱۵)

"(انہوں نے) میرے ملکوں کو آباد کیا تو ان میں میرے بندوں نے زندگی بسر کی۔"

اس حدیث قدسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کی خوش حالی اور معاشی تعمیر و ترقی مطلوب خداوندی ہے۔

امام ماوردی نے ایک اسلامی ریاست کے سربراہ کے فرائض میں سے ایک فریضہ یہ نقل کیا ہے:

﴿عمارة البلدان باعتماد مصالحھا و تھذیب سبلھا و مسالکھا﴾

"(اپنے زیر حکومت) ممالک اور شہروں کے جملہ مصالح کے تحفظ اور اس کی شاہراہوں اور دوسرے ذرائع نقل و حمل کو بہتر بنا کر ان کی تعمیر و ترقی اور خوشحالی و آبادی کو قائم رکھے۔" (ادب الدین والدنیا:۸۲)

سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے اہل عجم کو برا بھلا کہا گیا۔ آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ فرمایا: "ان کو برا نہ کہو

Marfat.com

کیونکہ ان لوگوں نے اللہ کے ملکوں کو آباد اور خوش حال بنایا اور ان میں اللہ کے بندوں نے اپنی زندگی گزاری۔'' (ادب الدین والدنیا:۸۲)

چنانچہ سیدنا عمرؓ حکومت کے عہدوں پر تقرر کرنے میں اس بات کا خاص خیال فرماتے تھے کہ متعلقہ افراد کو رعایا کی معاشی خوشحالی اور تعمیر و ترقی کی خاص فکر ہو۔ سیدنا عمرؓ نے عراق پر جب اسلامی لشکر جہاد کے لیے بھیجا تو بقول علامہ طبری آپ نے انہیں عراق بھیجتے وقت یہ فرمایا تھا:

''ایک ایسی قوم سے جہاد کرنے کے لیے جاؤ جو امور معاش پر حاوی اور ترقی یافتہ ہے۔ (قد حووا من فنون العیش) امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں سے تمہارا حصہ عطا کرے گا، اور تم بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ (اس ترقی اور خوشحالی سے فیض یاب اور مستفید ہوتے ہوئے) زندگی گزار سکو گے۔

(طبری،۳/ ،حوادث ۱۳ھ)

سیدنا عمرؓ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک میں معاشی ترقی کے بہت خواہاں تھے اور ان کی خواہش تھی کہ مسلمان جدید معلومات حاصل کر کے ملکی تعمیر و ترقی میں ایک نمایاں کردار ادا کریں۔ آپ کو ملک کو خوش حال بنانے اور اس کی تعمیر و ترقی کا اس قدر خیال بلکہ اہتمام تھا کہ آپ نے والی مصر سیدنا عمرو بن عاص کو لکھا تھا کہ مقوقس سے دریافت کریں کہ مصر کی خوش حالی اور آبادی کا انحصار کن عوامل پر ہے۔ (فتوح مصر لابن عبدالحکم: ۱۶۱) آپ نے انہیں ایسی تمام تدابیر اختیار کرنے کی تاکید فرمائی تھی جن سے مصر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو۔ مصر چونکہ ایک زرعی ملک تھا اور زرعی معیشت میں سب سے زیادہ اہمیت آبپاشی کے ذرائع کو حاصل ہے۔ اور آبپاشی کا سب سے بڑا ذریعہ نہروں کی تعمیر ہے۔ تجارت کے فروغ کے لیے شاہراؤں اور پلوں کی تعمیر اور دوسرے ذرائع نقل و حمل کی فراہمی کو حاصل ہے۔ چنانچہ آپ نے گورنر مصر کو ہدایات دیں کہ مصر میں نہروں کی کھدائی، شاہراؤں اور پلوں کی تعمیر اور دوسرے تعمیری کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے۔ آپ کے اس حکم کی تعمیل میں مصر کے تعمیری اور ترقیاتی کاموں

Marfat.com

ایک لاکھ چوبیس ہزار مزدور لگائے گئے تھے جو مختلف آلات کی مدد سے تعمیر وترقی کا کام کرتے اور سردی اور گرمی اور بہار اور خزاں میں یہ کام جاری رہتا۔ (فتوح مصر:۱۵۱)

شہروں میں تعمیری اور ترقیاتی کاموں کے فروغ کے لیے آپ نے موجودہ زمانہ کے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ (P.W.D) کی طرح ایک محکمہ بنایا۔ اس محکمہ کو آج کل کی عرب دنیا میں ''نظارت نافعہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نے اس محکمہ کے زیر اہتمام تمام اسلامی مملکت میں مختلف سرکاری عمارتیں بنوائیں، سڑکیں بھی تعمیر کرائیں اور مختلف شہروں میں نہریں بھی کھدوائیں۔ زراعت کی ترقی کی طرف بھی آپ نے خاص دھیان دیا۔ چنانچہ ملک میں جو نہریں کھدوائیں، ان میں چند ایک حسب ذیل ہیں:

(1) نہر ابی موسیٰ (2) نہر سعد (3) نہر معقل (4) نہر امیر المومنین

نہر امیر المومنین تمام نہروں سے بڑی تھی۔ اس نہر کے ذریعہ دریائے نیل کو بحر قلزم سے ملا دیا گیا تھا۔ اس نہر کے کھدوانے کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۸ھ میں بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے تمام عرب میں قحط پڑ گیا۔ پورے نو ماہ آسمان سے پانی کی ایک بوند نہ ٹپکی۔ ادھر آتش فشاں پہاڑ پھٹنے لگے جس سے زمین کی سطح اور اس کی ساری روئیدگی جل کر سیاہ مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ جب ہوا چلتی تو ساری فضا گرد آلود ہو جاتی۔ اس لیے لوگوں میں اس سال کا نام ''عام الرمادہ'' یعنی خاک اور ریت والا سال پڑ گیا۔ ملک کی اس کیفیت کو دیکھ کر سیدنا عمرؓ نہایت پریشان تھے اور دن رات آپ کو لوگوں کا یہ غم کھائے جا رہا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے باہر سے بہت سا غلہ منگوایا۔ شام اور مصر سے جو غلہ خشکی کے راستہ آیا وہ بہت دیر سے آیا کیونکہ خشکی کا راستہ نہایت طویل تھا۔ سیدنا عمرؓ نے گورنر مصر سیدنا عمرو بن عاصؓ کو لکھا کہ انجینئروں کی ایک ٹیم ساتھ لے کر بارگاہ خلافت میں حاضر ہوں۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ آپ نے گورنر اور ان انجینئروں سے فرمایا کہ دریائے نیل کو اگر سمندر سے ملا دیا جائے تو عرب میں قحط سالی کا کبھی خطرہ نہیں ہو گا ورنہ خشکی کے راستہ سے غلہ کا آنا ایک دشوار گزار معاملہ ہے۔ ان سب حضرات نے آپ کی اس تجویز کو پسند فرمایا اور فسطاط (موجودہ قاہرہ) سے بحر قلزم تک ایک نہر کھدوائی جس کی وجہ سے جہاز دریائے نیل سے سیدھے بحر قلزم میں آ جاتے اور پھر وہاں سے جدہ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہو جاتے۔

Marfat.com

یہ نہر قریباً ۶۹ میل لمبی تھی اور نہایت گہری تھی جس سے جہازوں کی آمد ورفت آسانی سے ہو جاتی۔ اتنی لمبی نہر صرف چھ ماہ میں کھودی گئی اور پہلے ہی سال بیس (۲۰) بڑے بڑے جہاز جن میں ساٹھ ہزار اروب غلہ بھرا ہوا تھا، اس نہر کے ذریعہ جدہ کی بندرگاہ پر آئے اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ لائے گئے۔ (سیدنا عمرؓ نے ملک کی تعمیر وترقی میں جو کردار ادا کیا اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب سیرت عمر فاروقؓ)

ایک اسلامی ریاست کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد کی پیدا آور جدوجہد کی ہمت افزائی کرے تاکہ وہ بھی ملک کی تعمیر وترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔ یہ نہیں کہ صرف زبانی وعدوں پر لوگوں کو ٹالا جائے۔ سربراہ مملکت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر ملک کی معاشی ترقی کے لیے مفید اقدام کرے اور سرکاری خزانہ کو رعایا کے لیے فائدہ مند بنائے۔ اگر لوگوں کی بہتری کے لیے یا سڑکوں اور پلوں کی تعمیر پر کوئی روپیہ خرچ ہو تو اس علاقہ کے لوگوں پر احسان نہ دھرے کیونکہ صدر مملکت نے اپنے باپ کے مال سے خرچ کر کے وہ سڑک نہیں بنوائی بلکہ لوگوں کے مال سے بنوائی ہے۔ اسے چاہیے کہ بارگاہ خداوندی میں سجدہ شکر ادا کرے جس نے اسے لوگوں کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔ سیدنا عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ”میں ان لوگوں کے ساتھ خیر خواہی برتتا ہوں جن کے امور کا اللہ تعالیٰ نے مجھے نگران بنا دیا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی رعیت کے ساتھ بدخواہی اور خیانت کرتا ہوا مرے گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پا سکے گا۔“ (فتوح البلدان بلاذری: ۴۳۹)

اپنی رعایا کے لیے وسائل زندگی میں فراوانی چاہنا بھی ایک سربراہ ریاست کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ فرماتے تھے کہ ”میں حکومت کے عہدے ان لوگوں کے سپرد نہیں کروں گا جو اس کے اہل نہ ہوں بلکہ ان لوگوں کے سپرد کروں گا جو مسلمانوں کے لیے فراوانی بہم پہنچانا چاہتے ہوں۔“ (مؤطا امام مالک: ۳۲۶)

تقسیم دولت میں تفاوت کی کمی:

اسلامی ریاست کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معاشرہ میں تقسیم دولت

Marfat.com

اندر جو تفاوت پایا جاتا ہو، اس کو کم کرے اور اس بات کی پوری پوری کوشش کرے کہ سماجی دولت کسی ایک طبقہ کے اندر مرکوز ہو کر نہ رہ جائے۔ اسے امراء اور اغنیاء کو یہ باور کرانا ضروری ہے کہ ان کے مالوں میں ضرورت مند اور محروم افراد کا حق بھی اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے، اور جو کچھ وہ غرباء اور سائلین کو دیتے ہیں وہ ان پر احسان نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مالوں میں ان کا حق رکھا ہے۔ اور اگر تم ان کو ان کا حق نہیں دو گے تو روز قیامت تمہیں اس کی باز پرس ہو گی۔ چنانچہ قرآن میں بھی اس کو حق کہا گیا ہے:

﴿وفی اموالھم حق للسائل والمحروم﴾ (الذاریات:۱۹)

''اور ان کے اموال میں سائل اور محروم افراد کا بھی حق ہے۔''

تقسیم دولت میں پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا مقصد اسلامی ریاست نے تین طریقوں سے حاصل کیا۔

1- ہر سال زکوٰۃ اور عشر کے ذریعہ دولت مندوں کے مال کا ایک حصہ غریبوں کی جانب منتقل کیا جاتا تھا۔

2- فئے کے مال کو غریبوں کے درمیان میں تقسیم کیا گیا۔

3- اصحاب دولت اور مال دار لوگوں کو ترغیب و تلقین کے ذریعہ اس بات پر ابھارا گیا کہ وہ ضرورت مندوں اور اہل حاجت کی مالی امداد کریں۔

اسلامی ریاست کے مصارف کے چند اصول:

اسلام نے اسلامی ریاست کے اخراجات کو کچھ اصولوں کا پابند بنایا ہے تا کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اخراجات کر سکے اور عوام الناس کی فلاح و بہبود زیادہ سے زیادہ ہو۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں:

(1) پہلا اصول یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے اخراجات کی مدیں حلال اور جائز ہوں، حرام اور خلاف شریعت نہ ہوں۔ کیونکہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث﴾ (اعراف:۱۵۷)

''اور (وہ نبی ﷺ) حلال کرتے ہیں ان کے لیے پاک چیزیں اور حرام کرتے ہیں ناپاک چیزیں۔''

Marfat.com

پھر جن مدات میں خرچ کرنے کی اجازت ہے ان میں بھی اسلام ترجیحا
کے اصول کو اپناتا ہے۔

(2) ایک اسلامی ریاست کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اپنے مختلف
کے اخراجات میں اعتدال، کفایت شعاری اور میانہ روی سے کام لے تا ک
بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے نہ دبے اور ایک خوددار اور باعزت قوم کی ز
بسر کر سکے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

''اور فضول خرچی ہرگز نہ کرو، بے شک (اخراجات میں) حد سے
تجاوز کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔'' (بنی اسرائیل:۲۶۔۲۷)

قرآن حکیم فضول خرچی اور بخل دونوں کے درمیان کی راہ اخراجات میں اخ
کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

''اور (ایمان والے) وہ لوگ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ
اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں کے
درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔'' (الفرقان:۶۷)

سرکار دو عالم ﷺ نے بھی اس بارہ میں ارشاد فرمایا:

﴿الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة﴾ (کنز العمال عن عمرؓ)
''یعنی اخراجات میں میانہ روی معاشی خوش حالی کا نصف حصہ ہے۔''

ایک اور روایت علامہ سید محمود آلوسیؒ نے نقل فرمائی ہے:

﴿من فقه الرجل رفقة فی معیشة﴾ (روح المعانی:۴۲/۱۹)
''کسی شخص کی دانشمندی اور فرزانگی میں یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنی
معیشت میں اعتدال سے کام لے۔''

یہی اصول ایک اسلامی ریاست کے لیے بھی ہے۔

اس اصول کے تحت ایک اسلامی ریاست کو وہ تمام اخراجات کرنے ممنوع
جو فضول خرچی کے زمرے میں آتے ہیں۔

اسلامی ریاست کے اخراجات کا ایک زریں اصول تمام شعبہ ہائے زندگی میں سادگی کو اپنانا ہے۔ یہ اصول دراصل کفایت شعاری ہی کا ایک حصہ ہے جس پر عمل کر کے ایک حکومت کروڑوں روپے کے اخراجات بچا سکتی ہے۔ تکلفات پر کروڑوں روپے خرچ کرنا آج کل کی مسلمان حکومتوں کا معمول بن چکا ہے۔ بڑی بڑی بلڈنگیں بنانا اور عیش و عشرت اور تکلفات کی زندگی بسر کرنا ہمارے افسران حکومت کا وطیرہ بن چکا ہے۔ بیرونی دوروں پر صرف اپنے کارکنوں اور ماتحتوں کو ممنون کرنے کے لیے کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں بلکہ جونہی کوئی وزیر اعظم بنتا ہے تو اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر فوراً عمرہ پر سعودی عرب چلا جاتا ہے۔ وزیر اعظم بننے سے پہلے اسے کبھی عمرہ اور حج یاد نہیں آتا۔ یہ عمرے صرف اپنے ان ساتھیوں کو ممنون کرنے کے لیے ہوتے ہیں جنہوں نے الیکشن میں ان کی مدد کی ہوتی ہے۔ ایسے عمرے نہ تو اللہ کے ہاں مقبول ہیں اور نہ ہی اسلام ان کی اجازت دیتا ہے۔ مسلمان ملکوں کے قرضوں کا اکثر حصہ فضول اخراجات پر اٹھ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم سربراہانِ حکومت کی ان فضول خرچیوں کے باعث بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے پوری زندگی کراہتی رہتی ہے۔ ہماری حکومتوں کے ہزاروں کے اخراجات لاکھوں میں اور لاکھوں کے کروڑوں میں صرف تکلفات کے شوق میں بدل جاتے ہیں۔ افسوس آج کروڑوں کا بجٹ صرف دفاتر کی جلوہ آرائیوں، سر بفلک عمارات کی تعمیر، گراں قیمت کاروں کی خریداری اور رنگا رنگ تقاریب کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے، اور یہ تمام اخراجات ان غریب لوگوں پر ٹیکس لگا کر پورے کیے جاتے ہیں جو مشکل سے اپنی ضروریات زندگی پوری کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے سادگی کو چھوڑ کر تکلفات اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والوں کو معاشی ہلاکت اور بربادی کی اطلاع دی ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ معاش اور تمدن کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

”(اور ہم نے) کتنی ہی ایسی بستیاں (تباہ و برباد کر دیں) جو اپنی

Marfat.com

معیشت میں مغرور اور متکبر ہو گئیں۔ اب یہ ہیں ان کے مکانات
کہ ان کی ہلاکت کے بعد بہت کم آباد ہو سکے ہیں اور دراصل حقیقی
مالک اور وارث تو ہم ہی ہیں۔ (قصص:۵۸)

خود سرکار دو عالم ﷺ نے بھی اپنی زندگی نہایت سادگی سے گزاری۔ لوگو
کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی اور سربراہ ریاست کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ایاک والتنعم، فان عباد الله لیسوا بالمتنعمین﴾
(مشکوۃ باب فضل الفقراء)

''عیش کوشی سے اجتناب کرو، کیونکہ اللہ کے بندے عیش کوش نہیں
ہوتے۔''

رسول اللہ ﷺ کی انہی تعلیمات کی روشنی میں سیدنا ابوبکرؓ نے اپنی زند
گزاری، خصوصی طور پر جب خلافت کا بارگران آپ کے کاندھوں پر پڑا تو آپ نے ا
زندگی کو پہلے سے بھی سادہ بنا لیا۔ چنانچہ آپ کا یومیہ وظیفہ پہلے پانچ درہم تھا پھر سا
درہم ہو گیا۔ سیوطیؒ نے روایت نقل کی ہے کہ سیدنا ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت سی
عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا سے فرمایا کہ ''دیکھو! یہ اونٹنی جس کا ہم دودھ پیتے ہیں، اور یہ
پیالہ جس میں کھاتے پیتے ہیں، اور یہ چادر جس کو میں اوڑھے ہوئے ہوں، یہ سب
بیت المال کا ہے۔ ہم ان سے اسی وقت تک نفع اندوز ہو سکتے تھے جب تک می
مسلمانوں کے امور خلافت انجام دیتا تھا۔ جس وقت میں مر جاؤں تو یہ تمام سامان عم
دے دینا۔'' چنانچہ جب آپ کا انتقال ہو گیا تو سیدہؓ نے یہ تمام اشیاء سیدنا ابوبکرؓ کے
ارشاد کے مطابق بیت المال کو واپس کر دیں۔ سیدنا عمرؓ نے یہ اشیاء وصول کر کے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے کہ انہوں نے یہ تمام تکالیف میری
وجہ سے اٹھائی ہیں۔'' (تاریخ الخلفاء:۷۸)

سیدنا عمرؓ بھی اپنے عہد خلافت میں سیدنا ابوبکرؓ کے نقش قدم پر چلتے ر
چنانچہ ابو عثمان بیان کرتے ہیں کہ ہم آذربائیجان میں تھے کہ وہاں کے گورنر کے نام سی
عمرؓ کا خط آیا۔ اس میں آپ نے عتبہ بن فرقدؓ کو لکھا کہ

Marfat.com

''خبردار! عیش کوشی سے اجتناب کرنا۔'' (سیرت عمر لابن جوزی: ۱۴۰)

اصل بات یہ ہے کہ دنیا کی رنگینیوں اور لذتوں میں انہماک انسان کو آخرت ے غافل اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں سے بے پروا کر دیتا ہے اور اپنی رگی کے صالح مقاصد کے لیے اپنا مال اور وقت صرف کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔''

ایک اسلامی ریاست اس قسم کے غیر ضروری اور تعیش پسندانہ اخراجات پر ندی لگا کر سماج کو فائدہ پہنچانا چاہتی ہے جن سے مملکت اسلامیہ میں عوام کی فلاح و بود نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں ایک اسلامی ریاست اجتماع کے مصالح کو فرد کے مصالح ترجیح دے اور اجتماع کو انفرادی اعمال کے مضرت رساں اثرات سے بچانے کے لیے اسب حدود کا پابند بنائے۔ کاروبار میں نفع کمانا جائز اور نگاہ شریعت میں مستحسن ہے ر کاروبار کیا ہی نفع کے لیے جاتا ہے، لیکن جس وقت کوئی تاجر ذخیرہ اندوزی کر کے خریدار کی سخت احتیاج کی وجہ سے فائدہ اٹھا کر زیادہ دام وصول کرے تو ہر ایسا معاہدہ یع فاسد ہے۔ اور جو شخص نرخ گراں کرنے کی غرض سے ذخیرہ اندوزی کرے وہ سرکار وعالم ﷺ کے نزدیک غلط کار ہے۔ اور اللہ اس سے بری الذمہ ہے۔ (مستدرک حاکم: ۲/۱۲) اور جو شخص مسلمانوں کے بازار کے نرخ میں اس لیے دخل دے کر اسے گراں کر دے تو اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قیامت کے روز اسے زبردست آگ میں جھونک دے۔ (مسند ابی داؤد طیالسی: ۲۵، مستدرک حاکم: ۲/۱۳)

اور فقہائے اسلام نے لکھا ہے:

> ''مضطر کی خرید و فروخت فاسد ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص کو کھانے پینے یا لباس وغیرہ (ضروریات زندگی سے متعلق) اشیاء کی شدید ضرورت ہو اور فروخت کرنے والا بازار کے بھاؤ سے زیادہ قیمت وصول کرنے پر اصرار کرے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ فروخت کرنے والا فروخت کرنے پر مجبور ہو اور خریدنے والا بازار کے بھاؤ سے بہت کم دام پر سودا چکانا چاہے۔'' (ابن عابدین شامی: ۴/۴۴)

اسلام میں یہ بھی سادگی ہی کا ایک حصہ ہے کہ بازار میں اشیاء صرف کی قیمتیں

Marfat.com

معمولی ہوں تا کہ لوگوں کو خریدنے میں آسانی ہو۔ اگرچہ اشیائے صرف کی قیمتیں
کرنا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اس سے روکا ہے کیونکہ قیمتوں
میں اضافہ اس وقت ہوگا جب سپلائی اور ڈیمانڈ (Supply and Demand)
طلب اور رسد پر کوئی پابندی یا رکاوٹ ہو۔ کیونکہ ان میں اگر کوئی بندش اور قدغن نہ
اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اضافہ ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے حکومت کو اشیائے صرف
قیمتیں مقرر کرنے سے روکا گیا، لیکن اگر ضرورت عامہ کا دفعیہ اس کا متقاضی ہو تو قیمت
مقرر کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ ''اگر غلہ کے تاجر من مانی قیمتیں وصول
کرتے ہوں اور معقول قیمت سے زائد دام وصول کرتے ہوں (ویتعدون عن القیمۃ
تعدیاً فاحشاً) اور قاضی یا سربراہ ریاست نرخ مقرر کرنے کے علاوہ کسی دوسرے طریقے
سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہ کرسکتا ہو تو ایسی صورت میں اہل الرائے اور صاحب
بصیرت افراد کے مشورہ سے قیمتیں مقرر کردینے میں کوئی حرج نہیں۔'' (ہدایہ: ۴/۱۲۶)

سیدنا عمرؓ نے سرکار دو عالم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق اسلامی ریاست
ایک فلاحی مملکت اس وقت بنایا جب کہ پوری دنیا میں کوئی فلاحی مملکت نہ تھی۔ بلکہ دنیا
بڑی بڑی حکومتیں ٹیکسوں کے ذریعہ لوگوں کے خون کو چوس کر اپنے حکام اور سربراہوں
کے عیش و آرام کے لیے ان کو صرف کرتی تھیں، اور خود ان کے عوام فقر و مسکنت کی چکی
میں پس رہے ہوتے تھے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''سیرت عمر فاروقؓ''
اسلامی ریاست کی سب سے پہلی ذمہ داری کفالت عامہ، معاشی ترقی کا اہتمام اور تقسیم
دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا ہے۔ علاوہ ازیں اصول شریعت کے
مطابق اخراجات کرنا، کفایت شعاری کو اپنا اصول زندگی بنانا، سادگی سے اپنی زندگی گزارنا
کیونکہ جب حکومت کے اعلیٰ افسران اپنی زندگیاں سادگی سے گزاریں گے تو عوام بھی ان کو
دیکھ کر سادگی کو اپنائیں گے جس سے تبذیر و اسراف کی عادت قوم میں ختم ہوگی۔

سیدنا عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں گورنروں میں سادگی پیدا کرنے کو قانونی
شکل دے رکھی تھی اور جب کبھی کسی شخص کو گورنر مقرر فرماتے تو کبار صحابہ کرامؓ کی موجودگی
میں اس سے عہد لیتے کہ وہ (ترکی) گھوڑے پر سوار نہ ہوگا۔ باریک کپڑے نہیں پہنے

Marfat.com

چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا، دروازہ پر دربان نہ رکھے گا اور اہل حاجت کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھے گا۔ (کتاب الخراج لابی یوسف:٦٦)

آپ نے سادگی کو نہ صرف قانونی شکل دی بلکہ اس کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ اس کے لیے ایک تو آپ نے اپنے جاسوس رکھے ہوئے تھے جو گورنروں کی کارکردگی، اخراجات میں کفایت اور ذاتی زندگی میں سادگی اپنانے کی اطلاع دیتے تھے۔ دوسرا آپ نے گورنروں کو یہ حکم دیا ہوا تھا کہ وہ حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں حاضر ہوں، اور ان کی حاضری پر عام اعلان کیا جاتا کہ اگر کسی شخص کو کسی گورنر کے خلاف کوئی شکایت ہو تو وہ بغیر کسی ڈر خوف کے بیان کرے۔ چنانچہ لوگ اپنی شکایات پیش کرتے اور آپ ان کا تدارک فرماتے۔ اگر آپ کو پتہ چل جاتا کہ کسی گورنر نے کسی پر کوئی زیادتی کی ہے تو اسے مجمع عام میں سزا دی جاتی۔ چنانچہ سیدنا عیاض بن غنمؓ سرکار دو عالم ﷺ کے جلیل القدر صحابی اور مصر کے ایک علاقہ کے عامل تھے۔ بارگاہ خلافت میں شکایت پہنچی کہ سادگی کے اصول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے باریک کپڑا پہنتے ہیں اور گھر کے باہر دربان مقرر ہے۔ اطلاع کا پہنچنا تھا کہ قانون احتساب حرکت میں آ گیا۔ فوراً محمد بن مسلمہؓ "افسر تحقیقات" کو تحقیقات کے لیے بھیجا اور حکم دیا گیا کہ اگر یہ اطلاع درست ہو تو عیاض بن غنمؓ کو فوراً بارگاہ خلافت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ محمد بن مسلمہؓ مصر پہنچے اور سیدھے سیدنا عیاض بن غنمؓ کے گھر گئے۔ دیکھا کہ واقعی دروازہ پر دربان ہے اور عیاض بن غنمؓ باریک کپڑا پہنے گھر میں بیٹھے ہیں۔ سیدنا محمد بن مسلمہؓ عامل مصر کو اسی ہیئت اور لباس میں لے کر مدینہ آئے۔ سیدنا عمرؓ نے ان کا باریک کرتہ اتروایا اور بالوں کا موٹا کرتہ پہنا کر جنگل میں بکریاں چرانے کا حکم دیا۔ عیاضؓ کو انکار کی مجال نہ تھی۔ بار بار یہی کہتے تھے کہ اس سے مر جانا بہتر ہے۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے فرمایا: "یہ تو تمہارا آبائی پیشہ ہے، اس میں عار کیوں ہے؟" عیاضؓ نے دل سے توبہ کی اور جب تک زندہ رہے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور احسن طریق سے انجام دیتے رہے۔ (کتاب الخراج:٦٦، طبری:٣/٢٠٧)

اسی طرح سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ رشتہ میں سرکار دو عالم ﷺ کے ماموں (اسد الغابہ:٢/٢٩١) اسلام لانے میں چھٹے یا ساتویں شخص، غزوہ بدر، غزوہ احد، فتح مکہ،

Marfat.com

غزوۂ طائف اور دیگر غزوات کے جانباز مجاہد، عشرہ مبشرہ کے ایک فرد، فاتح ایران، ا
صفات کے حامل، لیکن بتانے والے نے جب بتایا کہ انہوں نے کوفہ میں ایک محل تعمیر کر
ہے جس میں ایک ڈیوڑھی بھی ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو گورنر تک پہنچنے میں رکاو
ہونے کا اندیشہ ہے تو آپ نے اسی وقت سیدنا محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا کہ اس بات کی تحقیق
کریں۔ اگر واقعی ڈیوڑھی بنی ہوئی ہے تو وہ ''قصر سعد'' نہیں ''قصر فساد'' ہے۔ اسی وقت
اس ڈیوڑھی کو آگ لگا دیں۔ چنانچہ سیدنا محمد بن مسلمہ نے آپ کے اس حکم کی تعمیل م
کوفہ کی اس ڈیوڑھی کو آگ لگا دی اور سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ اس منظر کو خاموشی
دیکھا کیے۔

آج کل کے اس مغرب زدہ دور میں جب کہ تمام انسانی اقدار تبدیل ہو چ
ہیں، کوئی شخص زبان اعتراض دراز کرے کہ گورنروں پر اس قدر سختی اچھی نہیں اور نہ ہی ا
قدر سادگی سے دنیا کا کام چلتا ہے؟ لیکن ملک میں کرپشن کو روکنے کا یہی ایک ذریعہ
کہ ارکان حکومت اور عہدہ دارانِ سلطنت سادگی اختیار کریں۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے ا
یہ بالکل درست ہے کہ ''الناس علیٰ دین ملوکھم'' یعنی لوگ اپنے بادشاہوں
دین اور طور طریقوں پر ہوتے ہیں۔ حکومت کے وزراء اور سیکرٹریوں کو لوگ جو کرتا دیکھ
ہیں خود بھی وہی کرنا شروع کر دیتے۔ یہ اونچے عہدوں پر فائز حضرات اگر سادگی کی زند
گزاریں تو ملک کے عوام بھی سادگی کو اپنائیں گے۔ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت کی مث
ہمارے سامنے ہے۔ ان کے وزراء کے لباس اور خانگی زندگی کے تمام شعبوں میں ساد
پائی جاتی ہے، اس وجہ سے ان کے عوام بھی سادگی کے خوگر ہیں۔ ان کے ہاں نیلی
کاروں کی خریداری کا وہ جھرمٹ نہیں ہے جو ہمارے ہاں ہے۔ حکومت کے اعض
جوارح اگر سادہ زندگی گزاریں گے تو لوگوں میں بھی ان کی طرح سادہ زندگی گزارنے
عادت پیدا ہو گی، لیکن اگر وہ ان کو عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے دیکھیں گے تو ع
کے دلوں میں بھی عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کی عادت پیدا ہو گی۔ سیدنا عمرؓ
ارکان سلطنت پر سختی کی لیکن عوام الناس کو اس بارہ میں کچھ نہیں کہا۔ چنانچہ حکومت
عمال کی سادگی نے عوام کے طرز معاشرت میں بھی سادگی پیدا کر دی، لیکن جہاں آ

Marfat.com

نے دیکھا کہ عمال حکومت کو بڑے سروسامان سے رہنا سیاسی مصلحت کا تقاضا ہے وہاں آپ نے بالکل تعرض نہیں کیا جیسا کہ بیت المقدس کے دورہ کے وقت آپ نے بعض صحابہ کرام کو اچھا لباس پہنے ہوئے دیکھا تو پہلے تو آپ کو ان کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر غصہ آیا لیکن جب انہوں نے کہا کہ ہمارا یہاں رومیوں سے ہر وقت سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ان کی نظر میں اس کے بغیر سلطنت کا رعب و داب قائم نہیں رہتا تو پھر آپ ان کے اس جواب سے خاموش ہو گئے اور ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

(4) اسلامی ریاست اپنے اخراجات اس طرح کرے کہ عام شہریوں اور خصوصاً غرباء اور مساکین کو زیادہ فائدہ ہو۔ اسلام کے مالیاتی نظام میں ٹیکسوں کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک فلاحی ریاست قائم ہو جس میں امراء کی دولت ٹیکسوں کے ذریعہ غرباء تک پہنچائی جائے تاکہ ملک میں عدل اجتماعی قائم ہو اور اسلامی ریاست کا کوئی شہری بلا تمیز نسل و مذہب محروم المعیشت نہ رہے۔ پورے معاشرے میں دولت گردش کرے اور پیسہ ہر شخص کی جیب تک پہنچے۔

عدل اجتماعی کے اس اصول کے نظائر سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ کی زندگیوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ سیدنا عمرؓ نے تو اس بارہ میں مختلف مواقع پر اپنے گورنروں کو ہدایات بھی دیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا:

”اگر یہ سچ ہے کہ روپیہ کی مقدار وہ ہے جو تم مجھے بتا رہے ہو تو پھر یمن کے رہنے والے چرواہے تک کا اس مال میں حصہ ہے، بایں حالات کہ سفر کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتا تا ہوا ہو۔“ (کتاب الخراج لابی یوسف:۴۶)

سیدنا عمرؓ کے اس قول میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ جنہیں سیدنا عمرؓ نے ایک علاقے کا خراج وصول کرنے کے لیے مقرر کیا تھا، آپ کی خدمت میں ایک لاکھ درہم یا دینار لے کر آئے تو سیدنا عمرؓ نے اس رقم کو بہت زیادہ خیال کیا اور یہ ارشاد فرمایا جو اوپر نقل کیا گیا ہے۔

رعایا کی ضروریات زندگی کی تکمیل کا سیدنا عمرؓ کو کتنا خیال تھا، اس کا اندازہ آپ کے اس خطبہ سے کیا جا سکتا ہے جو قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سنانے کے بعد آپ نے عوام

کے سامنے دیا تھا، آپ نے فرمایا تھا:

''مجھے اس بات کی انتہائی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی تمہاری کوئی ضرورت دیکھوں اسے پورا کروں، جب تک ہم سب مل کر اسے پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں۔ جب ہمارے پاس دولت اتنی نہ رہ جائے تو ہم باہمی امداد کے ذریعہ گزراوقات کریں گے یہاں تک کہ سب کا معیارزندگی ایک سا ہو جائے۔ کاش تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کس قدر خیال ہے، لیکن میں یہ بات تمہیں اپنے عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھوں بلکہ اگر میں اس کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھوں بلکہ تمہاری شی سمجھ کر تمہاری طرف واپس کردوں اور تمہاری خدمت کے لیے تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو، تو میں تمہارے ذریعہ فلاح پاؤں گا۔ اگر میں اسے اپنا بنالوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے حقوق کے مطالبہ کے لیے اپنے گھر آنے پر مجبور کردوں تو تمہارے ذریعہ میرا انجام خراب ہوگا۔ دنیا میں کچھ عرصہ میں خوشی منالوں گا اور عیش وعشرت کرلوں گا (غیر ملکی دورے کرلوں گا جیسا کہ آج کل پاکستان کے سربراہوں کی ذہنی نہاد ہوگئی ہے۔) لیکن آخرت میں میرا انجام خراب ہوگا اور میں عرصہ دراز تک غمگین رہوں گا۔ میرا حال یہ ہوگا کہ نہ کوئی مجھ سے کچھ کہنے والا ہوگا اور نہ کوئی میری بات کا جواب دے گا کہ میں اپنا کوئی عذر بیان کر کے معافی حاصل کرسکوں۔'' (البدایہ والنہایہ: ۷/۴۶)

تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ جب بھی مسلمان حکمرانوں نے اسلامی ہدایات کو اپنا راہ نما بنایا تو انہوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور اس کا سرعام اعلان کیا۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ کے ہم نام اور عزیز عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو آپ

Marfat.com

کفالت عامہ اور عدل اجتماعی کی ذمہ داری کی گراں باری محسوس کر کے رونے لگے۔ آپ کی اہلیہ فرماتی ہیں کہ میں ایک بار رات کو آپ کے پاس گئی۔ آپ اپنے مصلی پر بیٹھے ہوئے تھے اور زار و قطار رو رہے تھے۔ آپ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی بلکہ آنسو ڈاڑھی سے بارش کے قطروں کی طرح نیچے گر رہے تھے۔ میں نے کہا: ''کوئی نئی بات ہو گئی؟'' آپ نے روتے ہوئے فرمایا:

''امت محمدیہ کی مکمل اور پوری ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے، لہٰذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد غریب الدیار قیدیوں، بوڑھے اور نحیف و ناتواں افراد اور ان لوگوں کے بارہ میں سوچ رہا تھا جو بکثرت اہل و عیال والے ہیں لیکن ان کے پاس مال نہیں ہے۔ اور مختلف علاقوں میں بسنے والے اسی قسم کے دوسرے افراد کے بارہ میں متفکر تھا۔ مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے روز مجھ سے ان سب لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میرے مقابلہ میں ان لوگوں کے وکیل رسول اللہ ﷺ ہوں گے۔ مجھے ڈر لگا کہ جرح میں میری بات درست ثابت نہ ہو سکے گی تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا۔''

(ابن اثیر: ۲۴/۵، کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۰، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۱۸۹، سیرت عمر بن عبدالزیز لابن محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم: ۱۷۸)

نہ صرف یہ کہ آپ کو اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کو پورا پورا شعور تھا بلکہ آپ نے واضح طور پر اعلان کر رکھا تھا کہ

''تم میں سے جس کسی کی بھی کسی ضرورت کا مجھے علم ہوگا اس کی وہ ضرورت پوری کرنے کی میں حتیٰ الامکان پوری پوری کوشش کروں گا۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم: ۴۱)

اور تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ انہوں نے ان کی وہ سب ضرورتیں پوری

Marfat.com

کیں، لیکن اپنی ضرورتیں پوری نہ کر سکے۔ خود ان کے اپنے بچے بھوکے رہتے لیکن دوسروں کے بچوں کو انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ عید کے روز ان کے اپنے بچے پرانے کپڑے پہنتے تھے لیکن دوسرے بچوں کو انہوں نے نئے کپڑے پہنائے۔

سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جب بھی کوئی ضرورت مند آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس کی وہ ضرورت پوری کرنے کا اہتمام فرمایا۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی:۵۶)

آپ کو اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ رعایا فقر و فاقہ سے نجات پائے اور اس کی معاشی حالت بہتر ہو جائے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک شخص مدینہ طیبہ سے آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ ''فلاں مقام پر جو فقیر بیٹھا کرتے تھے ان کا کیا حال ہے؟'' اس نے بتایا کہ وہ لوگ اب وہاں نہیں بیٹھتے، اللہ نے ان کو وہاں بیٹھنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی:۷۶)

مملکت اسلامیہ کی ان گراں بار ذمہ داریوں کے بار دوش سے سبکدوش ہونے کے لیے وہ دن رات متفکر رہتے۔ اسی فکر میں ان کا انتقال ہوا اور ان کی اہلیہ محترمہ فاطمہ اور دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے جسم پر گوشت کی بجائے صرف ہڈیاں نظر آتی تھیں۔

سیدنا عمرؓ کو اس اجتماعی عدل کی بڑی فکر تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

''بخدا! اگر میں زندہ رہ گیا تو اہل عراق کی بیواؤں کو ایسا کر چھوڑوں گا کہ میرے بعد وہ کسی امیر کی محتاج نہیں رہیں گی۔''

(محلی لابن حزم:۶/۱۵۸)

آپ کے غلام اسلمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا عمرؓ کو یہ فرماتے سنا ہے:

''اگر میں آئندہ سال اس موقع تک زندہ رہا تو تقسیم مال میں آخر کے لوگوں کو سر فہرست لوگوں سے ملا دوں گا تاکہ سب برابر ہو جائیں۔'' (کتاب الاموال:۲۶۳)

اسی روایت کو طبقات میں ابن سعد نے ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

''میں نے سیدنا عمر بن خطابؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ خدا کی قسم اگر میں

Marfat.com

اگلے سال اس موقع پر زندہ رہا تو آخر کے لوگوں کو شروع کے لوگوں
سے ملا دوں گا اور ان سب کو حصہ کے اعتبار سے ایک جیسا کر دوں گا۔"

(طبقات ابن سعد: ۳/۳۰۱)

امام ابو یوسفؒ کی روایت اس بارہ میں زیادہ واضح ہے کہ آپ نے فرمایا:

"(راوی کہتا ہے) جب آپ نے یہ دیکھا کہ فئے کا مال بہت زیادہ آنے لگا ہے تو فرمایا: "اگر میں آئندہ سال اس شب تک زندہ رہا تو فئے کے رجسٹر میں درج آخر کے لوگوں کو شروع کے لوگوں سے ملا دوں گا تا کہ سب کو برابر وظیفے ملنے لگیں۔ (حتی یکونوا فی العطاء سواء) لیکن آپ اس سے قبل انتقال فرما گئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔" (کتاب الخراج: ۵۵)

عدل اجتماعی کے اس سلسلہ میں سیدنا علیؓ کا قول بھی نہایت اہم ہے۔ فرماتے ہیں کہ "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دولت مندوں کے مال پر ان کے غریبوں کی معاشی حالت کو بدرجہ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔" (محلی لابن حزم: ۶/۱۵۶)

ابن حزمؒ سیدنا علیؓ کے اس قول کی قانونی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سربراہ ریاست ارباب دولت کو غرباء کی معاشی کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔" (محلی لابن حزم: ۶/۱۵۸)

تمام اسلامی حکومتوں میں ایک شعبہ "حسبہ" کا ہوتا تھا۔ اس شعبہ کا کام یہ تھا کہ اگر کسی معروف کو عملاً ترک کیا جا رہا ہو یا کسی منکر کا ارتکاب کیا جا رہا ہو، اور یہ خرابیاں اعلانیہ نمودار ہو جائیں تو ان کو دور کیا جائے۔ (الاحکام السلطانیہ، ماوردی: ۲۰۸، الاحکام السلطانیہ لابی یعلی: ۲۶۸)

چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے بھی اپنے زمانہ کے حالات اور اپنے معاشرہ کی ضرورت کے پیش نظر بعض کاروباری سرگرمیوں پر پابندی عائد فرما دی تھی، اور کاروباری معاملات کو چند آداب وضوابط کا پابند بنایا تھا کیونکہ شریعت کی نگاہ میں اجتماع کے مصالح

Marfat.com

چند افراد کے مصالح سے زیادہ اہم ہیں۔ سرکار دو عالم ﷺ نے کاروباری سرگرمیوں کی نگرانی اور کاروباری افراد کو اسلامی حدود کا پابند رکھنے کے لیے ایک خصوصی افسر مقرر کیا تھا۔ سیدنا عمرؓ اس کام کی نگرانی خود بھی فرماتے تھے اور آپ نے بازار کی نگرانی کے لیے سیدنا عبداللہ بن عتبہ کو خاص طور پر مامور کیا ہوا تھا۔

(کنز العمال: ج ۳ روایت نمبر ۲۶۵۲، ۲۶۵۸، موطا امام مالک، باب عشور اہل الذمہ)

چنانچہ ایک بار آپ نے پانی ملے دودھ کو زمین پر بہا دیا تھا تا کہ ملاوٹ کرنے والوں کو عبرت ہو اور وہ سماج دشمن سرگرمیوں اور خلاف اسلام حرکات سے باز آ جائیں۔

(5) اسلامی ریاست کے اخراجات کے لیے اسلام نے ایک اصول یہ بھی رکھا ہے بلکہ یہ ایک اہم ترین اصول ہے اور وہ ہے امانت و دیانت۔ اس اصول کی رو سے اور حقیقت میں بھی سرکاری خزانہ کسی بھی سربراہ ریاست کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا امین (Trustee) ہوتا ہے، اور وہ شرعاً اور اخلاقاً اس قانون کا پابند ہے کہ وہ بیت المال کو جو قوم کی ایک امانت ہے، قوم کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کرے نہ کہ اس کو اپنی ذات اور اپنی سیاست کو چمکانے کے لیے صرف کرے۔ اگر اس نے اس مال کے خرچ کرنے میں امانت اور دیانت سے کام نہ لیا تو وہ نہ صرف اللہ کے ہاں بلکہ قوم کے سامنے بھی جواب دہ ہو گا۔

''اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ جس شی کے تم امین بنائے گئے ہو اس کو مالک تک کے پاس امانت کے ساتھ واپس کر دو۔'' (النساء: ۵۸)

اگر اس نے مستحق اور اہل لوگوں کو یہ مال نہ پہنچایا اور صرف اپنے ساتھیوں کو خوش رکھنے کے لیے اور اپنی حلقہ میں اپنی سیاست چمکانے کے لیے قوم کے ٹیکسوں اور سرکاری خزانے کی رقوم کو خرچ کیا تو وہ خیانت کے جرم کا مرتکب ہو گا اور خدا کے حضور جواب دہ بھی۔ اور قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿ان اللہ لایحب الخائنین﴾ (الانفال: ۵۸)

''بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

اگر صدر ریاست سرکاری خزانہ کے مال کو امانت سمجھ کر استعمال کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت بھی ہوگی اور برکت بھی، ملک بھی ترقی کرے گا، قوم بھی خوش حال ہوگی اور اس سے خوش ہوگی اور وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو ہوگا۔

سرکار دو عالم ﷺ پر مال غنیمت (جو دراصل بیت المال کا ہی مال ہوتا ہے) کی منصفانہ تقسیم کے باوجود جب ایک شخص کو طبعاً کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی برأت میں جو آیت نازل فرمائی وہ تمام سربراہان مملکت کے لیے سرکاری اموال اور ان کی تقسیم اور اخراجات کے بارہ میں ایک زریں اصول کا درجہ رکھتی ہے۔

﴿ماکان لنبی ان یغل، ومن یغلل یات بما غل یوم القیامۃ﴾

(آل عمران:۱۶۱)

''نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ کچھ چھپائے (یعنی خیانت کرے) اور جو کوئی بھی غلول (یعنی خیانت) کرے گا وہ قیامت کو اسے لے کر آئے گا۔''

اس آیت میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا افسر بھی خیانت کرے تو وہ بھی مواخذہ سے نہیں بچ سکتا کیونکہ سرکار دو عالم ﷺ جن کی برأت کے لیے یہ آیت نازل ہوئی ہے، سے بڑا اور کوئی دنیا میں نہیں ہوسکتا۔

خلفائے راشدین نے سرکاری خزانہ کو قوم کی امانت تصور کرتے ہوئے صرف کیا۔ ان کے ذہنوں میں یہ تصور کبھی پیدا ہی نہیں ہوا کہ یہ ان کا ذاتی مال ہے۔ بلکہ سیدنا عمرؓ کا تو یہ ایک مشہور قول ہے کہ ''مجھ کو بیت المال میں اتنا ہی حق ہے جتنا کہ یتیم کے ولی کو یتیم کے مال میں۔ اگر میں خوش حال ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر حاجت مند ہوں گا تو دستور کے مطابق کھانے کے لیے لوں گا۔'' (الاسلام والحضارۃ العربیۃ:۱۲۸)

یہی وجہ تھی کہ سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنی ساری زندگی زہد و قناعت میں گزاری۔ سیدنا طلحہؓ فرمایا کرتے تھے کہ قدامت اسلام اور ہجرت کے لحاظ سے بہت سے لوگوں کو سیدنا فاروق اعظمؓ پر فوقیت حاصل ہے لیکن زہد وقناعت میں وہ سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کی فوجیں ہر محاذ پر شکست کھا رہی ہیں، مختلف محاذوں پر جرنیلوں

Marfat.com

اور کمانڈروں کو خطوط لکھے جارہے ہیں، پوری دنیا کے بادشاہوں کے دلوں پر آپ کی شخصیت کی ہیبت طاری ہے، لیکن آپ کی اپنی حالت یہ ہے کہ کئی کئی پیوند لگا کپڑا زیب تن ہے، عمامہ پھٹا ہوا، چپل بوسیدہ، بیوہ عورتوں کے گھروں میں پانی بھرنے کے لیے مشک کاندھے پر، سونے کے لیے خاک کا بستر، چشم فلک نے ایسا سربراہ مملکت اس سے پہلے کم ہی دیکھا ہوگا۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو اپنا موٹا کرتہ پیوند لگانے کے لیے دیا۔ اس نے بجائے اس پرانے کرتہ کے ایک نرم و ملائم کپڑے کا کرتہ پیش کیا۔ سیدنا عمرؓ نے وہ نرم و ملائم کرتہ اس کو واپس کر دیا اور اپنا وہی پرانا کرتہ لے کر فرمایا: ''یہی اچھا ہے کیونکہ اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔'' (کنز العمال: ۶/۳۵۰)

بارہا دیکھا گیا کہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ حج کے لیے جارہے ہیں۔ دوران سفر خیمہ یا شامیانہ کبھی ساتھ نہیں رکھا۔ جہاں ٹھہرے وہیں کسی درخت پر چادر ڈال کر سو رہے۔ طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ کا روزانہ خانگی خرچ صرف دو درہم تھا۔ آج کل کے حساب سے اس کا حساب لگالیں۔ (منتخب الکنز: ۴/۴۱۱)

سیدنا حسن بن علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیدنا عمرؓ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمارہے تھے۔ میں نے شمار کیا تو آپ کے تہبند کو بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ (کنز العمال: ۶/۳۴۷)

بعض کپڑوں پر چمڑے کے پیوند بھی ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ عتبہ بن فرقدؓ شریک طعام تھے۔ دسترخوان پر سوکھی روٹی اور ابلا ہوا گوشت تھا۔ عتبہؓ زبردستی حلق سے سوکھی روٹی کے ٹکڑے نیچے کر رہے تھے۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے دیکھا تو فرمایا: ''عتبہ! اگر تم سے نہیں کھایا جاتا تو نہ کھاؤ۔'' عتبہؓ نے جواب دیا: ''امیر المومنین! اگر آپ اپنے کھانے پینے میں کچھ خرچ کریں گے تو مسلمانوں کا مال اس سے کم نہیں ہو جائے گا۔'' آپ نے فرمایا: ''افسوس! تم دنیوی عیش و عشرت کی ترغیب دیتے ہو۔'' (کنز العمال: ۶/۳۴۸)

سیدنا عمرؓ فرمایا کرتے تھے: ''خدا کی قسم! میں زندگی کی لذتوں کی پروا نہیں کرتا کہ میں اس بات کا حکم کروں کہ ایک چھوٹی بکری کی کھال نکالی جائے اور وہ بھونی جائے اور یہ حکم دوں کہ اعلیٰ درجہ کے گیہوں سے ہمارے لیے روٹیاں بنائی جائیں اور ہمارے

Marfat.com

لیے کٹے ہوئے مشکیزوں میں نبیذ بنائی جائے اور اس کا رنگ اس طرح ہو جائے جیسے چکور کی آنکھ ہوتی ہے۔ ہم اسے کھائیں اور پئیں، لیکن ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ہمارا مال آخرت کے لیے باقی رہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

''تم اپنی لذتوں کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے اور ان کو خوب برت چکے، سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی، اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔'' (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم: ۱/۴۹)

ایسا ہی آپ کا ایک واقعہ اور بھی ہے جس کو سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ نے روایت کیا ہے، جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ اگر میں چاہوں تو نرم معیشت اختیار کر سکتا ہوں، لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ (منتخب الکنز: ۴/۴۰۲)

ایک دفعہ سیدنا احنف بن قیسؓ رؤسائے عرب کے ساتھ آپ کو ملنے کے لیے گئے۔ دیکھا کہ آپ آستین چڑھائے ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔ احنفؓ کو دیکھ کر فرمایا: ''تم بھی میرا ساتھ دو کیونکہ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق ہے؟'' ایک شخص نے آپ کی اس تگ و دو اور جدوجہد دیکھ کر کہا: ''امیر المومنین! آپ اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ کسی غلام کو حکم فرمایئے وہ اس اونٹ کو ڈھونڈ لائے گا۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

﴿ایّ عبد اعبد منّی﴾

''یعنی مجھ سے بڑھ کر اور کون غلام ہو سکتا ہے؟''

ایک مرتبہ سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ نے بیت المال کا جائزہ لیا تو اس میں سے صرف ایک درہم نکلا۔ انہوں نے وہ درہم سیدنا عمرؓ کے ایک بچے کو دے دیا۔ سیدنا عمرؓ کو پتہ چلا تو آپ نے وہ درہم واپس لے کر بیت المال میں جمع کروا دیا اور سیدنا ابوموسیٰ اشعری جیسے جلیل القدر صحابی رسول ﷺ کو بلا کر فرمایا: ''تمہیں سارے مدینہ میں آل عمر کے سوا اور کوئی کمزور نظر نہ آیا۔ تم چاہتے ہو کہ روز قیامت تمام امت مسلمہ کا ہاتھ میری گردن پر ہو۔ (کنز العمال: ۶/۳۵)

Marfat.com

ایک مرتبہ آپ نے ایک نہایت فربہ اور موٹا اونٹ مدینہ کی منڈی میں فروخت ہوتے دیکھا۔ پوچھا: ''یہ کس کا ہے؟'' بتایا گیا کہ آپ کے صاحبزادے عبداللہ کا۔ آپ نے عبداللہؓ سے پوچھا: ''یہ اونٹ کہاں سے آیا؟ اور اتنا موٹا تازہ کیسے ہوا؟'' انہوں نے عرض کی: ''میں نے اسے خرید کر سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا تھا۔ یہ وہاں چر کر موٹا ہو گیا ہے؟ اس لیے اسے فروخت کر رہا ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''چونکہ یہ سرکاری چراگاہ میں چر کر فربہ اور موٹا ہوا ہے، اس لیے تم اتنی ہی قیمت کے مستحق ہو جتنے میں خریدا تھا۔'' آپ نے اس اونٹ کی زائد رقم بیت المال میں جمع کرا دی۔'' (کنزالعمال: ۶/۳۵)

آپ نے بیت المال کی اس قدر حفاظت فرمائی کہ ایک آدمی اس کے بارہ میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ سیدنا علیؓ نے ایک مرتبہ سیدنا فاروق اعظمؓ کو دیکھا کہ سواری کو دوڑائے جا رہے ہیں۔ پوچھا: ''کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟'' فرمایا: ''بیت المال کا ایک اونٹ فرار ہو گیا ہے اسے تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ یہ سن کر سیدنا علیؓ نے فرمایا:

﴿اذللت الخلفاء بعدک﴾

''آپ نے اپنے بعد والے خلفا کو مشقت میں ڈال دیا۔''

سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''ابوالحسن! یہ کوئی قابل ملامت شی نہیں ہے۔ اس ذات کی قسم جس نے جناب رسول اللہ ﷺ کو رسالت ونبوت کے ساتھ بھیجا، اگر بکری کا بچہ بھی فرات کے کنارے جا کر گم ہو جائے تو قیامت کے روز اس کی بھی عمرؓ سے پرسش ہوگی۔

(سیرت عمر بن خطاب ابن جوزی: ۱۴۰، البدایہ والنہایہ: ۷/۳۶)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں سرکاری خزانے کے مداخل اور مخارج دونوں خراب ہو چکے تھے اور قومی خزانہ بجائے پبلک پراپرٹی کے کافی حد تک پرائیویٹ پراپرٹی بن چکا تھا۔ آپ نے مداخل کی اصلاح بھی کی اور ذرائع آمدنی میں جو جو خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، ان سب کی اصلاح کی۔ پھر ان کے مصارف میں جو خرابیاں واقع ہو چکی تھیں، ان کی اصلاح بھی فرمائی۔ چنانچہ یزید بن مہلب بن ابی صفرہ گورنر خراسان کو خیانت اور بددیانتی کے جرم میں معزول کر کے پس دیوار زندان کر دیا گیا۔ (یعقوبی: ۲/۲۱۳)

بیت المال کی حفاظت کا آپ نے اتنا سخت انتظام کیا کہ ایک دفعہ یمن

Marfat.com

بیت المال سے ایک دینار گم ہو گیا جو کہ سرکاری خزانہ کے لیے ایک معمولی شی تھی، لیکن آپ نے وہاں کے افسر خزانہ کو لکھا کہ میں تمہاری امانت اور دیانت کو متہم نہیں کرتا، لیکن تمہاری بے پروائی کو ایک سنگین جرم قرار دیتا ہوں اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے مال کا مدعی ہوں۔تم پر فرض ہے کہ تم شرعی قسم کھاؤ۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز:۵۸)

آپ نے اپنی کارکردگیوں اور اعمال سے کارکنان حکومت کو یہ احساس دلایا کہ ہم خزانہ کے مالک نہیں ہیں بلکہ متولی ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنی مرضی سے جتنا چاہیں اور جہاں چاہیں خرچ کریں۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں روایت نقل کی ہے کہ ابوبکر بن حزم نے سلیمان بن عبدالملک کے آخری عہد خلافت میں کاغذ، قلم، دوات اور روشنائی کے دفتری اخراجات کے اضافہ کے لیے لکھا تھا۔ یہ خط ابھی بارگاہ خلافت میں پہنچا ہی تھا کہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا، لہٰذا وہ اس بارہ میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔خلیفہ کے انتقال کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ مسند خلافت پر بیٹھے تو ابوبکر بن حزم کی یہ ڈیمانڈ ان کے سامنے پیش کی گئی۔ آپ نے اس کے جواب میں ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ ''وہ دن یاد کرو جب تم اندھیری رات میں بغیر روشنی کے کیچڑ میں اپنے گھر سے مسجد نبوی میں جایا کرتے تھے، اور آج خدا کی قسم! تمہاری حالت اس سے کہیں بہتر ہے۔ان چیزوں کے اخراجات میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔قلم باریک کر لو، اور سطریں قریب قریب لکھا کرو۔ اپنی اس قسم کی ضروریات میں کفایت شعاری سے کام لو۔ میں مسلمانوں کے بیت المال سے ایسی رقم صرف کرنا ہرگز پسند نہیں کرتا جس سے ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ (طبقات ابن سعد: ۲۹۶/۵، سیر اعلام النبلاء: ۱۳۲/۵)

اسی طرح کی ہدایت آپ نے دوسرے گورنروں کو بھی لکھیں کہ کوئی گورنر یا کوئی حکومتی کارکن بڑے کاغذ پر جلی قلم سے نہ لکھے۔ خود آپ کے اپنے فرامین بھی مختصر اور باریک قلم سے ہوتے۔ چنانچہ روایات میں ہے آپ کے فرامین ایک بالشت سے زیادہ نہ ہوتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۳۳/۵، طبقات ابن سعد: ۲۹۵/۵)

گویا کہ قومی خزانہ کے بارہ میں آپ نے اس قدر احتیاط فرمائی کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ قومی خزانہ میں فضول خرچی اور اسراف کی بھی روزِ قیامت پرسش ہوگی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے

اپنے جسم کا گوشت سکھا کر اور شبانہ روز کوشش کر کے بیت المال کو پھر مسلمانوں کی مشترکہ امانت بنا دیا۔ اس سے پہلے بیت المال کا روپیہ بڑے بڑے لوگوں کی جائز و ناجائز ضروریات پر خرچ ہوتا تھا لیکن آپ نے اس کا کل اندوختہ پبلک اور عوام الناس کی ضرورت کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی آمدنی کا بڑا حصہ خالص رعایا کے مفاد کے کاموں میں صرف کیا جاتا تھا۔ ملک کے تمام اپاہج اور معذور افراد کے نام حکومت کے رجسٹر میں درج تھے، ان سب کو گذر اوقات کے لیے حکومت کی طرف سے معقول وظیفہ ملتا تھا۔ (الاصابہ: ۸۰/۵) جو عمال اور کارکنانِ حکومت اس بارہ میں ذرا بھی غفلت سے کام لیتے تھے ان کی گوش مالی کی جاتی تھی، لہٰذا ہر کارکن بڑے محتاط طریقہ سے ان معاملات کو انجام دیتا تھا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ "دمشق کے بیت المال سے ایک اپاہج شخص کے وظیفہ کے سلسلے میں میمون بن مہران نے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک تو کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں صحیح اور تندرست آدمی کے برابر وظیفہ نہیں دیا جا سکتا۔ کسی طریقہ سے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو اس بارہ میں اطلاع مل گئی تو انہوں نے نہایت عتاب آمیز خط لکھا جس سے اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ (طبقات ابن سعد: ۲۸۱/۵)

عمر بن عبدالعزیزؒ نے وظیفہ کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا کہ اکثر و بیشتر لوگوں کو نقد روپیہ کے بجائے جنس وظیفہ میں دیتے تھے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو فی کس ساڑھے چار اروب کے حساب سے غلہ ملتا تھا۔ (ابن سعد: ۲۵۵/۵) قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کا بھی بیت المال میں ایک حصہ رکھا ہوا تھا۔ (ابن سعد: ۲۵۷/۵) علاوہ ازیں شیر خوار بچوں کے وظائف مقرر تھے۔ ایک عام لنگر خانہ بھی تھا جس سے فقراء اور مساکین کو کھانا بھی ملتا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۲۷۹/۵)

عام مستحقین کو صدقات اور خیرات کی رقم تقسیم ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو تقسیم مال کے لیے رقم بھیجا۔ اس نے وہاں جانے سے عذر کیا کہ آپ مجھے ایسی جگہ بھیج رہے ہیں جہاں میں کسی کو نہیں پہچانتا۔ وہاں امیر و غریب سب ہیں۔ مجھے کیا پتہ کہ صدقات و خیرات کا مستحق کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اسے دو۔ وہ یقیناً مستحق ہوگا۔" (زرقانی شرح موطا: ۲۳۷/۴) اس سے یہ پتہ

Marfat.com

چلا کہ اس زمانہ میں غیر مستحق ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا۔

ان مصارف کے علاوہ اور بھی بیت المال کے جو مفید مصارف تھے آپ بے دریغ ان نیک مصارف میں قومی خزانہ صرف کرتے۔ اس فیاضانہ داد و دہش میں قومی خزانہ پر بہت بار پڑا۔ آمدن کم اور خرچ زیادہ ہوگیا۔ اس بارہ میں بعض گورنروں نے آپ کو توجہ بھی دلائی تو آپ نے فرمایا: ''جب تک ہے دیتے چلے جاؤ۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۸۵)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے پہلے کے زمانہ کے خلفاء بیت المال کو اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھنے لگے تھے اور اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوئے اپنے آپ پر اور اپنے چہیتوں پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے حکومت کو بیت المال کا صحیح تصور دیا۔ چنانچہ انہوں نے بیت المال کا اپنے کو کسٹوڈین (Custodian) سمجھا اور بیت المال کو ہاتھ تک نہ لگایا بلکہ اس سے بالکل مستغنی رہے، ان کے نزدیک بیت المال میں صرف اس کے حق دار کا حصہ تھا خود امیر المومنین کا بھی اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کے بیٹے نے درخواست کی کہ بیت المال میں سے مجھے میری شادی کا خرچہ دیا جائے۔ آپ سے قبل خلفاء کے بیٹے اپنی شادی کا خرچہ بیت المال ہی سے کرتے تھے۔ آپ نے اپنے بیٹے کی اس عرض داشت کو مسترد کر دیا حالانکہ آپ کی واضح ہدایات تھیں کہ بیت المال سے نادار اور قلاش لوگوں کی شادیاں کروادی جائیں۔ آپ کا وہ بیٹا نادار بھی تھا اور قلاش بھی۔ اگرچہ وہ خلیفہ کا بیٹا تھا لیکن خلیفہ خود نادار تھا۔ آپ نے بیٹے کے نادار ہونے کے باوجود اس کی درخواست مسترد کر دی کیونکہ اس کی ایک بیوی پہلے سے موجود تھی۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے نہ صرف اس کی درخواست کو مسترد کیا بلکہ ناراض ہو کر اسے لکھا:

> ''خط تمہارا موصول ہوا۔ اس میں مرقوم ہے کہ میں مسلمانوں کے مال سے سوکنوں کو جمع کر دوں حالانکہ مہاجرین کے بیٹوں میں سے کسی کے پاس ایک بیوی بھی نہیں کہ وہ اس کے ذریعہ عفیف اور پاک دامن رہے۔ خبردار! آئندہ مجھے اس قسم کی کوئی درخواست نہ کرنا اور دوسرا سامان فروخت کر کے شادی کر لو۔''

ایک طرف تو اپنے بیٹے کو آپ نے یہ لکھا اور دوسری طرف کوفہ کے گورنر کو یہ لکھا کہ تم نے لکھا ہے کہ فوجیوں کو مدد دیئے کے بعد تمہارے پاس بیت المال میں رقم بچ گئی ہے، لہٰذا یہ بچی ہوئی رقم اسے دے دو جس پر واجبی قرض ہے یا پھر اس کو دے دو جس نے نکاح کر لیا ہو مگر اس کے پاس گھر کے اخراجات چلانے کے لیے نقد روپیہ نہ ہو۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم: ۲۷)

یہ وہ خلیفہ تھے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو بیت المال سے ہر قسم کا فائدہ اٹھانے اور غلاموں اور جانوروں سے انتفاع حاصل کرنے سے یک قلم محروم رکھا۔ انہوں نے اپنے جد امجد سیدنا فاروق اعظمؓ کی روش اور طریقہ پر چل کر اپنی ذاتی ضرورتوں کے لیے ذاتی چراغ جلایا اور جو پانی موسم سرما میں وضو کے لیے گرم کرتے تھے اور جو پھل وغیرہ وہ کبھی کھاتے تھے، اس پر اپنا ذاتی پیسہ خرچ کرتے تھے یہاں تک بیت المال کا عنبر جب تقسیم کیا جاتا تو اس کو کاٹتے وقت جو خوشبو پھیلتی، اس کو نہ سونگھنے کے لیے اپنی ناک بند کر لیا کرتے تھے، اور اگر آپ کے پاس سرکاری سواری پر کوئی ہدیہ بھیجا جاتا تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت سرکاری جانوروں کو چارہ کھلانے میں صرف کر دیتے تھے۔

(سیرۃ عبدالعزیز لابن جوزی: ۱۱۱، سیرۃ لابن عبدالحکم: ۵۲)

اس خلیفہ نے اپنے خواص کو بھی یہ اختیار نہ دیا تھا کہ وہ سرکاری مال یا غلام یا جانور کو اپنی ذات کے لیے استعمال کرے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک غلام نے ایک شخص کو سرکاری گھوڑے پر آپ کی اجازت کے بغیر سوار کر دیا۔ پہلے خلفاء کے لیے یہ ایک معمولی بات تھی اور اکثر وہ سرکاری سواریوں اور غلاموں کو اپنے ذاتی کاموں میں استعمال کرتے تھے، لیکن عمر ثانیؒ نے اس کو بلا کر فرمایا: ''جب تک اس کا کرایہ بیت المال میں جمع نہیں کرائے گا اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا۔'' چنانچہ اس نے اس کا کرایہ بیت المال میں جمع کرا دیا۔

(کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۸۶)

عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک بیت المال میں سب مسلمانوں کا حق تھا اور ہر شخص اس میں سے اپنے حق کے مطابق لے سکتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مستحق لوگ بیت المال میں سے اپنا حق جو بنتا ہے وہ پورا پورا لیں اور کوئی شخص ان کو ان کے حق سے محروم نہ

Marfat.com

کرے۔ان کے نزدیک سرکاری مہمان خانہ بھی حکومت کے بیت المال سے چلنا چاہیے تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک سرکاری مہمان خانہ بھی قائم کیا کیونکہ آپ کے والد عبدالعزیز نے جب وہ مصر کے گورنر تھے ایک سرکاری مہمان خانہ قائم کیا تھا۔آپ کے نزدیک قرض داروں کے لیے بھی بیت المال میں حصہ مقرر تھا جس سے ان کے قرضوں کی ادائیگی ہوتی تھی۔ایک مرتبہ آپ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ قرض داروں کے قرض بیت المال سے ادا کیے جائیں۔ گورنروں نے آپ کو لکھا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے پاس گھر، گھریلو سامان، نوکر اور گھوڑا موجود ہے لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اس پر قرض بھی ہے۔ کیا اس شخص کا قرض بھی بیت المال سے ادا کیا جائے؟ آپ نے ان کے جواب میں لکھا: ”مسلمانوں کے لیے ایک گھر کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا سر چھپا سکے۔اور اس کے لیے ایک خادم کا ہونا بھی ضروری ہے جو اندرون خانہ اور بیرون خانہ اس کا ہاتھ بٹا سکے۔اور گھوڑے کا ہونا بھی ضروری ہے جو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکے۔اور گھریلو سامان کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ اچھے طریقہ سے اپنے گھر کو چلا سکے۔ان اشیاء کے باوجود اس شخص کا شمار قرض داروں میں ہے اگر اس کے ذمہ کچھ قرض ہے، اس لیے اس شخص کا قرض اتار دیا جائے۔(سیرۃ ابن عبدالحکم: ۷۰)

عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاں بیت المال درہم و دینار جمع کرنے کا مکان نہیں کہ درہم و دینار اور سونا چاندی اس میں جمع ہو کر ایک منجمد پہاڑ بن جائیں اور ان سے سیراب کرنے والا سیلاب جاری نہ ہو۔آپ کے خیال میں مال جمع کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ اس مال سے رعایا کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔آپ کے بیت المال کے اس نظریے اور تصور نے بیت المال کے محافظین کو پریشان کر دیا کیونکہ ان کا نظریہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ان کے ہاں بیت المال کا تصور یہ تھا کہ اس میں مال جمع کیا جائے اور وہ پھر خرچ نہ ہو بلکہ جمع ہی رہے (جیسا کہ آج کل وزیر اعظموں اور صدروں کا نظریہ ہے) چنانچہ آپ اکثر و بیشتر اپنے گورنروں کو یہ لکھتے رہتے کہ بیت المال کو لوگوں کی ضروریات میں خرچ کیا جائے، اور اگر کوئی گورنر آپ کو لکھتا کہ آپ نے بیت المال کو نقصان پہنچایا ہے تو عمر ثانی اس کو جواب میں لکھتے کہ جو کچھ بیت المال میں ہے اس کو خرچ کرتے رہو، پھر جب اس

Marfat.com

میں کچھ باقی نہ رہے تو اس کو کیچڑ سے بھر دو۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۵۸)

اسلامی ریاست میں بلکہ ہر حکومت میں کچھ شہر مال دار ہوتے ہیں اور نادار۔ اس بارہ میں آپ کا نظریہ یہ تھا کہ مال دار شہر نادار شہر کی ضروریات کو پورا کر اگرچہ مالدار شہر کے پاس کچھ باقی نہ بچے۔ چنانچہ جب آپ نے مغصوبہ جاگیریں جائیدادیں واپس دلوائیں تو عراق کا مال ختم ہوگیا۔ آپ نے حکم فرمایا کہ اب شام عر کی ضروریات کو پورا کرے۔ آپ کی یہ پالیسی نہایت اچھی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ میں مملکت اسلامیہ ایک طاقتور اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے والی اکائی بن گئی اس کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جو نادار اور غریب ہو۔ اور اگر کسی شہر میں ناداری اور غریبی کا سا جاتا تو دوسرے مالدار شہر اس نادار شہر کی مدد کے لیے پہنچ جاتے اور اس کی ضروریا نہایت احسن طریق سے پوری کرتے۔

مختصر یہ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے قومی خزانہ کو قوم کے لیے وقف کر دیا دیانت دار حضرات کو ان پر مقرر کیا اور ملت اسلامیہ کے مساکین، فقراء ناداروں، مسافروں دوسرے مستحقین کے لیے بیت المال کے دروازے کھول دیئے۔ ان کے وظائف جاری اور بالغوں اور نابالغوں کے وظائف میں فرق رکھا۔ آپ نے گورنروں کو لکھا کہ پندرہ سال بچہ بالغ ہے اور اس سے کم عمر نابالغ کے حکم میں آتا ہے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۷۵)

اور اس طریقہ سے بیت المال کے مصرف میں جس قدر خرابیاں پیدا ہو تھیں، ان کو آہستہ آہستہ ختم کیا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کی بیت المال کی ان اصلاحات کے باعث اور دیانت تقسیم کنندگان کے باعث پوری مملکت میں کوئی شخص ایسا نہ رہا جو مستحق زکوٰۃ ہو۔ چنا محصل زکوٰۃ زکوٰۃ وصول کرتا اور اسی وقت ان کے فقراء اور مساکین کو جمع کر کے ان وہ تقسیم کر دیتا۔ اس سے ہر شخص خوش حال اور مالدار ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب آئندہ س فقراء اور مساکین کو زکوٰۃ اور صدقات لینے کے لیے بلایا جاتا تو صدقات قبول کرنے لیے کوئی فقیر و مسکین نہ ملتا تھا۔ چنانچہ آپ کے اڑھائی سالہ دور خلافت میں حالت گئی تھی کہ اگر ایک شخص مال کثیر لے کر آتا اور کہتا کہ یہ مال مستحق فقراء اور مساکین

Marfat.com

تقسیم کردو تو کوئی فقیر نہ ملتا اور مجبوراً اسے اپنا مال واپس لے کر لوٹنا پڑتا کیونکہ آپ نے لوگوں کو خوش حال اور مال دار بنا دیا تھا۔ چنانچہ یحییٰ بن سعید بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے مجھے صدقہ وصول کرنے کے لیے افریقہ بھیجا۔ میں نے صدقہ وصول کر کے فقراء و مساکین کو تلاش کیا تو مجھے کوئی بھی مستحق زکوٰۃ نہ ملا۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۸۵، سیرت ابن عبدالحکم: ۶۹، العقد الفرید: ۴/ ۴۳۶)

بیت المال کے دیگر مصارف:

گذشتہ صفحات میں بیت المال کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور مصارف ہیں جو اس زمانہ میں سرکاری خزانہ سے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ان میں چند ایک حسب ذیل ہیں:

(1) وظائف اور تنخواہیں:

ایسے افراد جو اسلامی ریاست کے مختلف محکموں کو اپنی خدمات فراہم کرتے ہیں ان کے وظائف اور ان کی تنخواہیں بھی سرکاری خزانہ سے ادا کی جائیں گی۔ اس میں سرکاری ملازمین کی تنخواہیں اور مسلح افواج کی تنخواہیں بھی شامل ہیں۔ یہ سرکاری خزانے کا ایک بہت بڑا مصرف ہے، اس میں افواج کے لیے اسلحہ کی خریداری بھی ہے۔

(2) قرضے:

بیت المال سے کاروباری مقاصد کے لیے شرکت اور مضاربت کی بنیاد پر قرضے بھی دیئے جا سکتے ہیں تا کہ لوگ اپنے بال بچوں کے لیے روزی کما سکیں۔

Marfat.com

مردم شماری

ظاہری نظر میں معاشیات کے مسئلہ میں مردم شماری کا عنوان کچھ عجیب سا گ
ہے، لیکن کسی ملک کے معاشی بجٹ اور معاشی نظام کے لیے اس کی بڑی اہمیت
کیونکہ جب تک ملک کی صحیح آبادی کا پتہ نہ چلے اور عوام کی معاشی زندگی کے درجات، ا
میں کمانے والوں کی تعداد اور اہل حاجت کی تعداد، زمین، کارخانے، معدنیات مداخل
مخارج اور ملکی آمدنی اور اس کے خرچ کا علم نہ ہو اس وقت تک حقیقی معنوں میں معا
توازن ملک میں قائم نہیں ہوسکتا۔

سیدنا عمرؓ نے سب سے پہلے اسلام میں مردم شماری کے اس سلسلہ کو شروع
کیونکہ آپ کے عہد خلافت میں ملکی فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہوگیا اور سلطنت اسلام
کی حدود و ثغور میں اس قدر اضافہ ہوا کہ عام آدمی کی عقل حیران تھی۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ
خلافت کے مختلف مسائل حل کرنے کے لیے ملک میں تمام افراد کی مردم شماری کرائی
آپ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے عطایا اور وظائف کے سلسلہ میں مردم شماری رج
قبائل اور منازل (مکانات) کے لحاظ سے مرتب کرائے۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چ
ہے کہ دراصل یہ خیال سیدنا عثمان بن عفانؓ نے سیدنا عمرؓ کے ذہن میں ڈالا۔ جیسا
طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ سیدنا عثمانؓ نے کہا:

> ''میں دیکھ رہا ہوں کہ مال میں بہت زیادہ بہتات اور اضافہ ہو رہا ہے اور اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ مال لوگوں کے لیے وسعت کے ساتھ کفایت کر سکتا ہے۔ اس لیے اگر مردم شماری کر کے ان کی تعداد کا احاطہ نہ کیا گیا تا کہ مال حاصل کرنے والوں اور نہ کرنے

Marfat.com

والوں کا صحیح پتہ چل سکے تو مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں معاملہ میں انتشار پیدا نہ ہو جائے۔'' (طبری: ۲۲/۵)

سیدنا عثمان کی رائے نہایت اہم بھی تھی اور درست بھی، لہٰذا سیدنا عمرؓ نے اس ں کرتے ہوئے لوگوں کی قبیلوں کے لحاظ سے ایک فہرست مرتب کروائی اور پھر اس ں سے ان کے روزینے مقرر فرما دیئے۔

سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں فوجی نظام کی بھی تنظیم کی اور کے کچھ اصول وضوابط متعین فرمائے۔ صحابہ کرامؓ کو جنگ اور جہاد کرنے کی تربیت ر پھر خود جس طرح فوج کی قیادت کی اور اس کے لیے جو طریقے اختیار فرمائے، و سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود علوم وفنون کے اس ترقی یافتہ دور میں س پر ایک حرف کا اضافہ نہیں ہوا۔ آپ ﷺ کے اس دنیا سے انتقال کے بعد ظم اور تربیت یافتہ جماعت نے اس زمانہ کی مہذب ترین اور متمدن ترین سپر پاورز (Super Pow) ایران اور روم کی افواج کو اپنی قلت تعداد اور سامان حرب وضرب ں کے باوجود ہر محاذ پر شکست فاش دی۔ سیدنا ابوبکرؓ نے اپنی خلافت کے پہلے سال مال ت سے جو کچھ بچا وہ سب لوگوں میں برابر تقسیم کر دیا، لیکن آپ نے نہ تو فوج کی کوئی ہ مقرر کی اور نہ ہی ان کا کوئی رجسٹر بنایا اور نہ ہی کوئی محکمہ دفاع قائم کیا۔ سیدنا عمرؓ کی ت کے اوائل تک یہی دستور رہا، لیکن سنہ ۱۵ھ میں سیدنا عمرؓ نے فوجی نظام اور وزارت ع کو نئی بنیادوں پر اس طرح منظم کیا کہ ان کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نا عمرؓ کی اس تبدیلی نے تاریخ کا دھارا بدل دیا اور انسانی تہذیب کو ایک نئی راہ دکھائی۔

عہد فاروقی میں فتوحات کی وسعت نے ایک طرف تو مال غنیمت میں بے پناہ انہ کیا اور دوسری طرف جزیہ اور خراج کی بے شمار رقوم مدینہ طیبہ پہنچنے لگیں۔ مال غنیمت س اس کے علاوہ تھا۔ مسلمان عراق وایران اور شام ومصر کے جس علاقے پر قبضہ تے اس کے باشندوں سے جزیے کی شرط پر صلح کر لیتے جو اوسطاً دو دینار فی کس لانہ کے حساب سے ہوتا تھا۔ یہ آمدنی اس خراج کے علاوہ تھی جو زمیندار اپنی زمینوں ے بدلہ میں ادا کرتے تھے۔ خراج کا ایک معتدبہ حصہ ملکی اصلاح وانتظام پر صرف کیا جاتا

تھا۔اس کے بعد جو رقم بچتی تھی وہ مدینہ طیبہ بھیج دی جاتی تھی۔اس سے پہلے کہ ا
فتح مکمل اور مصر پر حملے کا آغاز ہو، آمدنی کے اس شعبہ میں دولت کی وہ ریل پیل
سیدنا عمرؓ اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کے مالی اور فوجی نظام کو مرتب کرنے کے
سوچنے اور غور وفکر کرنے لگے۔

خراج اور جزیہ کی ان دو مدات کے علاوہ ایک تیسری مد مال غنیمت کا خم
فاروقی فوجوں نے دو تین سال کے عرصہ میں شام، عراق اور فارس کا ایک بہت
وسائل زندگی سے بھرپور علاقہ فتح کر لیا۔ان فتوحات کے نتیجہ میں ان کے ہاتھ
میں مال غنیمت آیا۔تین بڑی فتوحات کی حاصل شدہ غنیمت کے اعداد و شمار کچھ یو

(1) فتح قادسیہ سنہ ۱۴ یا ۱۵ھ

حصہ لینے والی عرب فوج کی مقدار تیس ہزار

مال غنیمت	ساٹھ کروڑ درہم
خمس	(مرکزی حکومت کا حصہ) بارہ کرو
خمس نکالنے کے بعد سوار کا حصہ	چھ ہزار درہم
پیادہ کا حصہ	دو ہزار درہم (کتاب الاغانی: ۱۴/۱)

(2) فتح مدائن سنہ ۱۶ھ (حکومت فارس کا گرمائی مستقر)

عرب فوج کی تعداد	ساٹھ ہزار سوار
مال غنیمت	نوے کروڑ درہم
خمس	اٹھارہ کروڑ درہم
سوار کا حصہ	بارہ ہزار درہم (طبری: ۴/۷)

(3) فتح جلولاء سنہ ۱۶ھ (عراق میں مواصلات کا سرحدی ...شن)

عرب فوج کی تعداد	بارہ ہزار سوار
مال غنیمت	تین کروڑ درہم
خمس	ساٹھ لاکھ درہم
سوار کا حصہ	ساڑھے چار ہزار درہم

Marfat.com

عراق کے ان تین بڑے معرکوں کا خمس جس کی مقدار تاریخ کے مطابق پندرہ
ئی گئی ہے، خلافت فاروقی کے دواڑھائی برس کے اندر اندر مرکزی خزانہ میں جمع
س کے مزید حصے مختلف محاذوں سے برابر مدینہ طیبہ آتے رہتے تھے یہاں تک
ی خزانہ (Central Exchequre) بھر گیا۔

دولت کی اس بہتات کی وجہ سے سیدنا عمرؓ نے اس موضوع پر کیسے سوچنا شروع
ین نے اس بارہ میں بہت سی روایات نقل کی ہیں، لیکن مشہور روایت اس بارہ
ہے کہ سیدنا ابوہریرہؓ جو اس وقت بحرین کے گورنر تھے، ایک مرتبہ سیدنا عمرؓ کے پاس
یدنا عمرؓ نے لوگوں کا حال دریافت کرنے کے بعد ان سے پوچھا: ''کیا لائے
ب دیا: ''پانچ لاکھ۔'' سیدنا عمرؓ سمجھے کہ ابوہریرہؓ مبالغہ سے کام لے رہے ہیں،
پھر وہی سوال کیا، اور جب ان سے وہی پہلا جواب سنا تو فرمایا: ''ابوہریرہ! تمہیں
ا ہے؟'' سیدنا ابوہریرہؓ نے کہا: ''ہاں۔'' یہ کہہ کر پانچ دفعہ لاکھ لاکھ کہا۔ آپ نے
نہیں نیند آرہی ہے، اپنے گھر جا کر سو رہو، کل صبح میرے پاس آنا۔'' دوسرے
ابوہریرہؓ بارگاہ خلافت میں پہنچے اور سیدنا عمرؓ کو یقین دلایا کہ ''وہ واقعی بحرین سے
درہم لائے ہیں۔'' سیدنا عمرؓ کو یقین آیا تو مجلس شوریٰ منعقد کی اور فرمایا: ''ابوہریرہؓ
پاس بڑی مقدار میں دولت لے کر آئے ہیں، اگر تم کہو تو گن کر تم میں تقسیم کی
ر اگر کہو تو وزن کر کے تقسیم کروں۔ سیدنا علیؓ، سیدنا عثمانؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ نے
اویز پیش کیں۔ ولید بن ہشام نے کہا کہ میں نے شام کے حکمرانوں اور ایران
اہوں کو دیکھا ہے کہ ان کے ہاں فوج کا رجسٹر مرتب رہتا ہے۔ وہ رجسٹروں کے
کے مطابق مال تقسیم کرتے ہیں۔ سیدنا عمرؓ کو یہ رائے پسند آئی اور فوج کی تنظیم و
ا خیال پیدا ہوا۔'' (فتوح البلدان: ۴۴۹)

ایک اور روایت میں ہے کہ رجسٹر مرتب کرنے کے سلسلہ میں سیدنا عمرؓ نے
ں سے مشورہ کیا۔ سیدنا علیؓ نے فرمایا: ''جتنا مال آپ کے پاس جمع ہو وہ سال کے
سم کر دیا جائے اور کوئی شی باقی نہ رہنے دی جائے۔'' سیدنا عثمان بن عفانؓ نے
میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں میں دولت کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اس کا

شمار نہ کیا گیا اور آپ کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں سے کس کس کو ملا ہے اور کس ک
ملا ہے تو سارا نظام چوپٹ ہو جائے گا۔ ولید بن ہشام بن مغیرہ بھی وہاں موج
انہوں نے سیدنا عمرؓ سے عرض کی کہ میں شام گیا تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ سلا
رجسٹروں میں لوگوں کے ناموں کا اندراج کرتے ہیں۔ آپ بھی ایسا ہی کیجیے۔
ان کی یہ بات پسند آئی۔ چنانچہ انہوں نے سیدنا عقیل بن ابی طالبؓ، سیدنا مخرم
اور سیدنا جبیر بن مطعمؓ کو بلایا جو عرب کے مشہور ماہرین انساب تھے اور ان
حیثیت اور مرتبہ کے مطابق ایک فہرست تیار کریں۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ سیدنا عمرؓ نے دیوان (رجسٹر) کی ت
وظیفوں کی تعیین کے متعلق مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انہوں نے سیدنا
رائے کی تائید کی۔ پھر آپ نے سپہ سالاران اور فاتحین سے مشورہ کیا۔ انہوں
آپ کی تجویز سے اتفاق کیا سوائے حکیم بن حزامؓ کے جو مکہ کے سرداروں او
الرائے لوگوں میں سے تھے۔ انہوں نے آپ کی اس تجویز کے جواب
''امیر المومنین! قریش تجارت پیشہ لوگ ہیں اگر آپ ان کے وظیفے مقرر کر دی
تجارت چھوڑ دیں گے۔ پھر آپ کے بعد کوئی ایسا فرمانروا اور صدر ریاست آ
کے وظیفے بند کر دے گا، اور اس وقت تجارت بھی ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہو
حکیم بن حزامؓ یہ بات بڑی دوراندیشی کی تھی یا پھر ان کے قلب میں اللہ تعا
سے القاء کی گئی تھی۔ اور ہوا بھی وہی کہ وظیفہ خوری کی عادت نے عربوں کو نا
بنا دیا، اور وہ روزی کے لیے دوڑ دھوپ اور جدوجہد کرنے کے قابل نہ ر
بعد حالات نے کروٹ لی اور فتوحات کا سلسلہ بند ہو گیا او غیر عرب اسلامی
شامل ہو گئے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اسلام کا دارالسلطنت بغداد
حکومت حقیقی معنوں میں عباسیوں کے بجائے برامکہ کے ہاتھوں میں آ گئی تو
وظائف بند کر دیئے گئے۔ آسائش اور بے عملی کی گود میں پرورش پانے والی نس
طرف لوٹ سکی اور نہ روزی کے لیے دوڑ دھوپ کر سکی، جس کے نتیجے میں ایسا
ہوا کہ آج تک اس کی وہ رونق واپس لوٹ نہ سکی۔

Marfat.com

اس پر بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حکیم بن حزامؓ نے جو بات کہی تھی سیدنا عمرؓ نے اس بات کو وظائف مقرر کرتے وقت نگاہ میں کیوں نہ رکھا؟ اس کا مختصر اور سادہ جواب یہ ہے کہ سیدنا عمرؓ کو بھی اس بات کا اندازہ تھا اور وہ وظائف کے اس نتیجے سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ عوام کو سخت محنت کرنے اور زیادہ سے زیادہ روزی کمانے کی تلقین اور تاکید کرتے رہتے تھے، اور دوسری طرف ان لوگوں کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو نمائشی زہد و اتقاء کے زیر اثر دنیا سے بے تعلقی ظاہر کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے ایک زاہد مرتاض کو دیکھا۔ آپ اس کے پاس گئے اور اس کو ایک درّہ مار کر فرمایا: ''خدا تجھے موت دے۔ ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے؟'' وہ لوگوں سے اکثر فرمایا کرتے تھے: ''جس کے پاس دولت ہے اسے دولت کو مفید اور نفع بخش کاموں میں لگانا چاہیے کیونکہ عنقریب ایسا شخص آنے والا ہے جو اسی کو دے گا جسے چاہے گا۔'' ان کا یہ مقولہ بھی بعض کتابوں میں نظر سے گذرا ہے کہ ''انسان اپنی دنیا کے لیے اس طرح کام کرے گویا وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اپنی آخرت کے لیے اس طرح کام کرے گویا کل ہی مرجائے گا۔'' دین و دنیا کے بارہ میں ان کی یہ رائے کس قدر وقیع اور کارآمد ہے۔

اصل میں جو لوگ سیدنا عمرؓ پر مذکورہ بالا اعتراض کرتے ہیں وہ وظائف مقرر کرنے کی اصل غرض و غایت سے ناآشنا ہیں۔ سیدنا عمرؓ نے عربوں کو تجارت کی جدوجہد سے غافل اور کاہل بنانے کے لیے ان کے وظائف مقرر نہیں کیے تھے بلکہ وظائف کا یہ رجسٹر انہوں نے اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ عرب ہمہ تن جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف ہو جائیں اور اللہ کے دین کی دعوت کے لیے میدان صاف کر دیں۔ وظائف مقرر کرنے سے ان کا مقصد لوگوں کو کاہل اور سست بنانا نہ تھا۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ کے بیان کے جواب میں ولید بن ہشام بن مغیرہ نے سیدنا عمرؓ سے جو بات کہی تھی، اس کے الفاظ یہ ہیں:

> ''میں شام گیا ہوں اور وہاں کے بادشاہوں کو دیکھا ہے کہ انہوں نے دفتر (رجسٹر) اور فوج بنا رکھی ہے۔ پس آپ بھی رجسٹر بنایئے اور فوج منتظم کیجیے۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے ولید بن ہشام کی بات پر عمل کیا۔'' (مقریزی: ۱/۹۲، فتوح البلدان: ۴۴۹)

Marfat.com

اس سے پتہ چلتا ہے کہ رجسٹر مرتب کر کے اس لیے لوگوں کے وظائف مقرر کیے گئے تھے تا کہ ایک باقاعدہ فوج تیار کی جا سکے اور اس فوج کو ماہانہ وظائف کی شکل میں تنخواہ ملتی رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جن لوگوں سے فوجی خدمت نہیں لی جاتی تھی اور قدیم جنگی خدمات کا استحقاق بھی وہ نہیں رکھتے تھے۔ سیدنا عمرؓ ان کو یہ وظیفہ یا تنخواہ نہیں دیتے تھے جیسا کہ علامہ بلاذری نے فتوح البلدان ص ۴۵۸ پر لکھا ہے۔

اور یہی وجہ تھی کہ سیدنا عمرؓ نے زمین فوجیوں میں تقسیم کرنے کی ممانعت فرمادی تھی بلکہ پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) سے یہ بات منظور کروائی تھی تا کہ زراعت انہیں جہاد سے غافل نہ کردے اور زمین کی محبت میں وہ دعوت اسلام کو فراموش نہ کردیں۔

''دیوان'' ایک فارسی لفظ ہے جسے معرب کرلیا گیا۔ اس کے معنی ہیں وہ ''رجسٹر'' جس میں فوجیوں اور وظیفہ خواروں کے نام درج کیے جائیں۔ چنانچہ دیوان وہ رجسٹر تھا جس میں فوجی اور غیر فوجی وظیفہ خواروں کے نام لکھے جاتے تھے اور ہر شخص کے نام کے آگے اس کے وظیفہ کی رقم درج ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں ایک اور روایت بھی کتابوں میں درج ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ جب وسیع ہو گیا اور انہوں نے بہت سے ملکوں پر قبضہ کرلیا اور سلطنت اسلامیہ کی پہنائیوں میں بے پناہ اضافہ ہوا اور دولت وثروت کا ذخیرہ ہر جانب سے بہہ کر سا جمع ہو گیا اور اس کی عمرانی حدود بہت بڑھ گئیں اور خراج و جزیہ کے علاوہ فئے و غنیمت میں اس قدر اضافہ ہونے لگا کہ خلیفۂ وقت اور اعیان خلافت اس کے نظم و انتظام سے عاجز آنے لگے اور مستحقین مصارف اور تقسیم عطایا میں اصحاب عطیات کا احاطہ ناممکن ہو گیا، اور تاوقتیکہ خاص قیودات اور معین و مرتب اصول پر ان کو مرتب نہ کیا جائے، ان کی ترتیب دشوار ہو گئی۔ تب سیدنا عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کی مجلس شوریٰ منعقد کی اور ان سے مشورہ کیا کہ کس طرح اہل مصارف کی مردم شماری کے اور محاصل کی تفصیلات کے رجسٹر مرتب کیے جائیں۔'' (اشہر مشاہیر الاسلام: ۲/۳۶۴)

سیدنا عمرؓ کے حکم سے سیدنا عقیل بن ابی طالبؓ، سیدنا مخرمہ بن نوفل اور سیدنا

جبیر بن مطعمؓ نے حیثیت اور مرتبے کے لحاظ سے لوگوں کی فہرستیں مرتب کیں۔ ان میں فوجیوں اور غیر فوجیوں کی الگ الگ فہرستیں تیار کی گئیں۔ سب سے پہلے بنو ہاشم کے نام لکھے گئے، پھر سیدنا ابوبکرؓ کے قبیلے بنو تیم اور پھر سیدنا عمرؓ کے قبیلے بنو عدی کے نام لکھے گئے، اور پھر اسی ترتیب سے دوسرے قبائل کے۔ سیدنا عمرؓ نے جب تیسرے نمبر پر اپنے قبیلے کا نام دیکھا تو فرمایا:

"خدا کی قسم! چاہتا تو میں بھی یہی تھا۔ کاش ایسا ہوتا لیکن تم رسول اللہ ﷺ کی قرابت سے شروع کرو۔ جو سرکار دو عالم ﷺ سے قریب تر ہیں سب سے پہلے ان کا نام لکھو۔ پھر وہ جو ان کے بعد ہیں یہاں تک کہ عمرؓ کو وہاں رکھو جہاں اللہ تعالیٰ نے اسے رکھا ہے۔"

بعض روایات میں ہے کہ بنو عدی کو جب سیدنا عمرؓ کی یہ بات معلوم ہوئی تو وہ آپ کے پاس آئے اور کہا: "آپ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہیں۔ آپ نے اپنا نام وہیں کیوں نہ رہنے دیا جہاں ان لوگوں نے لکھا تھا۔" سیدنا عمرؓ نے نہایت غضب ناک نگاہوں سے انہیں دیکھا اور فرمایا: "واہ بنو عدی! تم چاہتے ہو کہ میری کمائی کھاؤ اور تمہاری وجہ سے میری نیکیاں برباد ہو جائیں۔ نہیں، خدا کی قسم! تم اسی ترتیب سے آؤ گے جس ترتیب سے تمہارے پاس دعوت پہنچی تھی۔ چاہے تمہارے ناموں پر رجسٹر ختم ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ خدا کی قسم! ہمیں دنیا میں جو عزت ملی ہے اور ہم آخرت میں اپنے عمل کے بدلے اللہ تعالیٰ کے جس ثواب کے امیدوار ہیں وہ سب محمد رسول اللہ ﷺ کا صدقہ ہے، اس لیے آپ ہمارا اشرف ہیں اور آپ کی قوم "اشرف العرب۔" اس کے بعد وہ جو اس سے قریب ہیں، پھر جو ان سے قریب ہیں۔

طبری اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ سیدنا عمرؓ نے عقیل بن ابی طالبؓ، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعمؓ کو بلایا اور یہ تینوں انساب قریش کے ماہر تھے اور فرمایا:

﴿اکتبوا الناس علیٰ منازلھم﴾ (طبری: ۵/۴۳)

''لوگوں کے اعداد و شمار ان کے مکانات پر جا کر کرو۔''

یہ اور اس قسم کی دوسری روایات جو مقریزی، ابن کثیر، طبری، ابو عبیدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں جن میں مختلف ضروریات کے لیے مردم شماری اور محاصل و مصارف کی تفاصیل کے سلسلہ میں اعداد و شمار کی اہمیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اعداد و شمار اور رجسٹروں کی ترتیب کا یہ سلسلہ ہر ایک حکومت میں ہوتا ہے اور حکومت کی مختلف ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت بھی ہے، خواہ وہ کسی نظام کی حکومت ہو۔ پس اس کا ''صالح معاشی نظام'' کے بنیادی مسائل سے کیا تعلق؟

اس سوال کا آسان اور سادہ سا جواب یہ ہے کہ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اعداد و شمار اور اس سے متعلق دواوین اور رجسٹرات کا تعلق ہر قسم کی حکومت سے ہوتا ہے اور یہ کسی خاص طرز حکومت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے لیکن اس سلسلہ میں ''صالح معاشی نظام'' اور ''فاسد معاشی نظام'' کے درمیان یہ فرق ہے کہ جس حکومت کے اصول اور سسٹم سے مذموم سرمایہ داری نشو و نما پاتی اور وجود میں آتی ہو، اس نظام حکومت میں مردم شماری اور اعداد و شمار کی اہمیت اس لیے ہوگی کہ اس کے ذریعہ یہ معلوم کیا جا سکے گا کہ ملک میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کی ترقی اور ان کی نشو و نما کیا ہو اور کس طرح غریب عوام کو سرمایہ داروں کے ناپاک مقاصد کو ترقی دینے کے لیے آلۂ کار بنایا جائے۔ اگرچہ اس سرمایہ دارانہ نظام یا فاسد نظام معیشت میں بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کی بھی آوازیں سنائی دیں گی لیکن ان آوازوں کے پس پردہ وہی ذہنیت کارفرما ہو گی جو اس نظام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن اس کے برعکس جس حکومت کا طرز و طریق خلق خدا کی فلاح و بہبود پر قائم ہو گا اور اس کے اقتصادی اور معاشی نظام میں ان اعداد و شمار کو عوام و خواص کی حاجت روائی کے لیے مؤثر ذریعہ خصوصی طور پر محروم المعیشت افراد کی حق رسی کا بہترین وسیلہ بنایا جائے گا۔ اس وجہ سے اسلام کے معاشی نظام میں اعداد و شمار کی اہمیت

بہت زیادہ ہے اور وہ عوام وخواص اور محروم المعیشت لوگوں کی حاجت روائی کے لیے ہے۔ لہٰذا وہ اقتصادی مسئلہ میں اساسی مقصد کا مقدمۂ خیر ہے تمہید شر نہیں۔ اس لیے ایک سربراہ اسلامی ریاست کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی ریاست میں ''مردم شماری'' کا نظام قائم کرے اور مسلم وغیر مسلم، ذمی اور مستأمن، غریب اور امیر، محروم المعیشت اور برسرِ روزگار، مریض اور معذور اور بے روزگار لوگوں کے اعداد وشمار الگ الگ فہرستوں میں درج کرے۔ علاوہ ازیں محاصل ومصارف کی تفصیلات کے بھی الگ الگ رجسٹر رکھے تاکہ ہر شخص اپنے معاشی حقوق کو آسانی کے ساتھ حاصل کر سکے۔ آج کل تو کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ اس میں تو یہ سارا کام نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔

........❖❖❖........

Marfat.com

حکومتی وظائف

ایک اسلامی ریاست کی رعایا دو اقسام پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک مسلم یعنی جماعت جس نے اسلام کے مکمل نظام کو قبول کر لیا ہو اور دین اسلام کے ہر فیصلہ کو ا[یمان] بنا لیا ہو۔ اور دوسری قسم وہ غیر مسلم جماعت ہے جس نے ایمانیات، عبادات او[ر] اخلاقیات دینی میں آزاد رہ کر اور اسلام کے مکمل نظام سے انحراف کر کے صرف اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی امور میں حکومت اسلامیہ اور اس کے قوانین کی پناہ قبول کر لی ہو۔ اور ایک اسلامی ریاست کا مطیع رہنا منظور کر لیا ہو۔ ایک اسلامی ریاست میں پہلی قسم یعنی مسلمانوں پر جانی اور مالی سب خدمات عائد کی گئی ہیں اور بعض حالات میں انہیں ان خدمات کے لیے مجبور بھی کیا جا سکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے اسلام کے مکمل نظام کو قبول کر لیا تو اب اسلام کا حق ہے کہ وہ اپنی ہر ایک خدمت کے لیے اس کو آواز دے اور حالات و مقتضیات وقت کے پیش نظر ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کی تکمیل کے لیے جو خدمت چاہے اس کے سپرد کرے۔ اس کو انکار کا کوئی حق نہیں۔ ویسے بھی مسلم کا مطلب ہے ''گردن نہادن'' یعنی جو کچھ اسلام اس سے مطالبہ کرے ایک مسلمان کے لیے ضروری اور لازمی ہے کہ وہ اس کے حکم کے سامنے اپنی گردن ڈال دے۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے مختلف حکومتی نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کا یہ نظام حیات ایک مسلمان کا خود اپنا نظام ہے، لہٰذا اس کا فرض ہے کہ وہ اس نظام کے استحکام اور اس کی بہتری کے لیے ہر قسم کی خدمات انجام دے۔ اس کی زندگی کا عمل اس نظام کی بہتری کے لیے ہونا چاہیے۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

اس اصول کے تحت جب ایک مسلمان کی جان و مال اسلام اور حکومت اسلامی کے لیے وقف ہے تو اب حکومت کے لیے بھی ضروری اور لازمی ہے کہ اس جماعت کے اکثر و بیشتر افراد کا تکفل اپنے ذمہ لے اور اس کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بڑی حد تک ضامن ہو تا کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد اپنی علمی اور عملی محنت اور جدوجہد کے ذریعہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود میں ہمہ تن مصروف ہو، اور معاشی اور اقتصادی ذمہ داریوں سے فارغ البال ہو کر رفاہیت اور پاکیزہ عیش و راحت کے ساتھ جماعتی اور ملکی استحکام کے لیے ایک کار آمد چیز بن سکے اور اس کی زندگی کا بڑا حصہ اسلامی ریاست اور ملک و ملت کی خدمات کے لیے وقف ہو جائے کیونکہ ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اس طریق کار کا ایک بڑا اور اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ قوم و ملت کی جماعتی فلاح اور ترقی کا وہ اثر جو اس طریقہ سے پیدا ہو گا، خود قوم کے افراد پر پڑے گا اور ہر فرد ملت نہ صرف اپنی معاشی زندگی میں بلکہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں اپنی اپنی طبعی اور فطری استعداد کے مطابق بہرہ مند اور فیض یاب ہو سکے گا۔ اور یہی اقتصادی اور معاشی نظام کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ پس حکومت اور اسلامی ریاست اس جماعت (مسلم) کے افراد سے مختلف شعبوں کی خدمت لیتی اور ان کی اور ان کے اہل و عیال کی براہ راست کفالت کرتی ہے، مثلاً جہاد، اعلاء کلمۃ اللہ کی خدمت، تعلیم و تبلیغ کی خدمت، صدقات و زکوٰۃ کی وصولی کی خدمت اور مختلف محکمہ جات کی خدمت۔ اور جو افراد ان خدمات کے قابل نہیں ہیں جیسے مریض، معذور یا معاشی وسائل سے محروم، یتامیٰ و بیوگان، فقراء اور مساکین وغیرہ تو ان کا بار کفالت بھی اسلامی ریاست کے کاندھوں پر ہے تا کہ اسلامی معاشی نظام کا مقصد وحید فوت نہ ہونے پائے۔ حکومت کی یہی کفالت اور معاشی ذمہ داری عطایا اور وظائف کے نام سے موسوم ہے۔

اسلامی ریاست کی رعایا کی دوسری قسم یا دوسری جماعت غیر مسلم ہے۔ اسلامی اصطلاح میں ان کو ذمی کہا جاتا ہے۔ آج کل کی حکومتوں میں اکثریت اور اقلیت کی

Marfat.com

اصلاح استعمال کی جاتی ہے لیکن اسلام میں اقلیت کے لیے ذمی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر سے اہل ذمہ کے مال، ان کی جانیں اور آبرو کی حفاظت ایک اسلامی ریاست کے لیے ضروری ہے اور اس کے بدلہ میں ایک مقررہ ٹیکس (خراج جزیہ) کے علاوہ ان پر کوئی ٹیکس عائد ہوتا ہے اور نہ وہ فوجی خدمات کے لیے مجبور کیے سکتے ہیں اور نہ ہی حکومت کی دوسری خدمات ان کے ذمہ لازمی ہیں۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جزیہ کی معمولی سی رقم کے بدلہ میں اہل ذمہ کے جان و مال اور عزت و آبرو کی ذمہ داری اسلامی ریاست پر ہے۔ کسی ذمی کا قتل اسلام میں گناہ کبیرہ ہے، اور قتل تو بڑی شے ہے اس کی غیبت بھی اسلام میں حرام ہے اور اس پر کسی قسم کا ظلم کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

> "جس شخص نے کسی مسلمان کے ذمہ کو جو اس نے کسی ذمی سے کیا تھا، توڑ دیا اور اس کو برقرار نہ رکھا، اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کی کوئی نفلی عبادات اور فرضی عبادات قبول نہیں کرتا۔"

اور جو لوگ غیر اسلامی ممالک میں سکونت پذیر ہیں لیکن ان سے معاہدہ ہو چکا ہے ان کو خلاف عہد تکلیف پہنچانا اور قتل و غارت کرنا مصیبت اور گناہ کبیرہ میں داخل ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے معاہدہ حدیبیہ میں یہ شرط کی تھی کہ جو مسلمان دین اسلام کو قبول کر کے مسلمانوں کے پاس آ جائے گا مسلمان اس کو واپس کر دیں گے۔ چنانچہ جب کفار مکہ نے ابو جندلؓ اور ابو بصیرؓ کی واپسی کا مطالبہ کیا تو ان کی ہزار منت و سماجت کے باوجود آپ نے ان دونوں کو بلا تامل واپس کر دیا۔ صحابہ کرامؓ نے آپ کے اس حکم کی پابندی اس حد تک کی کہ اس سے بڑھ کر پابندی ناممکن تھی۔

اسلام میں ذمیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ہیں بلکہ کئی لحاظ سے ذمیوں کے حقوق مسلمانوں سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ حقوق کی اس برابری کی وجہ سے جس طرح مسلمان اپاہجوں اور محتاجوں کا سماجی تحفظ اور معاشی کفالت اسلامی ریاست کے ذمہ ہے اسی طرح ازکار رفتہ غیر مسلموں کا معاشی تحفظ اور ان کے روزینے کا انتظام

Marfat.com

بھی ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ چنانچہ مختلف معاہدات میں جو مسلمانوں نے غیر مسلموں سے کیے تھے ان میں اس بات کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، مثلاً حیرہ کی فتح کے موقع پر سیدنا خالد بن ولیدؓ نے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بھی اس بات کی صراحت موجود تھی کہ:

''جو کوئی غیر مسلم بوڑھا کام کرنے کے قابل نہ رہے یا کسی غیر مسلم کو کوئی ایسی معصیت اور آفت پہنچے اور وہ روزی کمانے کے قابل نہ رہے، یا وہ مال دار ہو اور پھر فقیر ہو جائے، اور اس کے اہل مذہب اس کو صدقہ و خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ معاف ہو جائے گا اور حکومت اس کا اور اس کے متعلقین کا اس وقت تک سماجی اور معاشی تحفظ اور کفالت کرتی رہے گی جب تک یہ لوگ دار ہجرت (مدینہ) اور اسلامی ممالک میں رہیں گے۔''

اس عہد نامہ کے آخر میں کہا گیا تھا کہ:

''یہ لوگ مسلمانوں سے اگر کوئی امداد طلب کریں گے تو ان کی مدد کی جائے گی اور اس مدد کے سلسلہ میں جو اخراجات ہوں گے ان کا ذمہ دار بیت المال ہوگا۔'' (کتاب الخراج لابی یوسف:۱۴۴)

ایک اسلامی ریاست میں جیسا ایک مسلمان کے خون کا قصاص ہے یا اس کے اعضائے بدن کے عوض اعضائے بدن کا قصاص ہے ایسا ہی ایک ذمی کے قاتل سے قصاص لیا جائے گا اور ایک مستامن کے قاتل سے بھی وہی قصاص لیا جائے گا۔ (مستامن وہ ہے جو غیر اسلامی ملک میں رہتا ہے لیکن امن لے کر اسلامی ریاست میں آ کر آباد ہوا اور ذمی بن گیا۔) بلکہ بعض لحاظ سے ایک ذمی کے حقوق ایک مسلمان سے بھی اسلامی ریاست میں زیادہ ہیں۔ جو اموال یا اشیاء مسلمانوں کو رکھنا یا استعمال کرنا حرام ہیں بلکہ ان کو تلف کر دینا ضروری ہے، اور اگر وہ اشیاء تلف کر دی گئیں تو اس پر کوئی ضمان نہیں، لیکن اگر وہ اشیاء ایک ذمی کی ملکیت میں ہوں اور کوئی مسلمان اسے تلف یا ضائع کر دے تو اس مسلمان کے ذمہ ضمان واجب ہے۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کی شراب یا

Marfat.com

خنزیر کے گوشت کوتلف کر دے تو اس پر ضمان واجب ہے۔ (کمافی درمختار)

یہ تو ایک ذمی کی جان اور مال کا حال ہے۔ اسلام نے اس کی ننگ و ناموس بھی اسی طرح تحفظ کیا ہے جیسا کہ ایک مسلمان کی عزت و آبرو کا تحفظ کیا ہے۔ چنانچہ کسی ذمی کی آبروریزی اور اہانت و تذلیل خواہ قول سے ہو یا اشارہ و کنایہ سے ہو، سامنے ہو اس کی غیبت میں، قطعاً حرام ہے یہاں تک کہ ذمی کی غیبت کرنا بھی حرام ہے۔ گویا کہ ایک اسلامی ریاست میں ایک مسلمان اور ذمی کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے، اور اس کو بھی وہ تمام تحفظات حاصل ہیں جو ایک مسلمان کو حاصل ہیں۔

چنانچہ شرح شرعۃ الاسلام ۲/۱۳۶ میں ہے کہ:

''رعیت کے تمام انواع واصناف میں مساوات کوملحوظ رکھا جائے۔
کسی کوکسی پر اس کے مرتبہ یا مال کی وجہ سے تقدیم وترجیح نہ دے۔
قاضی کو چاہیے کہ مدعی اور مدعا علیہ میں کسی بات کا فرق نہ کرے، نہ
ان کی مجلس میں، ان کی طرف دیکھنے میں اور نہ ہی گفتگو میں۔''

حقوق و معاملات کی مساوات کا یہ دائرہ صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں بلکہ غیر مسلم، ذمی اور مستامن کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ایک فریق مسلمان تھا اور دوسرا یہودی۔ یہودی سچا تھا لہٰذا آپ نے ڈگری اس کے حق میں دی۔

ہاں مسلم اور ذمی (غیر مسلم) کا امتیاز کن امور میں ہے، اس کی چند ایک مثالیں یہ ہیں کہ کسی مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح درست نہیں ہے کیونکہ عورت مرد کے تابع ہوتی ہے اور مسلمان عورت جب غیر مسلم مرد کے تابع ہوگی تو اس کا اسلام اور ایمان معرض خطر میں ہوگا۔ البتہ مسلمان مرد غیر مسلم عورت سے اس صورت میں نکاح کر سکتا ہے کہ غیر مسلم عورت اہل کتاب میں سے ہو، مشرکہ نہ ہو، یا مثلاً غیر مسلم جو مسلمان حکومت کے تحت رہتا ہے اس سے اور مسلمان دونوں سے محصول لیا جاتا ہے، لیکن چونکہ مسلمان کے ہر قول وفعل میں عبادت کے پہلو کوملحوظ رکھا گیا ہے، اس لیے جو محصول اس سے لیا جاتا ہے اس کا نام زکوٰۃ یا عشر رکھا گیا ہے۔ اگر وہ ٹیکس اموال تجارت سے لیا گیا تو زکوٰۃ ہے اور اگر

اصل زمین سے لیا گیا تو عشر ہے۔ اور پھر ان کا مصرف بھی الگ الگ مقرر کر دیا گیا۔ غیر مسلم سے جو محصول لیا جاتا ہے اور کا نام جزیہ اور خراج رکھا گیا اور یہ اس کے حفظ جان و مال کا معاوضہ ہے تاکہ وہ معاملات اور معاشرت میں مسلمان کے برابر ہو کر رہیں۔ غیر مسلم کے مال سے جو ٹیکس لیا جاتا ہے وہ جزیہ کہلاتا ہے اور محاصل زمین سے جو کچھ لیا جاتا ہے وہ خراج کہلاتا ہے۔ زکوٰۃ و عشر میں چونکہ ایک قسم کی عبادت کو دخل ہے لہٰذا اس کا مصرف اور ہے، اور غیر مسلموں سے ان کے جان و مال کے تحفظ کے لیے لیا جاتا ہے لہٰذا اس کا مصرف اور ہے۔ البتہ بعض صورتوں میں مسلمانوں سے بھی خراج لیا جاتا ہے یعنی جو زمین ایک مرتبہ خراجی ہو گئی وہ مسلمان کے قبضہ میں جانے کے بعد بھی خراجی ہی رہتی ہے۔

اسلام کی انہی تعلیمات کی روشنی میں سیدنا عمرؓ نے اپنی ذمی رعایا کو وہ سب حقوق دیئے جو اسلام نے انہیں عطا کیے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اس زمانہ میں روم و فارس کی حکومتوں میں نہ تو آتش پرستوں کو وہ حقوق دیئے گئے تھے اور نہ ہی سلطنت روم میں عیسائیوں کو وہ حقوق حاصل تھے حالانکہ وہ رومیوں کے ہم مذہب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مصر کی فتح کے وقت قبطی باوجود عیسائی ہونے کے مسلمانوں کے بہی خواہ تھے کیونکہ جو حقوق انہیں مسلمانوں نے دیئے تھے وہ قیصر روم نے نہیں دیئے تھے۔ یہودیوں کا حال عیسائیوں سے بھی بدتر تھا۔ وہ ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم تھے۔ فارس میں جو عیسائی تھے ان کی حالت اور بھی قابل رحم تھی۔ چنانچہ اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کے ساتھ جو معاہدات کیے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو کیا کیا حقوق دیئے۔ بیت المقدس کا جو معاہدہ سیدنا عمرؓ کی موجودگی میں ہوا جس پر بطور گواہان سیدنا خالد بن ولیدؓ، سیدنا عمرو بن عاصؓ، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ کے دستخط تھے، اس معاہدہ میں صاف طور پر لکھا گیا کہ عیسائیوں کے جان و مال اور مذہب ہر طرح سے محفوظ ہوں گے۔ ان کے گرجے نہ تو توڑے جائیں گے اور نہ ان کی عمارتوں کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، اور نہ ان کے احاطوں میں دست اندازی کی جائے گی۔ یونانی باوجود اس کے کہ مسلمانوں سے لڑے تھے اور دراصل مسلمانوں کے حقیقی دشمن وہی تھے، ان کے جان و مال کو بھی پورا پورا تحفظ دیا گیا، اور ان کے گرجاؤں اور معبدوں سے کوئی تعرض نہ

Marfat.com

کیا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بیت المقدس کے عیسائی اگر وطن سے نکل کر رومیوں سے ملیں تو اس پر بھی ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ کیا کوئی حکومت مفتوحہ ملک کے باشندوں کو اس طرح کا انصاف اور عدل مہیا کر سکتی ہے۔ (طبری:۳/۱۰۵)

سیدنا عمرؓ نے ذمیوں کی جان و مال کو مسلمانوں کی جان و مال کے برابر قرار دیا اور یہی اسلام کی ذمیوں کے بارہ میں تعلیم ہے۔ چنانچہ اگر کسی مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تو سیدنا عمرؓ نے اس کے بدلہ میں مسلمان کو قتل کرانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ امام شافعیؒ روایت کی ہے کہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔ سیدنا عمرؓ کو جب پتہ چلا تو آپ نے لکھ بھیجا کہ قاتل قصاص کے لیے مقتول کے وارثان کو دے دیا جائے۔ چنانچہ وہ مقتول کے وارث حنین نامی کو دے دیا گیا اور اس نے اس کو قصاص میں قتل کر دیا۔ (الدرایہ فی تخریج البدایہ:۳۶۰)

مال اور جائیداد کو بھی پورا پورا تحفظ دیا اور جس قدر زمینیں غیر مسلموں کے قبضہ میں تھیں، ان کو اسی حیثیت سے بحال رکھا گیا جس حیثیت سے وہ فتح سے پہلے تھیں یہاں تک کہ مسلمانوں کو ان زمینوں کا خریدنا بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔

سیدنا عمرؓ نے شام کی فتح کے بعد سیدنا ابوعبیدہ بن جراحؓ کو جو فرمان لکھا، اس میں فرمایا:

> ”مسلمانوں کو سختی سے منع کرنا کہ وہ ذمیوں پر کسی قسم کا کوئی ظلم کرنے نہ پائیں، نہ ان کو کوئی نقصان پہنچائیں، اور نہ ان کا مال بے وجہ کھائیں۔ اور جس قدر شرائط آپ نے ان سے طے کی ہیں ان سب کو پورا کیا جائے۔“ (کتاب الخراج لابی یوسف:۸۲)

ایک مرتبہ شام کے ایک کاشتکار نے یہ شکایت بارگاہ خلافت میں کی کہ مسلمان فوج نے اس کی زراعت (کھیتوں) کو برباد کر دیا ہے۔ سیدنا عمرؓ نے اس کو بیت المال سے دس ہزار درہم بطور معاوضہ دلوائے اور تمام اضلاع کے حکام کو ایک گشتی مراسلہ (Circular) بھیجا کہ ذمیوں پر کسی طرح کی کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔

(ملاحظہ ہو کتاب الخراج لابی یوسف:۸

Marfat.com

اسی طرح امام ابو یوسفؒ ہی نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ سیدنا عمرؓ جب شام سے واپس تشریف لا رہے تھے تو آپ نے چند آدمیوں کو دیکھا کہ دھوپ میں کھڑے ہیں اور ان کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا ہے۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا: ''کیا ماجرا ہے؟'' جواب دیا کہ ان لوگوں نے جزیہ ادا نہیں کیا اس لیے ان کو سزا کے طور پر دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے۔ سیدنا عمرؓ نے پوچھا: ''جزیہ نہ دینے میں ان کا عذر کیا ہے؟'' جواب دیا گیا: ''مفلسی اور ناداری۔'' آپ نے حکم دیا کہ ان سب کو چھوڑ دو اور ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دو کیونکہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے سنا ہے کہ ''لوگوں کو تکلیف نہ دو۔ جو لوگ دنیا میں لوگوں کو عذاب اور تکلیف دیتے ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کو عذاب دے گا۔'' (کتاب الخراج: ۱۲۵)

امام بخاریؒ نے آپ کی اس وصیت کو جو آپ نے بعد میں آنے والے خلیفہ کو کی تھی، ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ:

> ''میں ان لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں جن کو خدا اور رسول ﷺ کا ذمہ دیا گیا (یعنی ذمی) کہ ان سے جو عہد ہے اس کو پورا کیا جائے اور ان کی حمایت میں لڑا جائے، اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔'' (بخاری: ۱/ ۱۸۷)

غیر مسلموں سے خراج وغیرہ لینے کے لیے مال گزاری کا جو بندوبست سیدنا عمرؓ نے کروایا اس میں نہایت نرمی اختیار کی گئی تاکہ کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو، لیکن اس کے باوجود آپ کو یہ خیال ہر وقت پریشان کرتا تھا کہ کہیں ان پر زیادتی تو نہیں کی گئی۔ چنانچہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، اس وقت بھی ذمیوں کا یہ خیال آپ کے ذہن میں اضطراب پیدا کر رہا تھا حالانکہ آپ کا ہر سال یہ معمول تھا کہ جب عراق کا خراج آتا تو دس اشخاص کوفہ اور بصرہ سے طلب کیے جاتے تھے اور سیدنا عمرؓ ان سے چار دفعہ تاکید کے ساتھ قسم لیتے تھے کہ مال گذاری کے وصول کرنے میں تمہارے ساتھ کچھ سختی تو نہیں کی گئی۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ۶۵)

شہادت سے دو تین روز قبل کا واقعہ ہے کہ تمام افسران بندوبست کو بلایا اور مال

گزاری کی تشخیص کے بارے میں ان سے گفتگو کی گئی۔ دوران گفتگو آپ ان سے بار
پوچھتے رہے کہ آپ لوگوں نے ان سے بندوست مال گزاری میں سختی تو نہیں کی۔
(کتاب الخراج:۲۱

سیدنا عمرؓ ملکی انتظامات میں بھی ذمیوں اور غیر مسلم رعایا سے مشورہ لیتے ر
تھے، گویا ملکی انتظامات میں آپ نے انہیں اپنے ساتھ شریک کیا ہوا تھا، خصوصی طور پر ا
معاملات میں جن کا تعلق ذمیوں سے ہوتا تھا، آپ ان کو اکثر و بیشتر ذمیوں ہی ۔
مشورے اور استصواب سے طے فرماتے۔ چنانچہ مصر کی فتح کے بعد وہاں جو انتظام کیا
میں اکثر مقوقش سے رائے لی اور عراق کا مال گزاری کا بندوبست کرتے وقت عجمی رئیسو
کو مدینہ منورہ بلا کر ان سے مال گزاری کے حالات دریافت فرمائے اور مال گزاری ا
کرنے والوں کے رویہ کی بابت بھی پوچھا۔ (مقریزی:۱/۷۴)

فاتح قوم کا رویہ مفتوح قوم سے اکثر درست نہیں ہوتا۔ مفتوح قوم کی عزت
ناموس کو اکثر و بیشتر مجروح کیا جاتا ہے اور اپنی برتری اور تحکم کا اظہار کیا جاتا ہے، ا
قرآن حکیم کے بقول "وجعلوا اعزة اهلها اذلة" عزت داروں کو ذلیل وخوار کر
رکھ دیا جاتا ہے، لیکن سیدنا عمرؓ نے ذمیوں کی عزت و آبرو کا اسی طرح خیال رکھا جس
طرح ایک مسلمان کی عزت و آبرو کا آپ خیال رکھتے تھے۔ کسی ذمی اور غیر مسلم کے با
میں کسی قسم کی تحقیر و تذلیل کا لفظ استعمال کرنا نہایت ناپسندیدہ خیال کیا جاتا تھا۔ ان ۔
بڑوں کی تکریم اور چھوٹوں پر اسی طرح شفقت کی جاتی تھی جس طرح مسلمانوں کی جا
تھی۔ سیدنا عمیر بن سعدؓ جو حمص کے گورنر تھے، نہایت نیک و پارسا اور زہد و تقدس میں ک
ان کا ہمسر نہ تھا۔ ایک مرتبہ کسی ذمی کے بارہ میں یہ لفظ نکل گیا "اخزک الله" یعنی
تجھے رسوا کرے۔ یہ لفظ تو غیر شعوری طور پر ان کے منہ سے نکل گیا لیکن اس کے بعد ا
اس قدر ندامت ہوئی کہ سیدنا عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر حمص کی گورنری سے استعفاد
دیا، اور بارگاہ خلافت میں عرض کیا کہ اس نوکری کی بدولت مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوئی
لہٰذا میں اس نوکری کو خیر باد کہتا ہوں۔ (ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، شاہ ولی اللہ: ۲/۲۰۳)

سیدنا عمرؓ نے مملکت اسلامیہ کے تمام ذمیوں کو مذہبی معاملات میں پوری

آزادی دی ہوئی تھی اور اپنی تمام مذہبی رسوم ادا کرنے میں انہیں نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ جھجک۔ اعلانیہ ناقوس بجاتے، صلیب نکالتے اور ہر قسم کے میلوں میں شرکت کرتے جن کا تعلق ان کے مذہب سے ہوتا تھا، ان کو پوری پوری آزادی تھی، ان کے مذہبی پیشوایان کو بھی اپنے مذہبی اختیارات میں ہر قسم کی آزادی تھی۔ اسی وجہ سے تو غیر مسلم ہمیشہ مسلمانوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ چنانچہ جنگ اجنادین جو رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک بہت بڑی جنگ تھی، اور ہرقل کا حقیقی بھائی رومی لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ رومیوں کے سپہ سالار نے ایک عربی شخص کو مسلمانوں کے لشکر میں اس غرض سے بھیجا تاکہ وہ ان کی اصلی اور اندرونی حالت کی خبر لائے۔ وہ عربی جب لشکر اسلام میں جاسوسی کی غرض سے آیا تو اس نے یہاں عجیب صورت حال دیکھی۔ ان کے شب و روز کا بغور مطالعہ کیا کہ مسلمان راتوں کو تہجد گزاری اور تلاوت قرآن حکیم میں گزارتے ہیں۔ اس نے ہر شخص کو دیکھا اور بلا تصنع اور تکلف کے عبادت خداوندی میں مصروف پایا۔ دیکھا کہ باہمی معاملات میں نہایت صفائی سے ایک دوسرے سے پیش آتے ہیں۔ ہر شخص امیر کے حکم کا دل و جان سے مطیع اور فرماں بردار ہے۔ جب وہ عربی مسلمانوں کے یہ حالات دیکھ کر واپس آیا تو رومی سپہ سالار نے پوچھا: ''کہو! کیا دیکھا؟'' اس نے جواب میں کہا:

﴿بالليل رهبان، وبالنهار فرسان، ولوسرق ابن ملكهم قطعوه، ولوزنىٰ رجم لاقامة الحق فيهم﴾

''یہ لوگ راتوں کو راہب اور عابد ہیں اور دن میں بہادر اور شہ سوار ہوتے ہیں۔ اگر ان کے بادشاہ کا بیٹا بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیں۔ اور اگر زنا کرے تو رجم کر دیں۔ حق کے جاری کرنے میں ان کے ہاں کسی کی رعایت نہیں۔''

رومی فوج کے سپہ سالار نے مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی کی یہ کیفیت سن کر کہا:

﴿ان كنت صدقتني لبطن الارض خير من لقاء هؤلاء﴾

''اگر تو نے سچ کہا تو زمین میں اتر جانا (یعنی مر جانا) اس سے بہتر

ہے کہ ان لوگوں سے مقابلہ کیا جائے۔“ (ابن اثیر: ۲/۱۶۰)

یہ عام صحابہ کرامؓ کی زندگی کا حال تھا کہ ہر مخالف شخص بھی ان کی زندگی متاثر ہوتا تھا۔ سیدنا عمرؓ تو ان کے امیر تھے۔ ان میں یہ سب خوبیاں ان سے زیادہ تھیں لہٰذا غیر مسلموں کے ساتھ کسی معاملہ میں نہ انہوں نے کبھی کوئی زیادتی کی اور نہ ہی کر کرنے دی۔ آپ نے تمام ذمیوں کے مذہبی لیڈروں کے تمام اختیارات کو جو ا حاصل تھے، باقی رکھا۔ چنانچہ مصر میں اسکندریہ کا پیٹر یارک بنیامین جو تیرہ برس تک رومیوں کے ڈر سے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا، سیدنا عمرو بن عاصؓ نے جب مصر فتح ک اس کو اسکندریہ بلا لیا۔ مورخین نے اس کے بارہ میں یوں لکھا ہے کہ مصر اور اسکندریہ کی کے بعد سیدنا عمرو بن عاصؓ نے فسطاط (موجودہ قاہرہ) میں قیام فرمایا تو انہوں عقیدے کی آزادی کو اپنی پالیسی کا سنگ بنیاد بنایا۔ چنانچہ جب قبطی راہبوں کو آپ کی ا پالیسی کا علم ہوا اور اس کی صحت و صداقت میں انہیں کوئی شک و شبہ نہ رہا تو ان کی ا بہت بڑی تعداد کلیساؤں سے نکل کر جہاں مذہبی استبداد کے زمانے میں انہوں نے لے رکھی تھی، اطاعت کا اعلان کرتی ہوئی سیدنا عمرو بن عاصؓ کی طرف دوڑی۔ سیدنا ع بن عاصؓ جانتے تھے کہ قبطیوں کو اسقف اعظم پیٹر یارک بنیامین سے غیر معمولی محبت تعلق ہے، اور جب سے اس نے صعید کے دور دراز علاقے کی طرف بھاگ کر صحرا پناہ لے رکھی ہے، قبطیوں کی اس محبت اور اس تعلق میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی ہے۔ ا لیے ان کی خواہش تھی کہ بنیامین اپنے مذہبی منصب پر واپس آ جائے۔ سیدنا عمرو بن عا نے تمام قبطیوں کو امان دے دی اور اسقف بنیامین کے بارہ میں خاص طور پر فر

”بوڑھے بطریق کو اپنی اور ان قبطیوں کی جان محفوظ سمجھتے ہوئے واپس آ جانا چاہیے جو یا غیر مصر میں آباد ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ ہی ان سے عہد شکنی کی جائے گی۔“ بنیامین کو عرب فاتح کے اس عہد کی اطلاع ملی تو وہ صحرائی مأمن سے نکل کر اسکندریہ کی طرف روانہ ہوا۔ اسکندریہ میں قبطیوں نے ایک ظفر مند کی حیثیت سے ا کا استقبال کیا۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور یہ خوشی ہر خوف اور ہر تکدر سے پاک تھی۔

جب پیٹر یارک بنیامین اپنے پیروؤں میں اطمینان سے رہنے لگا تو سیدنا

Marfat.com

عمرو بن عاصؓ نے اسے بلایا اور اس کے ساتھ نہایت عزت و تکریم کے ساتھ پیش آئے کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ "اذا جاء کریم قوم فاکرموہ" (یعنی جب کسی قوم کا کوئی بڑا شخص آئے تو اس کی تکریم کرو۔) بنیامین نے ان سے گفتگو کی۔ وقار اور تحمل کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں بڑی نرمی اور شیرینی تھی۔ سیدنا عمرو بن عاصؓ کے دل پر اس کی گفتگو کا بڑا اثر ہوا اور انہوں نے قبطیوں کی مذہبی سیادت بنیامین کے سپرد کر دی کہ وہ جس طرح چاہے ان کی مذہبی راہنمائی کرے۔ قبطی بطریق بنیامین بھی مسلمان فاتح کے حضور سے انتہائی مسرور اور مطمئن واپس ہوا اور اسکندریہ پہنچ کر اس نے سیدنا عمرو بن عاصؓ کے گن گانے شروع کر دیئے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں سے کہتا: "میں اپنے شہر اسکندریہ واپس ہوا اور دیکھا کہ یہاں ہر طرح کا امن وامان ہے۔ اللہ نے کافروں کے جبر واستبداد کی لعنت ہمارے سروں سے دور کر دی۔" جوں جوں وقت گزرتا گیا پیٹریارک بنیامین کے جذبات تشکر وامتنان میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر کار تمام قبطی اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور اپنی مذہبی رسومات بے کھٹکے ادا کرنے لگے۔ بنیامین نے ان کے کلیساؤں کی اصلاح اور ان کی عبادت گاہوں کا دورہ کیا۔ وہ جہاں کہیں جاتا عقیدت مندوں کا ہجوم کھجور کی چھڑیاں اور عود دان ہاتھ میں لیے ایک جلوس کی صورت میں اس کے ساتھ ہوتا۔ حنا نقیوسی مسلمانوں سے بغض رکھنے کے باوجود بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ "رومی سرزمین مصر سے اس لیے نکالے گئے اور مسلمان ان پر اس لیے فتح یاب ہوئے کہ ہرقل نے انسانیت سوز گناہوں کا ارتکاب کیا اور قبطیوں اور ان کے مذاہب پر بے انتہاء ظلم ڈھائے تھے۔ مصر میں رومیوں کی ناکامی اور مسلمانوں کی کامرانی کا یہی سبب ہے"۔

جب سیدنا عمرؓ کو پتہ چلا کہ اسقف بنیامین اپنی قوم میں بڑی حیثیت و منزلت رکھتا ہے تو انہوں نے سیدنا عمرو بن عاصؓ کو لکھا کہ وہ مصر کی حکومت اور اس کے باشندوں کی آسائش کے لیے قبطیوں کے اس بطریق کی رائے سے فائدہ اٹھائیں۔ بنیامین نے بھی مشورہ دینے میں بخل سے کام نہ لیا۔ سیدنا عمرو بن عاصؓ نے اس کا کھویا ہوا سارا اثر ونفوذ اسے واپس دلا دیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقریزی: ۱/۴۹۲)

سیدنا عمرو بن عاصؓ گورنر مصر نے غیر فوجی مناصب اکثر و بیشتر رومیوں ہی کے

Marfat.com

پاس رہنے دیئے جو فتح مصر سے قبل اپنی حکومت کی طرف سے ان عہدوں پر مامور کیے گئے تھے۔ اور جنہوں نے اسلامی اقتدار کے بعد بھی اپنے ملک واپس جانے کے بجائے مصر ہی میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ ان میں سے کئی رومیوں نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے منیاس کو زیریں مصر کا حاکم مقرر کیا جہاں وہ ہرقل کے زمانہ میں حکمران تھا اور اس کے دوسرے ابنائے جنس کو بعض اور علاقوں کی حکومت تفویض کی، البتہ جن رومی عہدے داروں نے اجنبی حکومت کی رعایا بننا گوارا نہ کیا اور سرزمین مصر کو چھوڑ کر چلے گئے ان کی جگہ قبطیوں کو دے دی گئی۔ اور یہ سب عہدے ذمیوں کو دیئے گئے۔

مختصر یہ کہ تمام غیر مسلموں کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت میں مذہبی معاملات میں پوری پوری آزادی تھی اور بنیامین کو اسکندریہ کی جو کرسی دوبارہ نصیب ہوئی، وہ بھی سیدنا عمر کی غیر مسلموں کے ساتھ نرم پالیسی کا نتیجہ تھی۔

یہ تو صرف مصر کا معاملہ ہے۔ آپ ان تمام معاہدات کو ایک نظر دیکھ لیں جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کے ساتھ کیے گئے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ہر معاہدہ میں یہ فقرہ موجود تھا کہ "نہ تو ان کا مذہب بدلا جائے گا اور نہ ہی ان کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت کی جائے گی۔" چنانچہ بیت المقدس کے معاہدہ میں بھی یہ الفاظ مذکور ہیں۔ ایسے ہی جرجان، آذربائیجان، موقان اور دوسرے تمام معاہدوں میں صاف طور پر لکھا گیا تھا کہ "ان کی جان، مال، مذہب اور شریعت کو امان ہے" (الامان علیٰ اموالھم وانفسھم وملتھم وشرائعھم) اگرچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اشاعت اسلام کے لیے نہایت کوشاں تھے لیکن وعظ و پند کے ذریعے نہ کہ جبر و استبداد کے ساتھ۔ کیونکہ اسلام کا حکم ہے "لاکراہ فی الدین" اور اسلام کے حکم کے سامنے سیدنا عمر کی گردن فوری طور پر خم ہو جاتی تھی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ملکی حقوق کے لحاظ سے ذمیوں اور مسلمانوں میں کوئی تمیز نہیں رکھی تھی۔ کوئی مسلمان اگر کسی ذمی کو قتل کرتا تو مسلمان بے دریغ اس کے قصاص میں قتل کر دیا جاتا۔ مسلمان والنٹیروں کو گھر بیٹھے جو تنخواہ ملتی تھی اس

بھی اس میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ بیت المال سے مسلمانوں کو جو رعایت ملتی وہی رعایت ایک ذمی کو بھی ملتی تھی۔ سیدنا ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں سیدنا خالد بن ولیدؓ نے حیرہ کی فتح میں اہل شہر کے ساتھ جو معاہدہ لکھا اس میں یہ الفاظ تھے:

> ''اور میں نے ان کو یہ حق دیا کہ اگر کوئی بوڑھا شخص کام کرنے سے معذور ہو جائے یا اس پر کوئی مصیبت آئے، یا وہ پہلے دولت مند تھا پھر غریب اور قلاش ہو گیا اور اس وجہ سے اس کے ہم مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا اور اس کو اور اس کے اہل وعیال کو مسلمانوں کے بیت المال سے نان ونفقہ دیا جائے گا جب تک وہ دار الاسلام میں رہے، لیکن اگر وہ مسلمانوں کا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک چلا گیا تو مسلمانوں پر اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔'' (کتاب الخراج لابی یوسف: ۸۵)

سیدنا عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اس اصول کو اپنائے رکھا۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ سیدنا عمرؓ نے ایک بوڑھے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا، اور جب آپ کو پتہ چلا کہ وہ جزیہ ادا کرنے کے لیے بھیک مانگ رہا ہے تو آپ نے نہ صرف اس کا بلکہ اس جیسے تمام معذوروں کا بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا اور یہ بھی فرمایا: ''خدا کی قسم! یہ بات عدل وانصاف کے منافی ہے کہ ان لوگوں کی جوانی سے تو ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں ان کو نکال دیں۔'' (کتاب الخراج: ۱۵۰۔۱۵۱)

غیر مسلم حضرات سے جزیہ وغیرہ معاف کرنا یا معذور ذمیوں کے نفقہ کا انتظام کرنا بھی کفالت عامہ کے زمرہ میں آتا ہے۔

مسلمانوں نے ذمیوں کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کیا اور ان کو وہی مراعات دیں جو مسلمانوں کو دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ذمیوں نے بھی ہر موقع پر خود اپنی ہم مذہب حکومتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کی یہاں تک کہ جاسوسی بھی کی۔ مسلمان لشکروں کی خوراک اور رسد مہیا کرنے اور دوسرے کئی طریقوں سے مدد کی۔ ہر قسم کے راز مسلمانوں تک پہنچائے اور تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ یرموک میں شرکت

کے لیے جب مسلمانوں کو انطا کیہ جانا تھا تو تمام مفتوحہ علاقوں کے امراء اور روسا مسلمانوں کے عدل وانصاف سے اس قدر گرویدہ ہو گئے کہ باوجود تخالف مذہب کے انہوں نے عیسائیوں کی خبر لانے کے لیے جاسوس مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ سیدنا ابوعبیدہؓ کو انہی جاسوسوں کی وجہ سے تمام واقعات کی اطلاع ہوئی۔ آپ نے اس بارہ میں اپنے افسروں سے مشورہ طلب کیا۔ مختلف افسروں نے مختلف مشورے دیئے۔ ایک تجویز کے جواب میں سیدنا ابوعبیدہؓ سے فرمایا کہ ''ہم عیسائیوں کو شہر سے باہر نکال دیں۔'' اس پر سیدنا شرحبیل بن حسنہؓ نے اٹھ کر کہا: ''اے امیر! آپ کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں۔ ہم نے ان عیسائیوں کو اس شرط پر امن دیا ہے کہ وہ شہر میں اطمینان سے رہیں۔ اس لیے نقض عہد کرنا جائز نہیں ہے۔'' سیدنا ابوعبیدہؓ نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ بالآخر یہ رائے ٹھہری کہ حمص کو چھوڑ کر دمشق روانہ ہوں۔ وہاں خالد بن ولیدؓ موجود ہیں اور عرب کی سرحد قریب ہے۔

جب یہ بات متفقہ طور پر طے ہو چکی تو سپہ سالار لشکر اسلامی سیدنا ابوعبیدہؓ نے افسر خزانہ حبیب بن مسلمؓ سے فرمایا کہ عیسائیوں سے جو جزیہ یا خراج لیا جاتا ہے وہ ان کی حفاظت کا ٹیکس ہوتا ہے۔ اس وقت ہماری حالت ایسی نازک ہے کہ ہم ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں اٹھا سکتے لہٰذا جو کچھ ان سے ہم نے لیا ہے سب ان کو واپس کر دو اور ان سے کہہ دو کہ ''ہم کو تمہارے ساتھ جو تعلق تھا وہ اب بھی ہے لیکن چونکہ اس وقت ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے، اس لیے جزیہ جو حفاظت کا معاوضہ ہے تم لوگوں کو واپس کیا جاتا ہے۔'' چنانچہ کئی لاکھ کی رقم جو وصول ہوئی تھی، ساری کی ساری واپس کر دی گئی۔ عیسائیوں کے حاشیہ خیال میں بھی ایسا ممکن نہیں تھا۔ انہیں قیصر روم کا جور وستم اور جبر و استبداد جو ٹیکس کی فراہمی کے بارہ میں تھا، یاد تھا، لہٰذا ان پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ روئے جاتے تھے اور جوش و جذبہ کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ ''خدا تم لوگوں کو جلد واپس لائے۔'' یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انہوں نے کہا: ''تورات کی قسم! جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر انہوں نے شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے اور ہر جگہ چوکی پہرہ بٹھا دیا۔ سیدنا ابوعبیدہؓ نے صرف حمص والوں کے ساتھ ہی یہ برتاؤ نہیں کیا تھا بلکہ جس قدر اضلاع فتح ہو چکے تھے اور انہیں فوجی اسکیم

Marfat.com

(Strategy) کے تحت خالی کرنا پڑا، ان سب کے جزیہ کی رقم جس قدر وصول ہوئی تھی، ساری کی ساری واپس کر دی۔

(فتوح البلدان: ۱۳۷، کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۸۱، فتوح الشام: ۱۳۸)

اسی طرح سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہد خلافت میں شاہی خاندان سے جب مسلمانوں کی غصب شدہ املاک چھین کر انہیں اصل مالکوں کو واپس کیں تو اس وقت ذمیوں کی مغصوبہ زمینیں بھی واپس دلائیں۔ اس سلسلہ میں ایک ذمی نے دعویٰ دائر کیا کہ عباس بن ولید نے جو شاہی خاندان کا چشم و چراغ تھا، میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے عباس سے جواب دعویٰ کے لیے کہا۔ اس نے کہا: ''یہ زمین ولید نے مجھے جاگیر میں دی ہے اور میرے پاس اس کی دستاویز موجود ہے۔'' ذمی نے اپنے دعویٰ کا یہ جواب سن کر کہا: ''امیر المومنین! میں آپ سے کتاب اللہ کے مطابق اس کا فیصلہ چاہتا ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''کتاب اللہ ولید کی سند پر مقدم ہے۔'' چنانچہ آپ نے عباس بن ولید سے زمین چھین کر ذمی کو واپس لوٹا دی۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۱۰۴، البدایہ والنہایہ: ۹/۲۱۳)

آپ کا حکم تھا کہ کوئی مسلمان کسی ذمی کے مال پر دست تطاول دراز نہ کرے۔ چنانچہ اس ہدایت کے اثرات تھے کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے مال اور زمین پر دست درازی نہیں کر سکتا تھا۔ جو ایسا کرتا اسے قرار واقعی سزا ملتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسلمان ربیعہ شوذی نے ایک سرکاری ضرورت کے تحت ایک نبطی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی۔ یہ ایک معمولی بات تھی۔ آپ سے پہلے بھی ایسا ہوتا تھا۔ آج بھی گھوڑے کیا عوام کی گاڑیاں اور بسیں صرف اپنے سیاسی جلسوں کی رونق بڑھانے کے لیے یا صدر صاحب اور وزیراعظم کے ہاں اپنے نمبر بڑھانے کے لیے بیگار میں پکڑ لی جاتی ہیں اور ان کو کئی کئی روز تک استعمال میں لایا جاتا ہے۔ عوام روتے رہتے ہیں اور حکومت کے کارندوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی کیونکہ سرکاری عہدے داروں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بہرے ہوتے ہیں۔ عوام کے رونے اور چلانے کی آواز انہیں سنائی نہیں دیتی۔ وہ ''یک چشم'' بھی ہوتے ہیں کہ انہیں صرف اپنا آپ دکھائی دیتا ہے،

Marfat.com

عوام دکھائی نہیں دیتے' لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس عہدے دار کو چالیس کوڑے لگوائے تا کہ دوسرے بیوروکریٹس کے لیے باعث عبرت ہو۔

(طبقات ابن سعد: ۲۷۶/۵)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی سیدنا عمر فاروقؓ کی طرح جزیہ، خراج اور مال گذاری کی وصولی میں ذمیوں کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دیں اور اس سلسلہ میں جتنی بدعنوانیاں گذشتہ حکمرانوں نے پیدا کر دی تھیں، ان سب کا تدارک کر دیا۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے ابن اشعث، کی حمایت کے الزام میں عراق کے ذمیوں کے جزیہ کی مقدار بڑھا دی تھی۔ آپ کو پتہ چلا تو آپ نے فوری طور پر اسے کم کر دیا۔

تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے عہد خلافت میں ذمیوں کے ساتھ اتنی نرمی برتی گئی کہ اس سے عام لوگوں کو کئی نقصانات اٹھانا پڑتے۔ آپ کے زمانہ میں غلہ کا نرخ گراں ہو گیا۔ ایک شخص نے آپ سے اس گرانی کا سبب پوچھا۔ فرمایا: ''پہلے خلفاء ذمیوں کو جزیہ کی وصولی میں ناقابل برداشت تکالیف دیتے تھے، اس لیے وہ جس نرخ پر بھی ہو سکتا تھا غلہ فروخت کر دیتے تھے، اور میں ہر شخص کو صرف اتنی تکلیف دیتا ہوں جس کو وہ برداشت کر سکے، اس لیے اب ہر ذمی جس طرح چاہتا ہے اپنا غلہ فروخت کرتا ہے۔

(کتاب الخراج لابی یوسف: ۷۶)

عمر بن عبدالعزیزؒ ایک نہایت دیندار شخص تھے، اس وجہ سے ان کی نگاہ سے یہ بات اوجھل نہ تھی کہ دنیا میں عبادت خانوں کا باقی رہنا لوگوں کے لیے باعث صلاح و فلاح ہے۔ وہ عبادت خانے خواہ کسی دین وملت کے ہوں، کیونکہ کوئی مذہب بھی لوگوں کو بداخلاقی اور بدتہذیبی نہیں سکھاتا بلکہ عبادت خانوں ہی میں جا کر لوگوں کے اخلاق اور ان کی تہذیب میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے اور ان کی معاشرت درست ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ دو خارجیوں نے آ کر آپ سے ذمیوں کے بارہ میں استفسار کیا کہ ''کیا انہیں طاقت سے زیادہ تکلیف دی جا سکتی ہے؟'' آپ نے جواب میں فرمایا کہ ''جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت کے اندر تکلیف دیتا ہے تو ہم کون ہیں جو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف دیں۔'' پھر انہوں نے اہل ذمہ کے گرجے ڈھا دینے کی بابت پوچھا تو سیدنا عمر ثانیؒ نے

Marfat.com

فرمایا: ''ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ عبادت خانے اور گرجے میری رعایا کی صلاح اور اصلاح میں شامل ہیں۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن عبدالحکم: ۱۷۴)

ایک اسلامی ریاست کے بے شمار واقعات ہیں جس میں ذمیوں کے ساتھ بعض لحاظ سے مسلمانوں سے بھی بہتر سلوک کیا گیا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ ایک اسلامی ریاست میں مسلمان بھی رہتے ہیں اور غیر مسلم بھی۔ مسلمانوں سے ریاست کے لیے ہر قسم کی خدمت لی جا سکتی ہے لیکن غیر مسلم رعایا سے جزیہ اور خراج کے عوض ان کو ہر قسم کی فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اور یہ جزیہ اور خراج لے کر ایک اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔

وظائف کا اجراء:

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ سیدنا فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں سلطنت کی پہنائیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اور چاروں طرف سے مال سمٹ سمٹ کر سرکاری خزانہ میں آنا شروع ہو گیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال میں ایک روایت نقل کی ہے:

> ''جب سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں مال کی بہتات ہو گئی اور اعداد و شمار کے رجسٹر مرتب ہو گئے تو حکومت کے کارکنوں، گورنروں اور قاضیوں وغیرہ کے مشاہرے مقرر کر دیئے گئے تھے اور مال اور خزانے جمع کرنے کی ممانعت کر دی گئی، اور مسلمانوں پر کاشتکاری اور زمین داری ممنوع کر دی گئی، اس لیے کہ ان کے اور ان کے اہل و عیال کے روزینے بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے بلکہ ان کے غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں کے بھی، اس سے مقصد یہ تھا کہ تمام قوم میں عسکریت کا جذبہ پیدا ہو جائے (کیونکہ اس وقت کا تقاضا یہ تھا) اور اس طرح وہ کوچ کے لیے چست و چالاک رہے اور اس کے (جہادی) سفر کے سامنے نہ زمینداری مانع آئے اور نہ کاشت کاری،

Marfat.com

اور یہ کہ وہ بے محنت کی زندگی اور عیش وعشرت میں نہ پڑ جائے۔"

(کتاب الاموال: ۲۳۶، نظام العالم والامم: ۲/۱۸۳)

اس عبارت سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام کاشت کاری اور زراعت کا دشمن ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو ملکی معیشت کا ایک حصہ ہیں۔ اگر غلہ اور کھانے پینے کی دوسری اجناس ملک میں پیدا نہیں ہوں گی تو ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت کو کس طرح برقرار رکھا جا سکے گا۔ سیدنا عمرؓ کے اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ قوم کاشتکاری اور زمینداری میں ہمہ تن مصروف ومشغول ہو کر کہیں اسلام کے اہم ترین مسئلہ جہاد کو یک قلم فراموش نہ کر دے کیونکہ اسلام میں اس کو "ذروۃ سنامہ" یعنی نہایت چوٹی کا مسئلہ کہا گیا ہے۔ بہر حال یہ ایک وقتی ممانعت تھی۔ اس سے دراصل مسلمانوں کو یہ باور کرانا تھا کہ جب تم لوگوں نے دین کے پورے نظام حیات کو قبول کر لیا ہے تو اب تمام افراد ملت یہ یقین کریں کہ اعلاء کلمۃ اللہ کی بقاء کے لیے جہاد از بس ضروری ہے اور مسلمانوں کی زندگی اجتماعی نظام کی حیات کے ساتھ وابستہ ہے اور ان کے عملی قویٰ خود اپنے لیے نہیں بلکہ جماعت کی خدمت اور اسلامی ریاست کے استحکام کے لیے ہیں، اور اسی لیے ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کے لیے اسلامی اسٹیٹ بڑی حد تک خود متکفل ہو۔ علاوہ ازیں جاگیرداری اور زمینداری سسٹم چونکہ ایک انسان کو عیش وعشرت کی زندگی اور دوسروں کی محنت پر بھروسہ کرنے اور کاہلی اور بیکاری کی دعوت دیتا ہے، اس لیے اسلام نے اس کی تحسین نہیں کی اور مسلمانوں کو اس سے الگ رکھنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مسلمانوں نے زمینداری اور جاگیرداری کے جال میں الجھ کر "جہاد" کو جس کو حدیث میں "ذروۃ سنام" کہا گیا ہے، چھوڑ دیا اور دنیا میں اپنے مقام کو کھو بیٹھے۔ اگر وہ جہاد بالحق کو اپنا شعار بنائے رکھتے اور پاک معاشی زندگی کو اپنا اسوہ بنائے رکھتے اور کاشت کاری اور جاگیرداری کے جال میں نہ الجھ جاتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا اور آج مسلمانوں کے لیے نکبت و ادبار اور ذلت وافلاس کی یہ حالت پیدا نہ ہوتی جس میں سے وہ آج کل گزر رہے ہیں۔

اسلام نے اپنی رعایا کے لیے جو وظائف کا سلسلہ شروع کیا وہ مختلف شعبوں پر مشتمل تھا اور ہر شعبہ کی الگ الگ فہرستیں اور الگ الگ رجسٹر تھے۔

Marfat.com

1- پہلا شعبہ:

پہلے شعبہ میں وہ وظائف آتے ہیں جو فوجی خدمات کے بارے میں تھے۔ جیسا کہ سطور بالا میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے اس کے ہر ماننے والے کے لیے جہاد بالسیف کا سپاہی ہونا ضروری اور لازمی ہے، لہٰذا اس شعبہ کو دو حصوں میں علماء نے تقسیم کیا ہے۔

1- ایک وہ فوجی جماعت جو میدان کارزار میں عام طور پر سر بکف ہوتی ہے اور اس کا کام ہی میدان جنگ میں دشمن سے لڑنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ باقاعدہ فوج میں شامل ہیں۔

2- اور دوسری جماعت وہ ہے جو عام طور پر اپنے آپ کو کاروبار میں مصروف رکھتی ہے لیکن وقت پر فوجی خدمت کے لیے حاضر ہو جاتی ہے۔ آجکل کی اصطلاح میں اس کو ریزروفورس (Reserve Force) کہا جاتا ہے۔

ایک اسلامی ریاست میں ان دونوں جماعتوں کے لیے وظائف کا تقرر کیا جانا ضروری ہے اور خلافت فاروقی میں پہلی مرتبہ مہاجرین وانصار اسی فہرست میں داخل تھے اور بحرین سے جو پانچ لاکھ کا مال کثیر آیا تھا اس میں اسی شعبہ کے وظائف مقرر کیے گئے تھے۔ چنانچہ اس مال کے آنے پر سیدنا عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے اس بارہ میں مشورہ فرمایا تو ولید بن ہشامؒ نے کہا:

> ''امیرالمومنین! میں شام میں رہ کر آیا ہوں، وہاں کے بادشاہوں کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں رجسٹر بنا رکھے ہیں اور لشکریوں اور فوجیوں کے ناموں کا اندراج باقاعدہ اس رجسٹر میں کر رکھا ہے۔ آپ بھی اسی طرح رجسٹر بنوائیں اور فوجیوں کے ناموں کا ان میں اندراج کروائیں۔ سیدنا عمرؓ کو ولید بن ہشام کی یہ بات پسند آئی اور انہوں نے رجسٹر بنوائے۔'' (طبری:۵/۲۳)

اس سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ نے بھی ایک روایت نقل کی کہ:

Marfat.com

''اللہ تعالیٰ نے جب سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں فتوحات کا سلسلہ وسیع کیا اور فارس وروم کے علاقے فتح ہو کر مملکت اسلامیہ کی حدود وثغور میں شامل ہو گئے اور ہر طرف سے ڈھیروں مال غنیمت اور فئے کی شکل میں سرکاری خزانہ میں آنا شروع ہوا تو سیدنا عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کی مجلس مشاورت منعقد کی اور فرمایا کہ میرا ارادہ ہے کہ مال کو بیت المال میں جمع رکھوں، اس لیے کہ یہ باعث برکت ہوگا اور اس میں سے لوگوں کے لیے سالانہ وظیفے مقرر کروں۔ اس بارہ میں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ صحابہ کرامؓ نے کہا کہ آپ اس بارہ میں جو مناسب سمجھیں کریں۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق آپ کے شامل حال ہے۔ پس سیدنا عمرؓ نے وظائف مقرر فرمائے اور ان کو رجسٹر میں درج کرنے کے لیے رجسٹر منگوائے۔ پھر پوچھا کہ پہلے کس کا نام لکھوں۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ اپنے نام سے شروع فرمائیں۔ سیدنا عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا: ''خدا کی قسم! یہ کبھی نہ ہوگا بلکہ سرکار دوعالم ﷺ کے خاندان بنی ہاشم سے شروع کرتا ہوں۔''

(کتاب الخراج:۴۴)

وظائف کے اس تقرر میں اگرچہ فوجیوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے نام بھی پائے جاتے ہیں لیکن ابتداء میں فوجی اور غیر فوجی دونوں کے نام اکٹھے لکھے گئے لیکن بعد میں فوجیوں اور غیر فوجیوں کے الگ الگ رجسٹر بنا دیئے گئے۔

اسلام سے قبل دنیا میں بڑی بڑی حکومتیں قائم رہ کر نیست ونابود ہو چکی تھیں خود اس زمانہ میں دو بڑی سپر پاورز قیصر وکسریٰ کی حکومتیں تھیں۔ ان کا فوجی سسٹم بھی غیر مربوط، غیر منظم اور اصول سیاست کے خلاف تھا۔ ملک میں جو لوگ مکھیا اور جاگیردار تھے سپہ گری اور سپہ سالاری کا جوہر رکھتے تھے، ان کو بڑی بڑی جاگیریں اس وعدہ پر دی تھیں کہ جنگی مہمات کے وقت وہ فوج لے کر حاضر ہوں گے۔ ان میں سے ہر شخص کے پاس ایک خاص تعداد میں فوج ہوتی تھی۔ فوجوں کا تعلق براہ راست حکومت سے نہیں

تھا۔ اس طریقہ کار کا نام فیوڈل سسٹم (Fuedle System) تھا اور یہ فوجی افسر بیرن (Barons) کہلاتے تھے۔ ایسا فوجی نظام بازنطینی اور ایرانی دونوں حکومتوں میں تھا۔ عرب میں بھی یمن وغیرہ کے بادشاہوں کے پاس فوج کا کوئی منظم اور مربوط سسٹم نہ تھا۔

سرکار دو عالم ﷺ کی ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کو فوج کی کوئی با قاعدہ ضرورت نہ پڑی، اس وجہ سے آپ نے فوج کا کوئی منظم بندوبست نہ کیا۔ سیدنا ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں صرف اس قدر ہوا کہ خلافت کے پہلے سال غنیمت سے جو کچھ بچا وہ سب لوگوں میں دس دس درہم کے حساب سے تقسیم کر دیا گیا۔ دوسرے سال آمدنی زیادہ ہوئی تو یہ تعداد دس سے بیس تک پہنچ گئی۔ لیکن نہ تو فوج کی کوئی با قاعدہ تنخواہ مقرر ہوئی اور نہ فوجیوں کا کوئی رجسٹر بنا اور نہ ہی کوئی محکمہ دفاع قائم ہوا۔ سیدنا عمرؓ کے اوائل خلافت تک یہی حال رہا لیکن سنہ ۱۵ھ ہی میں سیدنا عمرؓ نے اس صیغہ کو اس قدر منظم اور با قاعدہ کر دیا کہ اس وقت کے لحاظ سے لوگوں کو تعجب ہوتا ہے جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرۃ عمر فاروقؓ'' میں درج کر دی ہے۔

عرب پیدائشی طور پر جنگ جو تھے لیکن وہ زیادہ تر آپس ہی میں لڑتے رہتے تھے، لیکن سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں جب انہیں دنیا کی متمدن، مہذب اور طاقت ور حکومتوں سے لڑنا پڑا تو ایک تو ایمانی جذبہ نے ان میں جرأت و ہمت پیدا کی دوسرے انہوں نے خود اپنی پیدائشی جنگ جویانہ صلاحیتوں کو منظم کیا۔ چنانچہ انہی دو خوبیوں کی وجہ سے انہوں نے فوجوں کی قلت تعداد اور سامان حرب و ضرب کی کمی کے باوجود دنیا کی دو بڑی طاقتوں کو ہر میدان میں شکست سے دوچار کیا۔

سیدنا عمرؓ نے سیدنا عقیل بن ابی طالبؓ، سیدنا مخرمہ بن نوفل اور سیدنا جبیر بن مطعمؓ نے حیثیت اور مرتبے کے لحاظ فہرستیں تیار کیں۔ ان میں فوجیوں اور غیر فوجیوں کی الگ الگ فہرستیں تیار کی گئیں۔ سب سے پہلے بنو ہاشم کے نام لکھے گئے۔ پھر سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے قبیلے بنو تیم کا اور پھر سیدنا عمرؓ کے قبیلے بنو عدی کے نام لکھے گئے، اور پھر اسی ترتیب سے دوسرے قبائل کے، سیدنا عمرؓ نے جو طبقاتی درجہ بندی کی وہ سیدنا ابوبکرؓ کے مسلک کے خلاف تھی۔ سیدنا ابوبکرؓ اپنے عہد خلافت میں عورت مرد، چھوٹا بڑا اور آزاد غلام

Marfat.com

سب پر مال برابر تقسیم فرماتے تھے کیونکہ سرکار دو عالم ﷺ کا یہی دستور تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ بحرین سے مال آیا اور حسب سابق برابر تقسیم کیا گیا، تو فی کس بیس درہم حصہ میں آئے، بعض حضرات نے اعتراض کیا کہ ''اے خلیفۂ رسول! آپ نے مال برابر تقسیم کر دیا حالانکہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کو دوسروں پر تقدیم وتفوق حاصل ہے۔ اگر آپ سبقت فی الاسلام اور فضیلت کی رعایت رکھتے تو بہتر ہوتا۔'' یہ سن کر سیدنا ابوبکرؓ نے فرمایا ''وہ اللہ کے لیے اسلام لائے اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے جو قیامت کے روز انہیں عطا فرمائے گا۔ اس دنیا میں ان سب کا حصہ برابر ہے کیونکہ یہ معاش کا معاملہ ہے اس میں برابری کا معاملہ کرنا ترجیح دینے سے بہتر ہے۔ (کتاب الخراج:۴۲)

سیدنا عمرؓ نے جب ''السابقون الاولون'' کو فضیلت دینا چاہی تو سیدنا ابوبکرؓ کا قول ''السویة خیر من الاثرة'' (برابری کا معاملہ ترجیح دینے سے بہتر ہے) ان کے سامنے دہرایا گیا تو انہوں نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ''میں رسول اللہ ﷺ سے لڑنے والوں کو ان لوگوں کے درجہ میں نہیں رکھ سکتا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر جنگ کی ہے۔'' چنانچہ آپ نے اہل بدر کو سب پر مقدم رکھا، لیکن جو حضرات رسول اللہ ﷺ سے رشتہ میں سب سے قریب تھے انہیں فضیلت دینے میں جہاد اور سبقت فی الاسلام کا لحاظ نہ رکھا۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کے جو وظائف منظور کیے حسب ذیل تھے:

1-	سیدنا عباس بن عبدالمطلبؓ عم محترم	۱۲ ہزار درہم سالانہ
2-	سیدہ صفیہ بنت عبدالمطلبؓ عمہ محترمہ	۶ ہزار درہم سالانہ
3-	امہات المومنینؓ	۱۲ ہزار درہم سالانہ

یہ ابن سعد کی روایت ہے۔ طبری نے دس ہزار درہم لکھا ہے لیکن ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ سیدہ عائشہؓ کو دو ہزار درہم زیادہ دیئے کیونکہ سرکار دو عالم ﷺ ان سے زیادہ محبت فرماتے تھے۔

4-	سیدنا علی بن ابی طالبؓ	۵ ہزار درہم سالانہ
5-	سیدنا حسن بن علیؓ	۵ ہزار درہم سالانہ

	سیدنا حسین بن علیؓ	۵ ہزار درہم سالانہ
	شرکاءِ بدر	۵ ہزار درہم سالانہ
	مہاجرین حبشہ اور شرکائے احد	۴ ہزار درہم سالانہ
	فتح مکہ سے قبل ہجرت کرنے والے	۳ ہزار درہم سالانہ
-1	فتح مکہ کے موقع پر ایمان لانے والے	۲ ہزار درہم سالانہ
-1	شرکائے قادسیہ و یرموک	۲ ہزار درہم سالانہ
-1	قادسیہ اور یرموک کے بعد کے مجاہدین	تین سو درہم سالانہ
-1	اہل یمن	تین سو درہم سالانہ
-1	بلا امتیاز مراتب	تین سو درہم سالانہ

مختصر یہ کہ کسی شخص کا تین سو درہم سالانہ سے کم وظیفہ مقرر نہ فرمایا، اور فرمایا: ''اگر مال کی کثرت اور بہتات ہوئی تو ہر شخص کو چار ہزار درہم اور وظیفہ دوں گا۔ ایک ہزار سفر کے لیے، ایک ہزار اسلحہ کے لیے، ایک ہزار اہل وعیال کے واسطے اور ایک ہزار اس کے گھوڑے کے لیے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں ان کے امثال واقران سے زیادہ وظیفہ دیا گیا۔ چنانچہ سیدنا عمر بن ابی سلمہؓ کا وظیفہ چار ہزار درہم مقرر کیا گیا۔ یہ عمرؓ سیدہ ام سلمہ ام المومنینؓ کے صاحبزادے تھے۔ ان کے وظیفہ پر محمد بن عبداللہ بن جحشؓ نے اعتراض کیا اور سیدنا عمرؓ سے کہا: ''آپ نے عمر بن ابی سلمہؓ کو ہم پر فضیلت کیوں دی ہے؟ ہمارے بزرگوں نے تو ہجرت بھی کی اور مختلف غزوات میں شریک بھی ہوئے۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''میں نے انہیں رسول اللہ ﷺ کی قرابت کی وجہ سے فضیلت دی ہے۔ لاؤ اگر کوئی ایسی ماں جس پر سیدہ ام سلمہؓ کی طرح عنایت اور مہربانی کی گئی ہو؟''

سیدنا طلحہ بن عبیداللہؓ اپنے بھائی عثمانؓ کو آپ کے پاس لائے تو آپ نے اس کا وظیفہ آٹھ سو درہم مقرر فرمایا۔ پھر سیدنا نضر بن انسؓ آئے تو سیدنا عمرؓ نے فرمایا کہ ان کا وظیفہ دو ہزار درہم لکھو۔ اس پر سیدنا طلحہؓ نے کہا: ''میں بھی ان ہی کی طرح کے ایک آدمی (عثمانؓ) کو آپ کے پاس لایا تو آپ نے اس کا وظیفہ آٹھ سو درہم مقرر فرمایا اور نضر بن انسؓ کے لیے آپ نے دو ہزار مقرر فرمائے؟'' آپ نے یہ سن کر فرمایا:

Marfat.com

— ''اُن کے والد احد کے روز مجھے ملے تو انہوں نے پوچھا: ''رسول اللہ ﷺ کا کیا ہوا؟'' میں نے بتایا کہ میرے خیال میں تو آپ شہید ہو گئے۔ یہ سن کر انہوں نے اپنی تلوار کھینچ لی اور نیام توڑ دی اور بولے: ''اگر رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے تو اللہ تو زندہ ہے، وہ کبھی نہیں مرے گا۔''

اس کے بعد وہ لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے اور اس وقت عثمان کا باپ فلاں جگہ بکریاں چرا رہا تھا۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ (کتاب الخراج: ص ۴۳)

سیدنا اسامہ بن زیدؓ کا وظیفہ بھی چار ہزار درہم مقرر کیا گیا۔ اس پر آپ کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: ''آپ نے مجھے تو تین ہزار درہم دیئے اور اسامہ کو چار ہزار درہم، حالانکہ میں غزوات میں شریک ہوا ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''میں نے اس لیے زیادہ وظیفہ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اسے تم سے اور اس کے باپ کو تمہارے باپ سے زیادہ چاہتے تھے۔'' سیدنا ابوبکرؓ کی زوجہ محترمہ سیدہ اسماء بنت عمیسؓ کو ایک، سیدہ ام کلثوم بنت عقبہؓ کو ایک ہزار اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی والدہ ماجدہ کو ایک ہزار وظیفہ دے کر ہم چشموں سے انہیں ممتاز کر دیا۔ جن لوگوں کے نام رجسٹر میں درج تھے ان کی بیوی بچوں کی تنخواہیں اور وظائف بھی مقرر ہوئے۔ (کتاب الاموال: ۲۳۷، ۲۴۱)

چنانچہ مہاجرین و انصار کی بیویوں کا وظیفہ دو سو درہم تک، اہل بدر کی اولاد کا وظیفہ دو ہزار درہم مقرر ہوا۔ جن لوگوں کا وظیفہ مقرر ہوا ان کے غلاموں کا وظیفہ بھی مقرر کیا گیا۔ شروع شروع میں سیدنا عمرؓ کسی شیرخوار بچے کا وظیفہ اس وقت تک مقرر نہ فرماتے جب تک اس کا دودھ نہ چھوٹ جاتا، لیکن ایک دفعہ رات کو گشت کرتے انہوں نے دیکھا کہ ایک عورت کا بچہ بہت رو رہا ہے لیکن اس کی ماں پر اس کے رونے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ آپ نے اس عورت سے دریافت کیا تو اس نے عرض کیا کہ عمرؓ کا حکم ہے کہ جب تک بچے کا دودھ چھوٹ نہ جائے اس کا وظیفہ مقرر نہیں ہو سکتا اور میں ایک پریشان حال عورت ہوں، اس لیے میں نے قبل از وقت اس کا دودھ چھڑا دیا ہے۔ اس وجہ سے یہ بچہ بے تاب ہو کر رو رہا ہے اور اس کے رونے کی طرف کوئی دھیان نہیں دے رہی کیونکہ مجھے علم ہے کہ

Marfat.com

ں رو رہا ہے۔ سیدنا عمرؓ کو عورت کی یہ بات سن کر اپنے آپ پر افسوس ہوا اور صبح تمام
ت میں منادی کرادی کہ آئندہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا روزینہ اور وظیفہ مقرر کردیا جایا
ے گا۔ (ملاحظہ ہو کتاب الاموال لابی عبید: ۲۳۷)

جن جن مردوں کے ناموں کا اندراج رجسٹر میں ہوا اگرچہ وہ سب صیغہ فوج
تعلق رکھتے تھے لیکن جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا ہے، ان فوجیوں کی دو قسمیں قرار
ئیں:

وہ فوجی جو مستقل فوج میں تھے اور ہر وقت جنگی اور فوجی مہمات میں مصروف رہتے تھے۔ گویا یہ حکومت کی باقاعدہ فوج کے سپاہی تھے۔

دوسرے وہ فوجی تھے جو عموماً اپنے گھروں میں رہتے تھے اور ضرورت کے وقت طلب کیے جاتے تھے جب کو آج کل کی اصطلاح میں ریزور فوج کہتے ہیں۔

فوجی نظم ونسق اور ان کے وظائف کے تعین کی طرف یہ سیدنا عمرؓ کا پہلا قدم تھا
پ نے ۱۵ھ میں اٹھایا۔ اگرچہ اس میں کچھ خامیاں بھی رہ گئیں۔ اس میں ایک خامی
ں کہ فوجی وظائف کے ساتھ غیر فوجی وظائف بھی رجسٹر میں درج ہو گئے یعنی دونوں کا
ی رجسٹر تھا، لیکن سنہ ۲۵ھ میں سیدنا عمرؓ نے فوج کے اس صیغہ کو اس قدر منظّم اور
ب کیا کہ اس وقت کسی دوسرے ملک میں ایسا نظام نہیں تھا۔ اس وجہ سے بعض مورخین
ے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ سیدنا عمرؓ نے وظیفوں کے رجسٹر کب مرتب کیے۔
ری ۱۵ھ بتاتے ہیں اور ابن سعد ۲۰ھ۔ ہمارے نزدیک اصل اور درست بات یہ ہے کہ
ل نظام کی ابتداء ۱۵ھ میں کی گئی تھی، لیکن اس کو منظّم ۲۰ھ میں کیا گیا تھا۔ اس دوران
ں نظام کی اصلاح ہوتی گئی اور اس میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو دور کیا گیا۔

وظائف کا یہ انتظام جو کیا گیا اس کو چلانے کے لیے اور وظائف کے لیے فنڈ
یا کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ہر صوبے کی آمدن اس صوبے کے بیت
لمال میں جمع ہوتی اور پھر وہاں کے مصارف اور وظائف میں استعمال ہوتی۔ وظائف اور
صارف کے بعد جو رقم بچتی وہ مرکزی خزانہ (Central Exchequer) میں منتقل ہو
الی۔ سیدنا عمرؓ اس بارہ میں صوبوں کے گورنروں کے نام مختلف اوقات میں مختلف ہدایات

Marfat.com

اور احکام ارسال فرماتے رہتے تھے۔ پھر بیت المال کے حساب کتاب کے لیے رجسٹر تیار کیے گئے۔ اس وقت عرب میں مستقل سن کا رواج نہ تھا، لہٰذا آپ نے سنہ میں سن ہجری ایجاد کر کے اس کمی کو پورا فرمادیا۔

مرکزی بیت المال کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ منورہ کے باشندوں کے وظائف اور ان کی تنخواہوں کا سالانہ خرچ تین کروڑ درہم اس سے حکومت کی آمدنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یعقوبی نے سیدنا معاویہؓ کے میں حکومت کی جو آمدنی بتائی ہے وہ قریباً ۱۴۵ ملین درہم اور ۱۸۹۲ ہزار دینار کے ان علاقوں کی ہے جو سیدنا عمرؓ کے زمانہ خلافت میں فتح ہوئے تھے۔ (یعقوبی: ۲/۷۷) ان میں سے بعض علاقوں کی آمدنی سیدنا عمرؓ کے زمانہ میں زیادہ تھی۔

دوسرا شعبہ...... وظائف:

اس سلسلہ میں دوسرا شعبہ اسلامی ریاست میں جوڈیشل (Judicial) اور ایگزیکٹو (Executive) کے اراکین کے مشاہروں کا ہے۔ مشاہروں کا یہ نظام قدیم اور جدید طرز ہائے حکومت کے نظام اور سسٹم پر قائم نہیں کہ اس کی اساس دماغی اور ذہنی استعداد کا معیار قائم کر کے مقرر کی جائے، اور اس طرح رضا کارانہ تجارتی سسٹم میں ڈھال دیا جائے، بلکہ ان کے لیے بھی حکومت اسلامی کی طرف سے وظائف مقرر ہوتے ہیں اور ان کے تقرر میں دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔

اول یہ کہ اس کا وظیفہ اتنا ضرور ہو کہ ان کی اور ان کے اہل و عیال کی اچھے طریقے سے کفالت کر سکے اور تنگ دستی کے باعث رشوت کی جانب مائل نہ ہونا پڑے۔

دوسرے یہ کہ عام طور پر ان میں تقریبی یکسانیت ہو، یہ نہ ہو کہ ایک اگر دس روپے پا رہا ہے تو دوسرا ایک ہزار۔ ان وظائف کے تقرر کا معاملہ صدر ریاست اور اولی الامر کی صواب دید پر ہے۔

اس سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ نے قضاۃ، عمال اور حکومت کے دوسرے کارکنان کے وظائف کے بارہ میں تحریر فرمایا:

Marfat.com

''اے ہارون الرشید! تم اپنی تمام سلطنت میں یہ احکام بھیج دو کہ ہر شہر اور ہر قریہ میں عادل اور ثقہ لوگ منتخب کر کے ان کو ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ دیا جائے کیوں کہ اگر عادل ثقہ شخص کی خبر قابل اعتماد نہ ہو گی تو اور کس کی خبر قابل اعتماد ہو گی۔ اور ان لوگوں کے لیے بیت المال سے روزینے مقرر کریں۔ اور ہر وہ شخص جس کو تم مسلمانوں (یعنی اسلامی ریاست) کی خدمت پر مامور کرو اس کا روزینہ بیت المال (سرکاری خزانہ) سے مقرر کرو۔ اور قاضیوں اور گورنروں کو زکوٰۃ کی مد سے وظیفہ نہ دیا جائے، صرف عاملین صدقات کو زکوٰۃ کی مد میں سے وظیفہ دیا جا سکتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے اس کی تصریح وفرمادی ہے ''والعاملین علیھا'' (یعنی صدقات میں سے ان لوگوں کو روزینہ دو جو اس کی وصولی پر مامور ہیں) باقی ان کے وظائف کی کمی بیشی کا معاملہ آپ کی (یعنی خلیفہ مسلمین) کی صوابدید پر ہے۔'' (کتاب الخراج لابی یوسف:۱۸۶)

قریباً یہی بات امام ابوعبیدؒ نے اپنی کتاب الاموال میں لکھی ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۶۰۱۔

عاملین اور کارکنان حکومت کا روزینہ ماہوار یا سالانہ کتنا ہونا چاہیے یہ صدر ریاست کی صوابدید پر ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسف کی طرح ابوعبیدؒ نے بھی لکھا ہے:

''امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کارکنان حکومت کا روزینہ کوئی مقررہ چیز نہیں ہے بلکہ یہ خلیفہ کی صوابدید اور اس کے اجتہاد پر منحصر ہے۔'' یہی ابوسفیان اور اہل عراق کا قول ہے اور ہمارا معمول بہ بھی یہی ہے۔'' (کتاب الاموال:۶۰۶)

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں تو ہر کام بغیر تنخواہ اور وظیفہ ہی کے چلتا تھا۔ عاملین زکوٰۃ کو زکوٰۃ وصول کرنے پر اس کا حصہ ملتا تھا، اور مال غنیمت میں مجاہدین اسلام کو حصہ ملتا، لیکن وظائف وغیرہ کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ آپ ﷺ کے انتقال

Marfat.com

کے بعد جب سیدنا ابوبکرؓ مسند خلافت پر بیٹھے تو زمام خلافت ہاتھ میں لینے سے قبل ابوبکرؓ کی اپنی آمدنی کے دو ذریعے تھے۔ ایک تجارت اور دوسرا جائداد کی آمدن۔ تجارت کا آبائی پیشہ تھا۔ ان کا بڑا لڑکا عبدالرحمٰن بھی یہی کام کرتا تھا۔ سیدنا ابوبکرؓ کے پاس غلام بھی تھے جن سے وہ محنت مزدوری کروا کر یومیہ ٹیکس وصول کرتے تھے۔ ہجرت کے رسول اللہ ﷺ نے ان کو مدینہ سے نکالے ہوئے یہودیوں کی اراضی سے ایک جا بھی عطا کی تھی جس میں نخلستان اور قابل زراعت زمین تھی۔ ان کی ایک جائداد مدینہ سے پانچ چھ میل دور "غابہ" کے مرغزار میں بھی بتائی گئی ہے۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۱۷۰/۶)

مدینہ میں ان کے دو مکان تھے جن میں ان کی دو بیویاں رہتی تھیں۔

(طبقات ابن سعد: ۱۸۵/۳، یعقوبی: ۲/۷)

اس کے علاوہ وہ خیبر وغیرہ میں بھی کچھ اراضی تھی۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب سیرت ابوبکر صد)

خلیفہ ہونے کے بعد سیدنا ابوبکرؓ کی ذمہ داریاں اتنی بڑھ گئیں کہ تجارت چھوڑنا پڑی۔ خلیفہ کے لیے ان کی جائز ضروریات پوری کرنے کی خاطر وظیفہ مقرر کرنا اسلامی ریاست کے ذمہ ہے۔ ضروری ہے کہ بیت المال میں سے خلیفہ کے لیے اتنی مختص کر دی جائے جو اس کی اور اس کے اہل وعیال کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہو، صحابہ کرامؓ نے سیدنا ابوبکرؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد مندرجہ ذیل اشیاء بیت المال سے ان کے لیے مقرر کر دیں۔

دو یمنی چادریں، ایک سردیوں میں اور دوسری گرمیوں میں لباس کے طور پر استعمال کرنے کے لیے، جب پرانی ہو جائیں اور پھٹ جائیں تو ان کی جگہ نئی لے لی سفر کے لیے ایک سواری، اہل وعیال کے خرچ کے لیے اتنی رقم جتنی سیدنا ابوبکرؓ خلافت سے پہلے خرچ کرتے تھے اور بکری کا نصف حصہ جس میں سر اور اوجھڑی شامل نہیں تھی

(کنز العمال: ۵۹۵/۵، مصنف عبدالرزاق: ۱۱/۱۰)

سیدنا ابوبکرؓ کا حکومت کے بارہ میں وہ نظریہ نہیں تھا جو اس زمانہ کے حکمرانوں کا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ خلیفہ کو ایسا لباس نہیں پہننا چاہیے جس سے وہ دوسروں سے ممتاز

Marfat.com

معلوم ہو۔ چنانچہ آپ کا لباس نہایت سادہ تھا کہ بعض دفعہ ان کو پہچاننا نہایت مشکل ہو جاتا تھا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ خلیفہ کی زندگی زہد وتقشّف کے قریب ہونی چاہیے۔ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے سامنے سیدنا ابوبکرؓ نے دو شعر پڑھے ؎

اذا اردت شریف الناس کلھم
فانظر الیٰ ملک فی زی مسکین
ذالک الذی حسنت فی الناس فاقۃ
و ذاک یصلح للدنیا وللدین

یعنی اگر تم شریف ترین انسان کو دیکھنا چاہو تو اس بادشاہ کو دیکھو جو مسکینوں کے لباس میں ہو۔ ایسے انسان کی فاقہ کشی میں بھی ایک حسن ہوتا ہے اور ایسا ہی انسان دین و دنیا دونوں کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ (کنز العمال: ۷۶۴/۵)

یہ تو خلیفہ کی تنخواہ اور اس کے وظیفہ کا معاملہ تھا، لیکن کارکنان حکومت کے وظیفہ کا معاملہ سرکار دو عالم ﷺ کے زمانہ ہی سے شروع ہو گیا تھا، مگر یہ عام رواج نہ تھا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکہ کا گورنر سیدنا ابوسفیان کے چچا کے پوتے سیدنا عتاب بن اسیدؓ کو مقرر فرمایا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس (۲۱) سال تھی۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ان کا روزینہ ایک درہم یومیہ مقرر فرمایا اس پر عتابؓ نے کہا:

﴿ایھا الناس! اجاع اللہ کبد من جاع علیٰ درھم﴾

''اے لوگو! اللہ تعالیٰ اس شخص کے جگر کو بھوکا رکھے جو ایک درہم میں بھی بھوکا رہے۔''

عتاب نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد سیدنا ابوبکرؓ کے سارے عہد خلافت میں مکہ کے گورنر رہے۔ عہد صدیقی میں بھی ان کا ماہانہ وظیفہ تیس درہم تھا یعنی ایک درہم یومیہ۔ (روض الانف: ۳۸۵/۲، الاستیعاب: ۵۳/۳، اسد الغابہ: ۳۵۸/۳، تہذیب التہذیب: ۲۷۹/۷، الترتیب الاداریہ للکتانی: ۲۶۴/۱)

اتنا قلیل وظیفہ ناگزیر ضروریات زندگی ہی کے لیے کفیل ہو سکتا تھا۔ اس میں اتنی گنجائش کہاں تھی کہ وہ اس میں سے کچھ پس انداز کر سکیں۔ چنانچہ جب وہ اس منصب

سے سبکدوش ہوئے تو اس پورے زمانہ کی آمدنی کی پس انداز چیزیں صرف دو کپڑے تھے جو انہوں نے اپنے غلام کسان کو پہنا دیئے۔

وظیفہ اور مشاہرہ کے تعین میں عہدہ کی حیثیت اور اس کے ضروری اخراجات لوازم کی رعایت بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ سیدنا علی فرمایا کرتے تھے: ''ہم میں سے جو شخص بھی والی ہو، اگر اس کی بیوی نہ ہو تو بیوی حاصل کرے، نوکر نہ ہو تو نوکر رکھے، گھر نہ ہو تو گھر بنائے یا کرایہ پر لے، سواری نہ ہو تو سواری لے۔ اس سے زیادہ جو لے گا وہ خائن ہے یا چور۔ (مختصر کنز العمال برحاشیہ مسند احمد بن حنبل: ۱۴۲/۲)

سیدنا ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں بیت المال کے کارکنان حکومت کو کیا اور وظیفہ ملتا تھا، تاریخ میں اس کی کوئی مقدار نہیں آئی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ عہد صدیقی میں عہد نبوی سے زیادہ وظیفے اور مشاہرے لوگوں کو ملتے تھے کیونکہ اسلامی ریاست کی وسعت میں اضافہ کی وجہ سے ریاستی آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا، اس وجہ سے مشاہروں اور وظیفوں کی مقدار میں بھی ضرور اضافہ ہوا ہوگا۔ ویسے سیدنا ابوبکرؓ کا یہ اصول تھا کہ جونہی کہیں سے بیت المال میں آتی وہ اس کو لوگوں میں برابر برابر تقسیم فرما دیتے۔ (یعقوبی: ۵۲/۲)

روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں سب سے آخر میں جو وصول ہوئی وہ بحرین کا خراج تھا جس کی مقدار آٹھ لاکھ درہم تھی لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ کل رقم ایک ہی مجلس میں تقسیم فرما دی۔ سیدنا ابوبکرؓ نے اپنی خلافت میں اگرچہ کوئی بیت المال قائم نہیں فرمایا تھا لیکن جو کچھ مال غنیمت آتا وہ آپ اسی وقت لوگوں میں تقسیم فرما دیتے۔ آپ نے بیت المال کے لیے ایک مکان خاص کر لیا تھا لیکن وہ ہمیشہ بند رہتا تھا کیونکہ جو کچھ آتا اسی وقت تقسیم کر دیا جاتا تھا، اس لیے خزانہ میں رکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد خزانہ سے صرف ایک درہم یا دینار نکلا۔

سیدنا عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں آپ کے اس اصول کو توڑ دیا کہ مال تمام لوگوں میں برابر تقسیم کیا جائے۔ سیدنا عمرؓ نے لوگوں کے مقام اور منصب کے لحاظ سے کے سالانہ وظائف مقرر فرمائے تھے۔ چنانچہ سیدنا عبدالرحمٰن بن حارثؓ کے غلام ابوقرہ

بیان ہے کہ ''سیدنا ابوبکرؓ نے فیئے میں مجھے بھی اتنا ہی حصہ دیا تھا جتنا میرے آقا کو دیا۔''
(المحلی لابن حزم: ۷/۲۲۲، کنز العمال: ۴/۵۲۱)

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء کے عہد میں قصاۃ کے وظائف بھی بیت المال سے دیئے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد نبوت میں مختلف علاقوں میں قاضی مقرر فرمائے جیسے کہ سیدنا علیؓ اور سیدنا معاذ بن جبلؓ کو آپ نے یمن کا قاضی مقرر فرمایا۔ سیدنا ابوبکرؓ نے اپنے عہد خلافت میں سیدنا علیؓ، سیدنا معاذ بن جبلؓ، سیدنا عثمان بن عفانؓ، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سیدنا زید بن ثابتؓ وغیرہ کو قضاۃ کے عہدہ پر مامور فرمایا اور بیت المال سے ان کو وظائف دیئے۔

سیدنا عمرؓ جب مسند نشین خلافت ہوئے تو صوبوں کا انتظام، حکومت کے وسیع معاملات اور اعلیٰ سیاست نے انہیں قاضی ہونے کی ذمہ داریوں سے غافل کر دیا کیونکہ خلافت صدیقی میں آپ قاضی القضاۃ تھے۔ چنانچہ آپ نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہد برآ نہیں ہو رہے جن کے بارہ میں اپنی بیعت کے روز انہوں نے عوام سے وعدہ کیا تھا۔ عراق و شام کے اسلامی لشکروں کی خبریں ان کی بہت سی توجہ اور ان کا بہت سا وقت لے لیتی ہیں اور مملکت کے مختلف حصوں میں ان کے گورنر کیا کچھ کر رہے ہیں ان کے بارہ میں بھی وہ سوچتے رہتے تھے۔ پھر مختلف حالات نے بھی اہل مدینہ کے مفادات میں کچھ الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ چنانچہ وہ مدینہ کے عدالتی فرائض کے بارگراں سے سبکدوش ہو گئے اور یہ منصب انہوں نے سیدنا ابوالدرداءؓ کے سپرد فرما دیا اور انہیں قاضی کے نام سے موسوم کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے سیدنا علیؓ سے فرمایا تھا کہ وہ لوگوں کے تنازعات اور خصومات کے فیصلے کریں اور جنگی امور سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ (سیرت ابن جوزی: ۱۱۶)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علیؓ لوگوں کے لیے قاضی تھے لیکن ان کے اپنے تنازعات اور خصومات کے لیے سیدنا عمرؓ قاضی تھے بلکہ قاضی القضاۃ تھے۔ چنانچہ بخاری اور صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں منقول ہے کہ

Marfat.com

''سیدنا عباس بن عبدالمطلبؓ اور سیدنا علیؓ دونوں نے اموال فئے اور اموال بنی نضیر کے بارہ میں سیدنا عمرؓ کی عدالت میں اپنا تنازعہ پیش کیا۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ اس جائداد وغیرہ کو آپ لوگوں میں مالکانہ حقوق دے کر تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اس کی آمدنی آپ حضرات کے مابین عہد نبوی کے دستور کے مطابق تقسیم ہوتی رہے گی اور باقاعدہ جاری رہے گی۔ اگر آپ لوگوں کے درمیان اس کی نگرانی بھی قابل نزاع ہو رہی ہے تو یہ مجھے واپس کر دیں، میں خود نگرانی کا انتظام کروں گا اور اس کی آمدنی آپ حضرات کو باقاعدہ حاصل ہوتی رہے گی۔''

(بخاری:۱/۳۵،۲/۸۰۶، مسلم:۲/۸۱)

یہ تو مدینہ طیبہ کا حال تھا۔ پھر جب کوفہ اور بصرہ آباد ہوئے اور عربوں نے وہاں سکونت اختیار کر لی اور دوسری طرف مصر اور دوسرے علاقے فتح ہو کر سلطنت کی پہنائیوں اور وسعتوں میں اضافہ ہوا اور لوگوں میں باہمی تنازعات اور اختلافات پیدا ہوئے تو کوفہ کا قاضی شریحؒ کو بنا دیا گیا اور بصرہ کا قاضی سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کو بنا دیا گیا۔ اس کے بعد جب مصر فتح ہوا تو وہاں کے مسلمانوں کا قاضی قیس بن ابی العاص سہمی کو مقرر کیا گیا۔ یہ تمام قاضی کتاب وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے آزادانہ فیصلے کرتے تھے کیونکہ آپ نے عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ الگ کر دیا تھا۔

سیدنا عمرؓ کو اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی اور جوہر شناسی کا ملکہ ودیعت فرمایا ہوا تھا لیکن آپ نے قضاۃ کے انتخاب میں گورنروں کے انتخاب کی طرح بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ اپنی وہبی صلاحیتوں کا ثبوت دیا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ خود فقہ اور شریعت اسلامی کے عالم اور آشنا تھے اور اس بارہ میں ان کی نظر اس قدر گہری تھی کہ اس وقت میں کوئی اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے:

''عمرؓ کا علم اگر ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور عرب کے تمام

Marfat.com

قبائل کا علم دوسرے پلڑے میں تو بھی عمرؓ کا پلڑا بھاری رہے گا۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کہی ہے کیونکہ آپ قبل از قبول اسلام قریش کے عہدۂ سفارت پر مامور تھے۔ قبول اسلام کے بعد وہ اکثر و بیشتر بارگاہ نبوت میں حاضر رہتے تھے اور آپ سے علم دین سیکھتے تھے۔ پھر فطری ذہانت بھی تھی۔ چنانچہ آپ میں آدمیوں کی جوہر شناسی کا ایک فطری جذبہ تھا اور قاضی شریحؒ کے کوفہ کا قاضی بنائے جانے کا واقعہ اس کی بہترین دلیل اور اعلیٰ ترین ثبوت ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ سیدنا عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور اس کی آزمائش کے لیے اس پر سوار ہوئے۔ اتفاق سے گھوڑا چوٹ کھا کر داغی ہو گیا۔ سیدنا عمرؓ نے اس کو واپس کرنا چاہا۔ اس نے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''کسی کو اس بارہ میں ثالث بنالو'' مالک نے عرض کی: ''شریح عراقی۔'' دونوں شریحؒ کی ثالثی پر رضامند ہو کر ان کے پاس پہنچے۔ شریحؒ نے فریقین کے دلائل سن کر کہا: ''اگر گھوڑے کے مالک سے اجازت لے کر سواری کی گئی تھی تو گھوڑا واپس کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔'' سیدنا عمرؓ نے یہ فیصلہ سن کر فرمایا: ''حق یہی ہے۔'' اور شریحؒ کو کوفہ کا قاضی مقرر فرما دیا جہاں وہ ساٹھ برس تک اس منصب پر قائم رہے۔

قاضی اگرچہ گورنر صوبہ یا حاکم ضلع کے ماتحت ہوتا تھا اور ان لوگوں کو قاضیوں کے تقرر کا پورا پورا اختیار حاصل تھا لیکن پھر بھی احتیاط کی وجہ سے قاضی آپ خود منتخب کر کے مختلف صوبوں اور ضلعوں میں بھیجتے، اور قاضی کے انتخاب میں عملی امتحان اور ذاتی تجربہ سے کام لیتے۔ چنانچہ آپ کے زمانہ میں جو قاضی مقرر کیے گئے وہ نہایت قابل اور فضل و کمال کے حامل تھے۔ کوفہ کے قاضی سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ تھے جن کی قابلیت و فقاہت بے مثالی تھی۔ اور سیدنا عمرؓ نے ان کو اپنے پر ترجیح دیتے ہوئے انہیں کوفہ بھیجا تھا۔

(اعلام الموقعین: ۲/۲۱۹)

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی جلالت علم کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مسئلہ میں سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کی رائے اور تھی اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی اور۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کو جب پتہ چلا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی رائے ان کی رائے کے خلاف ہے تو فرمایا:

Marfat.com

﴿لا تسئلونی مادام هذا الحبر فیکم﴾

(بخاری:۲/ ۹۹۷،ابوداؤد:۲/ ۴۴)

''مجھ سے کوئی مسئلہ نہ پوچھا کرو جب تک یہ بڑا عالم تم لوگوں میں موجود ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے بعد ۱۹ھ میں آپ نے شریحؒ کو کوفہ کا قاضی مقرر فرمایا۔ یہ اگرچہ صحابی رسول نہ تھے لیکن اپنی ذہانت اور معاملہ فہمی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سیدنا علیؓ بھی ان کی ذہانت اور قضا کے معترف تھے۔ ان بزرگوں کے علاوہ سلمان ربیعہ الباہلی، عبدالرحمٰن بن ربیعہ، ابوقرہ الکندی، جمیل بن معمر وغیرہ سیدنا عمرؓ کے زمانہ کے قاضی تھے جو اپنے زمانہ کے علم وفضل، ذہانت اور معاملہ فہمی میں نہایت جلیل القدر حضرات تھے۔ بصرہ کے قاضی کعب بن سوار الازدی تھے جو اپنے زمانہ کے علم وفضل، ذہانت وفطانت اور معاملہ فہمی میں اپنی مثال آپ تھے۔ فلسطین کے قاضی سیدنا عبادہ بن صامتؓ تھے جن کی جلالت قدر تمام صحابہ کرام میں مسلم تھی۔ مدینہ طیبہ کے ایک قاضی سیدنا زید بن ثابت تھے جو رسول اللہ ﷺ کے کاتب وحی بھی تھے اور علم الفرائض میں تمام عرب میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔

قاضیوں کا تقرر سیدنا عمرؓ کا ایک ایسا قدم تھا جو مملکت کے بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت کے تحت اٹھایا گیا تھا۔ یہ کوئی عمومی تنظیم نہ تھی جس سے کسی اصول کی تطبیق مقصود تھی۔ چنانچہ جن گورنروں پر مملکت کے کاموں کا غیر معمولی بوجھ نہ تھا اور جو عدالتی فرائض انجام دے سکتے تھے، آپ نے ان کے صوبوں میں قاضی مقرر نہ فرمائے بلکہ تمام اختیارات (انتظامیہ اور عدلیہ کے) انہی کے ہاتھ میں رہنے دیے، لیکن یہ آپ کا ابتدائی قدم تھا، اور یہ قدم اٹھائے ابھی چند ہی سال گزرے تھے کہ وہ حکومت کے دوسرے نظاموں کی طرح ایک نظام بن گیا۔ چنانچہ آپ نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا جس سے قاضی کی خاص حیثیت ہوگئی۔ جسے ہر قسم کی عزت واحترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا، اور پھر آنے والے وقتوں کے قاضیوں نے انتظامیہ کے خلاف فیصلے کرنے میں بھی کوئی پس وپیش نہ کی۔

Marfat.com

اسلام میں قاضی کو بہت زیادہ اختیارات دیئے گئے ہیں یہاں تک کہ وقت کا ہنشاہ اور امیر المؤمنین بھی اس کی عدالت میں حاضر ہونے پر مجبور ہے جس طرح ایک م آدمی مجبور ہے۔اس سے خطرہ یہ تھا کہ وہ رشوت کا مرتکب نہ ہو جائے ،اور عدلیہ جب شی ہو جاتی ہے تو پھر ملک میں انصاف ملتا نہیں بلکہ بکتا ہے۔اسلام نے نہ صرف قاضی کو شوت لینے سے منع کیا بلکہ ہدیہ اور تحفہ لینے سے بھی روکا۔ ہدیہ کا اصل مادہ ''ہدی'' ہے۔ بلفظ جوڑنے اور ملانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں "اھدی الرجل لمرأتہ" یعنی مرد نے اپنی دلہن کو اپنے پاس بلایا اور اس سے ملا۔اس کی جمع ''ہدایا'' آتی ہے جب کہ اہل مدینہ کی لغت میں ''ہداوی'' ہے۔ صحاح جوہری میں ہے کہ ''مہدی'' میم پر زبر کے ساتھ) سے مراد تھال یا طباق اسی وقت ہوگا جب کہ ہدیہ دی ہوئی شی اس کے اندر موجود ہو۔ حدیث میں ہے "تھادوا تحابوا" یعنی ایک دوسرے کو ہدیے دیا کرو اس سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ (صحاح جوہری جلد:۲۴، ۲۵)

عام اصطلاح میں ہدیہ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہے۔کوئی کہتا ہے کہ ''کسی شرط کے بغیر ایک آدمی دوسرے آدمی کو جو مال دیتا ہے، اس کو ہدیہ کہتے ہیں۔'' اس تعریف میں ''کسی شرط کے بغیر'' کے الفاظ قید احترازی کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس سے رشوت خارج ہو جاتی ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری:۳/۱۲۲۶)

نیز ان الفاظ سے بدلہ کا ہدیہ بھی خارج ہو جاتا ہے۔ یہ وہ ہدیہ ہے جس میں اسی جیسا یا اس سے کم یا زیادہ تحفہ لوٹانے کی پیشگی شرط ہوتی ہے۔

ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ ''ایک شخص پہل کر کے دوسرے کو اس کی طلب کے بغیر ہدیہ دے۔'' (کشاف القناع عن متن الاقتناع:۶/۳۱۷)

ایک تعریف اس کی یہ بھی کی گئی ہے کہ ''ہدیہ وہ مال ہے جو دلی محبت کے اظہار، الفت کے حصول اور ثواب کی غرض سے عزیزوں، دوستوں، علماء و مشائخ اور صالحین امت کو دیا جائے جن کے بارہ میں اسے حسن ظن ہو۔

(تعریب السیاسۃ الشرعیہ فی حقوق الراعی والرعیۃ:۵۰)

Marfat.com

علماء نے لکھا ہے کہ ہدیہ دینا اگرچہ مستحب ہے اور اس کے استحباب کی حدیث میں یہ ہے کہ لوگوں میں محبت عام ہو لیکن یہ ہدیہ کا لین دین اس شخص کے لیے ہے جو مسلمان کے کسی کام کا نگران اور ذمہ دار نہ رہا ہو۔ رہا وہ شخص جسے کسی قسم کی ذمہ داری سونپی گئی ہو جیسے قاضی، سربراہِ مملکت، وزیر اعظم، وزراء، گورنر یا دوسرے ارکان سلطنت تو ایسے عہدے داران کے لیے ہدیہ قبول کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر کسی رکن سلطنت خواہ وہ کلرک چپڑاسی یا کوئی معمولی ملازم ہی کیوں نہ ہو، سے کام کرایا جاتا ہے اس ملازم پر ہدیہ لیے بغیر بھی فرض ہوتا ہے، یا اگر اس کے فرض کو یاد دلانے کے لیے اسے کوئی ہدیہ یا تحفہ دیا گیا تو وہ ایک قسم کی رشوت ہوگی۔ (مبسوط، سرخسی: ۸۲/۱۶) کیونکہ ہدیہ دینے والا اس کو ہدیہ پیش کرتا ہے، اس کی قربت اور نزدیکی کا خواستگار ہوتا ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی قربت اور نزدیکی مطلوب نہیں ہوتی اس لیے اس کے اندر کسی خیر کے پیدا ہونے کا سوال نہیں ہوتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہدیہ لینے والے کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو سکے۔ اس طرح اس کا دینا دلانا ایک دلی مقصد کے تحت ہوتا ہے جس کے خارج میں پائے جانے کو وہ دل سے چاہتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ لینے والا صاحب اقتدار، ذی جاہ اور بارسوخ آدمی ہے۔ اگر اس کی خوشنودی حاصل رہی تو اسے کامیابی ہوگی۔ اس کی توجہ اس کی طرف منعطف رہی تو اس کا کام ہو جائے گا۔ دوسروں کے خلاف انہیں مددل جایا کرے گی یا کوئی منصب یا ملازمت حاصل ہوگی یا قاضی کوئی فیصلہ میرے حق میں کردے گا، ایسی ہی کوئی صورت میسر آئے گی جس سے شخصی اور ذاتی مفاد کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ (تعریب السیاسۃ الشرعیۃ فی حقوق الراعی وسعادۃ الرعیۃ: ۵۰)

اسی وجہ سے علامہ ابن التین کہتے ہیں کہ گورنروں، عمال حکومت اور قضاۃ کو تحفہ دینا رشوت ہے۔ اس کو تحفہ اور ہدیہ کہا بھی نہیں جا سکتا، اس لیے کہ اگر وہ شخص گورنر یا قاضی نہ ہوتا تو کون اسے تحفہ دیتا؟ یونہی قاضی کو ہدیہ دینا سخت قبیح اور حرام ہے، وہ اس کا مالک بھی نہ ہوگا۔ (عمدۃ القاری: ۴۰۷/۱۱)

اور ربیعہ کہتے ہیں کہ ہدیہ سے بچو اس لیے کہ ہدیہ رشوت کا زینہ ہے۔

(معین الحکام: ۹)

سیدنا عمرؓ گورنروں کے تحفے اول تو قبول نہیں کرتے تھے اور اگر قبول بھی کرتے تو انہیں بیت المال میں داخل فرما دیتے تھے۔ اگر ان سے کوئی کہتا کہ رسول اللہ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے تھے تو آپ جواب میں ارشاد فرماتے کہ آپ کے وقت میں وہ ہدیہ ہوتا تھا لیکن آج وہ رشوت ہے۔ (حاشیہ الرہوتی: ۳۱۲/۷)

اور سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ سے جب یہ سوال ہوتا تو آپ فرماتے کہ آپ کے لیے وہ ہدیہ ہوتا تھا لیکن ہمارے لیے رشوت ہے کیونکہ آپ ﷺ کو ہدیہ مقام نبوت پر فائز ہونے کی وجہ سے ملتا تھا اور ہمیں والی ہونے کی بنا پر۔

(معین الحکام: ۱۷۱، الحلال والحرام فی الاسلام ص: ۳۳۲)

کسی شاعر نے کیا اچھا کہا ہے ۔

فساد الدین والدنیا قبول الحاکم المالا

ایک اور شاعر نے کہا ہے ۔

اذا اتت الهدیة دار قوم تطایرت الامانة من کواها

یعنی جب ہدیہ کسی قوم کے گھر آتا ہے تو امانت اس کے روشن دانوں سے نکل کر اڑ جاتی ہے۔

یہ رشوت ستانی کا تذکرہ تو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ جب قاضی کو سیدنا عمرؓ نے اس قدر اختیارات دیئے اور عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا تو شدید خطرہ تھا کہ قاضیوں میں کہیں رشوت کا چلن نہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے اس کو روکنے کے لیے مندرجہ ذیل پابندیاں (Restrictions) عائد کیں۔

1- قاضیوں کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر کیں تاکہ انہیں بالائی آمدنی کی ضرورت محسوس نہ ہو کیونکہ جب آمدنی کم ہو اور گھر کے اخراجات زیادہ ہوں تو پھر آدمی بالائی آمدنی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، چنانچہ سلمان بن ربیعہ الباہلیؓ اور قاضی شریحؒ کی تنخواہ پانچ پانچ سو درہم ماہوار تھی جو اس زمانہ کے لحاظ سے بہت بڑی تنخواہ تھی۔ ایسے ہی دوسرے قاضیوں کی تنخواہیں تھیں۔

2- اس سلسلہ میں دوسری بات آپ نے یہ کی کہ قاضی صرف ان لوگوں کو مقرر کیا

Marfat.com

جو دولت مند اور معاشرہ میں معزز تھے کیونکہ دولت مند ہونے کی وجہ سے وہ رشوت نہیں لیں گے اور معزز ہونے کی وجہ سے وہ کسی کے دباؤ میں آ کر فیصلہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ گورنر کوفہ کو آپ نے جو خط لکھا اس میں یہ وجہ آپ نے خود بھی بیان فرمائی کہ دولت مند قاضی رشوت کی طرف راغب نہ ہوگا اور معزز شخص کسی کے رعب و داب میں نہیں آئے گا۔

-3 تیسرا اقدام آپ نے یہ کیا کہ قاضی کے لیے تجارت اور خرید و فروخت کو ممنوع قرار دے دیا جو آج بھی پوری دنیا میں رائج ہے۔ چنانچہ آپ نے سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ کو ایک خط میں لکھا:

> ''فصل مقدمات کے وقت خرید و فروخت نہ کرو اور نہ ہی خرید و فروخت کی بات طے کرو، نہ کسی کی جائداد کی دلالی کرو، نہ رشوت لو اور نہ ہی غصہ کی حالت میں دو آدمیوں کا مقدمہ فیصل کرو۔''
>
> (کنز العمال:۳/۲۶۸)

تیسرا شعبہ...........اشاعت اسلام:

بیت المال کے اخراجات کا تیسرا شعبہ اسلام کی تبلیغ و تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت کے بارہ میں ہے، ایک اسلامی حکومت کا مقصد وحید دنیا میں اسلام کی نشر و اشاعت ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ کے جو افراد قرآن حکیم اور مسائل دین کی تعلیم، تبلیغ اسلام اور اسلام کی نشر و اشاعت کی خدمات انجام دیتے ہیں ان کی کفالت حکومت کے ذمہ ہے۔ اسلام نے ہر فرد امت کے لیے تعلیم کو ضروری اور لازمی قرار دیا ہے، لہٰذا ایک اسلامی ریاست کے لیے تعلیم و تعلم کی عام سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے وظائف کا تقرر ضروری ہے، اور دینی تعلیم میں اگرچہ معلمین کی خدمات لوجہ اللہ اور فی سبیل اللہ ہونی چاہئیں، لیکن جب کہ وہ اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے وقف کر چکے ہیں تو ایک اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ ان کی اور ان کے اہل و عیال کی کفالت کرے تاکہ وہ نہایت دل جمعی اور اطمینان قلب کے ساتھ تعلیم و تبلیغ کے اس مقدس فریضہ کو بخیر و خوبی ادا کر سکیں۔

سیدنا عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں دین کے اس شعبہ کی طرف بھی خصوصی توجہ فرمائی اور انہوں نے دور دور تک اسلام لوگوں کے دلوں میں اتار دیا۔ آپ کا مقصد اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلانا نہیں تھا جیسا کہ بعض مستشرقین آپ پر یہ الزام لگاتے ہیں۔ اسلام اپنے ذاتی محاسن کی وجہ سے پھیلا اور اس نے جس سرعت کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ شریعت نے بزور اور تخویف کے ذریعہ کسی کو مسلمان بنانے کی سخت ممانعت کی ہے۔ اور کسی ایک جگہ بھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ وہاں کے باشندوں کو اسلام لانے پر مجبور کیا گیا ہو یا انہیں روپیہ پیسہ کا لالچ دے کر یہ کہا گیا ہو کہ وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔

اگر اسلام کی اشاعت کے لیے وہی ذرائع اختیار کیے جاتے جو دنیا میں عیسائیت کی اشاعت کے لیے اختیار کیے گئے یا کیے جا رہے ہیں تو دنیا میں سوائے اسلام کے اور کسی مذہب کا وجود باقی نہ رہتا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''اسلام کی دعوتی قوت''۔)

سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں اکثر حضرات کا یہ خیال تھا کہ حکومت کے عہدہ پر یا دین کی کسی خدمت کے لیے معاوضہ یا تنخواہ لینا زہد وتقویٰ کے خلاف ہے۔ سیدنا عمرؓ کے نزدیک یہ بات اصول انتظام کے سراسر خلاف تھی۔ سیدنا عمرؓ نے لوگوں کی اس تمدنی غلطی کو اس طرح رفع کیا کہ عہدیداران حکومت کی خواہ وہ کسی شعبہ میں کوئی کام کرتے ہوں وظائف اور تنخواہیں مقرر فرما دیں۔ طبری نے لکھا ہے کہ سیدنا ابو عبیدہؓ نے جو امین الامت تھے، ایک موقع پر حق الخدمت لینے سے انکار کر دیا تو سیدنا عمرؓ نے بہت مشکل سے انہیں اس بات پر راضی کیا۔ سیدنا حکیم بن حزامؓ نے جو سیدہ خدیجہ طاہرہ سلام اللہ علیہا کے بھتیجے تھے، سیدنا عمرؓ کے بار بار اصرار پر بھی روزینہ یا مشاہرہ لینے سے یک قلم انکار کر دیا۔ (کنز العمال: ۳/۳۲۲)

مختلف علاقوں میں آپ نے مختلف صحابہ کرامؓ کو بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ سیدنا عبداللہ بن معقلؓ اور سیدنا عمران بن حصینؓ بھی انہی لوگوں میں سے تھے جن کو سیدنا عمرؓ نے فقہ کی تعلیم کے لیے بصرہ بھیجا تھا۔ اسی طرح سیدنا معاذ بن جبلؓ اور

Marfat.com

سیدنا ابوالدرداءؓ اور دوسرے کئی ایک صحابہ کرامؓ کو شام اور دوسرے علاقوں میں دین کی تعلیم وتبلیغ کے لیے بھیجا۔ جن لوگوں کے ذمہ لوگوں کو تعلیم دینے کا کام لگایا گیا تھا، آپ نے ان کی تنخواہیں اور وظائف مقرر فرمائے۔ تاکہ وہ گھریلو ضروریات سے فارغ ہو کر نہایت دل جمی کے ساتھ دین کی تعلیم وتبلیغ کا کام کر سکیں۔ آپ نے اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہیں بھی بیت المال سے مقرر فرمائیں۔ چنانچہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے:

﴿ان عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان کانا یرزقان المؤذنین والائمة والمعلمین﴾ (سیرت العمرین:۱۵۶)

''بے شک سیدنا عمر بن خطابؓ اور سیدنا عثمان بن عفانؓ مؤذنوں، اماموں اور معلموں کو ماہانہ وظائف دیا کرتے تھے۔''

اسی طرح آپ نے طلباء کے لیے بھی بیت المال سے وظائف مقرر فرمائے چنانچہ ابوعبیدؒ نے لکھا ہے:

''بے شک عمر بن خطابؓ نے اپنے بعض عمال اور گورنروں کو لکھا کہ قرآن سیکھنے والوں کے لیے وظیفہ مقرر کریں۔'' (کتاب الاموال:۲۶۱)

مؤطا امام محمدؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مسجد نبوی میں لوگو[ں] کی صفیں درست کرنے کے لیے بھی کچھ لوگ مقرر کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح حج کے مو[قع] پر بھی کچھ حضرات مقرر کیے گئے تھے جن کا فریضہ لوگوں کو عقبہ کے پاس پہنچانا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مؤطا امام محمد:۳۸۶، موطا امام مالک:۳۰

دین کی تعلیم وتبلیغ اور نشر واشاعت کے لیے مسجد کو بڑی اہمیت حاصل ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانہ میں مسجد کو کئی کاموں میں استعمال کیا۔ اس سے عدا[لت] کا کام بھی لیا گیا اور قید خانہ کا بھی کیونکہ اس زمانہ میں کوئی قید خانہ نہیں تھا۔ چنانچہ ثم[امہ] بن اثال جب گرفتار ہو کر آئے تو انہیں مسجد ہی کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ (فتح الباری:۱/۳۴۹) مسجد سے جیل خانے کا کام سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت تک لیا گیا۔ بعد میں سیدنا فاروق اعظمؓ کے زمانہ خلافت میں چار ہزار درہم سے جیل خانے کے لیے ایک مکان خریدا گیا۔ (فتح القدیر:۳/۲۶۰)

مسجد سے جہاں اور کام لیے گئے وہاں مسجد سے دینی تعلیم کا کام بھی لیا گیا۔ ...لہ یہ وہ سلسلہ ہے جو عہد نبوت سے مسجدوں میں قائم ہے۔ مساجد میں تعلیم کا یہ سلسلہ ...تھی صدی ہجری تک قائم رہا۔ چنانچہ مولانا حکیم سید عبدالحیؒ اپنی کتاب ''یادایام'' میں ...کھتے ہیں:

''ہمارے پیرومرشد روحی فداہ نے خاک پاک مدینہ میں جو پہلی مسجد بنائی اور جس کو مسجد نبوی کہتے ہیں، وہ ہمارا پہلا مدرسہ تھا۔ اس کے بعد جتنی مسجدیں دنیا میں تیار ہوئیں انہی کو آپ مدارس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تعلیم کا پرانا طریق یہ تھا کہ استاذ مسجد میں آ کر بیٹھ جاتا اور اس کے گردوپیش شاگردوں کا حلقہ بن جاتا۔ اساتذہ خالصاً لوجہ اللہ تعلیم دیتے اور ان کے شاگرد چٹائیوں پر سوکر اور دود چراغ کھا کر تحصیل علم کرتے تھے۔ بڑے بڑے شاہزادوں کو بھی اگر علم کا ذوق ہوتا تھا تو وہ بھی مسجدوں میں جا کر اور اپنے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے بیٹھتے تھے۔ یہی طریقہ چوتھی صدی ہجری تک علی العلوم جاری رہا۔ اس کے بعد سب سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ کے لیے شاندار عمارت بنائی گئی اور اساتذہ کی تنخواہیں اور طلباء کے وظائف مقرر ہوئے۔'' (یادایام:۳۴)

اس سے معلوم ہوا کہ چوتھی صدی تک مسجدیں ہی تعلیم گاہوں اور مدارس کا کام دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کے تمام محلوں میں مسجدیں بنائی جائیں۔ (سنن ابی داؤد، باب اتخاذ المسجد فی الدور) آپ ﷺ کے اس دنیا سے انتقال کے بعد جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو مسلمانوں نے پورے ملک میں مسجدوں کا ایک جال بچھا دیا۔ چنانچہ عطاء کی روایت سے سیدنا فاروق اعظمؓ کا یہ قول کتابوں میں موجود ہے:

''اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب سیدنا عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں شہروں کو فتح کیا تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سب

Marfat.com

مسجدیں بنائیں۔ (کشاف: ۱/ ۴۰۸، تفسیرات احمدی: ۲۸۳)

چنانچہ اس حکم کے تحت ملک کے ہر گوشہ میں مسجدوں کی تعمیر عمل میں آئی جو اجتماع کے مرکزی گھر کہے جاتے تھے اور جہاں قرآن حکیم، حدیث اور فقہ کی تعلیم ہوتی تھی کیونکہ علم کے سب سے بڑے مرکز مساجد ہی تھیں، اور درس کا طریقہ یہ تھا کہ مساجد کے صحن میں فقہاء بیٹھ جاتے تھے اور شائقین اور طالبان علم نہایت کثرت سے ان کے گرد حلقہ کی صورت میں جمع ہو کر فقہی مسائل پوچھتے جاتے تھے۔

مختصر یہ کہ سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں چھ ہزار سے زائد مسجدیں تعمیر ہوئیں سادہ تھیں کیونکہ سیدنا عمرؓ تزئین وآرائش والی مسجدوں کے حق میں نہیں تھے اور نہ ہی شریعت اسلامیہ کا یہ مزاج ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ:

> "امیر المومنین فاروق اعظمؓ نے مسجد نبوی کی تجدید عمارت کے وقت تاکید کر دی تھی کہ مسجد ایسی ہو جو لوگوں کی بارش وغیرہ سے حفاظت کرے۔ خبردار سرخ و زرد رنگوں سے رنگین مت بنانا کہ لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔" (تفسیر عزیزی پارہ اول: ۲۴۲)

ان سب مساجد کے موذنین اور اماموں کی تنخواہیں سرکاری خزانہ سے دی جاتی تھیں اور جو دوسرے لوگ بھی باقاعدہ مساجد کی خدمت کرتے تھے سیدنا فاروق اعظمؓ نے ان کے وظائف بھی مقرر فرما دیئے۔ اور جو طالب علم وہاں قرآن وسنت کی تعلیم حاصل کرتے تھے، ان سب کے وظائف بھی سیدنا فاروق اعظمؓ نے بیت المال سے دینے شروع کیے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اپنے زمانۂ خلافت میں ان روزینوں اور مشاہروں کو جاری وساری رکھا بلکہ ان میں اضافہ کیا کیونکہ آپ کے زمانہ میں بیت المال کے محاصل میں بہت اضافہ ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر حاکم اچھا ہو تو نہ صرف رعایا خوش حال ہو گی بلکہ حکومت کے محاصل میں بھی اضافہ ہو گا۔ لوگوں میں دیانت وامانت، صدق وراست بازی اور فرائض وحقوق کی ادائیگی کے جذبات ابھریں گے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے کے خلفاء لوگوں سے ناجائز محاصل وصول کرتے۔ وصولی میں ظلم وتعدی سے کام لیتے

Marfat.com

وصول کرتے وقت سختی اور تشدد کرتے۔ آپ نے ان سب چیزوں کا سد باب کر دیا۔ اب بغیر کسی سختی اور تعدی کے ٹیکس، خراج اور جزیہ وصول ہوتا۔ پھر اس کے مصارف بھی کثیر تھے اور ان کثیر مصارف کے باوجود بیت المال کی آمدنی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ عراق کی آمدنی حجاج بن یوسف کے ظالمانہ دور گورنری سے کہیں زیادہ تھی۔ آمدنی کے اس اضافہ کو دیکھ کر سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ حجاج پر لعنت کرے، اس کو نہ دین کا سلیقہ تھا اور نہ دنیا کا۔ وہ لوگوں پر سختی کرنے اور ناجائز طریقے اختیار کرنے کے باوجود بھی قومی خزانے کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ اس کے ظالمانہ دور میں عراق سے صرف دو کروڑ اسی لاکھ درہم وصول ہوتے تھے۔ اس نے کاشت کاروں کو بیس لاکھ درہم زمین کی آبادکاری کے لیے قرض کے طور پر دیے تو ایک کروڑ سات لاکھ درہم اضافہ ہوا۔ باوجود اس ویرانی کے جب عراق میرے قبضہ میں آیا تو میں نے بارہ کروڑ چالیس لاکھ درہم وصول کیے۔ اور اگر زندہ رہا تو سیدنا فاروق اعظمؓ کے زمانہ سے بھی زیادہ رقم وصول کروں گا حالانکہ دور فاروقی ایک سنہری دور تھا۔ (فتوح البلدان: ۳۵۷)

یہ سب اضافہ ان کی نیکی کی برکات کی وجہ سے تھا۔

امام ابو عبیدؒ نے اس بارہ میں روایت نقل کی ہے کہ

> ''عمر بن عبدالعزیزؒ نے یزید بن ابی مالک اور حارث بن یمجد اشعری کو بھیجا کہ وہ دیہات میں لوگوں کو دین سکھائیں، اور ان کے لیے روزینہ مقرر فرمایا۔ مگر یزید نے تو روزینہ قبول کر لیا جب کہ حارث نے روزینہ لینے سے انکار کر دیا یعنی لوجہ اللہ اور بلا معاوضہ یہ خدمت انجام دی۔'' (کتاب الاموال: ۲۶۲)

اسی طرح طلباء کے لیے بھی آپ نے وظائف مقرر فرمائے، چنانچہ آپ نے بعض عمال حکومت کو لکھا کر قرآن حکیم سیکھنے والوں کے لیے بھی وظیفہ مقرر کر دیں۔ آپ کے اس حکم پر گورنروں اور عمال حکومت نے یہ لکھا کہ بعض لوگوں نے قرآن حکیم سیکھنے کی رغبت کے بغیر محض وظیفہ حاصل کرنے کی خاطر طالب علم بننا اختیار کر لیا ہے لیکن آپ نے اس کے باوجود وظیفہ بند نہیں کیا۔ (کتاب الاموال: ۲۶۱)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے دل میں قرآن وسنت کی تعلیم وتبلیغ اور اشاعت اسلام کا جذبہ ہر وقت کروٹیں لیتا رہتا تھا اور ان کی یہ خواہش تھی کہ اسلام زمین کے کونہ کونہ میں پھیل جائے اور لوگ غلط راہ چھوڑ کر صحیح راستہ پر گامزن ہو جائیں۔ آپ نہایت زور شور سے علماء کو لکھتے کہ ذمیوں کو اسلام کی دعوت دو۔ ذمیوں کے مسلمان ہونے کی صورت میں اگر کوئی گورنر سرکاری خزانہ کے خالی یا کم ہونے کی شکایت کرتا تو آپ اسے ڈانٹ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو لکھا: ''تم نے مجھے لکھا ہے کہ حیرہ کے بہت سے یہودی، عیسائی اور مجوسی مسلمان ہو گئے ہیں حالانکہ ان کے ذمہ جزیہ کہ بھاری رقم واجب الادا ہے۔ تم نے مجھ سے ان سے جزیہ وصول کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خیر کی دعوت دینے والا بنا کر بھیجا تھا جزیہ وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ اگر غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں تو ان کے مال میں صدقہ ہے جزیہ نہیں۔ ان کی میراث ان کے اعزاء واقرباء کے لیے ہے۔ اگر وہ ان میں سے نہیں ہوں تو ان کی میراث مسلمانوں کے بیت المال میں جمع ہو گی، اور اگر وہ کوئی خیانت کرے گا تو اس کی طرف سے اس مال سے دیت دی جائے گی۔''

(کتاب الخراج لابی یوسف:۱۳۱)

عمر بن عبدالعزیزؒ نے اور ان کے گورنروں کی سوچ میں بڑا فرق تھا۔ گورنروں کی سوچ مال اکٹھا کر کے سرکاری خزانہ بھرنا تھا اور سیدنا عمرؒ کو اسلام کی تبلیغ واشاعت کی فکر تھی۔ چنانچہ آپ کے زمانے میں مصر کا خراج کم ہونے لگا کیونکہ اکثر قبطی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ مصر کے گورنر نے چاہا کہ نو مسلم قبیلوں سے جزیہ وصول کیا جائے، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ نے صاف انکار کر دیا اور یہ لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو داعی بنا کر بھیجا تھا جزیہ وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ عدی بن ارطاط کو جب اس نے خراج گھٹنے کی شکایت کی، لکھا: ''میں تمہارے خط کا مطلب سمجھ گیا۔ بخدا! میری تو یہ تمنا ہے تمام لوگ مسلمان ہو جائیں تا کہ ہم اور تم کسان بن کر اپنے ہاتھوں سے کما کر کھائیں۔

(سیرۃ ابن جوزی ص ۱۰۰، کتاب الخراج لابی یوسف ص ۶)

افریقہ میں ایک جماعت بربر تھی جو سیدنا معاویہؓ کے زمانہ میں بہت تنگ کر

Marfat.com

تھی۔ یہ پہلے موسیٰ بن نصیرؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی۔ پھر جب سنہ ۱۰۰ھ میں افریقہ کے گورنر اسماعیل عبداللہ بن ابی مہاجر ہوئے تو چونکہ آپ جنگ، خراج اور صدقات کے رئیس تھے اور نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے، اس لیے تمام بربر سچے دل سے مسلمان ہو گئے اور کوئی دائرہ اسلام سے باہر نہ رہا۔

(فتوحات واخبار مصر: ۲۱۳، ابن اثیر: ۵/۱۰، ظہر الاسلام، احمد امین: ۱/۲۹۳)

آپ کے جذبہ تبلیغ اسلام اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ آپ کے محاسن اخلاق کی شہرت کے پیش نظر کچھ ممالک نے آپ کو بذات خود اسلام کے مبلغ بھیجنے کے لیے لکھا کیونکہ ان کا اسلام کی طرف میلان ہو گیا تھا چنانچہ تبت کے کچھ وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ سے مبلغ بھیجنے کی درخواست کی۔ ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے آپ نے سلیط بن عبداللہ حنفی کو تبت میں اسلام کی تبلیغ کے لیے بھیجا۔ (یعقوبی: ۲/۳۶۲) ان سب مبلغین کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔

چوتھا شعبہ.........فقراء اور مساکین:

بیت المال کے وظائف کا چوتھا شعبہ ان محروم المعیشت فقراء اور مساکین کا ہے جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ ایک اسلامی ریاست کا یہ مقصد اور نظریہ ہوتا ہے کہ پوری ریاست میں ایک شخص بھی معیشت سے محروم نہ رہے یعنی وہ افراد مملکت جو پرانے مریض ہیں، بیوگان، یتامیٰ، معذور الاعضاء یا کسی اور سبب سے اگر وہ اپنی روزی کمانے سے معذور ہیں تو وہ افراد امت پر باردوش نہ ہوں بلکہ ایک اسلامی ریاست کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ سرکاری خزانہ یا بیت المال سے ان کے لیے وظیفہ مقرر کرے تاکہ وہ نہایت عزت وتکریم کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار سکیں۔ اسلام کی یہ خواہش ہرگز نہیں ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں رہے اور پوری سوسائٹی میں اس کی گردش نہ ہو۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ:

﴿کی لایکون دولة بین الا غنیاء منکم﴾ (حشر: ۷)

"تاکہ دولت صرف دولت مندوں ہی میں نہ رہے۔"

Marfat.com

یعنی یہ اموال صرف دولت مندوں کے الٹ پھیر میں پڑ کران کی مخصوص جاگیر بن کر نہ رہ جائیں جن سے سرمایہ دار تو مزے لوٹیں اور غریب بیچارے فاقوں مریں۔

اور ایک حدیث میں زکوٰۃ وصدقات کی غرض وغایت ہی یہ بیان کی گئی ہے کہ

﴿توخذ من اغنیائهم و ترد الیٰ فقراء هم﴾

''یعنی ان کے مال داروں سے صدقات لیے جائیں اور ان کے فقراء اور مساکین پر خرچ کیے جائیں۔''

چنانچہ احادیث میں ایک تو فقراء و مساکین اور یتامیٰ کی امداد و اعانت ضروری قرار دیا گیا۔ دوسرے صدقات و زکوٰۃ میں ان کا ایک حصہ رکھا گیا جس کا ذکر قرآن میں ہے اور اس کی تفصیل ہم زکوٰۃ کے باب میں ذکر کریں گے۔

احادیث صحیحہ میں امت کو فقراء اور مساکین کی معیشت کی تنگی کے انسداد کے لیے حکم دیا گیا ہے کیونکہ اسلام محروم المعیشت لوگوں کو معاشرہ میں بلند مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ سیدنا جریرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں ایک قوم آئی جو ننگے پاؤں اور ننگے بدن تھے اور چیتے کی کھال کی طرح صوف یا عبا پہنے ہوئے تھے۔ تلواریں انہوں نے حمائل کی ہوئی تھیں، اور ان میں زیادہ تر قبیلہ مضر کے لوگ تھے اور ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ فاقہ زدہ لوگ ہیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر سرکار دو عالم ﷺ کا چہرۂ اقدس سرخ ہو گیا اور آپ اپنے حجرہ مبارک میں داخل ہوئے اور پھر باہر آ کر صحابہ کرامؓ کے سامنے سورۃ النساء اور سورۃ الحشر کی آیات پڑھ کر سنائیں، جن کا حاصل یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو خواہ وہ امیر و کبیر ہوں یا فقیر و صغیر ایک انسان یعنی آدم علیہ السلام سے پیدا کیا ہے اس لیے سب ہی بنی آدم (آدم علیہ السلام کے بیٹے) ہیں، اور یہ کہ انسان کو خدا سے ڈرنا چاہیے کہ کل قیامت کے روز خدا کے حضور کیا لے کر جا رہا ہے۔''

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کی خستہ حالی دیکھ کر صدقہ کرنے کا حکم فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ صدقہ کرو اس سے پہلے کہ صدقہ نہ کر سکو، صدقہ کرو اس سے پہلے کہ تم صدقہ کرنے سے عاجز ہو جاؤ۔ کوئی شخص جو بھی دے سکے

Marfat.com

دینار دے سکے، درہم دے سکے، کپڑا دے سکے، گیہوں دے سکے، جو دے سکے، کھجور دے سکے حتیٰ کہ کھجور کی ایک پھانک ہی دے سکے وہ دے دے۔

ایک انصاری اٹھے اور ایک تھیلا بھرا ہوا لائے جوان سے اٹھتا بھی نہ تھا۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور ﷺ کا چہرۂ انور خوشی اور مسرت سے چمکنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص بہتر طریقہ جاری کرے اس کو اس کا بھی ثواب ہے اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا بھی ثواب اس کو ہوگا اس طرح پر کہ عمل کرنے والوں کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہوگی، اور اسی طرح اگر کوئی شخص برا طریقہ جاری کرتا ہے تو اس کا گناہ تو اس کو ہوگا ہی، جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان سب کا گناہ بھی اس کو ہوگا۔ اس طرح سے کہ ان کے گناہوں کے وبال میں کچھ کمی نہ ہوگی۔

اس کے بعد سب لوگ چلے گئے۔ کوئی دینار لایا، کوئی درہم لایا، کوئی غلہ لایا۔ غرض غلہ اور کپڑے کے دو ڈھیر حضور ﷺ کے قریب جمع ہو گئے اور آپ ﷺ نے وہ سب قبیلۂ مضر کے آنے والوں پر تقسیم کر دیئے۔ (نسائی، درمنشور)

یہ اس زمانے کی بات ہے جب مدینہ کی اسلامی ریاست ابھی استحکام پذیر نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے صحابہ کرامؓ سے چندہ اکٹھا کر کے قبیلۂ مضر کے ان غریب لوگوں کی مالی امداد کی۔ اصل میں یہ ایک اسلامی ریاست کے صدر کی ذمہ داری ہے کہ محروم المعیشت لوگوں کی اعانت کرے۔ ویسے قرآن وسنت نے صدقات کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

> ''اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو تو مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میرے اوپر تین روز گزر جائیں اس حال میں کہ میرے پاس اس میں سے کچھ بھی ہو سوائے اس کے کہ کوئی شی قرض کی ادائیگی کے لیے رکھ لی جائے۔'' (رواہ البخاری)

رسول اللہ ﷺ کا ایک اپنا واقعہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ عقبہ بن حارثؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی۔ آپ ﷺ نے نماز کا سلام پھیرا اور تھوڑی دیر بعد اٹھ کر نہایت عجلت کے ساتھ لوگوں

Marfat.com

کے مونڈھوں پر سے گزرتے ہوئے ازواج مطہراتؓ کے گھروں میں سے ایک گھر میں تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ کی اس طرح جلدی گھر جانے کی وجہ سے لوگوں میں تشویش پیدا ہوئی کہ نہ معلوم کیا بات پیش آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ ﷺ مکان سے واپس تشریف لائے تو آپ ﷺ نے لوگوں کی حیرانی کو محسوس کیا۔ اس پر سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مجھے سونے کا ایک ٹکڑا یاد آ گیا تھا جو گھر میں رہ گیا تھا۔ مجھے یہ بات گراں گذری (کہ موت آ جائے اور وہ ٹکڑا رہ جائے اور میدان حشر میں اس کی جواب دہی اور اس کا حساب) مجھے روک لے، اس لیے اس کو جلدی بانٹ دینے کا کہہ کر آیا ہوں۔''

(رواہ البخاری)

انہی حادیث نبویہ کے پیش نظر سیدنا عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں فقراء اور مساکین قسم کے لوگوں کے حق معیشت سے متعلق تقرر وظائف میں یہ کیا کہ اچھی خوراک کے چند لوگوں کو بلا کر دو وقت کھانا کھلایا اور پھر اسی اندازہ سے ہر شخص کی خوراک کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔ (فتح البلدان: ۴۴۲) اور ایک اور روایت میں ہے کہ:

سیدنا عمرؓ ایک ہاتھ میں مد (غلہ ناپنے کا پیمانہ) لیے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ میں قسط (تیل ناپنے کا پیمانہ) لیے ہوئے فرما رہے تھے کہ میں نے ہر مسلمان کے لیے ہر ماہ دو مد گیہوں اور دو قسط روغن زیتون اور دو قسط سرکہ وظیفہ کے طور پر مقرر فرما دیا ہے۔ یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ''کیا غلام کے لیے بھی؟'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''ہاں غلام کے لیے بھی۔

(کتاب الاموال لابی عبید: ۲۴۶، فتوح البلدان: ۲۱۶)

ایک اور روایت میں ہے کہ:

''سیدنا عمرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور حمد وصلوٰۃ کے بعد فرمایا:

Marfat.com

''ہم نے تمہارے لیے ہر ماہ عطایا اور روزینوں کا تعین کر دیا ہے،
اور سیدنا عمرؓ کے ہاتھ میں مد اور قسط دو پیمانے تھے۔''

(کتاب الاموال: ۲۴۷)

اسی طرح سیدنا عثمانؓ نے خیار نہدی کے ضعف پیری اور کثرت عیال کو دیکھ کر ان کے بچوں کی تعداد دریافت کرنے پر ان کا اور ان کے بچوں کا الگ الگ وظیفہ مقرر فرما دیا۔ (کتاب الاموال لابی عبید: ۲۴۸)

گذشتہ صفحات میں ہم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ پہلے تو سیدنا عمرؓ نے فوجی اور غیر فوجی دونوں قسم کے لوگوں کے اکٹھے رجسٹر بنائے اور بعد میں فوجیوں اور غیر فوجیوں کے الگ الگ رجسٹر بنا کر ان کے وظائف ان میں الگ الگ ان کی ضروریات اور ان کی اہلیتوں کے مطابق میں مقرر کیے۔ ان رجسٹرات میں فقراء اور مساکین کا رجسٹر اور دیوان الگ تھا، لیکن امام ابو عبیدؒ اور قاضی ابو یوسفؒ نے اس فرق کو اپنی کتابوں میں الگ الگ تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس میں سے کچھ تفصیل ہم نے بھی اپنی اس کتاب کے گزشتہ صفحات میں بیان کی ہے۔ ابو عبیدؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ فوجی وظائف کا تعلق زیادہ ترفئے سے تھا جب کہ فقراء اور مساکین اور دیگر صاحب حاجات کا تعلق زکوٰۃ، عشر، عشور (کسٹم ڈیوٹی) اور دوسری قسم کی آمدنی کی مدات سے تھا۔ (کتاب الاموال: ۲۴۳-۲۴۴)

علاوہ ازیں ہماری فقہ وحدیث کی کتابوں میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ کہ اسلامی ریاست کے ذمہ فقراء و مساکین، بیوگان، یتامیٰ، مسافر اور مقروض کی کفالت ضروری ہے اور ان کی ضرورت کے پیش نظر ان کے ماہوار، ششماہی یا سالانہ وظائف مقرر کرنا ایک اسلامی حکومت کے سربراہ کے ذمہ ضروری ہے،

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے اور گذشتہ صفحات میں اجمالی طور پر اس کو بیان بھی کر دیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست میں دو قسم کے لوگ رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ ایک ''مسلم'' اور دوسرے ''غیر مسلم۔'' مسلم رعایا پر تو ایک اسلامی ریاست کی ہر قسم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے لیکن غیر مسلم رعایا اسلامی اصطلاح میں ''ذمی'' کہلاتی ہے۔ ان پر اسلامی ریاست کی طرف سے ایک ٹیکس عائد ہوتا ہے جس کو

Marfat.com

''جزیہ'' کہتے ہیں۔ ذمیوں میں سے جو شخص بھی جزیہ ادا کرتا ہے اس کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت و ذمہ داری ایک اسلامی ریاست کے ذمہ ضروری ہو جاتی ہے۔ اس جزیہ کی وجہ سے وہ غیر مسلم ہر قسم کی فوجی خدمات سے مستثنیٰ ہے۔ ایک اسلامی ریاست اس سے کوئی بھی فوجی خدمت نہیں لے سکتی۔ البتہ اگر بغیر کسی جبر و اکراہ کے ''ذمی'' اسلامی فوج میں شامل ہو کر اپنی خوشی اور مرضی سے جنگ میں حصہ لے تو اس پر سے جزیہ کا ٹیکس معاف ہو جاتا ہے اور مال غنیمت میں سے بھی اس کو معقول حصہ یا عطیہ دیا جائے گا کیونکہ جنگ کی فتح میں بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ اور سربراہِ مملکت اگر مناسب سمجھے تو وہ اس کو فوجی وظیفہ بھی دے سکتا ہے۔ جنگی خدمات میں حصہ لینے کی وجہ سے اس سے جزیہ کا ٹیکس اٹھالیا جائے گا۔ ان کا ان تمام معاہدات میں تذکرہ ہے جو خلفائے راشدین نے غیر مسلموں سے جنگ سے قبل یا جنگ کے موقعوں پر کیے۔ چنانچہ آذربائیجان کے معاہدہ میں صاف لکھا ہوا ہے کہ:

> ''اور جو ذمی مسلمانوں کے لشکر میں حصہ لے گا تو اس سال کا جزیہ اس سے معاف کر دیا جائے گا۔'' (طبری: ۴/۲۵۶)

ایسا ہی فتح جرجان کے معاہدہ میں لکھا گیا ہے کہ:

> ''اور تم (ذمیوں) میں سے جس شخص سے ہم فوجی خدمت لیں گے، اس کی اس فوجی خدمت کا یہ صلہ ہوگا کہ اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔'' (طبری: ۴/۲۵۴)

بلاذری نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ عبید اللہ بن زیاد نے بخارا کی ایک بڑی جماعت کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اسلام کی امان میں آجائیں اور یہ کہ ان کے لیے ''معاشی وظیفہ'' بھی مقرر کر دیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس کو بخوشی قبول کر لیا اور بصرہ میں قیام پذیر ہو گئے۔'' (فتوح البلدان: ۲۶۹)

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں سیدنا خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ کے لیے عہد نامہ تحریر فرمایا تھا، اس میں بھی یہ بات نہایت واضح الفاظ میں لکھی کہ حقوق معاشرت میں مسلم اور غیر مسلم (ذمی) دونوں برابر ہیں۔ یہ معاہدہ ایک لاکھ نوے ہزار

Marfat.com

درہم سالانہ جزیہ پر اہل حیرہ سے ہوا۔طبری نے لکھا ہے کہ سیدنا خالدؓ نے درج ذیل صلح نامہ لکھ کر ان کے حوالے کیا:

''اہل حیرہ نے اس عہد نامہ کو قبول کر لیا ہے اور اپنے سرداروں کو اس کی تکمیل کے لیے مجاز گردانا ہے۔عہد نامہ کے مطابق اہل حیرہ کو ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ جزیہ ان کے پادریوں اور ان کے راہبوں سے بھی وصول کیا جائے گا۔البتہ محتاجوں، اپاہجوں اور تارک الدنیا راہبوں کو معاف ہوگا۔ اگر یہ جزیہ باقاعدہ ادا کیا جاتا رہا تو اہل حیرہ کی حفاظت کی پوری ذمہ داری مسلمانوں پر ہوگی۔ اگر وہ ان کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے تو جزیہ نہیں لیا جائے گا۔اگر قول یا فعل کے ذریعہ بدعہدی کی گئی تو یہ ذمہ داری ختم سمجھی جائے گی۔ یہ معاہدہ ربیع الاول سنہ ۱۲ھ میں لکھا گیا ہے۔'' (طبری:۲/ ۵٦۷)

قاضی ابو یوسفؒ نے اس معاہدہ کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں:

''اور میں یہ طے کرتا ہوں کہ اگر ذمیوں سے کوئی ضعیف پیری اور بڑھاپے کی وجہ سے ناکارہ ہو جائے یا ارضی اور سماوی آفات کے باعث کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے، یا ان میں سے کوئی مال دار محتاج ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو ایسے تمام اشخاص سے جزیہ معاف ہے، اور بیت المال ان کی اور ان کے اہل وعیال کی معاش اور روزینہ کا کفیل ہوگا جب تک کہ وہ دارالسلام میں مقیم ہیں۔'' (کتاب الخراج:۱۴۴)

جزیہ کے تعین کے بارہ میں سیدنا عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں بڑی احتیاط سے کام لیا کہ اہل ذمہ پر جزیہ نہ لگ جائے۔بعض علماء نے لکھا ہے کہ:

''ذمیون سے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ایک ٹیکس وصول کیا جاتا ہے جس کو جزیہ کہتے ہیں۔ یہ جزیہ صرف ایسے مردوں پر لگایا

Marfat.com

جاتا ہے جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں اور بچے اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح بوڑھے مسکین اور وہ اندھے، لنگڑے اور اپاہج بھی مستثنیٰ ہیں جو مال نہیں رکھتے۔ نادار مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ٹیکس اشخاص کی حیثیت کے لحاظ سے لگایا جاتا ہے۔''

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ جزیہ امان کا بدلہ ہے یعنی انہیں امان دی گئی تو اس عوض انہوں نے جزیہ دیا۔ (قرطبی: ۱۱۴/۸)

جزیہ خود سربراہ مملکت عائد کرتا ہے، لیکن ان سفارشات کے مطالعہ کے بعد فنی ماہرین قابل جزیہ افراد کے حالات کا جائزہ لے کر ارسال کرتے ہیں۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے عثمان بن حنیفؓ کو عراق اسی مطالعہ کے لیے بھیجا تھا اور انہوں نے واپس آ کر اپنی تجاویز سیدنا عمرؓ کو پیش کیں۔ سیدنا عمرؓ نے سواد عراق کے مال داروں پر ۴۸ درہم سالانہ اور ناداروں پر ۱۲ درہم سالانہ جزیہ عائد کیا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد عثمان بن حنیفؓ دوبارہ آئے اور انہوں نے سیدنا عمرؓ سے اہل فسطاط کے بارہ میں بات کی اور کہا کہ اللہ کی قسم اگر فی کس دو درہم بڑھا دیں تو انہیں قطعاً دشوار معلوم نہ ہو گا۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے ۴۸۔ ۵۰ درہم سالانہ کر دیئے۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۱۹۶/۹)

سیدنا عمرؓ نے اہل شام پر فی کس چار دینار اور دو مد گیہوں اور تین قسط زیتون کا تیل ماہانہ عائد کیا تھا۔ (مصنف عبدالرزاق: ۸۵/۶، کتاب الاموال: ۳۹)

کچھ صورتوں میں یہ جزیہ ساقط بھی ہو جاتا ہے۔ ان میں پہلی صورت موت ہے۔ چنانچہ جس شخص پر جزیہ عائد ہوا اگر وہ مر جائے تو اس کا جزیہ ساقط ہو جائے گا کیونکہ جزیہ کی ادائیگی شخص پر ہوتی ہے۔ اگر شخص ہی نہ رہا تو جزیہ کیسا؟

دوسری چیز اسلام ہے۔ جزیہ دینے والا اگر مسلمان ہو جائے تو بھی جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اہل الیس میں سے دو شخص مسلمان ہو گئے تو سیدنا عمرؓ نے ان کا جزیہ ساقط کر دیا۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۱۹۹/۹) اسی طرح اہل نجران میں سے ایک شخص مسلمان ہو گیا۔ حکومت کے کارندوں نے اس سے جزیہ وصول کرنا چاہا۔ اس نے انکار

Marfat.com

دیا تو سیدنا عمرؓ نے اس سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے تم پناہ ڈھونڈھ رہے ہو۔'' اس شخص نے کہا کہ اسلام میں پناہ ہی ہے، اگر دینا چاہیں۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''بے شک اسلام ہی جائے پناہ ہے، اور حکم تحریر فرمایا کہ اس سے جزیہ نہ لیا جائے۔'' (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۳۳۶) ماوراء النہر کے ایک دہقان زقیل نے اسلام قبول کر لیا تو سیدنا عمرؓ نے اس کے لیے دو ہزار درہم دینے کا حکم دیا اور جزیہ بھی معاف کر دیا۔ (المحلی: ۷/۳۴۵)

جزیہ کے ساقط ہونے کی ایک وجہ ناداری ہے۔ اگر کوئی ذمی پہلے مال دار ہو اور پھر نادار ہو جائے اور جزیہ ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو اس سے جزیہ ساقط کر دیا جائے گا بشرطیکہ جزیہ کی ادائیگی شرائط صلح میں واجب قرار دی گئی ہو۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا فاروق اعظمؓ ایک مکان پر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ایک بوڑھا نابینا بھیک مانگ رہا ہے۔ سیدنا عمرؓ نے دریافت کیا تو کون ہے؟ اس نے کہا: ''میں یہودی ہوں''۔ سیدنا عمرؓ نے دریافت کیا کہ کس چیز نے تجھ کو بھیک مانگنے پر مجبور کیا؟ اس نے جواب دیا: ''ادائے جزیہ، معاشی ضرورت اور ضعف پیری نے۔ سیدنا عمرؓ نے یہ سن کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے مکان پر لے جا کر جو موجود تھا اس کو دیا۔ پھر بیت المال کے خازن کے پاس فرمان بھیجا کہ:

> ''یہ اور اس قسم کے دوسرے ضرورت مندوں کی تفتیش کرو، خدا کی قسم! ہم ہرگز انصاف پسند نہیں ہو سکتے اگر ان ذمیوں کی جوانی کی محنت (جزیہ) تو کھائیں اور ان کی پیری کے وقت ان کو بھیک کی ذلت کے لیے چھوڑ دیں۔ قرآن عزیز میں ہے ''انما الصدقات للفقراء والمساکین'' میرے نزدیک یہاں فقراء سے مسلمان مفلس مراد ہیں اور مساکین سے اہل کتاب کے غرباء و فقراء۔ اس کے بعد سیدنا عمرؓ نے تمام ایسے لوگوں سے جزیہ بھی معاف کر دیا اور ان کا وظیفہ بھی بیت المال سے مقرر فرما دیا۔'' (کتاب الخراج: ۱۴۴)

جزیہ کی کوئی رقم عہد نبوی اور عہد صدیقی میں مقرر نہیں تھی۔ سیدنا عمرؓ نے اس کی شرح متعین کر دی۔ اہل یمن خوشحال تھے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک دینار فی کس

Marfat.com

جزیہ مقرر کر دیا تھا۔ سیدنا خالدؓ نے اہل حیرہ سے دس درہم فی کس کے حساب سے عہد صدیقی میں جزیہ وصول کیا۔ (کتاب الاموال: ۲۷)

سیدنا عمرؓ کو اس بارہ میں اس قدر اہتمام تھا کہ ایک دفعہ جب کہ سیدنا حذیفہؓ دجلہ کی ایک سمت میں اور سیدنا عثمان بن حنیفؓ کو دجلہ کی دوسری سمت میں خراج کی وصول یابی کے لیے روزانہ فرمایا اور وہ خراج وصول کر کے واپس تشریف لائے تو سیدنا عمرؓ نے فرمایا کہ شاید تم لوگوں نے ذمیوں سے ان کی طاقت سے زیادہ صول کیا ہوگا۔ سیدنا حذیفہؓ نے کہا: ''جو ان کے پاس چھوڑا ہے اس کے مقابلہ میں یہ بہت کم ہے۔ اور سیدنا عثمان بن حنیفؓ نے فرمایا کہ ان کے پاس اس سے دو گنا حصہ چھوڑ آیا ہوں۔ سیدنا عمرؓ نے یہ سن کر بھی معاملہ کی اہمیت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا:

''خدا کی قسم! اگر میں زندہ رہ گیا تو اہل عراق کی بیواؤں کو ایسا کر چھوڑوں گا کہ میرے بعد کسی امیر کی محتاج نہیں رہیں گی۔''

(کتاب الخراج: ۳۷)

مختصر یہ کہ اسلام اپنے معاشی اور اقتصادی نظام میں وظائف کا نظام مختلف شعبوں میں اس لیے قائم کرتا ہے کہ معاشی اور اقتصادی نظام کا جو حقیقی مفاد ہے وہ باحسن طریق پورا ہو جائے اور اس کا کوئی گوشہ بھی تشنۂ تکمیل نہ رہے۔ چنانچہ مختلف علماء نے اس مسئلہ پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے خصوصی طور پر علامہ ابن حزم اندلسیؒ نے اپنی کتاب محلی میں اس مسئلہ کے تمام شعبوں پر بحث کی ہے اور امت کے اجتماعی معاشی اور اقتصادی مسائل کا حل بتایا ہے۔ ایک انسان کی بنیادی ضروریات کون کون سی ہیں اور ان بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنا ایک اسلامی ریاست کے لیے ضروری اور لابدی ہے۔ اس اسلامی فقہ کی کتابوں میں بھی مرقوم ہے کہ معاشی تکفل میں کھانا پینا، لباس، سر چھپانے کے لیے مکان، شیر خوار بچہ کے لیے دودھ وغیرہ معاشی کفالت میں وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر کسی صاحب حاجت کو اپنی کسی اہم ضرورت کی وجہ سے کسی خادم کی ضرورت اور حاجت ہو تو اس خادم کا نفقہ بھی متکفل کے ذمہ ضروری اور لازمی ہے۔ (بدائع الصنائع: ۴/ ۳۸)

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ سیدنا ابو بکرؓ نے اپنے عہد خلافت میں

Marfat.com

مساوات کو اسوہ بنایا اور اعمال کی فضیلت کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب بیت سا مال آیا تو سیدنا ابوبکرؓ نے مستحقین میں برابر تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں نے عرض کی کہ کاش آپ ''السابقون الاولون'' کو فضیلت دے کر دوسروں سے زیادہ عطا فرماتے۔ ان حضرات کی یہ بات سن کر آپ نے فرمایا:

> ''تم لوگوں نے جو اہل سبقت و قدم اور اہل فضیلت کی سبقت کا ذکر کیا ہے تو یہ بات مجھے تم سے زیادہ معلوم ہے لیکن یہ صفات تو ایسی چیز ہیں جس کا ثواب اللہ کے پاس ہے، یہ معاملہ معاش کا ہے اس میں ترجیح کے مقابلہ میں مساوات ہی بہتر ہے۔''

(کتاب الخراج: ۴۲، کتاب الاموال: ۲۶۳)

لیکن سیدنا عمرؓ نے وظائف کی تقسیم میں سبقت اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی قرابت کا لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مابین امتیاز قائم کیا جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے آخری دور میں سیدنا ابوبکرؓ ہی کی رائے کو مفید سمجھا اور اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اگر میں آئندہ سال ان وظائف کے دنوں میں زندہ رہا تو یقیناً السابقون الاولون اور بعد میں آنے والوں کو ملا دوں گا اور عطیہ اور وظیفہ میں سب کو برابر اور مساوی کر دوں گا۔''

(کتاب الخراج: ۴۶، کتاب الاموال: ۲۶۴)

ابوعبیدؒ کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ سیدنا علیؓ بھی سیدنا ابوبکرؓ کی رائے کے موید تھے۔ چنانچہ لکھا ہے:

> ''اور اسی طرح سیدنا علیؓ سے بھی مساوات ہی کی تائید منقول ہے۔
> بہر حال دونوں طریقوں کی اسلام تائید کرتا ہے۔''

(کتاب الاموال: ۲۶۴)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

یہاں ایک شبہ ہر معقول ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ عمال حکومت، کارکنان

Marfat.com

ریاست اور اہل حاجت وضرورت اور دیگر لوگوں کے لیے وظائف اور عطیات کا انفرادی اور شخصی سلسلہ اسی طرح قائم رکھا جائے جیسا کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے تو ملک میں صنعت وحرفت، تجارت و کاشت کاری اور دوسرے ذرائع بالکل ختم ہو جائیں گے اور ہر شخص ان وظائف وعطیات پر بھروسہ کر کے سست اور کاہل ہو جائے گا اور تمام ذرائع معیشت واقتصاد میں ترقی کی راہیں نہ صرف مسدود بلکہ ختم ہو جائیں گی۔

یہ شبہ سب سے پہلے سیدنا ابوسفیانؓ کے ذہن میں آیا تھا۔ لیکن سیدنا فاروق اعظمؓ نے اس کا جو جواب دیا اس نے نہایت اچھے طریقہ سے اس شبہ کا ازالہ کر دیا۔ چنانچہ بلاذری نے فتوح البلدان میں وظائف عطایا کی بحث میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے:

''جب سیدنا عمرؓ نے وظائف کے رجسٹر مرتب کرائے تو سیدنا سفیان بن حربؓ نے عرض کیا: ''کیا آپ بھی رومیوں کی طرح وظائف کے لیے رجسٹروں کا یہ طریقہ رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ نے اس طرح کے وظائف اور روزینے مقرر فرمائے تو پھر لوگ وظائف پر ہی بھروسہ کر بیٹھیں گے اور تجارت وغیرہ کو یک قلم چھوڑ دیں گے؟'' اس کے جواب میں سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''میرے لیے ایسا کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ مال فئے کثرت سے بیت المال میں آ رہا ہے۔''

اس کی زندہ مثال آج ہمارے سامنے عرب ریاستوں کی ہے۔ ان ریاستوں میں تیل کے وافر ذخائر نکل آئے جس سے ملکی آمدنی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں نے اپنے باشندوں کے وظائف مقرر کر دیئے۔ ان کی تمام ضروریات زندگی کی کفیل حکومت وقت ہے۔ بالغ ہونے پر ان کی شادی اور رہائش کا انتظام بھی حکومت کے ذمہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اکثر و بیشتر آبادی کا ذریعہ معاش وہ وظائف ہیں جو حکومت کی طرف سے ان کو ملتے ہیں اور ملک کی تجارت اور صنعت وحرفت بلکہ بعض ممالک میں کاشتکاری بھی غیر ملکی لوگوں کے پاس ہے۔ ملک کے لوگوں کو ملی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دولت کے انبار ہونے کے باوجود ان ریاستوں میں کوئی انڈسٹری نہیں بلکہ یہ ممالک کھانے پینے کی اشیاء میں بھی دوسروں کے

Marfat.com

ج ہیں۔ اسلام کے عظیم مفکر حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی شہرہ
فاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ ''اس زمانہ میں حکومتوں کی تباہی اور بربادی کا
لب سبب دو چیزیں ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ بیت المال کے آمدنی پر تنگ حالی کے
یے منڈلانے لگیں یعنی ایسے حضرات بھی اپنی تمام معیشت کا بار قومی خزانہ پر ڈال دیں
ن کا واقعی بیت المال پر حق ہے جیسے مجاہدین، علماء اور وہ افراد بھی جن کے لیے آج کل
کے بادشاہوں نے داد و دہش اور عطیات کے خزانے کھول رکھے ہیں جیسے صوفی اور شاعر
یرہ، یا اسی قسم کے دوسرے مکدر اور غلط اسباب کی راہ سے بیت المال (قومی خزانہ) کو
ر بار کیا جائے۔ دراصل ان لوگوں کے دماغوں میں یہ بات آنی چاہیے کہ اسلام میں
ترین ذریعہ معاش قوت بازو سے کمانا ہے نہ کہ اجتماعی مصالح کے قیام کی راہ سے صرف
ت المال کے وظیفہ پر اکتفا کر بیٹھنا، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک جماعت دوسری
ناعت کے ساتھ مزاحمت کرتی ہے اور پھر آپس میں ایک دوسرے کے لیے تکدر اور
عاشی خرابی کا باعث بنتی ہے۔ اور بالآخر حضارت اور ریاست کے لیے بار دوش ہو جاتی
ہے (جس کے نتیجہ میں ملک کی معاشی حالت برباد ہو جاتی ہے۔) (حجۃ اللہ البالغہ: ۱/۴۵)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اس عبارت سے یہ پتہ چلا کہ جب ملک کی اکثر و بیشتر
آبادی قومی خزانہ کے وظائف و عطیات اور سوشل سیکورٹی پر انحصار کر لے تو ملکی نظام
معیشت واقتصاد تباہی و بربادی کے راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ملک تباہی
کے دہانہ پر پہنچ جاتا ہے کیونکہ افراد ملت ہاتھ کی کمائی اور ذاتی محنت کے ذریعے تحصیل
معاش کو چھوڑ کر اپنا سارا بوجھ ملکی خزانہ یا سوشل سیکورٹی پر ڈال دیں گے تو وہ نہ صرف ملکی
خزانہ کے لیے بلکہ خود ملک کے لیے باعث مصیبت بن جائیں گے اور ملک کا خزانہ تنگی
میں مبتلا ہو جائے گا اگرچہ ان میں سے بعض افراد ملت کا حق معیشت بیت المال ہی سے
کیوں نہ متعلق ہو جیسے مجاہدین اسلام اور علماء و صوفیاء وغیرہ۔

یہ شبہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام تو ایک مسلمان کو سست و کاہل نہیں بناتا
بلکہ اس کو ملک و ملت کے لیے ایک مفید شہری بناتا ہے۔ اگر افراد ملت نے اپنا سارا انحصار
بیت المال پر رکھا اور بیت المال نے ملک کی اکثر و بیشتر آبادی کو وظائف دینے شروع کر
دیے تو حکومت کی صنعت و تجارت اور تمام معاشی وسائل میں اضمحلال اور پژمردگی پیدا

Marfat.com

ہو جائے گی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی ریاست کا اپنے دفاع کے لیے میں مصروف رہنا بھی ضروری اور لازمی ہے بلکہ جہاد کو جاری رکھنے کے لیے صنعت حرفت اور تجارت و کاشتکاری کا فروغ بھی ضروری ہے۔ اس شبہ کا جواب فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے یہ دیا ہے کہ:

"سیاست ملکی میں تقسیم کار اور مختلف منازل کسب واکتساب کا ہونا ازحد ضروری ہے، اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ صورت حال یہ ہو کہ وہ سب ایسے کسب واکتساب کی جانب متوجہ ہو جائیں کہ آخر کار وہ ملک کے نقصان کا باعث بن جائے۔ مثال کے طور پر ملک کی اکثریت زراعت کو خیر باد کہہ دے اور اپنی ساری توجہ تجارت کی طرف پھیر دے۔ یا اس کی اکثریت صرف جہاد ہی میں مشغول ہو جائے اور تجارت اور صنعت و زراعت معدوم ہونے لگے، یا اسی طرح کسی ایک مشغلہ میں ملک کی اکثریت مشغول رہ کر دوسرے ملکی ذرائع ترقی کو کھو بیٹھے تو یہ سیاست ریاست کے لیے انتہائی نقصان دہ اور مضر ہے بلکہ عام شہری باشندوں کو اس بات پر غور وفکر کرنا چاہیے کہ کاشت کار اجتماعی حیات کے لیے بمنزلہ طعام کے ہیں اور تاجر و صناع اور فوجی و سپاہی گویا نمک برائے اصلاح طعام کی طرح ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ ۱/۴۴)

لوگوں کو جب مفت خوری کی عادت پڑ جائے تو پھر ان کے لیے جدوجہد کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور جو کام بھی کرنے لگیں گے، کوشش یہ کریں گے کہ ان کو ہر چیز حکومت کی طرف سے مل جائے اور انہیں کوئی محنت مزدوری نہ کرنا پڑے۔ آج بعض یورپی ممالک میں بھی ملک کی معتدبہ آبادی ہڈ حرام ہو چکی ہے اور اس کا گزارہ سوشل سیکورٹی پر ہے۔ کام کرنے کو ان کا جی نہیں چاہتا لہٰذا طرح طرح کے بہانے تراش کر ملکی خزانہ سے لے لے کر کھاتے ہیں اور معاش کے ان اصولی وسائل کو چھوڑ بیٹھے ہیں جن پر نظام عالم کی بنیاد ہے۔ چنانچہ مفکر اسلام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

"اور باشندوں کی اکثریت خلیفہ کی عیال بن جاتی ہے اور اس طرح

بیت المال پر بار ہو جاتی ہے۔ اور کبھی وہ یہ کہہ کر وظیفہ حاصل کرتے ہیں کہ وہ مجاہدین اور ملک کے سیاسی راہ نما اور مدبر ہیں۔ اور اس وظیفہ سے ان کا ضروری حاجات کا دفع کرنا مقصد نہیں رہتا بلکہ باپ دادا کی رسم کو قائم رکھ کر مفت خوری مقصد ہو جاتا ہے، اور کبھی یہ کہہ کر وظیفہ حاصل کرتے ہیں کہ وہ درباری شاعر ہیں اور بادشاہوں کی جانب سے شعراء پر دادو دہش ہوا ہی کرتی ہے۔ اور کبھی وہ یہ کہہ کر وظیفہ وصول کرتے ہیں کہ وہ صوفی اور درویش ہیں، اور خلیفہ ان کے تفتیش حالات کو معیوب سمجھنے لگتا ہے، اور اس طرح وہ ایک دوسرے کی تنگی کا باعث بن جاتے ہیں، اور ان کا معاشی کسب و اکتساب صرف بادشاہوں کی مصاحبت، ان کی خوشامد اور جی حضوری اور ان کی مدح سرائی رہ جاتا ہے، اور آخر کار یہ ایک ایسا فن بن جاتا ہے کہ ان کی تمام دماغی صلاحیتیں خوشامد، چاپلوسی اور صلاحیتوں کے ضیاع کا سبب بن جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ جب کسی قوم میں یہ اشغال و افعال بڑھ جاتے ہیں تو لوگوں کے نفوس میں ادنیٰ اور ذلیل و خسیس افکار و خیالات رونما ہونے لگتے ہیں اور پست خیالی اور دنائت ان کو اخلاق صالحہ اور حسنہ سے باز رکھتی ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ:۱/۱۰۶)

یہ شبہ سب سے پہلے سیدنا ابوسفیانؓ کے ذہن میں آیا تھا۔ جو انہوں نے سیدنا عمرؓ کے سامنے پیش کیا لیکن سیدنا عمرؓ کے مختصر اور اجمالی جواب نے سیدنا ابوسفیانؓ کے اس بنیادی سوال کا جواب دے دیا۔ سیدنا عمرؓ نے سیدنا ابوسفیانؓ کے سوال کا انکار نہیں فرمایا لیکن جواب میں فرمایا کے ایسا کرنا ضروری ہے کیونکہ اس طریقہ سے بیت المال سے متعلق تمام قسم کے مصارف کو پورا کیا جا رہا ہے، اور اس سلسلہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا مصرف بھی تشنۂ تکمیل نہیں ہے۔ تاہم بیت المال مال فئے سے بھرا ہوا ہے لہٰذا میں اس کو اپنی ذات یا عمال حکومت پر خرچ کرنے کے بجائے ملک کے فقراء، مساکین، یتامیٰ اور دوسرے اصحاب حاجات کے علاوہ افراد امت پر بھی اس مال کو خرچ کرنا چاہتا ہوں تا کہ اپنے ہاتھ سے حاصل کردہ مال کے علاوہ اس ذریعہ سے بھی ان میں زیادہ سے زیادہ رفاہیت اور خوش حالی پیدا ہو۔

Marfat.com

پیدائش دولت

معاشیات کی اصطلاح میں پیدائش دولت سے مراد دستیاب قدرتی اور انسانی وسائل سے کام لے کران اشیاء وخدمات کو وجود میں لانا ہے جن میں کسی انسانی احتیاج کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ کسان کا زمین سے پیداوار حاصل کرنا، مزدور کا محنت کرنا، نانبائی کا روٹی پکانا، مصنوعات کی تیاری، استاذ، ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل کی پیشہ وارانہ خدمات یہ سب پیدائش دولت کے اعمال ہیں۔ آغاز آفرینش میں انسانی احتیاجات مختصر اور سادہ تھیں، اس پیدائش عمل کا دائرہ بھی محدود تھا، لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ احتیاجات میں وسعت اور تنوع پیدا ہو جانے سے دولت کی پیدائش کے اعمال اور سرگرمیوں کا پھیلاؤ بھی بڑھتا گیا اور اب حال یہ ہے کہ معاشی جدوجہد کے دائرہ میں بالخصوص سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے اندر اسے مرکزی اور محور کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

معاشیات کی اصطلاح میں معاش کے بنیادی وسائل زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت ہیں، اس لیے کہ قدیم وجدید علمائے معاشیات نے عاملین پیدائش کو کہ معیشت کی ترقی کی عمارت کے ستون ہیں، زمین، محنت اور اصل میں منحصر سمجھا۔ زمین اور محنت تو معروف عوامل ہیں، البتہ اصل کی وضاحت یہ ہے۔ علم معیشت میں ''اصل'' اور ''دولت'' حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے ایک ہی شی کے دو نام ہیں مگر طریق استعمال کے لحاظ سے دونوں کے مابین فرق ہو جاتا ہے، اور یہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں شمار ہونے لگتی ہیں۔ پس اگر ہم دولت کو عامل پیدائش بنائیں یعنی اس کو اس طرح کام میں لائیں کہ اس سے مزید دولت پیدا ہو تو وہ علم معیشت میں ''اصل'' کہلاتی ہے۔

Marfat.com

اور اگر اس کو ثمرۂ پیدائش اور ماحصل سمجھیں اور اس طرح اس کو استعمال کریں کہ بجائے مزید دولت پیدا ہونے کے اس سے ہماری کوئی احتیاج پوری ہوتی ہو تو اس کا نام دولت ہے۔ مثلاً سکونت کے لیے جو مکان ہے وہ دولت ہے اور اگر اس میں کوئی کارخانہ چلایا جائے یا اس کو کرایہ پر دے دیا جائے تو وہ ''اصل'' بن جائے گا۔ اسی طرح کرایہ پر چلنے والی گاڑی ''اصل'' ہے اور سیر و تفریح کی گاڑی 'دولت'' کہلاتی ہے۔ (علم المعیشت: ۹۹/۶)

اور یہ بات بھی نہایت واضح ہے کہ ہر سہ عاملین پیدائش زمین، محنت اور اصل کا تعلق کم وبیش فرق کے ساتھ زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت تینوں ہی کے ساتھ ہے چنانچہ علم معیشت میں اس حقیقت کی تعبیر اس طرح کی جاتی ہے۔

''یوں تو پیدائش دولت کے واسطے ہر سہ عاملین زمین، محنت اور اصل کی شراکت لازمی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ شراکت میں زمین کا حصہ غالب رہتا ہے اور صنعت وحرفت میں اصل کارگزاری خاص طور پر قابل لحاظ ہوتی ہے محنت دونوں صورتوں میں یکساں ضروری ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ معاشی وسائل کی بنیادیں زراعت، تجارت اور صنعت پر قائم ہیں اور ان کی ترقی پر ہی معیشت کی فلاح و بہبود کا مدار ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں ان معاشی وسائل کو جب فروغ دیا جاتا ہے تو فساد وضیاع سے معاشی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور ترقی اور وسعت کا پیمانہ رفاہیت اور خوش حالی کی جانب رواں دواں نہیں ہوتا اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر روز بروز امیر تر اور غریب روز بروز غریب تر ہوتا رہتا ہے اور معاشی نظام ابتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلام میں اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام سے الگ ترقی اور وسعت کا معیار ہے۔ اس سے انفرادی اور اجتماعی دونوں شعبوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور اس میں ہر فرد ملت کو رفاہیت حاصل کرنے کا موقع یکساں طور پر ملتا ہے۔

اس بارہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا شاہ ولی اللہ قدس سرہ فرماتے ہیں:

''انسان جب کہ مدنی الطبع پیدا ہوا ہے اور اس کی معاشی اور اقتصادی زندگی باہمی تعاون اور امداد باہمی کے بغیر درست نہیں ہو

Marfat.com

سکتی، لہٰذا خدائی فیصلہ یہ ٹھہرا کہ امداد باہمی کو ضروری اور واجب کر دیا جائے اور یہ کہ جس شخص کے ذریعہ بھی تمدن کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اس کو تمدنی زندگی سے الگ نہ ہونا چاہیے سوائے اس کے کہ یہ کسی خاص وجہ سے مجبوری پیش آ جائے۔ نیز معاشی وسائل کو وسیلہ بنانے کے لیے بنیادی سلسلہ یہ ہے کہ اموال مباح کو قبضہ میں کیا جائے یا اموال مباح میں سے جو جس غرض اور مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کے خصوصی جوہروں کے ذریعہ اموال مباح میں ترقی کی جائے، مثلاً مویشیوں کی افزائش نسل، آب پاشی، اور اصلاح زمین کے ذریعہ زراعت وغیرہ، اور اس باہمی تعاون سے معاشی وسائل حل کرنے میں یہ شرط لازمی ہے کہ یہ قبضہ اور یہ حصول ترقی ایک دوسرے کی معاشی زندگی کی تنگی اور ضیق کا باعث نہ بن جائے کہ یہ نتیجہ نکلے کہ نظام تمدن فاسد اور خراب ہو کر رہ جائے۔

(حجۃ اللہ البالغہ:۲/۱۰۳)

........❖❖❖........

Marfat.com

زراعت

زراعت کا اسلام میں اور انسانی معیشت میں ایک بہت بڑا مقام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسانی دنیا پر زراعتی پیداوار کو ایک عظیم الشان احسان جتا کر یہ بتایا ہے کہ انسانی طبعی وسائل معیشت میں ''زراعت'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿أفرایتم ماتحرثون، ء انتم تزرعونه ام نحن الزارعون، لونشاء لجعلنا حطاماً فظلتم تفکھون، انا لمغرمون، بل نحن محرمون﴾ (واقعہ:۶۳۔۶۸)

''بھلا بتاؤ تو سہی تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو، اس کو تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا کر دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ بلاشبہ ہم پر تاوان ڈالا گیا بلکہ ہم تو محروم رہ گئے۔''

اس آیت کے بارہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

''بظاہر بیج زمین میں تم ڈالتے ہو لیکن زمین کے اندر اس کی پرورش کرنا پھر باہر نکال کر ایک لہلہاتی کھیتی بنا دینا کس کا کام ہے۔ اس کے متعلق تو ظاہری اور سطحی دعویٰ بھی تم نہیں کر سکتے کہ ہماری تیار کی ہوئی ہے۔ پھر کھیتی پیدا کرنے کے بعد اس کا محفوظ اور باقی رکھنا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ ہم چاہیں تو کوئی آفت بھیج دیں جس سے ایک دم میں ساری کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ پھر تم سر پکڑ کر روؤ اور آپس میں بیٹھ کر باتیں بنانے لگو کہ میاں ہمارا تو بڑا بھاری نقصان ہو گیا بلکہ سچ پوچھو تو بالکل خالی ہاتھ ہو گئے۔ (فوائد عثانی:۱۲:۷)

Marfat.com

زراعت پر انسانی زندگی کا انحصار ہے کیونکہ جو غلہ زمین سے اگتا ہے اس کو کھا کر ہی انسان زندہ رہتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ زراعت کو انسانی زندگی میں اور شریعت کے نزدیک بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ چنانچہ حدیث میں بھی ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿اطلبوا الرزق فی خبایا الارض رواہ ابو یعلی﴾

(مجمع الزوائد:۴/۸۲)

''زمین کی پہنایوں میں رزق تلاش کرو۔''

اس حدیث سے مراد زراعت اور کاشت کاری ہے کما قال الامام السرخسیؒ۔ فضیلت کے علاوہ زراعت کا یہ کام باعث اجر وثواب بھی ہے جیسا کہ احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے تو اس درخت میں سے جو کچھ کھایا جاتا ہے وہ اس کا صدقہ ہو جاتا ہے۔ جو کچھ اس میں سے چوری ہو وہ اس کا صدقہ ہو جاتا ہے۔ اور جو درندے کھالیں وہ اس کا صدقہ ہو جاتا ہے، اور جو پرندے کھالیں وہ اس کا صدقہ ہو جاتا ہے اور جو شخص اس میں سے کم کرے گا وہ اس کا صدقہ ہو جائے گا۔''

(مسلم حدیث نمبر:۳۸۵۶)

اسی مضمون کی ایک اور روایت سیدنا انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے یا کوئی کھیت اگاتا ہے، اس سے کوئی پرندہ، انسان یا جانور کھائے تو وہ اس کا صدقہ ہو جاتا ہے۔'' یعنی اس کے لیے اجر وثواب کا باعث بنتا ہے۔

(مسلم حدیث نمبر:۳۸۶۱، بخاری)

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اگر کوئی درخت لگائے تو جو جاندار بھی اس کا پھل کھائے گا وہ درخت لگانے والے کا صدقہ ہوگا۔ اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ ثواب

کا مدار تو نیت پر ہے۔ جب درخت لگانے والے نے اس صدقہ کی نیت ہی نہیں کی تو اس کو اس کا اجر وثواب کیسے ملے گا؟ بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اعمال اختیاریہ کے ثواب کا مدار نیت پر ہے، اور اگر کوئی فعل دوسرے فعل کا اتفاقاً سبب بن جائے جس میں اس کا قصد اور ارادے کا دخل نہ ہو تو اس پر بغیر نیت کے بھی اجر مل جاتا ہے۔

علامہ بدرالدین عینیؒ نے اس حدیث کے بارہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اور اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ درخت لگانے والے کو اس پر اجر وثواب ملتا ہے خواہ اس نے اس ثواب کا ارادہ بھی نہ کیا ہو، حتیٰ کہ اگر اس نے درخت لگایا اور پھر فروخت کر دیا اور کاشت کی اور اس کو فروخت کر دیا، تب بھی یہ اس کے حق میں صدقہ ہو جائے گا، اس لیے کہ اس کا یہ عمل مخلوق خدا کی روزی میں اضافہ کا باعث ہوا۔''

(عمدۃ القاری: ۱۱/۵/۷)

امام سرخسیؒ نے مبسوط میں لکھا ہے کہ تقرب الی اللہ کے علاوہ اس امر کا کارِ خیر ہونا اس اثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿عمروا بلادی فعاش فیها عبادی﴾ (مبسوط: ۱۳۶/۳)

''میری بستیوں کو آباد کرو تا کہ ان میں میرے بندے زندگی گزار سکیں۔''

اس بارہ میں امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

﴿فلهذا قلنا هذا الفعل حسن من کل احد﴾ (ایضاً)

''پس اس وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ یہ عمل (یعنی زراعت) ہر کسی کے ہاتھوں بہتر عمل ہے۔''

امام سرخسیؒ ہی کا بیان ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مقام جرف میں زراعت اور کاشت کاری کی ہے۔ (مبسوط: ۲/۲۲) اور تجارت کرنا تو آپ ﷺ کا بہت سی احادیث میں آیا ہے۔ اس وجہ سے معلوم ہوا کہ جس طرح تجارت کرنا سنت ہے ایسے ہی

Marfat.com

زراعت اور کاشت کاری بھی سنت نبوی ہے۔صرف اختلاف اس میں ہے کہ تجارت کرنا افضل ہے یا زراعت کرنا۔بعض علماء کے نزدیک کاشت کاری سب سے افضل ہے۔بعض نے کہا کہ ہاتھ کی محنت پر مشتمل کام سب سے افضل ہے۔بعض نے کہا کہ تجارت سب سے افضل ہے۔حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا گیا: ''کون سا پیشہ اور کسب سب سے افضل ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو کام انسان اپنے ہاتھ سے کرے اور ہر جائز بیع۔درحقیقت ان سب میں اضافی فضیلت ہے۔بعض اعتبار سے کاشت کاری افضل ہے، بعض اعتبار سے تجارت افضل ہے اور بعض اعتبار سے صنعت وحرفت افضل ہے۔'' امام سرخسیؒ اس بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ بعض مشائخ حنفیہ کا قول ہے کہ تجارت اور صنعت وحرفت سے زراعت اور کاشتکاری افضل ہے، وجہ اس کی یہ بتائی کہ اس کا نفع عام ہے اور اس کی خیر کثیر ہے۔اور سرکار دو عالم ﷺ کے ارشاد اور عمل مبارک میں ان رکیک خیال لوگوں کا ردّ ہے جو کاشتکاری اور فن تعمیر کو برا سمجھتے ہیں۔'' (مبسوط: ۲۳/۱۴)

علامہ بدرالدین عینیؒ نے بخاری کی شرح میں وہی بات کہی ہے جو ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔فرماتے ہیں: ''کہ ان تینوں وسائل معیشت کی افضلیت اور اہمیت دراصل ذاتی نہیں ہے بلکہ اضافی ہے۔وہ اس لیے کہ یہ مخلوق خدا کی فلاح و بہبود اور عام خوش حالی اور رفاہیت کا ذریعہ ہیں، لہٰذا جن ممالک میں خام اجناس کی کمی ہو اور وہاں کے طبعی حالات یا ماحول میں زراعت کی زیادہ ضرورت ہو تو وہاں زراعت افضل ہے تاکہ لوگوں کو اس سے نفع عام ہو، لیکن اگر کسی جگہ زراعت کے وسائل مفقود ہوں تو وہاں تجارت کو افضلیت اور برتری حاصل ہوگی۔اور اگر کسی ملک کے باشندوں کو قدرتی اور طبعی طور پر زراعت اور تجارت کے مقابلہ میں صنعت کی زیادہ ضرورت ہوگی تو وہاں صنعت وحرفت کو فوقیت ہوگی اور یہی بات اور فیصلہ بہتر اور خوب ہے۔'' (عمدۃ القاری: ۵/۱۱۷)

معلوم ہوا کہ ہر سہ وسائل کے باہم راجح اور مرجوح ہونے کا سوال ملکوں کی طبعی حالت اور زمانہ کی ضروریات و حاجات کے پیش نظر ہے نہ کہ کسی ذاتی فضیلت کے پیش نظر۔ان کی یہ فضیلت اضافی ہے۔

Marfat.com

اصل بات یہ ہے کہ ان تینوں وسائل کی جانب ملکی باشندوں کو یکساں توجہ دینی ہے کیونکہ یہ تینوں وسائل ہی ملکی ضرورت کے لیے لازمی ہیں۔ ان میں سے جس وسیلہ میں بھی کمی ہوگی ملک کا نقصان ہوگا۔ ملک کی تمدنی حالت اسی صورت میں درست اور مضبوط ہوسکتی ہے جب تینوں وسائل بقدر ضرورت ملک میں موجود ہوں ورنہ ملک کی بربادی یقینی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خام اجناس اور زرعی پیداوار کے بغیر نہ تجارت کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے اور نہ صنعت وحرفت ترقی کرسکتی ہے۔ زراعت کی کمی دنیوی تمدنی زندگی کو نہ صرف فاسد بلکہ تباہ و برباد کر دیتی ہے، جب قومیں معاشی وسائل کو چھوڑ کر عیش پرستانہ وسائل زندگی کو اختیار کر کے ان میں منہمک ہو جاتی ہیں اور سرمایہ دارانہ بلندیوں اور مسرفانہ اور مترفانہ رفاہیت میں باہمی مقابلہ کو اپنی زندگی کا معیار بنالیتی ہیں (جیسا کہ آج کل پاکستان میں ہو رہا ہے) تو وہ کبھی بھی اپنی تمدنی زندگی میں پھل پھول نہیں سکتیں اور ان کی یہ عیش کوشی اور مترفانہ زندگی ان کو جلد ہی لے ڈوبتی ہے اور پھر ان قوموں کا نام صرف تاریخ کے صفحات میں رہ جاتا ہے، صفحۂ ہستی سے وہ مٹ جاتی ہیں۔ چنانچہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ:

> ''جب کسی ملک کی اکثریت اور جم غفیر اس قسم کے غیر طبعی اور غیر مفید کسب واکتساب میں منہمک ہو جاتی ہے تو زراعت اور تجارت جیسے وسائل معیشت کو خیر باد کہہ دیتی ہے اور جب کہ روسائے شہر اور امرائے ملک غلط وسائل معیشت پر مال خرچ کرتے ہیں تو ایسے لوگ تمدنی مصالح کو برباد اور تباہ کرتے ہیں، اور آہستہ آہستہ یہ غلط انہماک ان لوگوں کے لیے باعث مصیبت بن جاتا ہے جو اہم اور ضروری معاشی وسائل کی جانب مشغول ہیں، مثلاً کاشت کار، تاجر اور صناع۔ نیز یہ فاسد انہماک ان پیشہ ور افراد پر بھاری ٹیکسوں کا باعث ہو جاتا ہے اور یہ بات تمدنی زندگی کے لیے اس قدر نقصان دہ ہو جاتی ہے کہ اعضائے جماعت کے ایک عضو سے متعدی ہو کر دوسرے عضو تک پہنچتا ہے اور آہستہ آہستہ تمام افراد قوم میں چھڑ ی

Marfat.com

لگنے کی طرح متعدی ہو جاتا ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ:۲/۱۰۶)

مختصر یہ کہ یہ تینوں وسائل معیشت اپنی اپنی جگہ پر ضروری ہیں۔ لیکن زراعت اپنی ذات میں فرض کفایہ ہے کیونکہ انسان اور حیوان سب ہی اس کے محتاج اور ضرورت مند ہیں۔

صنعتی انقلاب کے بعد دنیا میں ترقی اور خوش حالی کی منزل ان ممالک کو حاصل ہوئی جو صنعتی اور تجارتی تھے۔ ان کے برعکس جو ممالک صرف زرعی تھے انہیں وہ ترقی حاصل نہ ہوئی۔ لیکن اگر سب ملک ایک دوسرے کے مدومعاون ثابت ہوں اور معاشی دست برد کے ذریعہ ظلم کی راہ نہ کھولیں تو سب قوموں کے لیے یہ بات خوش آئند ہو، لیکن موجودہ زمانے میں مختلف ممالک میں باہمی تعاون کے بجائے مناقشت ومنازعت ہے جو مہذب قوموں کی بدحالی کا باعث ہے۔ اس وقت وہ ممالک بہت ہی خوش بخت ہیں جو قدرت کی فیاضیوں سے زراعتی بھی ہیں اور تجارتی اور صنعتی بھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں زراعتی ممالک صنعتی ممالک کے مقابلہ میں امیر نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر پاکستان ایک زراعتی ملک ہے۔ ہم اگر سارا سال چاول، گندم اور کپاس وغیرہ کاشت کریں اور پھر اپنے ملک کے لوگوں کی بنیادی ضروریات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان تمام خام اجناس کو ایکسپورٹ اور برآمد کر دیں۔ اور ان کے بدلہ میں ہمیں جو زرمبادلہ حاصل ہو امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک جو صنعتی وسائل میں یدطولیٰ رکھتے ہیں صرف دس جہاز ہمیں دے دیں تو نہ صرف ہمارا کمایا ہوا زرمبادلہ ہم سے واپس لے جائیں بلکہ ہمیں ان کا مقروض بھی ہونا پڑ جائے۔ ان ممالک نے اپنی صنعت وحرفت اور انڈسٹری کے ذریعہ زرعی ممالک کو اپنا غلام بنا لیا ہوا ہے اور ان کی صنعت وتجارت کو مفلوج کر کے ان پر معاشی دست برد حاصل کر لی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

زراعت کے بارہ میں ایک شبہ ذہن میں آتا ہے کہ وہ یہ کہ جب اسلام کے معاشی نظام میں بنیادی وسائل معیشت میں "زراعت" کو اچھی خاصی اہمیت دی گئی ہے

اس حدیث کا کیا مطلب ہے جس کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں سیدنا ابوامامہ الباہلیؓ سے نقل کیا ہے کہ سیدنا ابوامامہؓ نے ایک جگہ ہل اور کھیتی کے بعض دوسرے آلات کو دیکھ کر فرمایا کہ میں نے سرکار دوعالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

﴿فلا یدخل هذا بیت قوم الا ادخله الله الذل﴾ (بخاری: ۱/۳۱۲)

اسی حدیث سے تو زراعت کے متعلق حقارت اور ذلت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ زراعت پیشہ آدمی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عزت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ فقہائے اسلام نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس حدیث کا محمل وہ لوگ ہیں جو کاشت کاری اور زراعت میں حد سے زیادہ مصروف و مشغول ہوں جس کی وجہ سے ان کے فرائض وواجبات فوت ہو جائیں۔ اسی طرح ترمذی میں سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زمین اور جائداد بناؤ پھر تم دنیا میں رغبت کرو گے۔'' (ترمذی: ۳۳۸)

اس حدیث کا محمل بھی یہی ہے کہ زمین اور جائداد بنانے میں اس قدر مشغول مت ہوؤ جس سے امور دینیہ رہ جائیں، اور اس باب کی احادیث کا محمل یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق کاشتکاری کرو یا اس قدر کاشت کاری کرو جس سے مسلمانوں کو فائدہ ہو یا ثواب کی غرض سے کاشت کاری کرو اور محض دنیوی اموال کو مقصود مت بناؤ۔ تمام دنیوی امور میں یہی قاعدہ کارفرما ہے۔ اگر ان میں بقدر ضرورت اشتغال ہو اور اپنے فرائض اور حقوق کی ادائیگی سے غفلت نہ ہو تو وہ مباح ہیں، بلکہ اگر ان امور کو کسی عبادت کے ساتھ مرتبط کیا جائے تو مستحب ہیں۔ اور اگر ان دنیوی امور کو خلق خدا کو نفع پہنچانے کے لیے اختیار کیا جائے تو یہ بلا تاویل مستحب ہیں اور ان میں اجر ملے گا۔ اور اگر دنیوی امور میں دنیا کی محبت کی وجہ سے یا ریاکاری سے یا فخر ومباہات کی وجہ سے اشتغال ہو، یا ان امور میں اس قدر زیادہ اشتغال ہو جس کی وجہ سے فرائض یا واجبات فوت ہو جائیں تو پھر یہ امور ضرر اور وبال کا باعث ہیں۔

بخاری کی اس حدیث کے بارہ میں امام محمدؒ اور ان کے اتباع میں امام سرخسیؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ:

Marfat.com

"لوگوں نے اس حدیث سے غلط مطلب سمجھا ہے۔ چونکہ اکثر غیر مسلموں کی زمینوں پر خراج لازم ہوتا ہے تو شاید اس وجہ سے زراعت ذلت کا باعث ہے، حالانکہ یہ درست اور صحیح نہیں ہے، بلکہ حدیث کی حقیقی مراد یہ ہے کہ مسلمان اگر زراعت کو زندگی کا مستقل مشغلہ بنالیں اور بیلوں کی دم کے پیچھے پیچھے پھریں اور جہاد جیسے اہم فریضہ سے غفلت برت لیں تو ان کے دشمن ان پر حملہ آور ہو جائیں گے اور ان کو ذلیل وخوار کر چھوڑیں گے۔

(مبسوط، سرخسی: ۸۳/۱۰)

حدیث کی توجیہ ابن حزمؒ اور دوسرے کئی ائمہ نے بھی یہی کی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی لکھا ہے کہ:

"واضح رہے کہ سرکار دو عالم ﷺ خلافت عامہ کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور آپ کی بعثت کا مقصد تمام مسخ شدہ ادیان پر ان کے انقلابی دین کا غلبہ جہاد اور وسائل جہاد میں انہماک کے بغیر ناممکن ہے۔ پس اگر مسلمان جہاد کو چھوڑ بیٹھیں اور بیلوں اور گایوں کی دم کے پیچھے پیچھے پھرنے لگیں تو ان کو چاروں طرف سے ذلت و رسوائی گھیر لے گی اور تمام اہل ملل و ادیان ان کو مغلوب اور محکوم بنا لیں گے۔" (حجۃ اللہ البالغہ: ۱۷۳/۲، محلی لابن حزم: ۲۱۱/۸)

لیکن ہمارے نزدیک اس حدیث کی سب سے بہتر توجیہ وہ ہے جو محدث ابن التینؒ نے بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد زراعت سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کو بیان نہیں کرتا بلکہ مستقبل میں ہونے والے ایک ایسے تکلیف دہ واقعہ کی جانب متنبہ کرتا ہے جو آج کی دنیا میں حرف بہ حرف صحیح نظر آ رہا ہے، اور سرکار دو عالم ﷺ کی صداقت وحقانیت کا منادی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کی تمام جماعتوں میں سب سے زیادہ ظلم و جبر کا شکار اس جماعت کو بنایا جائے گا جس کو کاشت کار کہا جاتا ہے، اور سب سے زیادہ ذلت اور رسوائی اور مسکنت سے ان ہی کو دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ابن التینؒ نے کہا ہے:

Marfat.com

﴿ھذہ من اخبارہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمغیبات لان المشاھدۃ الآن ان اکثر الظلم انما ھو علی اھل الحرث﴾

"یہ ارشاد سرکار دو عالم ﷺ کی اخبار غیب میں سے ہے، اس لیے کہ آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ سب سے زیادہ ظلم وستم کا شکار وہی لوگ ہیں جو کھیتی باڑی کرنے والے ہیں (یعنی کاشتکار ہیں)"

(اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا حفظ الرحمٰن:۱۷۱)

........❖❖❖........

Marfat.com

ملکیت زمین

زمین کی ملکیت کا مسئلہ نہایت ہی اہم ہے اور اس کا منصفانہ حل زراعت ترقی اور خوشحالی کا باعث بنتا ہے کیونکہ زمین کی ذاتی ملکیت زمین میں دلچسپی پیدا ہے اور صحرا کو گلزار اور جنگل کو منگل بنا سکتی ہے۔ زمین کا مالک نہایت اعلیٰ طریقہ نہایت محنت سے زمین کو کاشت کرتا ہے اور ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ زمین کی صلاحیت میں اضافہ ہو اور اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو جب کہ دوسرے کی ملک زمین پر کام کرنے والا شخص اتنی دلچسپی اور جدوجہد سے کام نہیں کرتا، کیونکہ وہ زمین اس اپنی نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے کی ہے۔

زمین کی ملکیت کے بارہ میں اس وقت دنیا میں کئی نقطہ ہائے نظر اور نظام رائج ہیں، مثال کے طور پر برطانیہ اور کئی دوسرے یورپی ممالک میں رائج نظام کے مطابق زمین میں انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کیا جاتا ہے جب کہ بعض ایشیائی ممالک میں انفرادی ملکیت کا حق بالکل تسلیم نہیں کیا جاتا، بلکہ ایک شخص زمین کا مالک بن سکتا ہے، اپنی ملکیت کو بذریعہ وراثت اپنے ورثاء کو منتقل کر سکتا ہے۔ اپنی زمین کی خرید و فروخت کر سکتا ہے لیکن زمین کی حتمی (Ultimate) ملکیت کا حق ریاست کے پاس ہے جب کہ چین اور سابق روس میں انفرادی ملکیت زمین کا حق مکمل طور پر ساقط کر دیا گیا تھا اور کسی بھی شخص کو زمین کی انفرادی ملکیت کا حق حاصل نہیں تھا۔ کیونکہ سوشلزم یعنی اشتراکیت میں ہر چیز اسٹیٹ کی ملکیت ہوتی ہے اور چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں کے بجائے ریاست کی شکل میں ایک بہت بڑا جاگیردار لوگوں کے سر پر بیٹھا ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں پائے جانے والے زمین کی ملکیت کے ان مختلف نقطہ ہائے

Marfat.com

کے مقابلہ میں اسلام نے ایک بالکل منفرد اور متوسط نقطہ نظر پیش کیا ہے جس کے
بق کائنات کی ہر شی کا مالک اللہ تعالیٰ ہے جس نے اس کائنات کو اور اس میں موجود ہر
کو پیدا کیا ہے۔ اسلام نے زمین کی ملکیت کی بحث کو صرف ایک لفظ ''خلافت'' سے
ل کر دیا کہ کھیتی باڑی ہی کی کیا خصوصیت، زمین و آسمان کی ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ
، اور یہ ساری چیزیں بحیثیت خلیفہ انسان کو امانت کے طور پر دی گئی ہیں، اور امین کو اس
، استعمال کا حق اسی وقت تک ہے جب تک اس سے مفاد عامہ میں خلل پڑنے کا
یشہ نہ ہو، ورنہ خلافت کو اس کا جائز حق پامال کیے بغیر ہر تصرف کا اختیار دیا گیا ہے۔
حق استعمال اور حق انتفاع کو ملکیت سے تعبیر کریں تو مضائقہ نہیں ہے اور نہ اس سے
ی اصولی کلیہ پر زد پڑتی ہے بلکہ اسلام میں جہاں کہیں بھی شخصی و اجتماعی ملکیت کا ذکر
ہے اس سے اسی قسم کی ملکیت مراد ہے۔

اس خالق کائنات کی طرف سے یہ ملکیت افراد اور ریاست کی طرف منتقل ہوتی
ہے۔ ایک فرد کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہے، لیکن یہ حق مطلق نہیں ہے بلکہ چند حدود
قیود کا پابند ہے اور زمین و جائداد کے استعمال میں ان حدود کی پابندی مالک کی ذمہ داری
تی ہے۔

زمین کی ملکیت کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ حتمی ملکیت زمین اسلامی
ریاست کا حق ہے جب کہ ریاست اپنا یہ حق انفرادی طور پر افراد کی طرف منتقل کرتی ہے کہ
یک فرد اپنی ملکیتی زمین و جائداد کو استعمال کر سکتا ہے، اس کی خرید و فروخت کر سکتا ہے اور
وراثت میں ورثاء کو منتقل کر سکتا ہے جب کہ اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب
چاہے معاشرے اور سوسائٹی کے وسیع تر مفاد میں زمین کو سرکاری ملکیت میں لے سکتی ہے۔''

(DR. Afzal-ur-Rehman, Exonomic Doctrine of Islam, Vol. II, P.54)

اس نقطۂ نظر کے مطابق زمین کی اصل ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے، نہ تو معاشرے
اور نہ ہی افراد کی ملکیت مطلق ہے بلکہ یہ ملکیت اللہ تعالیٰ کے نائب اور خلیفہ ہونے کی
حیثیت سے ہے۔ اس حیثیت سے ان پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ جو درج
ذیل ہیں:

Marfat.com

1- چونکہ ملکیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی ہے، اس لیے اس ملکیت پر تمام حدود کو پیش نظر رکھ کر ملکیت کے حقوق سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔

2- دوسری ذمہ داری افراد کی ایک دوسرے کے حوالے سے ہے کہ تمام مالک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں اور اپنی حدود سے تجاوز نہ کریں اور دوسرے کی حدود ملکیت میں مداخلت نہ کریں۔

اس طرح ایک رائے یہ ہے کہ اسلامی نظریہ ملکیت زمین نہ تو معروف معنوں میں سرکاری ملکیت کا نظریہ ہے اور نہ ہی انفرادی ملکیت کا۔ عام حالات میں حق کے بارہ میں یہ اصول نہیں ہے کہ ہر چیز کی انفرادی ملکیت جائز ہے اور نہ ہی یہ کہ سرکاری ملکیت میں لی جاسکتی ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق دونوں طرح کی ملکیت جائز ہے۔

1- انفرادی ملکیت:

جس کے دو ذرائع ہیں: (1) احیاء ارض الموات یعنی مردہ اور افتادہ زمینوں کو قابل استعمال بنا کر قبضہ میں لانا۔ (2) کسی اور طریقہ سے ملکیت کا ہونا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

2- سرکاری ملکیت یا اجتماعی ملکیت:

اس کے تین ذرائع ہیں (1) بیت المال کی ملکیت زمین (2) سرکاری ملکیت میں لی جانے والی زمینیں اور (3) مشترکہ ملکیت کی زمین اور اشیاء۔

قرآن حکیم اور تصور ملکیت:

جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کی کوئی چیز یہاں تک کہ اس کا ایک حقیر ذرہ بھی اصلاً انسان کی ملک نہیں۔ دوسری اشیاء کا کیا ذکر خود اپنی ذات پر بھی انسان کو اس قسم کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اس کے مالکانہ حقوق جن چیزوں پر بھی ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے بخشے ہوئے ہیں۔ اس کی اپنی جان، جسم اور قوتیں، زمین، کھیت اور

Marfat.com

گھر بار، اس کا سارا مال اور اس کی تمام املاک اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانتاً سپرد کی گئی ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿لله مافی السماوات وما فی الارض﴾ (بقرہ:۲۸۴)

''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وانفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه﴾ (الحدید:۷)

''اللہ نے جن مالوں پر تم کو اپنا نائب بنایا ہے ان میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ انسان کے پاس جو مال واملاک ہیں ان کا اصل مالک تو اللہ ہی ہے۔ انسان محض نائب کے طور پر ان املاک میں تصرف کا مجاز ہے۔

........❖❖❖........

اسلام میں اراضی کی اقسام

اسلام کے نظام زراعت میں چھ قسم کی زمینیں ملتی ہیں:

1- فتح کی ہوئی زمینیں
2- معاہدہ کی ہوئی زمینیں
3- مسلم کی زمینیں
4- خالصہ زمینیں
5- بنجر زمینیں
6- قدرتی پیداوار والی زمینیں

1-اراضی مفتوحہ:

سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت سے قبل مفتوحہ زمینوں کے بارہ میں نہایت ظالمانہ قوانین رائج تھے۔ اسلام سے قبل دستور تھا کہ جنگ میں جو کچھ حاصل ہو بادشاہ کے مقررہ حصہ کے علاوہ سب لڑنے والوں کا حق ہے۔ (الاحکام السطانیہ:۲۱۴)

قرآن حکیم نے اس دستور کو ختم کر کے تمام مفتوحہ اشیاء کو اللہ کی ملک قرار دیا۔ جیسا کہ سورۃ الانفال کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

''لوگ آپ سے غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔'' (الانفال:۱)

آیت میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر تنظیم و تقسیم کے لیے ہے کہ آپ بحیثیت صدر ریاست مفاد عامہ کے پیش نظر قانون شریعت کے مطابق مال غنیمت لوگوں میں تقسیم کریں۔ آپ ﷺ کا ذکر ملکیت کے سلسلہ میں نہیں ہے۔ امام بخاریؒ نے آیت غنیمت میں لفظ ''رسول'' کے بارہ میں جو تصریح کی ہے، اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔

﴿للرسول قسم ذالک﴾ (بخاری:۲/۸۷، کتاب الاموال:۳۰۴)

''رسول کے واسطے ہے یعنی رسول اس کو تقسیم کرے۔''

اس بات کی مزید تائید اس حدیث سے بھی ہوتی جس کو حافظ ابن قیمؒ نے نقل کیا ہے۔

''خدا کی قسم! (میں نہ اپنی خواہش سے کسی کو دیتا ہوں اور نہ روکتا ہوں، میں تو صرف قاسم (تقسیم کرنے والا) ہوں وہیں تقسیم کرتا ہوں جہاں حکم دیا جاتا ہوں۔'' (زاد المعاد: ۲/ ۱۴۷)

صدر ریاست ''امین اللہ'' ہونے کی حیثیت سے مفاد عامہ کے پیش نظر وہ درج ذیل لوگوں میں تقسیم کرتا تھا۔

(1) غازیوں میں (2) اصل باشندوں میں

چونکہ ملک وقوم کی حفاظت کی خدمت فوجیوں کے سپرد ہوتی ہے، اور شروع میں فوجیوں کی تنخواہوں اور بھتوں وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لیے ان کی خدمات کے عوض مفتوحہ زمینوں کا کچھ حصہ ان کے حوالے کر دیا گیا تھا تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی معاش کے خود کفیل ہوں اور بقیہ زمین بالعموم اصل باشندوں ہی کے پاس رہنے دی جاتی تھی۔ لیکن فوجیوں کے خود کفیل ہو جانے کے بعد اس حیثیت سے زمین دینے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا جیسا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے خیبر کے کچھ حصہ کے علاوہ جس کو اہل خیبر چھوڑ کر چلے گئے تھے، قریباً تمام مفتوحہ زمینیں اصل باشندوں کے پاس ہی رہنے دی تھیں اور فوجیوں کو کسی میں سے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ پھر فوجیوں کو صرف اسی زمین میں سے حصہ دیا جاتا تھا جو جنگ کے بعد فتح ہوتی تھی، جس کو ''غنیمت'' کہتے ہیں۔ اور جو زمین بغیر جنگ کے فتح ہو جاتی تھی جسے فئے کہتے ہیں وہ پوری زمین بالعموم اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جاتی تھی اور وہی حسب سابق اس میں کاشت کرتے رہتے تھے۔

چونکہ مجموعی حیثیت سے دونوں قسم کی زمینیں اللہ کی ملک قرار دی جاتی تھیں اور ریاست وخلافت کی زیر نگرانی ہوتی تھیں، اس لیے مفاد عامہ کے پیش نظر زمین کی تنظیم و تقسیم میں ریاست کے اختیارات وسیع ہوتے تھے۔ (کما فی مختصر الطحاوی: ۱۶۷)

اصل باشندے اگر زمین چھوڑ کر چلے جاتے یا پھر مفاد عامہ میں خلل واقع ہونے کی وجہ سے کسی حصۂ زمین سے انہیں بے دخل کر دینا پڑتا تو ریاست مفاد عامہ کے

Marfat.com

پیش نظر بہتر تعلیم و تنظیم کی مجاز ہوتی تھی۔ وہ صورتیں درج ذیل تھیں:

1- قطیعہ دینے میں نفع خلق معلوم ہوتا تھا تو اس کے لیے بھی کوئی روک نہ تھی۔

2- ریاست کو اس بات کا بھی حق تھا کہ کسی کو زمین دیئے بغیر اپنے اخراجات خود کاشت کرائے اور پیداوار خود ہی لوگوں میں تقسیم کرے۔

3- ریاست اپنے اخراجات سے کاشت کرائے اور پیداوار سے اخراجات کی منہا کر کے باقی پیداوار صاحب زمین کے حوالہ کر دے جیسا کہ یحییٰ بن آ القرشی نے اپنی کتاب الخراج: ۲۲ میں لکھا ہے۔

مفتوحہ زمینوں کے بارہ میں قرآن حکیم میں بہت سی آیات ہیں۔ (انفال حشر: ۷۔۱۰) ان آیات میں فئے کا یہ ٹکڑا "وما أتاكم الرسول فخذوه وما نهٰ عنه فانتهوا" دراصل اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ صدر ریاست مفاد عامہ میں امو کی تنظیم و تقسیم کریں۔

دراصل قرآن حکیم کی انہی آیات اور اسی حقیقت کے پیش نظر سیدنا عمرؓ لوگوں کے اصرار کے باوجود عراق و شام وغیرہ کی زمینیں فوجیوں میں تقسیم نہیں کی تھیں بعد کی تمام مفتوحہ زمینیں بھی تقسیم نہیں ہوئی تھیں بلکہ وہ اصل باشندوں ہی کے پاس ر دے گئی تھیں۔

مفتوحہ اراضی کے بارہ میں فاروقی اصلاحات:

رسول اللہ ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکرؓ کے ہاتھ عنان خلافت آئی تو انہیں تو دوسرے فتنوں ہی سے فرصت نہ ملی کہ وہ زمینوں کے بارہ میں کوئی اصلاحات کر سکیں جب سیدنا عمرؓ مسند نشین خلافت ہوئے تو انہوں نے قرآن و سنت کے پیش نظر مفاد عامہ کے تحت مختلف اصلاحات کیں۔

عراق و شام فتح ہونے کے بعد زمین اور جائداد کے انتظام کے بارہ میں مشورہ ہوا۔ مجلس شوریٰ میں سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سیدنا بلالؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں کی رائے تھی کہ زمین فوجیوں میں تقسیم کر دی جائے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے ...د کا

Marfat.com

کچھ حصہ فوجیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ مفتوحہ زمین شرعی اصطلاح میں خراجی زمینیں کہلاتی ہیں اور یہ سب اسلامی ریاست کی ملکیت ہوتی ہیں۔خراج اس کرایہ کا نام ہے جو ایک اسلامی ریاست اپنی مملوکہ زمینوں پر وصول کرتی ہے۔(الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ، ضیاء الدین الریس:۱۵۶) کرایہ دار کی حیثیت عام کرایہ داروں جیسی بھی ہوسکتی ہے اور موروثی کاشتکاروں جیسی بھی۔ جو غیر مسلم کاشتکار اپنی زمینوں کے مالک نہ ہوں بلکہ اسلامی ریاست کی مملوکہ زمین پر کرایہ دار یا موروثی کاشتکار کی حیثیت سے کاشت کر رہے ہوں، ان سے حکومت اس زمین پر جو کرایہ وصول کرے گی اسے خراج کہا جاتا ہے اس کرایہ کی کوئی شرح شریعت نے متعین نہیں کی بلکہ مختلف زمینوں کی کیفیت کے لحاظ سے مختلف شرحیں رہی ہیں جو کہ کاشتکاری کی ضروریات اور زمین کی کیفیت کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔ جو غیر مسلم جنگ کے بعد اسلامی اقتدار کے تحت آئے ہوں ان کی زمینیں ان کی ملکیت میں نہیں رہ جاتیں بلکہ اسلامی ریاست کی ملکیت میں چلی جاتی ہیں۔خراج کا تعلق اصلاً ایسی ہی زمینوں سے ہے۔(کتاب الاموال:۶۸،۲۷۹،الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ:۱۱۱)

اسلام سے پہلے عربوں میں محاصل کی اس مد کا پتہ نہیں چلتا۔سرکار دو عالم ﷺ نے جب خیبر فتح کیا تو وہاں کے یہودیوں نے کہا کہ ہم ان زمینوں کے مالک ہیں اور ان کا جوتنا اور بونا ہم تم لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں، اس لیے ہمارے ساتھ بٹائی پر معاملہ کرو۔سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی اور نصفا نصفی پر معاملہ کرلیا۔فدک کے لوگوں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے بھی ایسا ہی معاملہ کرنا چاہا۔سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی درخواست بھی منظور فرمالی۔(کتاب الخراج لابی یوسف:۵۰/۵۱)

سیدنا ابوبکرؓ نے بھی اپنے دور خلافت میں ان لوگوں سے یہی معاملہ ''مقاسمت'' یعنی بٹائی پر رکھا۔(کتاب الخراج:۵۰) لیکن آپ کے عہد خلافت میں عراق اور شام کے جو علاقے فتح ہوئے آپ نے ان پر سرسری طور پر کچھ رقم متعین فرمادی تھی۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام کو کلی اختیار ہے کہ اگر وہ چاہے تو مفتوحہ زمین پر بٹائی پر معاملہ کرسکتا ہے اور اگر چاہے تو ایک خاص رقم متعین کردے، لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے کہ جب زمین

Marfat.com

بزور شمشیر فتح کی گئی ہو اور صدرِ ریاست نے اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کیا ہو۔

سنہ ۱۶ھ میں جب مسلمان فوجوں نے عراق عجم پر قبضہ کر لیا اور دوسری طرف یرموک کی فتح نے رومی حکومت کی قوت کا استیصال کر دیا تو اب سیدنا عمرؓ نے فوج کے نظم و نسق کی طرف توجہ فرمائی، لیکن اس معاملہ میں آپ کو نہایت مشکل کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ فوج کے سپہ سالاروں کا اصرار تھا کہ تمام مفتوحہ علاقوں کی زمینیں جو فوج نے بزور شمشیر حاصل کی ہیں، مالِ غنیمت کی طرح فوج میں تقسیم کر دی جائیں اور وہاں کے باشندوں کو ان کی غلامی میں دے دیا جائے۔ سیدنا عمرؓ نے ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن دوسری طرف امرائے فوج کا اصرار تھا۔ سیدنا عمرؓ کی مجلس شوریٰ میں سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سیدنا بلالؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں کی رائے تھی کہ یہ زمین فوجیوں میں تقسیم کر دی جائے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے خیبر کا کچھ حصہ فوجیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

مجلس شوریٰ کے دیگر ممبران سیدنا علیؓ، سیدنا عثمانؓ، سیدنا طلحہؓ اور سیدنا معاذ بن جبلؓ جیسے اکابر صحابہ کرامؓ کی رائیں سیدنا عمرؓ کی موافقت میں تھیں۔ آخر کار مجلس شوریٰ میں انتہائی غور و خوض کے بعد یہ بات طے پائی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر خلافت کی زیرِ نگرانی زمین اصل باشندوں ہی کے پاس رہنے دی جائے اور فوجیوں میں تقسیم نہ کی جائے۔ اس موقع پر شوریٰ میں موافقت اور مخالفت میں تقریریں ہوئیں۔ آخر میں سیدنا عمرؓ نے آیت فئے سے استدلال کیا۔ (ملاحظہ ہو سورۃ الحشر: ۱۰) جس نے سب کو خاموش کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

> ''کیا آپ حضرات نے ان لوگوں کی باتیں نہیں سنیں جو اس معاملہ میں مجھے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ شاید ان کا خیال ہے کہ میں ان کی حق تلفی کرنا چاہتا ہوں حالانکہ کسی فرد کی بھی حق تلفی کرنا میرے نزدیک صریح ظلم ہے۔ معاذ اللہ! خدا شاہد ہے میں نے کبھی بھی کسی معاملہ میں ان پر ظلم کیا ہو یا اب کسی پر ظلم کرنے کا ارادہ ہو۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ کسریٰ کی زمین (عراق و شام) فتح ہونے کے بعد اور کون سی زمین رہ گئی ہے کہ جس کی آمدنی سے خلافت کا نظام سنبھالا جا سکے گا۔ یہ تو محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ

اس نے کسریٰ کے اموال، زمین، جائداد اور جفاکش کام کرنے والے پر ہمیں غلبہ عطاء فرمایا ہے۔
یہ لوگ خود اس بات کے شاہد ہیں کہ اموال منقولہ میں نے فوجیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ خمس (پانچواں حصہ) نکال کر بھی اس کو مناسب موقع پر صرف کر دیا ہے۔ اب زمین (جائداد غیر منقولہ) باقی بچی ہے تو اس کے متعلق میرا ایسا خیال ہے کہ اسے آتش پرست مالکوں ہی کے پاس رہنے دوں اور زمین پر ٹیکس (خراج) اور ان کے مالکوں پر ان کے جان و مال کی حفاظت کا معاوضہ جزیہ مقرر کر دوں تاکہ یہ سب آمدنی اجتماعی مفاد میں کام میں لائی جا سکے اور اس کے ذریعہ فوجیوں کی تنخواہوں اور موجودہ اور بعد کے تمام لوگوں کا بندوبست کیا جا سکے۔''

''آپ حضرات ہی بتائیے کہ کیا یہ ممالک سرحدوں کی حفاظت کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔ کیا جزیرہ، کوفہ، بصرہ، عراق، شام اور مصر وغیرہ کے بڑے بڑے شہروں میں ان کی حفاظت کے لیے فوجی چھاؤنیوں کی ضرورت نہ پڑے گی۔ آخر فوجیوں کی تنخواہیں، ان کے بھتے اور دیگر تمام لوگوں کے وظیفوں کی رقم کہاں سے آئے گی؟''

سیدنا عمرؓ کی اس بصیرت افروز تقریر نے مجلس میں سب پر اثر ڈالا اور اراکین مجلس نے سیدنا عمرؓ کے خیال کی ان الفاظ میں تائید کی:

﴿فقالوا جمیعاً الرائی رایک فنعم ماقلت ومارأیت﴾

سب نے کہا کہ بس آپ ہی کی رائے صحیح اور درست ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر سرحدوں کی باقاعدہ حفاظت نہ ہوئی اور شہروں میں چھاؤنیاں نہ قائم کی گئیں تو دشمن پھر اپنے ملکوں میں قابض ہو جائیں گے۔

سیدنا عمرؓ شوریٰ کے فیصلہ سے مطمئن ہو گئے اور فرمایا:

Marfat.com

''اب مجھے اطمینان ہوا ہے کہ میں حق پر تھا اور اس معاملہ میں میری رائے درست تھی۔ اب آپ ایسے آدمیوں کا پتہ دیجیے جو زمین کی پیائش اور لگان کے مقرر کرنے میں نہایت ماہر اور تجربہ کار ہوں تاکہ ایک طرف زمین کی پیائش ٹھیک ہو جائے اور دوسری طرف کسی کی برداشت سے زیادہ ٹیکس اور لگان نہ مقرر کیا جائے۔''

چنانچہ زمین کے بندوبست کے لیے سیدنا عثمان بن حنیفؓ اور سیدنا حذیفہ بن یمانؓ کو جو زمین کے بندوبست میں نہایت ماہر تھے مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد سیدنا عمرؓ نے عراق کے گورنر سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کو خط لکھا کہ

''زمین اور نہروں کے علاوہ بقیہ مال غنیمت فوجیوں میں تقسیم کر دیں۔ زمین اور نہریں حسب سابق رہنے دیں تاکہ زمین سے وصول شدہ آمدنی لوگوں کے وظیفوں میں کام آئے اور بعد والوں کے لیے قوت کا سبب بنے۔'' (کتاب الاموال: ۵۸۔۵۹، کتاب الخراج لابی یوسف: ۲۵/۲۶، کتاب الخراج لیحیی: ۴۴)

قاضی ابو یوسفؒ نے اس واقعہ کے بارہ میں ایک قانونی کلیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ

''سیدنا عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ آپ نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان زمین تقسیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی تائید میں قرآن حکیم سے دلائل پیش کیے۔ یہ سب کچھ محض اللہ کی توفیق کا نتیجہ تھا اور اللہ تعالیٰ کی کتاب پر بصیرت حاصل ہونے کی بنا پر تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ جس حقیقت کو سیدنا عمرؓ کی نگاہ نے پا لیا تھا در اصل اسی میں جماعتی لحاظ سے تمام مسلمانوں کی بھلائی تھی۔ لگان کی آمدنی کو ایک جگہ جمع کر کے عام ضروریات پر خرچ کرنا یہ اس سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ زمین کو چند لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا اور وہی اس سے فائدہ اٹھاتے رہتے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر لگان کی آمدنی عام لوگوں

Marfat.com

کی تنخواہوں اور وظیفوں کے لیے وقف نہ ہوتی تو سرحدوں کی حفاظت اور فوجیوں کی کفالت کس مال سے کی جاتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی ملک اس قسم کے انتظامات کیے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

اسلام نے مفتوحہ ممالک کی ہر شی کی حفاظت کی:

آج اور پہلے بھی دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں کا دستور ہے کہ جب وہ کسی ملک کو فتح کرتی ہیں تو مفتوحہ ممالک کے باشندوں یا اقلیتوں پر بنیادی حیثیت سے اپنی تین چیزیں مسلط کرنا چاہتی ہیں۔ (1) زبان (2) مذہب اور (3) تمدن (کلچر) لیکن زمانہ خلافت میں ان تینوں کو خصوصیت کے ساتھ باقی رکھا۔

(1) جو ممالک فتح کیے گئے ان کے دفاتر کی زبان حسب سابق باقی رکھی گئی۔ جس طرح اسلام سے قبل عراق کا دفتر فارسی زبان میں، شام کا دفتر رومی زبان میں، مصر کا دفتر قبطی زبان میں تھا، اسی طرح فتح ہونے کے بعد بھی انہی زبانوں میں باقی رکھا گیا۔ (معجم البلدان بحوالہ الفاروق: ۲/۲۰)

(2) مذہبی معاملات و مراسم کی ادائیگی میں پوری آزادی دی گئی تھی اور مذہبی معاملات انہی کے مذہب کے مطابق طے کیے جاتے تھے۔

(3) ان کے تمدن اور کلچر کو باقی رکھا گیا تھا۔ (کتاب الاموال: ۱۰۱)

ایک اور مقام پر ابو عبیدؒ لکھتے ہیں:

"یہ سب لوگ اپنی شہادتوں میں، نکاح کے معاملات میں، وراثت کے قانون میں غرضیکہ وہ اپنے تمام قاعدہ قانون میں آزاد تھے۔"

(کتاب الاموال: ۱۴۰)

اس سلسلہ میں قاضی ابو یوسفؒ نے لکھا ہے:

"جب ان ذمیوں نے مسلمانوں کو اپنے معاملہ میں سچا پایا اور ان کے عمدہ کردار کو اچھی طرح سے جانچ لیا تو یہ لوگ مسلمانوں کے

Marfat.com

دشمنوں کے سب سے بڑے دشمن ہو گئے اور ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کے بہترین مددگار ثابت ہوئے۔ (کتاب الخراج:۱۳۹)

زمین کا بندوبست اور پیمائش:

مجلس شوریٰ نے اراضی کے بندوبست کے لیے سیدنا عثمان بن حنیفؓ اور سیدنا حذیفہ بن یمانؓ کا نام پیش کیا۔ یہ دونوں حضرات عراق میں زیادہ تر رہنے کی وجہ سے بندوبست کے اس کام سے بخوبی واقف تھے۔ امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس تحقیق اور صحت کے ساتھ زمین کی پیمائش کی جس طرح قیمتی کپڑا ناپا جاتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ سیدنا عمرؓ نے پیمائش کا میٹر (Meter) خود اپنے ہاتھ سے تیار کر کے ان حضرات کو دیا اور انہوں نے کئی ماہ تک بڑے اہتمام اور جانچ پڑتال سے پیمائش کا کام جاری رکھ کر بندوبست کا تمام حساب کتاب تیار کیا۔

ان دونوں حضرات نے عراق کا جو بندوبست کیا وہ کچھ اس طرح ہے کہ کل رقبہ طول میں ۳۷۵ میل اور عرض میں ۲۵۰ میل یعنی تین ہزار میل مکسر پیمائش کیا گیا۔ اور پہاڑ اور صحرا اور نہروں کو چھوڑ کر قابل زراعت رقبہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب ٹھہرایا گیا۔ شاہی خاندان کی جاگیر، آتش کدوں اور عام لوگوں کے اوقاف، لاوارثوں، مفروروں اور حکومت کے باغیوں کی جائیدادیں، وہ زمینیں جو سڑکوں کی تیاری کے لیے مخصوص تھیں، دریا برآورد وغیرہ، جنگلات، ان تمام اراضیات کو سیدنا عمرؓ نے خالصہ قرار دے کر جن کی مجموعی آمدنی ستر لاکھ تھی، رفاہ عام کے کاموں کے لیے مخصوص کر دی۔ کبھی کبھی کسی شخص کو اسلامی کوششوں کے عوض جاگیر بھی انہی زمینوں سے ادا کی جاتی تھی، لیکن یہ زمینیں بھی خراجی یا عشری ہوتی تھیں۔ ملک کا تمام بندوبست کر کے زمین قدیم قبضہ داران اور مالکان کے پاس رہنے دی گئی، لیکن اس پر حسب ذیل شرح سے لگان لگا دیا گیا۔

-1	گیہوں	۲ درہم سالانہ فی جریب
-2	جو	۱ درہم سالانہ فی جریب
-3	روئی	۵ درہم سالانہ فی جریب

-4	نیشکر (گنا)	۶ درہم سالانہ فی جریب
-5	انگور	۱۰ درہم سالانہ فی جریب
-6	نخلستان	۱۰ درہم سالانہ فی جریب
-7	تل (کنجد)	۸ درہم سالانہ فی جریب
-8	ترکاری	۳ درہم سالانہ فی جریب

بعض روایات میں ان شرحوں میں کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ کتاب الاموال اور کتاب الخراج میں گیہوں پر ۴ درہم سالانہ فی جریب اور جو پر ۲ درہم سالانہ فی جریب کی روایت بھی ہے۔ (کتاب الخراج: ۲۲، الاموال: ۱/۱۶۴)

روایات میں ہے کہ خراج کی یہ شرح سیدنا عثمان بن حنیفؓ نے سفارش کر کے بھیجی اور سیدنا عمرؓ نے اس کو نافذ فرما دیا۔ لیکن ایک روایت میں ہے کہ سیدنا عمرؓ وفات سے تین یا چار دن قبل سیدنا حذیفہؓ اور سیدنا عثمان بن حنیفؓ سے یہ فرما رہے تھے: ''شاید تم دونوں نے زمین پر اتنا بوجھ ڈال دیا ہے جسے وہ برداشت نہیں کر سکتی؟ سیدنا عثمانؓ نے جواب دیا کہ میں نے زمین پر اتنا ہی مالیہ عائد کیا جسے وہ برداشت کر سکتی ہے، اور اگر میں چاہتا تو اپنی زمین پر اس سے دگنا بار ڈال سکتا تھا۔'' سیدنا حذیفہؓ نے بھی کہا: ''میں نے جو شرحیں عائد کی ہیں انہیں یہ علاقہ برداشت کر سکتا ہے۔ اب جو فاضل بچ رہے گا وہ بہت زیادہ نہ ہوگا۔'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا:

> ''خوب غور کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم نے زمین پر اتنا بوجھ ڈال دیا ہو جو اس کی برداشت سے باہر ہو۔ اگر میں اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہا تو انہیں ایسے حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد کسی کی محتاج نہ رہیں گی۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ سیدنا عثمان بن حنیفؓ کو خراج کے معاملات اور زمین کے بندوبست اور پیمائش میں خوب مہارت تھی، لہٰذا انہوں نے زمین کی پیمائش اس طرح ٹھیک کی جس طرح کپڑا ناپا جاتا ہے، لیکن خوجی باشندے نہایت بداطوار تھے۔ انہوں نے سیدنا حذیفہؓ کو دھوکا دیا اور پیمائش میں ان سے تعاون نہ کیا۔ اس وقت

Marfat.com

خوجی کی زمین آباد اور کارآمد تھی لیکن اس واقعہ کے بعد اجڑ گئی۔ اس کا پانی زمین میں اتر گیا۔ اس کے منافع گھٹ گئے اور پھر اس کا مالیہ کم ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ باشندگان خوجی نے پیمائش میں سیدنا حذیفہ بن یمانؓ کو دھوکہ دیا۔ (کتاب الخراج:۲۹)

عراق کی زمین کے بندوبست اور پیمائش کے دوسرے سال ہی خراج کی مقدار آٹھ کروڑ سے دس کروڑ بیس لاکھ ہوگئی اور پھر ہر سال اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ امام ابو یوسفؒ نے روایت نقل کی ہے کہ سیدنا عمرؓ کے پاس جب عراق کا خراج آتا تو کوفہ اور بصرہ کے دس دس ثقہ اور معتمد اشخاص بارگاہ خلافت میں حاضر ہوتے اور ان کو چار دفعہ شرعی قسم دے کر پوچھا جاتا تھا کہ اس مال گزاری کے اکٹھا کرنے میں کسی ذمی یا مسلمان پر ظلم تو نہیں کیا گیا۔ (کتاب الخراج:۶۵)

سیدنا عمرؓ کی اسی نیک نیتی، خلوص اور مفاد عامہ کی خواہش کا یہ نتیجہ تھا کہ جتنا خراج ان کے زمانہ میں اکٹھا ہوا اتنا ان کے بعد پھر کبھی نہیں ہوا۔ یہ ان کی عدل گستری اور رعایا پروری کا نتیجہ تھا کہ آسمان سے برکتیں نازل ہوتی تھیں۔

عراق کے بندوبست کے علاوہ سیدنا عمرؓ نے اور کسی علاقے کا بندوبست نہیں کرایا بلکہ وہاں کی زمینوں کا جو بندوبست پہلی حکومتوں کے زمانہ میں ہوا تھا اس کو قائم رکھا، بلکہ آپ نے ان علاقوں کی زبان تک بھی نہ بدلی۔ آپ نے ان علاقوں کے پرانے انتظامی طریقہ میں جہاں ضروری سمجھا اصلاح کر دی وگرنہ دوسرا انتظامِ نظم ونسق اسی طرح رہا۔

........❖❖❖........

Marfat.com

اراضی معاہدہ

رسول اللہ ﷺ کے عہد اور آپ کے خلفائے راشدین کے عہد میں جس سرزمین کے باشندے اسلامی رحمت کو دیکھ کر معاہدے کے لیے ہاتھ بڑھاتے تو اسلام ان کو اپنے دامن رحمت میں چھپا لیتا۔ معاہدہ ہو جانے کے بعد ان کی زمینیں، تجارت، صنعت و حرفت غرض کہ ہر شی بدستور بحال رکھی جاتی تھی۔ معاہدین کی کسی شے سے تعرض کرنا یا معاہدہ کے وقت باہمی رضامندی سے جو کچھ طے ہو جاتا اس کی خلاف ورزی کرنا یا کسی شی کا طالب ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ معاہدہ کی پابندی پر زور اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ دنیوی قانونی گرفت کے علاوہ رسول اللہ ﷺ خود بنفس نفیس قیامت کے روز عدالت عالیہ الٰہیہ میں اس شخص کے خلاف مقدمہ دائر کریں گے جس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہو گی یا معاہدین پر کسی قسم کے ظلم و زیادتی کے ساتھ پیش آیا ہو گا۔ چنانچہ فرمان نبوت ہے:

> ''غور سے سن لو! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا ان کے حقوق میں کمی کرے گا یا برداشت سے زیادہ ان پر بار ڈالے گا یا ان کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز لے گا تو اس کے خلاف میں خود قیامت کے روز مدعی بن کر دعویٰ دائر کروں گا۔'' (کتاب الخراج: ۱۵۵)

آراضی معاہدہ کے بارہ میں ابو عبیدؒ نے اسلامی قانون یہ بیان کیا ہے:

> ''جس مقررہ مقدار کی ادائیگی پر معاہدہ ہو گیا ہو اس سے زیادہ لینے کی اجازت نہیں ہے اگرچہ معاہدین میں زیادہ دینے کی طاقت موجود ہو۔'' (کتاب الاموال: ۱۴۳)

Marfat.com

مقررہ مقدار سے زیادہ لینا تو در کنار اگر وہ لوگ مقررہ مقدار کی ادائیگی سے عاجز رہتے یا وہ ان کی پریشانیوں کا باعث نہ بنتی تو اس مقدار میں بھی کمی کر دی جاتی تھی جیسا کہ ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال میں لکھا ہے:

''اگر معاہدین مقررہ مقدار نہ ادا کر سکیں تو ان کی طاقت کی مقدار کم کر دی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے زیادہ لینے سے منع فرمایا ہے اور مقدار میں کمی کرنے سے منع نہیں فرمایا ہے۔''

(کتاب الاموال:۲۱۴۳)

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد میں جس قدر معاہدات ہوئے مسلمانوں نے ان کے احکام کے مطابق پابندی کی، اور اس طرح پابندی کی کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی پابندی نہیں کر سکی۔ ان پابندیوں کی چند ایک مثالیں درج ذیل ہیں:

(1) سیدنا عبادہ بن صامت انصاریؓ کا غوطہ نامی دمشق کے ایک گاؤں پر گذر ہوا آپ نے اپنے رفیق سفر سے مسواک لانے کے لیے کہا۔ پھر اس وجہ سے آپ نے اس کو منع کر دیا کہ ان لوگوں سے معاہدہ میں مسواک نہیں طے ہوئی تھی۔

(الاموال:۱۴۹)

(2) سیدنا ابو ہریرہؓ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ معاہدوں میں چھالے اور جانوروں کو کھلانے کے برتن تک سے پرہیز کرنا۔ (کتاب الاموال:۱۴۹)

(3) ایک دفعہ جابیہ کے مقام پر بہت سے مسلمان جمع تھے۔ سیدنا عمرؓ بھی ان میں موجود تھے۔ (یہ شاید سیدنا عمرؓ کے سفر شام کا واقعہ ہے) ایک شخص نے امیر المومنین سیدنا عمرؓ سے آ کر شکایت کی کہ بعض مسلمانوں نے میرے درخت کے انگور جھاڑ کر کھا لیے ہیں۔ یہ سن کر سیدنا عمرؓ نے انگوروں کا معاوضہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ (کتاب الاموال:۱۵۰)

(4) فوجی لوگ عموماً ظلم و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ میں بے باک ہوتے ہیں لیکن معاہدین کے شہروں سے ہو کر جب اسلامی فوج گزرتی تو پیش بندی کے طور پر سپہ سالار سے ادنیٰ چیز حتیٰ کہ سوئی اور اس سے بھی کم تر شی کا لینا بھی

قانون اور امن عامہ کے خلاف ورزی ہے۔ وہ اعلان یہ تھا:

﴿ولا تزرأ معاهداً ابرة فما فوقها﴾

"کوئی شخص کسی معاہد کی سوئی یا اس سے کم تر شی کا نقصان نہ کرے۔" (کتاب الاموال:۱۵۰)

5) معاہدہ کی پابندی میں یہاں تک احتیاط برتی جاتی تھی کہ اگر معاہدین کے وطن میں کسی ایسی شی کا استعمال کر لیا جاتا جو انتفاع کے لحاظ سے سب میں مشترک ہوتی اور ہر مقیم و مسافر برابر کے اس میں شریک ہوتے جیسے پانی، آگ، گھاس، سایہ وغیرہ تو اس کا معاوضہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سیدنا ابوالدرداءؓ کا جب کسی گاؤں پر گذر ہوتا، اگر وہ وہاں پانی پیتے یا درختوں کے سایہ میں بیٹھتے یا سواری کا جانور چرنے کے لیے چھوڑتے تو روانگی کے وقت ایک ایک پائی ان چیزوں کی قیمت ادا کر کے جاتے تھے۔ (کتاب الاموال:۱۵۱)

6) بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ جب سیدنا عمرؓ شام تشریف لائے تو اذرعات کے عیسائی اپنے ہاتھ میں ننگی تلواریں لیے ہوئے، پھول برساتے ہوئے، باجہ بجاتے ہوئے اور آپ پر بھی پھول برساتے ہوئے آپ کے استقبال کے لیے آئے۔ سیدنا عمرؓ نے ان کو روکنا چاہا لیکن سیدنا ابوعبیدہ بن جراحؓ نے کہا کہ آپ انہیں ایسا کرنے دیجیے اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔ یہ ان کا دستور ہے۔ اور اگر انہیں اس کام سے روکا گیا تو ان کو معاہدہ پر شک گزرے گا۔ (فتوح البلدان:۱۴۶)

یہ صرف چند واقعات نقل کیے گئے ہیں ورنہ اس قسم کے سینکڑوں واقعات تاریخ اسلام کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں۔

Marfat.com

اراضی مسلم

جس شہر یا ملک کے باشندے اسلام قبول کر لیں اس کی زمین کی تنظیم و تق[...] کے بارہ میں عام قانون یہی تھا کہ وہ بھی مفتوحین کی زمینوں کی طرح اللہ کی ملک قرار[...] جاتی تھیں اور ریاست کے انتظام ونگرانی میں انہی کے پاس رہنے دی جاتی تھیں[...] سرکاری ٹیکس کے علاوہ ان سے کچھ نہ وصول کیا جاتا تھا۔ عام قانون حدیث میں یوں ہے:

﴿ان القوم اذا اسلموا اخرزوا دماء ھم واموالھم﴾

(ابوداؤد)

''جب کوئی قوم اسلام قبول کر لے تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیتی ہے۔''

یہ قانون عرب وعجم کی تمام زمینوں کے لیے برابر ہے اور اس میں منقولہ اور[...] منقولہ جائدادیں سب شریک تھیں۔

امام قاضی ابو یوسفؒ اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس سرزمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں ان کا خون حرام ہے۔ قبول اسلام کے وقت جو مال ان کے پاس ہوگا وہ انہی کا رہے گا۔ ایسے ہی زمینیں بھی انہی کی رہیں گی، اور اس قسم کی زمینیں عشری ہوں گی، جس طرح مدینہ طیبہ کے باشندوں نے اسلام قبول کیا تو یہ ساری چیزیں انہی کے پاس رہنے دی گئی تھیں۔ اور جس طرح طائف اور بحرین کے لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ

Marfat.com

اپنے اپنے چشموں اور اپنے اپنے علاقوں پر باقی رکھے گئے تھے۔ قبیلہ والوں میں سے کسی کے لیے جائز نہ تھا کہ وہ ان کی چیزوں میں کوئی ایسا تصرف کریں جس کی بنا پر وہ اس کے مستحق بن جائیں اور نہ اس میں کسی کو (بلا) اجازت کنواں کھودنا جائز تھا کہ جس کی وجہ سے کچھ حصہ کے وہ مستحق ہو جائیں۔ البتہ انہیں گھاس سے کسی کو روکنا جائز نہیں۔ ایسے ہی چرواہوں اور مویشیوں کو پانی سے روکنا جائز نہیں، اور رجانورں اور اونٹوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکنا جائز نہیں ہے۔ ان کی زمینیں عشری ہوں گی بعد میں بھی ان سے نکالی نہ جائیں گی۔ ان میں وراثت جاری ہوگی اور وہ اس کی خرید وفروخت کر سکیں گے۔'' (کتاب الخراج:۶۳)

قاضی ابو یوسفؒ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''ایسے ہی جس شہر اور علاقہ کے لوگ اسلام قبول کر لیں تو ان کی زمین اور ساری چیزیں حسب سابق انہی کے پاس رہیں گی۔''
(کتاب الخراج:۶۳)

اسی طرح امام ابو عبیدؒ نے لکھا ہے کہ:

''جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں وہ زمین انہی کی ملک رہے گی اور عشر کے علاوہ کچھ نہ دینا پڑے گا۔'' (کتاب الاموال:۵۱۲)

اسی صفحہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں وہ اپنی زمین کے مالک ہوں گے (ان کی زمین ضبط کی جائے گی اور انہیں انتفاع اور استعمال کا حق رہے گا) جیسے مدینہ منورہ، طائف اور بحرین وغیرہ میں یہی کیا گیا تھا۔''

Marfat.com

اراضی خالصہ

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل تمام دنیا میں جاگیرداری اور زمین داری کا نظام رائج تھا۔ اس نظام کی وجہ سے زمین زمینداروں اور جاگیرداروں کے ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی اور کاشت کاروں کا طبقہ جبر وتحکم اور تشدد واستبداد کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہر قسم کے وحشیانہ مظالم برداشت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی جب کہ دوسرا طبقہ ہر حیثیت سے غلام اور بے بس تھا۔ اس کو زمین چھوڑ کر نہ دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت تھی اور نہ اپنی محنت سے متمتع ہونے کی۔ نہ آقاؤں کی تبدیلی کا اختیار تھا اور نہ اپنے آقا سے سرخروئی کی امید۔

جبر واستبداد کی فضا میں اسلام ایک عالمگیر انقلاب کی شکل میں امانت وعدالت، افادیت ورحمت، اخوت ومساوات اور ایثار وقربانی کا پیام لے کر وادی ''غیر ذی زرع'' سے نمودار ہوا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد اس نے دنیا کی زہریلی ہواؤں کو نسیم سحر کے جھونکوں میں تبدیل کر دیا اور ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں نہ تو ملکیت کی آڑ میں جور واستبداد کی گنجائش باقی رہ گئی اور نہ روٹی کی خاطر انسان غیر اللہ کی غلامی پر مجبور رہا۔ اس نے ذرائع پیداوار کی تنظیم وتقسیم میں مذہب وملت کا فرق کیے بغیر ضرورت وصلاحیت اور حسن عمل کے اصول کو ملحوظ رکھا اور اپنے زمانہ کے جاگیردارانہ نظام کو یک قلم ختم کر کے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جس میں زمین کی ملکیت کا تصور نہیں بلکہ اس کے امانت ہونے کا تصور غالب تھا۔

اسلام میں جاگیریں تو ملتی ہیں جو لوگوں کو مفاد عامہ کے پیش نظر اسلامی ریاست کی طرف سے دی جاتیں جن کو عربی زبان میں ''قطائع'' کہتے ہیں، لیکن

Marfat.com

جاگیرداری نظام کو اسلام نے یک قلم ختم کیا۔ جو جاگیریں اسلامی ریاست کی طرف سے دی جاتیں اس کے انتظام کی دوصورتیں رائج تھیں۔

(1) کسی کو کاشت کے لیے زمین دی جاتی تھی اور وہ خود اس پر کاشت کرتا تھا۔

(2) اگر مفاد عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہونے کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتا تو دوسرے کے ذریعہ کاشت کراتا تھا اور آمدنی یا پیداوار میں دونوں شریک ہوتے تھے۔

اسلامی ریاست کی طرف سے اس عطیہ کی کبھی تو یہ شکل ہوتی کہ اس کو صرف زمین کی منفعت کا مالک بنا دیا جاتا اور ذات زمین پر کسی قسم کے تصرف بیع، ہبہ وغیرہ کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ اور کبھی زمین اور اس کی منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا تھا۔ اس صورت میں ہر قسم کے تصرفات بیع، ہبہ وغیرہ کے اختیارات بھی اس کو حاصل ہوتے تھے۔ لیکن قطائع (جاگیروں) کی کوئی شکل بھی سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھی بلکہ اجتماعی مفاد کے لیے خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دوسری زمینوں کے ''قطائع'' پر زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ انہی اختیارات کے پیش نظر سیدنا عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے بعض قطائع کو جلیل القدر صحابہ کرامؓ سے واپس لے لیا تھا۔ اور اس واپسی پر مفاد عامہ کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے مفاد عامہ کی خاطر ''قطیعہ'' (جاگیر) دیا تھا اسی طرح سیدنا عمرؓ نے مفاد عامہ کے پیش نظر واپس لے لیا تھا۔ دراصل قطائع دینے اور ان کے واپس لینے دونوں میں مفاد عامہ کی روح کام کر رہی تھی۔

قطائع کی اس نوعیت کی وجہ سے علماء نے ان کی تعریف یوں کی ہے کہ

''مفاد عامہ کی حفاظت کی خاطر غیر آباد زمین کو آبادکاری کے لیے کسی کو دینا اور حسب ضرورت و مصلحت اس سے سرکاری ٹیکس وصول کرنا۔''

چنانچہ خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ فرماتے ہیں:

﴿الاقطاع اعطاء الارض للاحیاء سواء وجب فیه العشر او الخراج﴾ (فیض الباری:۳/۳۰۸)

Marfat.com

''اقطاع'' کسی کو آباد کاری کے لیے زمین دینا خواہ اس میں عشر واجب ہو یا خراج۔

علامہ مقریزیؒ اس سلسلہ میں کلام عرب کا یہ محاورہ نقل کرتے ہیں:

﴿اقطعه نهراً وارضاً اباح له ذالک﴾ (کتاب الخطط: ۱/۱۵۴)

''نہر اور زمین قطیعۃً دیا یعنی اس کے لیے مباح کر دیا۔''

اسی سلسلہ میں علامہ بدرالدین عینی قدس سرہ فرماتے ہیں:

''قطائع'' قطیعہ کی جمع ہے۔ خلیفہ کے قطائع دینے کی یہ صورت ہے کہ جس شخص میں وہ اہلیت اور صلاحیت دیکھے، اللہ کے اموال میں سے کچھ حصہ خلافت کی طرف سے اس کو عطا کر دے۔ اکثر اس لفظ کا استعمال زمین کے بارہ میں آتا ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ (1) یا تو زمین کی ذات اور منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔ (2) یا صرف زمین کی منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے ذات کا نہیں۔'' (عمدۃ القاری: ۶/۳۶)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

﴿وللسلطان اقطاعه على الملک وكذا على عدمه﴾

(مسویٰ شرح مؤطا: ۴۰۵)

''امیر ریاست کو قطائع دینا جائز ہے، چاہے تو زمین کا مالک بنا دے اور چاہے تو مالک نہ بنائے (یعنی صرف انتفاع کا موقع دے)''

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں قطائع کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ کسی شخص کو آباد کاری کے لیے ریاست کی طرف سے زمین دی جاتی تھی اور وہ زمین سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ ہوتی تھی بلکہ صدر ریاست کے اختیارات اس پر بہ نسبت دیگر اراضی کے زیادہ ہوتے تھے۔ لیکن اب یہ قطائع دیے جاگیروں کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور ان جاگیروں پر قابض بڑے بڑے جاگیردار کاشت کاروں پر بھی وہی ظلم وستم کرتے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں جاگیردار اور زمیندار کرتے تھے۔

Marfat.com

کس قسم کی زمین قطیعہ میں دی جاتی؟

کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ تین قسم کی اراضی ایسی تھیں جو ریاست کی جانب سے لوگوں کو بطور ''قطیعہ'' دی جاتی تھیں۔

(1) بنجر اور غیر آباد زمین جو ہمیشہ سے غیر مزروعہ چلی آتی تھی۔ عام لوگوں کو ان کی ویرانی دیکھ کر اسے آباد کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ریاست ایسی زمینوں کو قابل کاشت بنانے کے لیے لوگوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ چنانچہ سیدنا زبیر بن عوامؓ کو نقیع میں جو زمین دی گئی تھی وہ ایسی ہی زمین تھی۔ چنانچہ آپ نے محنت کر کے اس کو مزروعہ بنایا۔ ن (الاحکام السلطانیہ، ماوردی: ۱۸۳)

(2) افتادہ زمین جس میں قابل زراعت ہونے کے باوجود کسی وجہ سے زراعت نہ ہوتی تھی۔ اس میں وہ تمام زمینیں شامل تھیں جو بستیوں کے اجاڑ ہو جانے کے بعد بیکار پڑی رہتی تھیں اور انہیں کوئی آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ مدینہ منورہ کی وہ زمینیں بھی اسی میں شامل تھیں جو آبپاشی کی دشواری کی وجہ سے سرکار دو عالم ﷺ کے حوالہ کر دی گئی تھیں اور آپ ﷺ نے ان کو لوگوں میں زراعت کے لیے تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ سیدنا بلال بن حارثؓ کو سرکار دو عالم ﷺ نے ''وادی عقیق'' اسی زمین میں سے عطا فرمائی تھی۔ (کتاب الاموال: ۲۸۲)

(3) خالصہ زمین۔ اس میں مفتوحہ علاقوں کی وہ تمام زمینیں شامل ہوتی تھیں جو خلافت کے لیے خالصہ قرار دی جاتی تھیں۔ ایسی زمینوں کی مندرجہ ذیل قسمیں تھیں:

(ا) جن زمینوں کے مالک جنگ میں مارے جاتے۔

(ب) یا بھاگ جاتے

(ج) شاہی جاگیریں جو بادشاہ کے صرفِ خاص کے لیے ''خالصہ'' ہوتی تھیں

(د) شاہی خاندان اور افسران کی جاگیریں

(ہ) ترائی، جھلیں اور جھاڑیاں وغیرہ۔

Marfat.com

یہ اور اسی قسم کی وہ تمام زمینیں جن پر چند افراد قابض ہو کر عیش وعشرت کرتے تھے اور اسلامی غلبہ کے بعد ان کا کوئی مالک اور آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا، ایسی تمام زمینیں ریاست کے لیے ''خالصہ'' ہو کر مفاد عامہ کے لیے وقف ہو جاتی تھیں۔

(کتاب الاموال:۲۸۲، کتاب الخراج:۵۷،۵۹)

اس قسم کی جو زمینیں قطائع میں دی جاتی تھیں، ان کے بارہ میں دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔

(1) یا تو وہ بیکار پڑی رہتیں اور حقوق عامہ جو زمین کے متعلق ہیں وہ پامال ہوتے رہتے۔

(2) اور یا وہ صورت اختیار کی جاتی جو مفاد عامہ کے لحاظ سے مناسب اور بہتر ہوتی۔

خلافت نے مفاد عامہ کے پیش نظر دوسری صورت اختیار کی تھی۔ اسی وجہ سے زمانہ خلافت میں تمام بنجر اور افتادہ زمینیں آباد ہو گئیں اور آباد شدہ زمینوں سے غلہ اگلنے لگا تھا۔

زمینیں کس کو دی جاتیں؟

اسلامی ریاست میں قطائع انہی لوگوں کو دی جاتیں جو کاشت کار ہوتے یا جن کے ذمہ مفاد عامہ کی کوئی خدمت ہوتی تھی جس کی وجہ سے وہ خود کاشت نہ کر سکتے بلکہ دوسروں سے کاشت کرا کر زمین کو آباد کرتے یا رکھتے اور اپنی گذر بسر کرتے۔ چنانچہ فقہاء نے ایک کلیہ بیان کیا ہے:

> ''رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جانشینوں نے انہی لوگوں کو قطائع دیئے تھے جن کے دینے میں ملک وملت کی بھلائی ہوتی تھی اور تالیف قلوب مقصود ہوتی تھی۔'' (کتاب الخراج:۶۱، کتاب الخطط:۱/۱۵۴)

خلافت راشدہ کے زمانہ میں جن لوگوں کو یہ قطائع جاتے تھے، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

1- جن میں آباد کاری اور کاشت کاری کی خدمت ہوتی تھی۔

Marfat.com

2- جن کے سپرد مفاد عامہ کی کوئی صلاحیت ہوتی تھی۔
3- فوجی اور تمام وہ لوگ جو ملک وقوم کی حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔
4- نومسلموں کو تالیف قلوب کے لیے قطائع دیئے جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ خلافت کے پیش نظر قطائع کا مقصد اللہ کی مخلوق کے لیے زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانا اور عام خوشحالی کی فضاء پیدا کرنا ہوتا تھا، اس لیے بالعموم انہی لوگوں کو قطائع دیئے جاتے جو زمین کو زیر کاشت لا کر پیداوار بڑھا سکتے تھے، اور اگر کوئی خدمت سپرد ہونے کی وجہ سے خود کاشت نہ کر سکتے تو دوسروں کے ذریعہ کاشت کرا کر اس مقصد کو پورا کرتے تھے جیسا کہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا:

> ''اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء کسی کو کسی مسلمان یا معاہد کا حق نہ دیتے (اس لحاظ سے کہ زمین میں سب شریک ہیں)۔''

(کتاب الخراج:۶۰-۶۲، کتاب الاموال:۷۹-۸۱-۲۸۲)

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں قطائع دینے کا مقصد زیادہ سے زیادہ پیدوار حاصل کرنا اور اللہ کی مخلوق کا عام مفاد ہوتا تھا۔ جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا خلافت کو دخل دینے کی ضرورت نہ ہوتی تھی لیکن اگر اس میں کوتاہی ہوتی یا اور کوئی عمدہ صورت اراضی کی تنظیم کی سامنے آتی جس میں مخلوق خدا کا نفع زیادہ معلوم ہوتا تو اس وقت خلافت کو بے دخل کرنے کا پورا حق حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں چند ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں بلا پس وپیش اسی نظریہ کے ماتحت صاحب زمین کو بے دخل کر دیا گیا تھا۔

سرکار دو عالم ﷺ نے سیدنا بلال بن حارثؓ کو پوری وادی عقیق دے دی تھی، لیکن وہ اس کا بڑا حصہ آباد نہ کر سکے۔ سیدنا عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان سے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو یہ زمین اس لیے نہ دی تھی کہ نہ خود آباد کریں اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دیں، لہٰذا جتنی زمین آپ آباد کر سکتے ہوں اتنی اپنے پاس رکھیں اور بقیہ ریاست کو واپس کر دیں۔

Marfat.com

بات صاف تھی اور مفاد عامہ کے حق میں تھی لیکن یہ سن کر سیدنا بلالؓ نے ”میں رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی زمین کبھی واپس نہ کروں گا خواہ میں اسے آباد کروں یا نہ کروں۔“ سیدنا عمرؓ نے واپسی پر اصرار کیا اور بالآخر آباد شدہ حصہ چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی۔“ (کتاب الاموال: ۲۹۰، کتاب الخراج یحیٰ: ۹۳)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمرؓ نے مفاد عامہ کے پیش نظر سیدنا بلال بن حارثؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو رسول اللہ ﷺ کا دیا ہوا، عطیہ زمین مفاد عامہ کے لیے واپس لے لیا۔ ایسے ہی اور کئی واقعات کتابوں میں ملتے ہیں کہ ایک شخص کو سرکار عالم ﷺ نے زمین دی اور سیدنا عمرؓ نے زمین کے آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی۔ (کتاب الخراج یحیٰ: ۷۸)

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ خلافت میں ایک شخص کو کتنی زمین دی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں چند باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں:

1- اس زمانہ میں بنجر اور افتادہ زمینیں بکثرت تھیں اور انہیں آباد کرنے والے بہت کم تھے۔

2- پیداوار آج کے مقابلہ میں بہت کم تھی خصوصاً عرب کی زمینوں کی۔

3- رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت تک فوجیوں اور دیگر کارپردازوں کی تنخواہیں مقرر نہیں ہوتی تھیں۔

4- سیدنا عمرؓ نے رجسٹر مرتب کر کے تنخواہوں اور وظیفوں کا باقاعدہ انتظام کیا تھا اور جائداد کے بارہ میں وہی طرز عمل اختیار کیا جس کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا گیا ہے۔

قطائع کے بارہ میں علامہ بدرالدین عینیؒ نے لکھا ہے:

﴿یجوز للجندی الذی یقطع له ان یؤجر ما اقطع له﴾

(عمدۃ القاری: ۶/۳۶)

”فوجی کے لیے اپنے قطائع کرایہ پر دینا جائز ہے۔“

اور حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

﴿ولا یقطع الا قدرا یتاتی العمل لی﴾ (سویٰ:۲۰۵)

''اسی قدر قطیعہ دیا جائے جس پر اس کا کام کرنا آسان ہو۔''

پھر فرماتے ہیں:

امام را باید کہ اقطاع کند بقدر حاجت۔ (مصفیٰ:۲۰۵)

''خلیفہ کو بقدر ضرورت قطیعہ دینا چاہیے۔''

ان اقتباسات سے دو باتیں واضح ہوئیں۔

1- پہلی یہ کہ ضرورت سے زیادہ کسی کو قطیعہ نہ دیا جائے۔

2- دوسری یہ کہ ضرورت اور مصروفیت کی وجہ سے اپنے قطیعہ کو کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

صاحب زمین کے اختیارات

اسلام جس طرح اجتماعی مفاد کی خاطر ذاتی مفاد کو قربان کر دینے کا حکم دیتا ہے اسی طرح ہر شخص کی ذاتی آزادی اور انفرادی حقوق کا بھی خیال رکھتا ہے تاکہ ایک طرف انسان کی صلاحیتوں کو آزادانہ نشو ونما ملتی رہے اور دوسری طرف جدوجہد اور سعی وعمل کے میدان میں ترقی کا جذبہ سرد نہ ہونے پائے۔ اسلام میں فرد کو نہ تو اس طرح کی بالکلیہ آزادی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق پر جارحانہ حملہ کرے جس کی وجہ سے بہتوں کے حقوق پامال ہوں اور نہ فرد کو جماعتی شکنجہ میں اس طرح جکڑا جاتا ہے کہ اس کے ضمیر کا استقلال باقی نہ رہ سکے۔ اسی نظام اور اصولوں کے تحت زمانۂ خلافت میں صاحب زمین کو اپنی زمین پر کئی قسم کے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ ان میں سے چند ایک اختیارات حسب ذیل ہیں:

(1) زمانہ خلافت میں ہر شخص اپنی زمین وقف کر سکتا تھا چنانچہ:

i- اسلام میں سب سے پہلے واقف سیدنا عمرؓ ہیں جنہوں نے اپنا خیبر کا حصہ جو تقسیم کے وقت آپ کو ملا تھا، فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا۔ (بخاری ومسلم)

ii- سیدنا طلحہؓ نے اپنا محبوب ترین باغ اللہ کی راہ میں وقف کیا تھا۔ (بخاری)

iii- سیدنا عمرو بن العاصؓ نے مکہ اور مدینہ کے مکانات وقف کیے تھے۔

iv- سیدنا ارقمؓ نے اپنا وہ مکان وقف کر دیا تھا جس میں مدینہ پہنچنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایا تھا۔

v- سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا زبیرؓ نے اپنے مکہ کے مکان وقف کیے تھے۔

vi- سیدنا عمرؓ نے مکہ میں مردہ کے پاس اپنا ایک مکان وقف کیا تھا۔

وقف صحیح ہو جانے کے بعد واقف کو مالکانہ تصرف کا اختیار نہ رہتا تھا بلکہ اس کا انتظام ریاست کے ذمہ ہوتا تھا۔ موقوفہ زمین کے بارہ میں فرمان نبوت ہے:

﴿لا تباع ولا توهب ولا تورث﴾ (بخاری ومسلم)

''وہ زمین نہ بیچی جائے، نہ ہبہ کی جائے اور نہ اس میں وراثت جاری ہو۔''

2) صاحب زمین کو اپنی ضرورت اور مقصد کے پیش نظر زمین کو فروخت کرنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ ابو رافع صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے قطائع کو فروخت کر دیا تھا۔ (کتاب الخراج لابی یوسف:۶۱)

اسی طرح کئی صحابہ کرامؓ سے زمین خریدنا ثابت ہے جیسے سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ، سیدنا عتبہ بن فرقدؓ، سیدنا حسنؓ، سیدنا حسینؓ اور سیدنا خباب بن ارتؓ وغیرہ نے خراجی زمینیں خریدی تھیں اور حسب سابق وہ ٹیکس ادا کیا کرتے تھے۔ (الخراج لیحیی:۵۷)

اور ابوبکر جصاص رازیؒ کہتے ہیں:

﴿لا یکره للمسلم ان یشتری ارض خراج﴾

(احکام القرآن:۳/۱۲۷)

''مسلمان کے لیے خراجی زمین کے خریدنے میں کوئی کراہت نہیں۔''

زمین اور جائداد فروخت کرنے کی صورت میں ''حق شفعہ'' بھی مستحقین کو پہنچتا تھا۔ شفعہ دراصل ایک حق ہے جو جائداد غیر منقولہ کی بیع کے وقت شریک اور اگر شریک نہ ہو تو پڑوسی کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ شریک یا پڑوسی کو اطلاع دیئے بغیر اگر کوئی شخص جائداد غیر منقولہ فروخت کر دے تو معاملہ ہو جانے کے بعد انہیں بیع کو فسخ کرا کر خود خریدنے کا حق ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

''شریک کو اطلاع دیئے بغیر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا حلال نہیں ہے۔ اطلاع کے بعد شریک چاہے تو لے چاہے نہ لے۔ اور اگر کسی نے اطلاع دیئے بغیر فروخت کر دیا تو شریک کو اختیار ہے

Marfat.com

۔۔کہ بیع فسخ کر کے خود معاملہ کر لے۔" (مسلم ودارقطنی فی القضاء)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے پڑوسی کے بارہ میں فرمایا:

"پڑوسی زیادہ حق دار ہے اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کا انتظار کیا جائے۔" (نصب الرایہ للزیلعی: ۱۷۲/۳)

زمین کو ہبہ کرنا جائز ہے:

عہد نبوت اور زمانۂ خلافت میں جائداد غیر منقولہ زمین، مکان، کھیت، باغ وغیرہ کسی کو ہبہ کر دینا قانوناً درست اور صحیح مانا جاتا تھا۔ کلام عرب میں ہبہ کے لیے اس زمانہ میں کئی الفاظ مستعمل تھے۔ جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

(1) لفظ ہبہ کا استعمال دونوں قسم کی جائدادوں کے ہبہ کے لیے ہوتا تھا۔ یہی حال لفظ "منحہ" کا تھا، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿من كانت له ارض فليزرعها أو ليمنحها اخاه﴾

(مسلم، ابوداؤد)

"جس کے پاس زمین ہو وہ خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دے دے۔"

علامہ عینیؒ نے ابن بطالؒ کا قول نقل کیا ہے کہ "منحہ" کا لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کہ شئی کے منافع کا مالک بنایا جائے نہ کہ کسی کی ذات کا۔ (عمدۃ القاری: ۳۱۶/۶)

علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ فرماتے ہیں:

"منحہ" کے معنی ہیں کسی کو انتفاع کے لیے مفت زمین دے دینا۔

(فیض الباری: ۳۰۲/۳)

اس عہد میں امداد باہمی کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ کسی کو کاشت کے لیے مفت زمین دے دی جاتی تھی، اور کاشت کار اپنے اخراجات اور محنت سے کاشت کرتا تھا اس صورت میں پوری پیداوار کاشت کار کی ہوتی تھی اور زمین صاحب زمین ہی کی رہتی تھی اس مقصد کے لیے لفظ "عمریٰ" بھی اس زمانہ میں رائج تھا۔ اس کے بارے

Marfat.com

امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:

﴿العُمریٰ ھی العطیة الا ان معناھا راجع الیٰ تملیکه طول عمرہ﴾ (احکام القرآن:۳/۲۰۳)

''عمریٰ کی شکل عطیہ جیسی ہے، ایسا عطیہ کہ جس میں کسی شی کو پوری زندگی کے لیے مالک بنا دینے کے معنی پائے جاتے ہیں۔''

لفظ عمریٰ کے بارہ میں اہل زبان کا یہ محاورہ ہے:

﴿اعمر تک داری ھذہ یعنی ملکتک﴾

''جب اہل زبان کہتے ہیں ''اعمر تک داری ھذہ'' تو ان کا مطلب اس سے یہ ہوتا ہے کہ میں نے پوری زندگی کے لیے تجھ کو اس گھر کا مالک بنا دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمریٰ سے جس کو زمین وغیرہ دی گئی وہ اس کا مالک ہو گیا اور دینے والے کا دے دینے کے بعد پھر اس میں کوئی حق نہیں رہ جاتا تھا، اور واپسی کے سلسلہ کی جتنی شرطیں ہوتی تھیں وہ سب لغو قرار دی جاتی تھیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿من اعمر عُمریٰ له و لعقبه ترثھا من یرث من عقبه﴾

(ابوداؤد ونسائی)

''جس شخص کو عمریٰ دیا گیا، پس وہ اس کے لیے اور اس کے خاندان کے لیے ہے جس طرح وہ اور چیزوں کے وارث ہوتے ہیں اس کے بھی ہوں گے۔''

اور بخاری وغیرہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿العمریٰ لمن وھبت له﴾

(مسلم: ج ۲ باب العمریٰ، عینی ۶/۳۱۰، احکام القرآن، جصاص:۳/۲۰۳)

''عمریٰ اس شخص کا ہو جائے گا جس کو دیا گیا ہے۔''

اس زمانے میں بعض لوگ شرطیں کیا کرتے تھے کہ تیرے مرنے کے بعد یہ

زمین پھر میری ہو جائے گی یا اس قسم کی اور شرطیں کرتے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے عمریٰ کی شرطوں کو باطل قرار دے کر اصل ہبہ کو جائز اور باقی رکھا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عمدۃ القاری: ۳۱۱/۶، نووی شرح مسلم: ۳۸/۲)

عہد خلفاء میں لفظ ''رقبیٰ'' کے ساتھ بھی زمین اور جائداد کو بطور عطیہ دینے کا رواج پایا جاتا تھا، اس کی صورت یہ تھی کہ کوئی شخص کسی سے یہ کہتا کہ میں نے اپنا گھر یا زمین تجھ کو دے دیا اس شرط پر کہ اگر پہلے میں مرجاؤں تو یہ زمین یا گھر تیرے پاس ہی رہے گا اور اگر تو پہلے مرگیا تو یہ میرے پاس آجائے گا۔ تیرے ورثاء میں تقسیم نہیں ہوگا۔ رقبیٰ کے حکم کے بارہ میں امام نسائیؒ نے سیدنا ابن عباسؓ سے موقوفاً حدیث روایت کی ہے کہ:

﴿العمریٰ والرقبیٰ سواء﴾ (عمدۃ القاری: ۳۰۸/۶)

''عمریٰ اور رقبیٰ دونوں برابر ہیں یعنی ان دونوں کا حکم ایک ہے۔''

گذشتہ بحث کا خلاصہ یہ ہے اسلامی ریاست کی نظر میں ساری زمینیں اللہ تعالیٰ کی ملک ہوتی تھیں اور اسلامی ریاست کی نگرانی اور انتظام میں رہتی تھیں، اور کاشت کار اور صاحب زمین کی حیثیت ''امین'' کی ہوتی تھی، جب تک اس زمین سے مفاد عامہ کا مقصد پورا ہوتے رہتا ریاست کو بے دخل کرنے کی ضرورت پڑتی اور نہ صاحب زمین کے تصرفات واختیارات کے محدود کرنے کا سوال پیدا ہوتا اور جب یہ مقصد پامال ہونے لگتا اور مفاد عامہ کے فوت ہونے کا اندیشہ ہوتا تو کاشت کار اور زمین دار کو بے دخل کر دیا جاتا یا پھر اس کے تصرفات کو محدود کر دیا جاتا۔

........❖❖❖.........

بنجر زمینیں

بنجر زمینیں کیا ہوتی ہیں؟ اور عہد خلفاء میں کس قسم کی زمینیں بنجر سمجھی جاتی تھیں۔ احادیث اور فقہاء کے بیانات کے مطابق اس زمانہ میں مندرجہ ذیل زمینیں بنجر سمجھی جاتی تھیں۔

1) سخت پتھریلی یا ریتلی زمین۔
2) چٹیل میدان۔
3) خشک ٹیلے۔
4) وہ زمین جو جھاڑیوں، دلدلوں اور سیلابوں کی زندگی میں آ گئی ہو۔
5) ندیوں کا رخ تبدیل ہو جانے سے جو زمین نا قابل کاشت ہو گئی ہو۔
6) ترائی، جھیلیں اور اسی قسم کی وہ تمام زمینیں جن سے عدم صلاحیت کی وجہ سے انتفاع منقطع ہو گیا ہو۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج: ۶۳، قدوری: ۱۷۳، فتاویٰ عالمگیری: ۴/ ۱۶۷)

ایسی تمام زمینیں بنجر قرار دی جاتی تھیں اور خلافت اسلامیہ ان کو قابل کاشت بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ اس سلسلہ میں سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک گورنر کو خط میں لکھا:

> ”جس قدر خالصہ زمینیں ہوں ان سب کو لوگوں میں تقسیم کر دو اور پیداوار کی حیثیت کے مطابق جتنا ٹیکس وہ خلافت کو ادا کریں، ان کو منظور کر لو۔ اگر زمین زیادہ خراب ہو اور اس میں محنت اور اخراجات کی زیادہ ضرورت پڑے تو لوگوں میں مفت (یعنی بلا کسی قسم کے

Marfat.com

ٹیکس کے) تقسیم کر دو، اور اگر اس کے لیے بھی کوئی تیار نہ ہو تو سرکاری خزانہ کے اخراجات سے اس میں کاشت کراؤ (مگر زمین خالی نہ رہنے دو) (کتاب الخراج لیحییٰ: ۶۳) اس قسم کی تمام زمینوں کی آبادکاری کی مندرجہ ذیل شکلیں تھیں۔

(1) ایک شکل تو یہ تھی کہ خلافت اپنے مصارف سے ان کو آباد کراتی تھی جیسا کہ بن آدم قرشی نے لکھا ہے کہ:

''اسلامی ریاست اگر مناسب سمجھے تو سرکاری خزانہ کے صرفہ سے کسی کاشتکار کے ذریعہ اس میں کاشت کرائے۔'' (کتاب الخراج لیحییٰ: ۲۲)

اس صورت میں کاشت کار کو طے شدہ معاوضہ ملتا تھا اور پیداوار خلافت کی ہوتی تھی

(2) دوسری شکل یہ تھی کہ کاشتکار کو اپنی محنت اور اخراجات سے زمین کو آباد کرنے حق حاصل ہوگا، بیع یا ہبہ کرنے کے اختیارات حاصل نہ ہوں گے یعنی اس صورت میں انہیں صرف زمین کی منفعت کا مالک بنایا جاتا تھا اس کی ذات نہیں۔ اس بارہ میں فقہاء نے لکھا ہے:

''صدر ریاست کسی کو اس شرط پر بنجر زمین کے آباد کرنے کا حکم دے کہ آباد کرنے والا صرف زمین کے منافع کا مالک ہوگا اس کی ذات کا نہیں تو اس صورت میں آباد ہو جانے کے بعد وہ ذات کا مالک نہ ہو سکے گا۔'' (مختصر الطحاوی: ۱۳۳، فتاویٰ عالمگیری: ۴/ ۱۶۷)

(3) تیسری صورت یہ تھی کہ صدر ریاست کسی کو حق ملکیت دے کر آبادکاری کی اجازت دے۔ اس صورت میں آباد کرنے والے کو ہر قسم کے تصرفات اور جملہ حقوق حاصل ہوتے تھے جیسا کہ قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''آپ جو صورت مناسب سمجھیں اور جس میں فلاح اور بہبودی ہو، اس میں آپ کو بالکلیہ اختیار ہے۔ مناسب ہو تو کسی کو قطیعہ دے دیجئے یا اجرت دے کر اجیر سے کاشت کرائیے۔''

Marfat.com

بہر حال بنجر زمینوں کی آبادکاری کی جو بھی صورت ہوتی کبھی تو خلیفہ کی عام اجازت ہوتی اور کبھی اجازت لینا ضروری سمجھا جاتا تھا، کیونکہ زمین دراصل خلافت کی ہوتی ہے، اس لیے آبادکاری کے لیے آخری فیصلہ خلافت ہی کا سمجھا جانا مناسب بھی تھا۔ امام زیلعیؒ نے طبرانی کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے۔

﴿ليس للمرء الا ما طابت به نفس امامه﴾ (نصب الرایہ:۴/۲۹۰)

''آدمی کے لیے وہی کچھ ہے جس پر خلیفہ خوش ہو۔''

فقہاء نے لکھا ہے:

﴿ولايملكه الا بتمليك الامام﴾ (مختصر الطحاوی:۱۳۴)

''بغیر صدر ریاست (امام) کے مالک بنانے کے بغیر اس کا مالک نہیں ہوگا۔''

چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احیاء موات یعنی بنجر زمین پر قبضہ کرنے سے قبل ریاست کی باقاعدہ اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کی رائے کی تائید میں امام طحاویؒ اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک بھی ریاست سے اجازت لینا ضروری ہے۔ (فتح القدیر لابن ہمام:۸/۱۳۶، مختصر الطحاوی:۱۳۴)

اجازت طلبی ضروری قرار دینے کا ایک اہم فائدہ یہ ہوگا کہ متعدد افراد کے ایک ہی قطعۂ زمین پر قبضہ کی خواہش سے جھگڑے رونما ہونے کا امکان باقی نہ رہے گا۔ (کتاب الخراج:۶۷) لیکن امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ جمہور فقہاء اس رائے کو درست نہیں سمجھتے۔ (بدائع الصنائع:۶/۱۹۵) ان کے نزدیک اگر دوسری شرطیں پوری ہو رہی ہوں تو شریعت اسلامی کی نگاہ میں افراد کو آپ سے آپ قبضہ کا حق حاصل ہے۔ ریاست سے باقاعدہ اجازت حاصل کرنا ضروری قرار دینے کے لیے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔

بہر حال یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے لیکن اس میں موقف حضرت امام ابوحنیفہؒ کا زیادہ مضبوط ہے اور حالات و واقعات بھی اس موقف کی تائید کرتے ہیں، ایک اسلامی ریاست کا مقصد غیر مزروعہ اراضی کو قابل کاشت بنانا ہوتا تھا تاکہ حقوق عامہ اور عام مفاد

Marfat.com

جو زمین سے متعلق ہیں وہ پامال نہ ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا تھا جب کہ زمین پر کاشت کی جاتی اور اسی کو علت ملک قرار دیا جاتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں یہی روح کام کر رہی ہے:

''زمین بھی اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ جو شخص بنجر زمین کو آباد کرے گا وہ اسی کی ہوگی۔'' (ابوداؤد)

بہرحال اسلام کے معاشی نظام کا یہ بھی ایک اہم حصہ ہے کہ ملک کی تمام بنجر زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا جائے اور خام پیداوار سے ملک کو مالا مال کیا جائے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے زمینوں کو بنجر نہ رہنے دیا جائے، فقہاء نے اس کے دو طریقے لکھے ہیں ایک یہ کہ صدر ریاست ملک کے لوگوں کو ترغیب دے کہ جو شخص ان زمینوں کے جس قدر حصہ کو آباد کرے گا وہ اس کا مالک قرار دیا جائے گا۔ اور اگر امام یہ سمجھ کر کہ زمین بہت زیادہ محنت اور خرچ کے بعد قابل کاشت ہو سکتی ہے، ایک دو سال کا لگان بھی معاف کر دے تو وہ ایسا کرنے کا مجاز ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿من عمر ارضاً ليست لاحد فهو احق بها﴾

(بخاری، مسند احمد ۶/۱۲۰)

''جس شخص نے ایسی زمین کو قابل کاشت بنایا جو کسی کی ملک نہیں ہے تو وہ شخص ہی اس کی ملکیت کا مستحق ہے۔''

ایک اور روایت میں ہے:

﴿من احياء ارضاً مواتاً فهي له﴾

(کتاب الخراج: ۶۴ مسند احمد ۳/ ۳۳۸، ۳۸۱)

''جس شخص نے کسی بنجر زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی زمین ہے۔''

بعض فقہاء نے اس کی تین شرطیں لکھی ہیں:

1- ایک یہ کہ وہ زمین فناء شہر میں شامل نہ ہو یعنی عام شہری ضروریات میں کام آتی ہو۔ (کتاب الخراج: ۶۲-۶۳)

2- دوسری شرط یہ ہے کہ اگر صدر ریاست کی اجازت کے بعد تین سال تک اس کو

Marfat.com

آباد نہ کیا بلکہ بنجر ہی رہنے دیا تو وہ زمین اس کے قبضہ سے نکال لی جائے گی۔ اور کسی دوسرے شخص کو دے دی جائے گی۔ (کتاب الخراج: ۶۵)

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ زمین کنویں، تالاب اور چشمہ کی حریم ہو۔

(کتاب الخراج: ۱۰۰)

بنجر زمینوں کے آباد اور قابل کاشت بنانے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ریاست خود اپنی نگرانی میں کاشت کرائے اور وہ حکومت ہی کی ملکیت رہیں۔

سیدنا عمرؓ نے زراعت کی ترقی کے لیے یہ عام حکم دے دیا کہ تمام ممالک میں جہاں جہاں افتادہ زمینیں ہیں، جو شخص ان کو آباد کرے گا وہ اس کی ملکیت ہو جائیں گی، لیکن اگر کوئی شخص ان کو آباد کرنے کی غرض سے اپنے قبضہ میں لائے اور اسے تین برس کے اندر آباد نہ کرے تو زمین اس کے قبضہ سے نکل جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام زمینیں جو عرصہ دراز سے بنجر پڑی ہوئی تھیں، زمیندار لوگ ان پر قبضہ کر کے ان کے مالک بن گئے اور تین سال کے عرصہ میں وہ زرخیز اور غلہ پیدا کرنے والی ہو گئیں جس سے ملک کی زراعت کو بہت ترقی ہوئی۔

Marfat.com

قدرتی پیداوار والی زمینیں

اسلامی ریاست کے صدر کا یہ فرض ہے کہ وہ حتیٰ الوسع تمام مخلوق کا خیال ر
کیونکہ خلافت الٰہی میں اللہ کی صفات منعکس ہوتی ہیں۔ سربراہ مملکت عام انسانوں
لیے کاشت اور زراعت کا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہے اور اس کے ساتھ جانوروں
لیے ان کے گھاس اور چارہ کا انتظام کرنے کا بھی وہ ذمہ دار ہے۔ اسی لیے عہد خلفاء
چراگاہوں کا مسئلہ خاص توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے سیدنا عمرؓ فرمایا کرتے تھے:

"اگر فرات کے کنارے بھوک کی وجہ سے ایک کتا بھی مر جائے گا
تو قیامت کے روز اس کے متعلق عمرؓ سے باز پرس ہوگی۔"

اسلام نے اس دنیا میں آ کر اعلان کر دیا کہ وہ تمام چیزیں جن کی پیدائش
کارآمد بنانے میں کسی کی محنت اور قابلیت کو دخل نہیں ہے، اس میں تمام انسان برابر
شریک ہیں۔ چنانچہ عہد خلافت میں اس قسم کی وہ تمام چیزیں جن میں کسی کی محنت
قابلیت کو دخل نہ ہوتا تھا وہ نہ کسی فرد خاص کی ملکیت ہوتی تھیں اور نہ ان کے استع
کرنے میں کسی کو حق اولویت حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ ارشاد نبوت ہے:

﴿لا حمیٰ الا للہ ولرسولہ﴾ (بخاری، ابوداؤد)

"حمیٰ (چراگاہ) صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔"

حمیٰ زمین کے ان قطعات کو کہتے ہیں جو گھاس، چارہ اگنے کے لیے
جانوروں کے چرنے کے لیے خالی چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور ان پر کاشت نہیں کی جاتی
اسی طرح زمانہ خلافت میں جنگلات بھی کسی کے لیے مخصوص نہ ہوتے
بلکہ ان میں تمام لوگ برابر کے شریک سمجھے جاتے تھے اور ہر شخص اپنی ضرورت کے مطا

Marfat.com

ان میں سے لکڑیاں وغیرہ لے جاتا تھا۔

یہی حال ان تمام زمینوں کا تھا جو قدرتی پیداوار کا معدن ہوتی تھیں اور جن کو کارآمد بنانے کے لیے کسی کی محنت اور عمل کو دخل نہ ہوتا تھا جیسے نمک کی جھیلیں، تیل کے چشمے وغیرہ۔ ان سب کا انتظام ریاست کے ذمہ ہوتا تھا اور وہی حسب حاجت و مصلحت انتفاع کی شکلیں متعین کرتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل یہ دستور تھا کہ حکومت زمینداروں کو اجازت دے دیتی تھی کہ سرکاری افتادہ مگر شاداب اور سبزہ زار زمینوں کو معمولی ٹیکس کے ذریعہ یا بغیر کسی ٹیکس کے حمیٰ (چراگاہیں) بنالیں اور ان کی حد بندی کر کے ان کے درختوں اور گھاس وغیرہ سے بہت زیادہ فائدہ اٹھائیں اور چوپایوں کی افزائش نسل کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہیں۔ اس دستور سے اکثر عوام اور غریب کاشتکاروں کے لیے مصیبت نازل ہوتی رہتی اور وہ اپنے مویشیوں کے لیے چارہ سے محروم رہتے۔ اسلام نے اس ظالمانہ دستور کو روک دیا اور کہا کہ مویشیوں کے لیے چراگاہ کی حد بندی جائز نہیں ہے، اور یہ صرف ایک اسلامی ریاست کا حق ہے کہ جہاد اور صدقات کے مویشیوں کے لیے چراگاہ محدود کر دے۔ چنانچہ اس بارہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی لکھا ہے:

> ”میں کہتا ہوں جب حمیٰ کا دستور اور طریقہ لوگوں کی ضروریات میں دشواری کا باعث اور ان کے مفاد عامہ پر ظلم اور باعث نقصان تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو ناجائز قرار دے دیا۔“
>
> (حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۱۰۴)

سیدنا عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں یہ اعلان فرما دیا کہ اگر بارش کی قلت یا کسی اور وجہ سے خودرو گھاس کی کمی ہو اور ریاست کے عوام کے مویشی چارہ سے محروم ہو جائیں تو اس صورت میں سرکاری چراگاہ مفاد عامہ کے لیے کھول دی جائے۔ چنانچہ زید بن اسلمؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت سیدنا عمرؓ کے پاس موجود تھا جب انہوں نے اپنے آزاد کردہ غلام ”ھنی“ کو سرکاری چراگاہ پر نگران مقرر فرمایا، تو آپ فرمانے لگے:

''اے ہُنی! خبردار اپنے بازوؤں کو لوگوں سے سمیٹے رکھ اور مظلوم کی بددعا سے بچتا رہ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے۔ تو میری اس قائم کردہ چراگاہ میں بکریوں اور دیگر چوپایوں کے ریوڑ والوں کو اجازت دے کہ وہ چراگاہ میں اپنے ریوڑ چرا سکیں، اور عثمان بن عفانؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے چوپایوں کی پروانہ کر اس لیے کہ اگر ان کے چوپائے ہلاک بھی ہوجائیں تو وہ مدینہ میں اپنے کھجوروں کے باغ اور زمین کی کاشت سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اور اگر ان چرواہوں کے چوپائے مر گئے تو یہ مسکین چیختے چلاتے آئیں گے اور امیرالمومنین! امیرالمومنین کہہ کہہ کر امداد طلب کریں گے، اس لیے بیت المال کی رقم پر بوجھ ڈالنے سے میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ ان کو چراگاہ کے گھاس پانی سے فائدہ اٹھانے کی اجازت رہے۔'' (کتاب الخراج: ۱۰۵)

اسلامی دور سے قبل ایک دستور یہ بھی تھا کہ بڑے بڑے زمیندار خودرو گھاس، تالاب اور کھیتوں کا پانی اور خودرو درختوں کی خشک لکڑی پر بھی بلاشرکت غیرے قبضہ جمائے رکھتے تھے اور اپنی زمین کی ملکیت کے دعویٰ سے دوسروں کو اس سے فائدہ نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ یہ بھی عوام اور غرباء کے لیے ایک ظالمانہ دستور تھا۔ اسلام نے اس قبضہ کی بھی مخالفت کی اور مویشیوں کے اس چارہ کے علاوہ جن کو غلہ کی طرح بیج ڈال کر اور محنت کر کے بویا جاتا ہے، مفاد عامہ کے پیش نظر سب کے لیے عام کر دیا اور کسی کو اس کی ذاتی ملکیت کا حق نہیں بخشا مگر یہ کہ محنت سے حاصل کر کے اپنی ملکیت میں لے آئے جیسے ایک گھسیارہ گھاس کاٹ کر اپنی ملکیت میں کر لیتا ہے، یا سقہ اپنی مشک میں پانی بھر کر اس کا مالک ہوجاتا ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿لاتمنعوا فضل الماء لتمنعوا به فضل الكلاء﴾ (مسلم)

''ضرورت سے بچے ہوئے پانی سے لوگوں کو اس لیے نہ روک دیا کرو کہ اس بہانہ سے تم کو فاضل گھاس سے روکنے کا موقع مل جائے۔''

Marfat.com

اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ:

﴿المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار﴾

(ابوداؤد)

''تمام مسلمان پانی، گھاس اور سوختہ میں برابر کے شریک ہیں۔''

اور بعض روایات میں نمک کا اضافہ بھی ہے۔ اور بعض روایات میں ایسا کرنے والے پر قیامت کے روز خدا کا غضب نازل ہونے کی وعید بھی آئی ہے۔

امام ابوعبیدؒ فرماتے ہیں کہ ''میرے نزدیک یہ حکم اس زمین کے بارہ میں ہے جو کسی شخص کی مملوکہ ہو اور اس میں بیان کردہ جاری چشمہ کی طرح کا پانی ہو یا بغیر تخم ریزی کیے اور کھیتی کیے خودرو گھاس اگی ہوئی ہو۔'' (کتاب الاموال: ۳۰۰)

اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:

''اگر کسی بستی کے لوگوں کے بارہ میں یہ معلوم ہو کہ ان کی چراگاہیں جن میں وہ اپنے مویشی چراتے اور ان سے سوختہ حاصل کرتے ہیں، ان کی ذاتی ملک ہیں تو وہ ذاتی ملک ہی رہیں گی اور ان کو اس کے فروخت کرنے، خریدنے، اور ترمیم و تنسیخ کرنے کا حق حاصل ہے اور ان میں ان کی وراثت بھی جاری رہے گی، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ وہ چراگاہ کی خودرو گھاس اور اس کے پانی سے دوسروں کو روکیں، اور چرواہوں اور ریوڑ والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بغیر کسی روک ٹوک کے ان چراگاہوں میں اپنے مویشی چرائیں اور ان کو پانی پلائیں۔''

(کتاب الخراج: ۱۰۲، ردالمختار: ۵/ ۳۸۸)

مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چراگاہیں حکومت کی ملکیت نہ ہوں اور افتادہ زمینوں کی قدرتی چراگاہیں نہ بھی ہوں بلکہ وہ زمینداروں کی ذاتی ملکیت ہوں تب بھی ان کو خودرو گھاس اور پانی سے دوسروں کو فائدہ اٹھانے سے روکنے کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ ان دونوں چیزوں میں تمام افراد برابر کے شریک ہیں۔

اس سلسلہ میں اسلام نے باہمی تعاون کے بارہ ایک اصول بیان کیا ہے جو صرف لین دین کے معاملات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر اس شعبہ میں ایک گراں قدر اصول ثابت ہوتا ہے جو باہمی تعاون اور داشتراک عمل کا محتاج ہے۔ چنانچہ اس اصول کو سرکار دو عالم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿لا ضرر ولا ضرار﴾ (مسند احمد ا/۳۱۳)

"(یعنی زندگی کے تمام معاملات میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ) نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ کسی کو نقصان پہنچانا ہے۔"

اگر ہر شخص ہر معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کا بیان کردہ یہ گران قدر اصول پیش نظر رکھ لے کہ نہ مجھ کو نقصان اٹھانا چاہیے اور نہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہیے تو اسلام کے معاشی نظام میں کئی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

(1) اگر کوئی زمین پانی میں غرق ہو جانے، سیم اور تھوہر کی وجہ سے یا خشک سالی پیش آجانے کی وجہ سے قابل کاشت نہ رہے یا کسی آفت وغیرہ سے کھیتی تباہ ہو جائے تو اس سال کا خراج، مالیہ وغیرہ معاف ہے۔ اگر کسی آفت سے نقصان پہنچا ہے تو بقدر نقصان معافی ہو گی۔ اس معاملہ میں مالی، لگان اور بٹائی کا یکساں حکم ہے۔ (بحر الرائق: ۵/۱۱۷)

(2) اگر کاشت کار نے حکومت یا زمیندار سے زمین کو بٹائی (اجارہ) پر لیا ہے تو اس صورت میں بھی مالیہ اور لگان قطعاً معاف ہے۔ اگر کھیتی کو کوئی نقصان پہنچا ہے تو بقدر نقصان معاف ہو گا۔ اور اگر زمین کو نقد لگان (کراء الارض) پر لیا ہے تو اکثر فقہائے اسلام کے نزدیک اس صورت میں بھی لگان یا مال گزاری معاف ہے۔

لگان اور مالیہ وغیرہ کی معافی یا کمی کا یہ حکم اس صورت میں ہے کہ زمین اور کھیتی پر آئی ہوئی تباہی کاشت کار کے اختیار سے باہر ہو یعنی قدرتی ہو، اور اگر یہ تباہی اور خرابی کاشت کار اپنے ہاتھوں سے لایا ہے یا جان بوجھ کر غفلت برتی گئی ہے تو پھر کمی یا معافی نہیں ہو سکتی، وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ صاحب زمین کو نقصان پہنچانا ہے اور "ضرار" میں داخل ہے۔

Marfat.com

(۳) اگر کاشتکار زمین کا خود مالک نہیں ہے اور حکومت اور کاشت کار کے مابین زمیندار کا بھی دخل ہے تو سرکاری مالیہ (عشر یا خراج) اصولاً زمیندار کے ذمہ ہے نہ کہ کاشت کار کے ذمہ۔ اور مزارعت میں اگر بیج مالک زمین کا ہے تو ''عشر'' اسی پر واجب ہوگا اور اگر کاشت کار کے ذمہ بیج ڈالنا ہے تو دونوں پر حصہ رسدی واجب ہوگا۔ (ملاحظہ ہو، بحرالرائق: ۵/ ۱۱۷، ردالمختار شامی: ۲/ ۷۶)

معلوم ہوا کہ اسلام میں معاشی نظام میں سرمایہ (زمین) اور محنت میں عادلانہ توازن بخوبی رکھا گیا ہے اور محنت کو سرمایہ کے مقابلہ میں نفع کا زیادہ حق دیا گیا ہے۔

(۴) اگر زمین حکومت اور سرکار کی ہے اور کاشت کار مقررہ لگان ادا کر رہا ہے تو اس کو زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس نے اپنی معاشی زندگی کے لیے اس زمین کو کرایہ پر حاصل کیا ہے تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ جب تک وہ زمین کا واجبی لگان ادا کرتا رہے اس کا یہ معاشی ذریعہ اس سے نہ چھینا جائے۔ (ردالمختار: ۳/ ۳۵۵)

اس طرح کے اور کئی مسائل ''لاضرر ولا ضرار'' کے اصول کے تحت فقہاء نے اپنی کتابوں میں نقل کیے ہیں جن کو تطویل کی وجہ سے نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

زراعت اور باغبانی

ہماری غذا کا انحصار زراعت اور باغبانی پر ہے۔ اس کے بغیر نہ زندگی کا کوئی
عقدہ حل ہوسکتا ہے اور نہ اقتصادی ترقی وغیرہ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے کیوں
خام پیداوار کے بغیر نہ تجارت چلتی ہے اور نہ ہی صنعت وحرفت کو فروغ دیا جا سکتا ہے
قرآن حکیم نے اسی لیے زراعت و باغبانی کی ترغیب دی ہے بلکہ قرآن حکیم کی نظر میں
ان دونوں کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں کہیں اللہ کی قدرت کی
نشانیوں پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے اس میں اکثر و بیشتر یہی نظام پیش کیا گیا ہے
کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کارفرمائیوں اور جلوہ گریوں کو آسانی کے ساتھ مشاہدہ کر۔
کے لیے جتنا ذخیرہ اس نظام میں موجود ہے اتنا ذخیرہ شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے۔
نظام ایک طرف تو سائنٹیفک تحقیقات کے لیے بے شمار دفینے اپنے اندر مخفی رکھتا ہے اور
تحقیق کرنے والے کو آئے دن مختلف چیزوں پر غور وفکر کے لیے نظر واعتبار کے مختلف پہ
دیتا ہے، اور دوسری طرف ہر شخص کے لیے یہ بات بصیرت و بصارت کا سرمایہ ہے
زمین سے جتنی نباتات اگتی ہیں، ان سب کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا گیا ہے اور ہر
اپنی نوعیت، کمیت اور کیفیت میں ایک نپی تلی حالت رکھتی ہے۔ طرح طرح کے غلے ہیں
رنگ رنگ کے پھل پھول ہیں اور ان گنت قسموں کے درخت اور سبزیاں ہیں جو اپنی شکل
وصورت میں، رنگت اور خوشبو میں، مزہ اور خاصیت میں غرض کہ ہر حیثیت سے ا
ٹھہرائے ہوئے اندازہ سے بنائی گئی ہیں اور مخصوص سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہیں اور ہر اعتبار
سے نہایت معتدل اور مناسب ہیں۔

ان چیزوں کو دیکھ کر ایک خدا پرست اور مومن انسان کہتا ہے کہ یہ سب

Marfat.com

خالق اور قادر مطلق کی گل کاریوں اور حسن افروزیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ سب کچھ بغیر کسی موجد کے موجود ہوا اور بغیر کسی خالق کے وجود میں آئے۔ انسان کی فطرت کبھی اس کو یقین کرنے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔ وہ ضرور اس بات کو ماننے پر مجبور ہو گی کہ یہ سب مناظر قدرت کی ہماہمی اور کارخانہ خلقت کی ہنگامہ آرائی اور کسی مافوق الطبعی ہستی کی کرشمہ سازی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی مختلف آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے بلکہ وہ کسی مافوق الفطرت ہستی کے موجود ہونے پر مستقل دلیل بھی ہیں:

﴿فلینظر الانسان الیٰ طعامه، انا صببنا الماء صبا، ثم شققنا الارض شقاً وفاکهةً واباً، متاعاً لکم ولانعامکم﴾

(عبس:۳۲)

''انسان اپنی غذا پر نگاہ ڈالے، ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں، پھر اس کی سطح شق کر دیتے ہیں، پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں، اناج کے دانے، انگور کی بیلیں، کھجور کے خوشے، سبزی ترکاری، زیتون کا تیل، درختوں کے جھنڈ، قسم قسم کے میوے، طرح طرح کے چارے اور یہ سب کچھ تمہارے فائدے کے لیے اور تمہارے جانوروں کے لیے۔''

اس قسم کی بے شمار آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں جن میں زراعت اور باغبانی کا نظام پیش کر کے قدرت کی کارفرمائیوں اور جلوہ آرائیوں پر مستحکم دلائل قائم کیے گئے ہیں۔ انسان دنیا کی تمام چیزوں سے نظریں ہٹا کر غفلت و سرشاری میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن ایک دانا و بینا انسان اپنی زندگی کو باقی رکھنے والی غذا سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ غلہ کا ایک دانہ جو اپنی پیدائش سے لے کر پختگی اور کار آمد بننے تک مختلف احوال وظروف سے گزرتا ہے۔ جب تک اس کو غذا کے قابل بنانے کے لیے ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ پورا نظام سرگرم عمل نہیں ہو جاتا انسان کی غذا بننے کی صلاحیت اس میں نہیں پیدا ہوتی ہے۔ یہی حال دنیا کی ہر شی کا ہے۔ جب تک اس کی پرورش اور تکمیل تک پہنچانے

Marfat.com

کے لیے ایک خاص نظم کے تحت مسلسل جدوجہد نہیں کی جاتی اس میں کارآمد اور مفید بننے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح دنیا میں ہر شی کی پرورش اور اس کو کارآمد بنانے کے لیے ایک نظام موجود ہے جس کے تحت ہر شی کی مناسب انداز سے تربیت ہوتی رہتی ہے، تو کیا اس نظام کا چلانے والا کوئی موجود نہیں۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ نظم موجود ہو مگر کوئی ناظم موجود نہ ہو، قیام موجود ہو مگر کوئی قیوم موجود نہ ہو۔ انسان جب اس پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کا وجدان پکار اٹھتا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ قرآن نے انسان کے سامنے حقیقت کو عیاں کیا اور اس کو اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود سے آشنا کیا وگرنہ اس قسم کے لوگ اس وقت بھی اور اب بھی دنیا میں موجود ہیں جو ایک ایسی دنیا کا سفر کر رہے ہیں جس میں دور سے ریت کو دیکھ کر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ پانی ہے۔

زراعت اور باغبانی کی اسی اہمیت کے پیش نظر سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو مسلمان درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس سے چرندے، پرندے اور انسان اپنی غذا حاصل کرتے ہیں تو یہ سب اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے یعنی اس کو اجر وثواب ملتا ہے۔'' (مسلم و بخاری)

اس سے معلوم ہوا اور گذشتہ صفحات میں بتایا بھی جا چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کاشت کار کو کاشت کرنے پر ثواب ملتا ہے خواہ اس کی نیت ثواب حاصل کرنے کی ہو یا نہ ہو۔ وجہ اس کی علماء نے یہ لکھی ہے کہ زراعت کرنے سے ہر صورت میں خلق خدا کو فائدہ پہنچتا ہے خواہ کاشتکار فائدہ پہنچانا چاہے یا نہ چاہے۔ کیونکہ اسلام کی نظر میں اصلی نیکی مخلوق خدا کو فائدہ پہنچانا ہے۔ جس کام سے مخلوق خدا کو جتنا فائدہ ہوگا اس کا کرنے والا اتنا ہی زیادہ اجر وثواب کا مستحق ٹھہرے گا۔ علامہ بدرالدین عینیؒ اور دوسرے علماء نے بھی یہی لکھا ہے۔ (عمدۃ القاری: ۵/۷۱۱)

ایک اور حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس قدر کھیتی سے کھایا گیا وہ صدقہ ہے۔ جس قدر چوری ہو گیا وہ صدقہ ہے۔ جس قدر چرندوں نے کھا لیا وہ صدقہ ہے۔ جس

قدر پرندوں نے کھالیا وہ صدقہ ہے۔غرض کہ جس طرح بھی کمی ہوگئی
وہ سب درخت لگانے والے اور کاشت کار کے لیے صدقہ ہے۔

(مسلم:۲/۱۵)

پ ﷺ نے درخت کے بارہ میں بھی ارشاد فرمایا:

''جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے اور اس کا پھل کوئی انسان، چوپایہ اور پرندہ کھالیتا ہے، وہ سب درخت لگانے والے کے لیے قیامت کے روز تک کے لیے صدقہ (جاریہ) ہو جاتا ہے۔

(بخاری، مسلم کتاب المزارعہ)

حدیث کے بارہ میں علامہ عینیؒ نے لکھا ہے کہ:

''درخت اور کھیتی کی موجودگی میں اس لیے ثواب ملتا ہے کہ خلق خدا اس سے مستفید ہوتی ہے، اور کھیتی اور درخت نہ رہنے کے بعد ان لوگوں کی وجہ سے ثواب ملتا ہے جن کی تربیت اور نشوونما میں اس پھل اور غلہ کو دخل رہا ہے۔اس کے بعد ان لوگوں کی وجہ سے ثواب ملتا ہے جن کی پرورش اور نشوونما میں پہلے لوگوں کا حصہ رہا ہے۔ یہی شکل سلسلہ بہ سلسلہ قیامت تک چلی جاتی ہے۔''

(عمدۃ القاری:۵/۱۲۷)

سرکار دو عالم ﷺ نے زراعت کی بہت اہمیت اور فضیلت بیان فرمائی ہے لیکن ایک حدیث میں سیدنا ابو امامہ باہلیؓ نے ایک موقع پر ہل اور کچھ آلات زراعت دیکھ کر کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سنی ہے:

﴿لایدخل هذا البیت قوم الا ادخله الله الذل﴾

''جس گھر میں یہ آلات داخل ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اس میں ذلت و رسوائی داخل کر دیتا ہے۔''

اس حدیث میں زراعت کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔اس حدیث کی محدثین نے مختلف توجیہیں کی ہیں لیکن الفاظ حدیث کے مطابق یہ توجیہ ہے کہ اس سے رسول اللہ

Marfat.com

ﷺ کا مقصد زراعت سے روکنا یا اس کی اہمیت کو کم کرنا نہیں تھا بلکہ آپ کا اصل مقصد یہ بتانا تھا کہ جو قوم زراعت کو اپنی زندگی کا اصل مقصد بنا لیتی ہے اور بیلوں کی دُموں کے پیچھے پھرنا، اس کی زندگی کا ماحصل ہو جاتا ہے تو اس صورت میں یہ زراعت اس کے لیے بڑی ذلت ورسوائی کا سبب بن سکتی ہے۔

مدینہ طیبہ کے انصار چونکہ زراعت پیشہ لوگ تھے اس لیے آپ نے ذلت رسوائی کو زراعت کے ساتھ مخصوص فرمایا ورنہ یہی حال تجارت اور ملازمت وغیرہ کا بھی ہوتا ہے جب کہ اس میں مشغولیت اپنی حد سے گزر جاتی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جب انسان اپنے اصلی مقصد کو چھوڑ کر صرف ذرائع اور وسائل کو مقصد بنا لیتا ہے اور اسی کے لیے جدوجہد کرنا اس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے تو یہ حالت اس کے لیے ایک بڑے خطرے کا باعث اور ''الارم'' ہوتی ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ؎

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے غازی

ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید رحمت الٰہی کو عام کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا ہے۔ زراعت، تجارت، ملازمت اور زندگی کے دوسرے تمام کام کاج وغیرہ سب اس مقصد تک پہنچانے کے لیے وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ذرائع میں اس قدر گم ہو جائے کہ مقصد کے لیے وقت نہ ملے یا مقصد اہمیت میں نمبر دو ہو جائے، تو یہ ایک مسلمان کی زندگی کے لیے تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کو ایک اور مثال سے سمجھئے کہ مدارس اسلامی اور اسلامی جماعتیں ایک مقصد حاصل کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہوتی ہیں لیکن اگر یہ مدارس اور جماعتیں خود مقصد بن جائیں تو انسان شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد گلدستۂ طاق نسیان بن جاتا ہے۔ اس بات کو سرکار دو عالم ﷺ نے ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿اذا ضن الناس بالدينار والدرهم، وتبايعوا بالعينة، واتبعوا اذناب البقر، وتركوا الجهاد في سبيل الله،

انزل الله لهم بلاء فلا یرفعه حتی یراجعوا دینهم﴾

(ابوداؤد، مسند احمد)

''جب لوگ درہم و دینار (یعنی مال و دولت) کی محبت میں پھنس جائیں اور بیعانہ پر سودا کرنے لگیں اور کھیتی کے جانور اور دیگر کاروبار میں اس طرح دل لگالیں کہ وہی چیزیں مقصد حیات بن جائیں، اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا ترک کردیں تو اللہ تعالیٰ ان پر مصیبتیں اتارے گا اور وہ اس وقت تک دور نہ ہوں گی جب تک وہ (اپنا طریق فکر و عمل) تبدیل کر کے اپنے دین کے کاموں میں مضبوطی کے ساتھ نہ لگ جائیں۔''

اس حدیث میں بیعانہ سے مراد یہ ہے کہ ایک مرتبہ کوئی شی ادھار خریدی جائے پھر تھوڑی دیر بعد اسی شی پر نقد معاملہ کیا جائے اور یہ نقد معاملہ پہلی قیمت سے کم قیمت ہو۔ (نصب الرایہ زیلعی: ۴/۱۶)

ایک روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لاتتخذوا الضیعة ترغبوا فی الدنیا﴾

(احکام القرآن: ۳/ ۱۲۷، الخراج لیحییٰ: ۲۸)

''تم لوگ زمینیں نہ لو ورنہ پھر دنیا ہی کے ہو کر رہ جاؤ گے۔''

یہ تھی بنیادی روح اس حدیث کے پیچھے جو سیدنا ابو امامہ باہلیؓ سے مروی ہے کہ مسلمان کہیں وسائل ہی کو مقاصد نہ سمجھ لیں، اور پھر دین کے ''ذروۃ سنام'' جہاد کو چھوڑ کر زمیندار اور جاگیردار بن کر نہ رہ جائیں۔ اس لیے فرمایا کہ یہ آلات زراعت جس گھر میں داخل ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اس میں ذلت و رسوائی داخل کر دیتا ہے۔'' اسی وجہ سے سیدنا عمرؓ نے مسلمانوں کو زمین جائداد رکھنے اور کاشت کاری کرنے سے قانوناً منع فرما دیا تھا جیسا کہ علامہ طنطاوی جوہری نے لکھا ہے

''سیدنا عمرؓ کی خواہش تھی کہ خلافت کا مرکز مدینہ ہی میں رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ خواہش قوت و طاقت اور مدافعت کی ہمت

Marfat.com

کے بغیر پوری نہ ہوسکتی تھی، اس لیے آپ نے مسلمانوں کو زراعت سے روک دیا تھا تاکہ ان چیزوں میں ان کی مشغولیت مقصد سے باز رکھنے کا سبب نہ بن جائے۔'' (نظام العالم والامم:۲/۲۰۱)

یہ سبب مسلمانوں کو زراعت سے روکنے کا علامہ طنطاویؒ نے یہ بیان کیا کہ حدیث کی وجہ سے، اور دوسرا سبب اور وجہ یہ فرمائی

﴿لان الاشتغال بالزرع یشغلھم عن الحرب﴾

(نظام العالم والامم:۲/۲۰۱)

''اس لیے کہ زراعت میں مشغولیت رحمت الٰہی کو عام کرنے (جہاد) سے باز رکھے گی۔''

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ زراعت اور باغبانی کی احادیث میں ... فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے، لیکن اس میں ہمہ تن مشغول ہو جانا اور جہاد اور ... جہاد سے یک قلم غافل ہو جانا شریعت اس چیز کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ... معیشت میں کئی لحاظ سے زراعت کا درجہ افضل ہے جیسا کہ علامہ سرخسیؒ نے ... :۲۳/۱۰۲ پر لکھا ہے۔ اور بعض علماء کا قول ہے کہ زراعت فی نفسہ شرکت کے ساتھ ... شرکت ہو، فرض کفایہ ہے کیونکہ انسان اور حیوان سب ہی کے لیے زراعت کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

﴿والاکثر ان الزراعة افضل﴾ (فتاویٰ عالمگیری:۴/۱۴۲)

اکثر علماء کی یہ رائے ہے کہ زراعت سب سے زیادہ افضل ہے۔

علاء بدر الدین عینیؒ نے اس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال کے ... بیان ... مطابقت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا:

''جب افضلیت کا مدار افادیت کی وجہ سے ہے تو لوگوں کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لحاظ سے افضلیت میں اختلاف ہوگا۔ جہاں لوگوں کے لیے خام اجناس کی زیادہ ضرورت ہوگی وہاں زراعت زیادہ افضل ہوگی، اور جہاں کسی وجہ سے تجارت کی زیادہ ضرورت ہوگی

وہاں تجارت افضل ہوگی اور جہاں صنعت و حرفت کی زیادہ ضرورت ہوگی وہاں کے لیے صنعت و حرفت زیادہ افضل ہوگی (وحیث كانوا محتاجين الىٰ الصنائع اشد كانت الصناعة وهذا احسن) مطابقت کی یہی شکل زیادہ بہتر ہے۔''

(عمدۃ القاری:۱۲/۵)

........❖❖❖........

Marfat.com

مزارعت

مزارعت کا لفظ ''زرع'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے بیج ڈالنا، جب کہ اصطلاح میں اس سے مراد ہے ''زرعی زمین کا مالک اپنی زمین کسی دوسرے فرد کو اس زمین کی پیداوار میں ایک متعین نسبت سے حصہ دار ہونے کی شرط پر کاشت کے لیے دے۔''

مزارعت کے لیے دوسری اصطلاح ''مخابرت'' بھی استعمال ہوتی ہے، البتہ بعض علماء ان دونوں میں فرق کرتے ہیں کہ اگر بیج زمین کے مالک کی طرف سے ہو تو یہ مزارعت معاملہ ہے، اور اگر بیج کاشت کار خود ڈالے تو یہ مخابرت ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور اصطلاح ''مساقات'' ہے۔ مساقات اور مزارعت میں فرق یہ ہے کہ مزارعت عام زمین پر معاملہ ہوتا ہے اور ''مساقات'' انہی شرائط پر باغات کے سلسلہ میں معاملہ کرنے کو کہتے ہیں۔

مزارعت کی تعریف:

مزارعت سے مراد وہ عقد ہے جو زمین کی پیداوار کے کچھ حصہ پر زمین کی زراعت کے لیے کیا جائے۔ (الہدایہ)

جب ایک شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی خالی زمین اس شرط پر دے کہ وہ زمین کاشت کرے گا، پھر جو کچھ اللہ تعالیٰ اس سے پیدا کرے گا اس میں سے اس کاشت کرنے والے کو ایک حصہ ملے گا، تو اس معاملہ کا نام ''محاقلہ''، ''مخابرہ'' یا ''مزارعہ'' ہے۔ (امام شافعیؒ)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ مزارعت کے معنی مشترکہ طور پر کھیتی کرنا یعنی کسی کو بٹائی پر زمین دینا۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

﴿فهي عبارة عن عقد الزراعة ببعض الخارج﴾

(فتاویٰ عالمگیری: ۵۶/۴)

Marfat.com

''زمین کی پیداوار کے کچھ حصہ کے بدلہ میں کھیتی کا معاملہ کرنا مزارعت کہلاتا ہے۔''

عہد نبوی اور زمانہ خلافت راشدہ میں اس اشتراک کی دو صورتیں رائج تھیں۔

(1) اسلامی ریاست کاشت کاروں کو زمین دے کر کاشت کراتی تھی اور وہ طے شدہ معاملہ کے مطابق فصل کا ایک حصہ مقرر کر کے ریاست کو دیا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہی معاملہ اہل خیبر کے ساتھ کیا تھا اور وہ پیداوار کا نصف حصہ اسلامی ریاست کو دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمرؓ نے بھی اس معاملہ کو باقی اور جاری رکھا لیکن جب اہل خیبر وہاں سے زمین چھوڑ کر چلے گئے تو پھر سیدنا عمرؓ نے وہ زمین دوسروں میں تقسیم کر دی تھی۔ اسی طرح سیدنا عمرؓ نے یمن کے گورنر یعلی بن امیہ کو ایک فرمان دیا کہ یمن کے علاقہ کی خالی زمینیں لوگوں کو کاشت کے لیے دے دو۔ اگر وہ آلات زراعت اور تخم فراہم کر کے کاشت کرنا چاہیں تو نصف بٹائی پر معاملہ کرلو اور اگر یہ سب عمر (یعنی ریاست) کو دینا پڑے اور ان کی صرف محنت ہو تو اس صورت میں ریاست کو پیداوار کی دو تہائی ملے گی اور ان کو ایک تہائی۔''

(شرح معانی الآثار، باب الزارعت)

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اپنے گورنروں کو مزارعت کے بارہ میں یہ فرمان دیا تھا:

''تمہاری طرف جو زمینیں خالی اور بیکار پڑی ہیں ان سب کو کاشت کاروں میں تقسیم کر دو، اور پیداوار کے نصف حصہ پر ان سے معاملہ کرلو۔ اگر وہ لوگ اس پر راضی نہ ہوں تو پیداوار کا جتنا حصہ دینے پر وہ راضی ہو جائیں اتنے ہی پر معاملہ کرلو حتیٰ کہ اگر دسواں حصہ بھی ریاست کو دینے پر راضی ہوں تو اسے بھی تسلیم کر کے انہیں زمین دے دو۔ اور اگر اس پر بھی وہ تیار نہ ہوں تو ان میں مفت زمین تقسیم کر دو۔ اور اگر وہ مفت لینے پر بھی آمادہ نہ ہوں تو سرکاری خزانہ کے اخراجات سے زمین پر کاشت کراؤ لیکن کسی صورت میں

Marfat.com

زمین بیکار نہ رہنے دو اور نہ ہی کسی سے زبردستی کوئی زمین چھینو۔"

(کتاب الخراج لیحییٰ بن آدم: ۱۳۷)

(2) مزارعت کی دوسری صورت امداد باہمی کی تھی یعنی زمین کا مالک جب کسی معقول وجہ سے خود زمین کاشت نہ کر سکتا ہو تو وہ کسی دوسرے شخص سے بٹائی پر معاملہ کر لیتا تھا جیسا کہ سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا سعد بن مالک، سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے سیدنا حسنؒ، سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ، سیدنا عروہ بن زبیرؒ، سیدنا حاتمؒ، آل ابوبکرؓ، آل عمرؓ، آل علیؓ، محمد بن سیرینؒ اور عبدالرحمٰن بن یزیدؒ وغیرہ سے بٹائی پر زمین دینا ثابت ہے۔ امام بخاریؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

﴿ما بالمدينة اهل بيت هجرة الا يزرعون على الثلث والربع﴾ (بخاری: ۱/۱۲)

مزارعت کی اس دوسری صورت میں دو باتیں قابل غور ہیں۔

(1) مزارعت کی اجازت کن لوگوں کو تھی؟

(2) اور کس حالت میں تھی؟

پیشتر اس کے کہ ان دونوں باتوں کو واضح کیا جائے اسلام کی دو بنیادی حقیقتوں کو جان لینا ضروری ہے۔

(1) ایک اسلامی ریاست میں زمین اور ہر شی کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور انسان ایک "امین" کی حیثیت سے اس کے استعمال پر مامور ہے۔

(2) زمین ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لیے کسی کے پاس نہیں رکھی جاتی تھی بلکہ پیداوار حاصل کرنے اور مفاد عامہ کے لیے مفید ثابت ہونے والے ہی اس کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ لہٰذا اب دیکھنا ضروری ہے کہ عہد خلافت میں مزارعین کون ہوتے تھے اور کس حالت میں وہ زمین دوسروں کو کاشت کے لیے دیا کرتے تھے؟ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر و بیشتر دوسروں سے کاشت کرانے والے وہی ہوتے تھے جن کے ذمہ مفاد عامہ کی کو

Marfat.com

خدمت سپرد ہوتی تھی اور اسی حالت میں وہ دوسروں کو کاشت کے لیے زمینیں دیا کرتے تھے کیوں کہ وہ اس ڈیوٹی کی وجہ سے یا کسی اور خاص وجہ سے خود کاشت کرنے سے معذور ہوتے تھے۔

دوسرے زمانہ خلافت میں نہ کسی کو بیکار رہنے دیا جاتا تھا اور نہ کسی کو دوسرے کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا تھا۔

اسلامی ریاست نے مفاد عامہ کے پیش نظر اس دوسری صورت کو ترجیح دی اور جہاں اس کا انتظام نہ ہوسکتا تھا وہ خود اپنے اخراجات سے کاشت کا انتظام کراتی تھی۔

زمانۂ خلافت میں مزارعت کی شکل ایسی نہ تھی جس میں صاحب زمین اور کاشت کار دونوں میں سے کسی کی حق تلفی ہوتی ہو۔اس کی حیثیت بالکل تجارت میں شرکت جیسی تھی اور دونوں کو مساوی حیثیت حاصل تھی۔اس لیے وہ تمام صحابہ کرامؓ اور خود رسالتمآب ﷺ کے نزدیک جائز تھی، لیکن اسلام میں تمام وہ صورتیں ناجائز قرار دی گئیں تھیں جن میں کسی کی حق تلفی ہوتی یا باہمی نزاع کا اندیشہ ہوتا یا دونوں میں سے کسی کو کسی حیثیت سے معاملات میں فوقیت اور برتری حاصل ہوتی۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:

﴿وهو عندي جائز علىٰ ما اشترطا عليه علىٰ ماجاء ت به الآثار﴾ (کتاب الخراج:۹۱)

"میرے نزدیک مزارعت ان شرطوں کے ساتھ جائز ہے جو آثار (احادیث) سے ثابت ہیں۔"

اور آثار و احادیث میں انہی شرطوں سے ممانعت آئی ہے جس میں کسی طرف کی حق تلفی ہوتی یا باہمی نزاع کا اندیشہ ہوتا۔جن احادیث میں مزارعت کی ممانعت آئی ہے محدثین نے ان کے قریباً یہی جواب دیئے ہیں۔اور فقہاء کے نزدیک مزارعت میں اجارہ اور شرکت دونوں پائے جاتے ہیں۔جس وقت معاملہ کیا جاتا ہے اس کی حیثیت اس وقت اجارہ کی ہوتی ہے اور بعد میں اس کی حیثیت شرکت کی ہو جاتی ہے۔(عالمگیری)

اگر غور سے دیکھا جائے تو مزارعت ایک قسم کا معاہدہ ہوتا ہے جس کی رو سے

Marfat.com

کاشت کار زمین کو بٹائی پر لیتا ہے اور صاحب زمین کاشت کار کی محنت کا معاوضہ غلہ کی صورت میں ادا کرتا ہے اور کاشت کار صاحب زمین کی زمین کا کرایہ غلہ کی صورت میں دیتا ہے گویا کہ یہ باہمی تعاون وتشارک اور ہمدردی وغم خواری کی ایک بہترین شکل ہے۔ اگر یہ صورت نہ پائی جائے بلکہ کاشت کار کی مجبوری اور بے بسی صاحب زمین کی دولت میں اضافہ کا سبب بنے یا دونوں میں سے کسی جانب سے بددیانتی اور خیانت کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اسلام مزارعت کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

''مزارعت کی ان شکلوں سے منع کر دینا ہی مناسب ہے جو کاشت کاروں کو ان کی محنت کے پھل سے محروم کر دیں اور صاحب زمین کو کاشت کار کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کریں۔

(عالمگیری:۴/۸۷)

انہی تمام اندیشوں کے پیش نظر سرکار دو عالم ﷺ نے مفت زمین دینے کی ترغیب دی تھی کہ اس کا معاوضہ نہ کرایہ کی شکل میں وصول کیا جائے اور نہ بٹائی کی شکل میں۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

﴿من كانت له ارض فليزرعها أو ليمنحها اخاه﴾

(مسلم،ابوداؤد)

''جس شخص کے پاس زمین ہو وہ خود اس میں زراعت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دے دے۔''

لیکن اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ صاحب زمین کے پاس اس کی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے کوئی اور ذریعۂ آمدنی نہ ہو یا زمین بے کاشت پڑی رہنے کا اندیشہ ہو تو بٹائی کی صورت میں یا کرایہ کی صورت میں زمین کا کچھ معاوضہ لینے کی اجازت تھی۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

﴿لان يمنع اخاه ارضه خير من أن ياخذ عليه اجراً معلوماً﴾

(بخاری:۲/۳۳)

''اگر اپنے بھائی کو مفت زمین نہ دے سکنے اور روک رکھنے سے زیادہ

Marfat.com

بہتر یہ ہے کہ مقررہ کرایہ (یعنی بٹائی وغیرہ) پر اس کو دے دے۔"

مختصر یہ کہ عہد خلافت راشدہ میں مزارعت سے یہ مقصد ہرگز نہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس طرح مفت خوروں کا ایک مخصوص طبقہ پیدا ہو کر جسم انسانیت کے لیے سرطان اور ناسور ثابت ہو بلکہ اس کا مقصد باہمی تعاون اور تشارک سے ملکی پیداوار کو بڑھانا اور ملکی معیشت کو مضبوط اور مستحکم کرنا ہے۔ اسی لیے مزارعت کے بارہ میں مسلم، کافر، حربی، ذمی، دارالاسلام اور دارالحرب سب برابر ہوتے تھے۔ (ملاحظہ کتاب الخراج لابی یوسف:۹۱)

احادیث کی کتابوں میں بے شمار احادیث ایسی ملتی ہیں جن سے مزارعت کے جواز کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ، سیدنا عبداللہ بن عباسؓ اور سیدنا انس بن مالکؓ کی روایات کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا اور اس کا کچھ حصہ صلح سے اور کچھ حصہ بزور شمشیر فتح کیا۔ آدھے علاقے کو حکومت کی ضروریات کے لیے مخصوص کیا اور آدھے حصے کو اٹھارہ سو حصوں میں تقسیم کر کے پندرہ سو مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ (بارہ سو پیادوں کا اکہرا حصہ اور تین سو سواروں کا دوہرا حصہ) اس موقع پر یہودیوں نے درخواست کی کہ انہیں ان زمینوں سے بے دخل نہ کیا جائے اور انہیں ان زمینوں پر کاشت کاری کی اجازت دے دی جائے۔ آدھی پیداوار آپ لے لیں اور بقیہ آدھی ہمیں دے دیں۔ آپ ﷺ نے اس کو منظور فرما لیا۔ بٹائی کے اس معاہدے کی رو سے جو نصف پیداوار آتی، اس کو حکومت اور حصہ داران میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہ معاملہ سیدنا عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور تک رہا۔ بعد میں یہودیوں کی شرارتوں کی بنا پر انہیں جزیرۂ عرب سے نکال دیا گیا اور اس طرح یہودیوں سے یہ معاہدہ بٹائی ختم ہو گیا۔"

(بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ)

اس حدیث میں یہودیوں کے ساتھ سیدھا سیدھا بٹائی (مزارعت) کا معاملہ تھا۔

سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو انصار نے آ کر عرض کیا کہ آپ ہمارے نخلستانوں کو ہمارے درمیان اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم کر دیں، لیکن آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر

انصار نے مہاجرین سے کہا: ''آپ لوگ ہماری طرف سے ان نخلستانوں میں کام کریں اور ہم آپ کو ثمرہ (پھل) میں شریک کریں گے۔ اس پر مہاجرین نے کہا:

''یہ بات ہمیں بخوشی منظور ہے۔'' (بخاری)

قیس بن سلیم سیدنا باقر بن علی بن حسینؓ سے روایت کرتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جو تہائی یا چوتھائی حصہ پیداوار کے عوض کاشت نہ کرتا ہو۔'' امام بخاریؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس کی تائید میں مزید مثالیں دی ہیں کہ بٹائی پر معاملہ سیدنا علیؓ نے کیا، سیدنا سعد بن مالکؓ اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ، آل عمرؓ سب بٹائی پر کاشت کراتے تھے۔ سیدنا عمرؓ لوگوں سے اس طرح کا معاملہ کیا کرتے تھے کہ اگر عمرؓ (ریاست) اپنے پاس سے بیج دے گا تو آدھی پیداوار لے گا اور اگر کاشتکار اپنا بیج لائیں گے تو ان کا اتنا حصہ ہوگا۔ (بخاری)

ان احادیث کے علاوہ اور بھی کئی احادیث ایسی ہیں جن سے مزارعت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں عقلی دلائل سے بھی مزارعت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

(1) اگر مزارعت شریعت میں ممنوع اور ناجائز ہو تو زمین کے مالک بوڑھے، بیمار، معذور، عورتیں اور بچے وغیرہ اپنی زمینوں سے نہ اپنی روزی حاصل کرسکیں اور نہ ان سے مالی استفادہ اٹھا سکیں۔

(2) اسلامی قانون وراثت میں ایک طرف تو میراث تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرتی ہے اور دوسری طرف اس کے نتیجہ میں ایک شخص کے پاس بہت سے عزیزوں سے وراثت کے نتیجہ میں زمین جمع بھی ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں مالک زمین کے لیے افادہ حاصل کرنے کا جائز ذریعہ مزارعت ہی ہے۔

(3) اسلامی قانون کے مطابق ایک شخص اپنے جائز مال سے جائز اشیاء کی جتنی مقدار خرید وفروخت کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ یہی معاملہ زمین کا ہے، اس لیے قانون زراعت میں مزارعت کو ممنوع کر کے قانون بیع وشراء سے حاصل کردہ اشیاء کا استفادہ کرنے کا راستہ ایک شخص کے لیے مسدود اور بند نہیں ہونا چاہیے۔

(4) اسلام نے جائز ذرائع سے حاصل کردہ کسی شی کی ملکیت کی حد پر کوئی پابندی

Marfat.com

نہیں لگائی، لیکن زراعت پر یہ اطلاق کس لیے؟ یہ تو ہے عام قانون۔ البتہ بعض حالات میں اسلامی ریاست زمین کی زیادہ سے زیادہ ملکیت کے لیے مقدار کی ایک حد عارضی طور پر مقرر کر سکتی ہے۔

(5) جس طرح اسلام نے تجارت، صنعت وحرفت اور دوسرے کاروبار کے لیے شراکت اور مضاربت کے اصول پر معاملہ کرنے کی اجازت دی ہے، مزارعت بھی اسی طرح کا ایک معاملہ ہے اور مضاربت سے ملتا جلتا ہے، اس لیے مضاربت جائز ہے تو یہ بھی جائز ہونا چاہیے۔

مزارعت کے جواز میں شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ کی تحقیق بھی مزارعت کے جواز میں ہے چنانچہ وہ اپنی کتاب بدوہ البازغہ میں لکھتے ہیں:

> "لوگوں میں خلقی طور پر مساوات نہیں ہے۔ ان کی طبیعتوں میں اختلاف ہے، صلاحیتوں اور استعدادوں میں فرق ہے، اس لیے صالح سوسائٹی کے قیام کے لیے افراد میں باہمی تعاون اور غم خواری کا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے کیونکہ ہر شخص اپنی ضرورتوں کے رفع کرنے کے لیے دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایک شی کسی کے پاس موجود ہوتی ہے لیکن اسے کارآمد بنانے کے لیے دوسرے شخص کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً زمین کسی کے پاس ہوتی ہے لیکن جوتنے اور بونے کا سامان اس کے پاس نہیں ہوتا، یا سامان ہوتے ہوئے بھی صاحب زمین کو کاشت کاری کرنے کی طاقت اور ہمت نہیں ہوتی۔ یہی حال اموال منقولہ کا ہوتا ہے کہ رأس المال کسی کے پاس موجود ہے لیکن تجارت کرنے کی فرصت اس کو نہیں ملتی یا تجارت کرنے میں مشقت برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہوتی، یا وہ شخص اس سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کو ناپسند کرتا ہے، اس لیے

Marfat.com

باہمی تعاون اور دوسرے کو مال دے کر اس کو نفع میں شریک کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔" (البدور البازغہ: ۷۰)

مؤطا امام مالک کی شرح مصفّٰی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اس چیز کو ایک فتویٰ کی شکل دیتے ہوئے لکھا ہے:

میل فقیر دریں مسئلہ بمذہب امام احمد از جواز ہر دو (مصفّٰی)

یعنی فقیر کا میلان اس مسئلہ میں امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب کی طرف ہے اور اس کے جواز کا ہے۔ (ہر دو سے مراد مخابرت اور مزارعت ہے۔)

مزارعت کی ممانعت کی بحث:

مزارعت کے جواز اور عدم جواز کے بارہ میں فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ فقہاء مزارعت کو مضاربت کی طرح کا معاملہ قرار دے کر اسے جائز قرار دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ، امام زفرؒ اور کچھ دوسرے فقہاء مزارعت کے عدم جواز کے قائل ہیں۔ اس معاملہ کو ناجائز اور غلط قرار دینے والے فقہاء مختلف صحابہ کرامؓ سے منقول احادیث کی بنا پر اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے تین احادیث تین صحابہ کرامؓ سے یوں ہیں:

1- سیدنا رافع بن خدیجؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں زراعت کے لیے زمین لیتے تھے اور تہائی، چوتھائی اور ایک خاص مقدار غلہ کرایہ کے طور پر مقرر کرتے تھے۔ ایک روز میرے چچاؤں میں سے ایک آئے اور انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ایک ایسے کام سے روک دیا ہے جو ہمارے لیے نفع بخش تھا، مگر ہمارے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تابعداری زیادہ نفع بخش ہے۔ آپ ﷺ نے ہم کو اس بات سے منع کر دیا کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں اور تہائی اور چوتھائی اور مقررہ مقدار غلہ کے عوض انہیں کرایہ پر دیں۔ اور آپ ﷺ نے حکم فرمایا

Marfat.com

ہے کہ مالک زمین یا تو خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کرنے کے لیے دے دے، اور آپ ﷺ نے زمین کے کرایہ کو اور اس کے سوا دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے۔ (مسلم)

سیدنا رافع ؓ خود اپنا قصہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ اپنی کھیتی کو پانی دے رہے تھے۔ وہاں سے سرکار دو عالم ﷺ کا گذر ہوا۔ آپ نے پوچھا: ''یہ کس کی کھیتی ہے؟'' اور کس کی زمین ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: ''میری کھیتی ہے، اس میں تخم (بیج) اور عمل میرا ہے۔ آدھی پیداوار میری ہوگی اور آدھی بنی فلاں کی۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم نے سودی معاملہ کیا، زمین اس کے مالکوں کو واپس کر دو اور اپنا خرچ ان سے وصول کرلو۔'' (ابوداؤد)

سیدنا جابر بن عبداللہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کے پاس فاضل زمین ہو اسے چاہیے کہ یا خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو دیدے، لیکن اگر وہ نہ دینا چاہے تو پھر اپنی زمین روک رکھے۔'' دوسری روایت میں ہے: ''اسے چاہیے کہ ہبہ کر دے یا عاریۃً دیدے۔'' ایک دوسری روایت میں ہے: ''اس کو اجرت پر نہ دے۔'' ایک اور روایت میں ہے کہ: ''اس کو کرایہ پر نہ دے۔'' (مسلم، بخاری، ابن ماجہ)

اس سلسلہ میں ایک روایت سیدنا ثابت بن ضحاک ؓ سے مروی ہے جس میں مزارعت کے عدم جواز کو بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ممانعت کی جو روایات سیدنا زید بن ثابت، سیدنا ابوسعید خدری ؓ اور سیدنا ابوہریرہ ؓ وغیرہ سے مروی ہیں وہ انہی تینوں کی تائید وتوثیق کرتی ہیں۔

بہرحال اس سلسلہ کی جس قدر روایات ہیں ان کی تحقیق وتفصیل کے لیے ''زاد المعاذ'' لابن قیم ؒ اور ''شرح معانی الآثار'' کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ان کتابوں میں اس بارہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ ممانعت کی احادیث کے بارہ میں بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی قدس سرہ نے بھی ان تمام روایات پر اپنے ایک مضمون میں بڑی مدلل اور نفیس بحث کی ہے۔

Marfat.com

اس بارہ میں اجمالی طور پر یوں سمجھ لینا چاہیے کہ زمانۂ خلافت میں زمین کو بٹائی اور کرایہ دونوں پر دینے کی مختلف صورتیں رائج تھیں، ان میں سے بعض ایسی تھیں جو دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مفت خوروں کا طبقہ پیدا کرنے کا سبب بنتی تھیں اور بعض ایسی تھیں جن میں کاشت کاروں کی حق تلفی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مزارعت کے معاملہ میں بہت سی ایسی شرطیں رائج تھیں جن کا نتیجہ باہمی نزاع اور فساد کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ ان میں سے چند صورتیں حسب ذیل تھیں:

1- معاملہ کرتے وقت زمین کے کسی حصہ کی پیداوار متعین کر دیا کرتے تھے کہ اس حصہ میں جو کچھ پیدا ہو گا وہ زمین کے مالک کو ملے گا اور بقیہ حصہ کی پیداوار کاشت کار کو ملے گی۔ اگر اس مقررہ حصہ میں اتفاقاً پیداوار کم ہوتی یا کسی وجہ سے بالکل نہ ہوتی تو باہمی نزاع اور قتل وقتال تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کاشتکار کے حصہ پر مالک زمین زبردستی قبضہ کر لیا کرتا تھا۔

2- پیداوار کا کچھ حصہ مستثنیٰ کر کے بقیہ پر معاملہ کیا جاتا تھا، مثلاً جو کچھ پیدا ہوا اس سے دو من نکال کر بقیہ پیداوار میں صاحب زمین اور کاشت کار دونوں شریک ہوں گے۔ اس صورت میں کاشت کار کی حق تلفی ہوتی تھی کیونکہ دو من غلہ پہلے ہی مالک زمین کو مل جاتا تھا اور بعد میں حسب معاملہ دونوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ فرض کیجیے کہ کھیت میں کل تین من غلہ پیدا ہوا اور نصف نصف پر معاملہ طے ہوا تھا تو اس صورت میں کاشتکار کو صرف نصف من غلہ ملے گا۔ اور صاحب زمین کے حصہ میں اڑھائی من غلہ چلا جائے گا۔ دو من شرط کے مطابق اور نصف من معاملہ مزارعت کے مطابق۔

3- تیسری صورت اس زمانے میں یہ ہوا کرتی تھی کہ اس زمانہ میں لوگ اس طرح پر معاملہ کیا کرتے تھے کہ نہر اور نالیوں کے پاس کی پیداوار زمین کے مالک کی ہو گی اور بقیہ پیداوار کاشتکار کی ہو گی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ جس جگہ سے پانی ہو کر گزرتا وہاں کی پیداوار دوسری جگہوں کے مقابلہ میں زیادہ اچھی ہوتی اس صورت میں کاشت کار کی حق تلفی کا اندیشہ تھا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ

مقام کی پیداوار زیادہ پانی ہو جانے کی وجہ سے گل سڑ جاتی تھی۔ اس صورت میں مالک زمین کی حق تلفی کا سوال تھا۔

اس موقع پر خوبی کی بات یہ ہے کہ ان تینوں صورتوں کے روایت کرنے والے حضرات بھی ہیں جن کی روایات مزارعت سے ممانعت کے بارہ میں مروی ہیں۔ جیسا بخاری میں رافع بن خدیجؓ سے منقول یہ روایت ہے کہ:

"ہم لوگ (اہل مدینہ) زیادہ کھیتی باڑی کرنے والے تھے اور اس شرط پر زمین کو کرایہ پر دیتے تھے کہ کھیت کے اس حصہ کی پیداوار اس کی ہوگی اور اس حصہ کی پیداوار اس کی ہوگی۔ بسا اوقات ایک حصہ میں فصل ہوتی تھی اور دوسرے حصہ میں نہیں ہوتی تھی، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اس سے منع فرما دیا۔"

(بخاری: باب ما یکرہ من الشروط فی المزارعہ)

سیدنا رافع بن خدیجؓ سے اور بھی کئی روایات مروی ہیں جن کو امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے اور وہ سب قریباً اس کی تائید کرتی ہیں۔

مسلم میں سیدنا جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ:

"ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تہائی اور چوتھائی اور نالیوں کے اوپر کی پیداوار کی شرط پر زمینیں لیا کرتے تھے۔"

(مسلم: ج ۲ باب کراء الارض)

ان کے علاوہ کئی اور صحابہ کرامؓ کی روایات بھی ان تینوں خرابیوں کی تائید کرتی ہیں۔ ابن جوزیؒ نے بھی مزارعت کی بحث کے سلسلہ میں ان وجوہات کو بیان کیا ہے۔

(نصب الرایہ: ۴/۱۸۱)

بہر حال یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ زمانہ خلافت میں کئی ایسی خرابیاں موجود تھیں جو باہمی نزاع اور حق تلفی پر مبنی ہوتی تھیں، اس لیے سرکار دو عالم ﷺ نے مزارعت کی ان تمام صورتوں سے منع فرما دیا جن میں مذکورہ قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں، ورنہ مطلقاً عام طور پر امداد باہمی کی اس شکل سے لوگوں کو منع کر دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

Marfat.com

اور اگر ممانعت کی حدیثوں کو مزارعت کی تمام جائز و ناجائز شکلوں کے عام کیا جائے تو اس صورت میں یہ ممانعت درجۂ عزیمت حاصل کرنے کے لیے مشورہ ہو گی۔ اس کو قانونی اور حقیقی شکل حاصل نہ ہو گی، یعنی رسول اللہ ﷺ کا ممانعت سے مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں مفت زمین دینے کا رواج ہو تا کہ ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کے جذبہ کو تقویت پہنچے جیسا کہ حدیث میں سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ کا یہ قول منقول ہے:

﴿قاله تحريضاً للناس على الاحسان﴾ (ابن ماجہ باب المزارعۃ)

"رسول اللہ ﷺ کا ممانعت سے مقصد صرف احسان کی طرف رغبت دلانا تھا۔"

اور سیدنا ابن عباسؓ کی ایک اور روایت میں ہے کہ

"رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے حقیقتاً منع نہیں کیا تھا بلکہ آپ نے اس بات کی طرف رغبت دلائی تھی کہ اپنے بھائی کو مفت زمین دے دینا یہ اس بات سے بہتر ہے کہ زمین کا کچھ مقررہ کرایہ لیا جائے۔" (بخاری و مسلم باب کراء الارض)

انہی اقوال کی روشنی میں قاضی ابو یوسف اور دوسرے تمام فقہاء ممانعت کی حدیثوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کو زیادہ قابل اعتبار نہیں سمجھتے اور مزارعت کے جواز کی حدیثوں پر عمل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانہ نبوت و خلافت میں مزارعت کی بالکلیہ ممانعت ثابت نہیں ہوتی بلکہ خاص انہی صورتوں سے منع کیا گیا ہے جن میں کسی کی حق تلفی کا اندیشہ ہوتا یا کوئی ایسی شرط لگائی جاتی جس میں باہمی نزاع کا خطرہ ہوتا اور باہمی نزاع کو اسلام کسی صورت پسند نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کو نقصان پہنچانے اور نقصان کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

مزارعت سے ممانعت والی حدیث کی تحقیق:

مزارعت کے موضوع پر تمام احادیث کے بغور مطالعہ سے یہ بات واضح

کہ رسول اللہ ﷺ نے مزارعت کو مطلقاً نہیں بلکہ اس کی چند صورتوں سے منع فرمایا
۔اس موضوع پر تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو سربراہِ مملکت تھے،
کی اس دنیوی زندگی میں مزارعت کا معاملہ ہوتا رہا اور ایک حدیث کے مطابق (جو
گزر چکی ہے) مدینہ میں مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جو مزارعت کا معاملہ نہ کرتا
اگر آپ اس مزارعت کو ناپسندیدہ قرار دیتے تو اس معاملہ کو کبھی رائج نہ رہنے دیتے۔
طرح مزارعت کا معاملہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی جاری وساری رہا۔انہوں
بھی اس کو نہ روکا۔سیدنا رافعؓ نے جب مزارعت کے عدم جواز کی احادیث بیان کیں تو
وقت سیدنا معاویہؓ کی خلافت کا آخری زمانہ (یعنی قریباً ۵۰ھ یا اس کے بعد کا زمانہ تھا)
کہ سیدنا نافعؒ کے بقول سیدنا عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمینیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
نہ میں اور آپؐ کے بعد سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ اور سیدنا عثمانؓ کے زمانہ میں برابر کرایہ پر
تے رہے۔سنہ ۵۰ھ کے بعد ان تک یہ حدیث پہنچی تو انہوں نے یہ معاملہ روک دیا۔

بخاری اور مسلم کی روایت کے مطابق سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: ''مجھے
م ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں زمینیں کرایہ پر دی جاتی تھیں، مگر سیدنا
اللہ بن عمرؓ نے اس ڈر سے کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا ہو اور
اس کا علم نہ ہوا ہو، اپنی زمینیں کرایہ پر دینی بند کر دیں۔'' (بخاری ومسلم)

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ چونکہ زندگی کے آخری ایام میں بہت زیادہ محتاط ہو گئے
۔اس لیے انہوں نے یہ کہنے کے باوجود کہ ''رافع نے ہم کو ہماری زمین کے نفع سے
وم کر دیا۔'' (مسلم) مزارعت کے معاملہ کو روک دیا۔چونکہ انہوں نے احتیاط کی بناء پر
کیا تھا، اس لیے حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔

امام ترمذیؒ اور امام طحاویؒ نے تصریح کی ہے کہ رافع بن خدیجؓ کی حدیث میں
طراب ہے۔(بخاری: ۱/۳۱۵) چنانچہ عمرو بن دینار سے روایت ہے کہ انہوں نے سیدنا
فعؓ کی حدیث کو طاؤس کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے کہا: کہ دوسرے کو مزارعت پر
ے سکتا ہے کیونکہ ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا
یہ فرمایا ہے کہ کوئی اپنے بھائی کو زمین زراعت کے لیے (ویسے ہی) دے دے یہ اس

Marfat.com

سے بہتر ہے کہ اس سے کچھ حصہ مقررہ لے۔ اس سے زیادہ تصریح ترمذی کی روایت ہے کہ طاؤسؒ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے مزارعت کو حرام نہیں بلکہ ایک کو دوسرے کے ساتھ ہمدردی کا امر فرمایا۔ ترمذی نے کہا: ''یہ حدیث حسن صحیح اور رافع کی حدیث میں اضطراب ہے۔ عینی نے ایسا ہی نقل کیا ہے۔ (حاشیہ بخاری: ۱/

جس کو اس حدیث کے الفاظ کا اضطراب دیکھنا ہو وہ جمع الفوائد: ۱/ طرف مراجعت کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے الفاظ کس قدر مختلف ہیں۔ میں ہے کہ سیدنا رافع بن خدیجؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے دو چچاؤں نے بیان وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں زمین اجارہ پر دیا کرتے تھے، اس پیداوار کے عوض پانی کی نالیوں سے متصل پیدا ہو یا اور کسی حصہ کی پیداوار کے عوض جس کو مالک مخصوص کر دیتا، اور ہم کو رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا۔ حنظلہ (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے رافعؓ سے کہا کہ ''دینار و درہم کے عوض اجارہ پر د ہے؟'' رافعؓ نے فرمایا: ''دینار و درہم کے عوض اجارہ پر دینے میں مضائقہ نہیں۔ لی سعد فرماتے ہیں کہ غالباً مزارعت کی جس صورت سے منع کیا گیا تو وہ ایسی ہی ہے میں حلال وحرام کے سمجھنے والے غور کریں تو اس کو جائز نہیں کہیں گے کیونکہ اس میں معاملہ خطرہ سے خالی نہیں۔ (بخاری: ۱/۳۱۵)

اور ظاہر ہے کہ مزارعت کی اس صورت کو کسی نے بھی جائز نہیں کہا۔

علاوہ اس اضطراب کے اس حدیث میں یہ علت بھی ہے کہ یہ ''شاذ لما تعم به البادی'' کی قبیل سے ہے کہ جس معاملہ میں ابتلاء عام تھا اس کے بارے ایک ہی شخص روایت کر رہا ہے۔ چنانچہ بخاری ہی میں ہے:

''نافع سے روایت ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ اپنے کھیت اجارہ پر دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ کے زمانہ میں اور سیدنا معاویہؓ کی خلافت کے اوائل میں بھی یہاں تک کہ (خلافت معاویہؓ کے آخری زمانہ میں) ان سے کہا گیا کہ رافع بن خدیجؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

Marfat.com

نے اس سے منع فرمایا ہے تو وہ سیدنا رافعؓ کے پاس گئے اور میں بھی ساتھ گیا، اور ان سے یہ مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کے اجارہ سے منع فرمایا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اپنے کھیتوں کو اس پیداوار کے عوض کرایہ پر دیا کرتے تھے جو پانی کی نالیوں کے متصل پیدا ہو اور کچھ بھوسہ کے عوض۔

علامہ عینیؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ رافعؓ نے مطلقاً زمین کے اجارہ کی جو ممانعت بیان کی تھی، ابن عمرؓ نے اس سے انکار کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جس اجارہ سے منع فرمایا ہے وہ وہ اجارہ ہے جس میں کہ شرط فاسد ہو، وہ یہ کہ لوگ نالیوں کے پاس والی پیداوار کی شرط کرتے تھے اور کچھ بھوسہ کی جس کی مقدار مجہول ہوتی تھی، اور بعض دفعہ یہ قطعہ محفوظ رہتا اور دوسرے قطعہ میں پیداوار نہ ہوتی یا اس کے برعکس ہوتا، تو اس صورت میں جھگڑا اور نزاع پیدا ہوتا اور مزارع یا مالک زمین بالکل کورارہ جاتا، لیکن اگر قطعہ زمین مخصوص نہ ہو بلکہ کل پیداوار کا تہائی یا چوتھائی مقرر کر لیا جائے تو اس کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔ (بخاری: ۱/۳۱۳)

جو حدیث ایسے عموم نبوی میں سیدنا معاویہؓ کی خلافت کے آخری زمانہ میں ظاہر ہو اور اس کا راوی تنہا ایک ہی شخص ہو، وہ کس طرح حجت ہوسکتی ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے خلفاء کے زمانہ میں اور سیدنا معاویہؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں بھی کسی نے اس قسم کی روایت بیان نہیں کی، اس لیے بعض فقہاء نے اس روایت کو بالکل ردّ کر دیا ہے۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ:

"عمرو بن دینار نے طاؤس سے کہا کہ تم اگر مخابرت چھوڑ دو یعنی زمین بٹائی پر نہ دو تو اچھا ہے کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے

Marfat.com

اس سے منع فرمایا ہے۔ طاؤس نے جواب دیا کہ میں لوگوں کو (زمین مزارعت پر) دیتا ہوں اور ان کی (اس طرح) امداد کرتا ہوں، اور مجھے سب سے بڑے عالم یعنی سیدنا عبداللہ بن عباسؓ نے بتلایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع نہیں کیا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی اپنے بھائی کو (ویسے ہی) زمین دیدے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اس سے کچھ مقررہ لگان وصول کرے۔" (بخاری: ۱/۳۱۳)

اور جمع الفوائد میں ہے کہ:

"مجاہد نے طاؤس سے یہی کہا ہے کہ ذرا رافع بن خدیجؓ کے پاس جا کر وہ حدیث سنو جو وہ اپنے باپ کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، تو طاؤس نے ان کو جھڑک دیا اور فرمایا: "واللہ اگر میں یہ جانتا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے تو میں کبھی ایسا نہ کرتا، لیکن مجھے اس شخص نے جو رافعؓ سے زیادہ عالم ہے یعنی ابن عباسؓ نے خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ کوئی اپنے بھائی کو (ویسے ہی) زمین دے دے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اس سے مقررہ لگان وصول کرے۔" (جمع الفوائد: ۱/۳۵۷)

اور اسی میں ابوداؤد اور نسائی کے حوالہ سے عروہؒ کی روایت مذکور ہے کہ سیدنا زید بن ثابتؓ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ رافع بن خدیجؓ کو معاف فرمائے، واللہ! میں اس حدیث کو ان سے زیادہ جانتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو انصاری لڑتے جھگڑتے آئے تھے، تو سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: "اگر تمہاری یہی صورت (مزارعت کی) ہے تو اپنے کھیتوں کو اجارہ پر نہ دیا کرو۔" رافعؓ نے بس اتنا سن لیا: "لاتکروا المزارع" (کھیتوں کو اجارہ پر نہ دیا کرو) (اگلا حصہ نہیں سنا)

امام مالکؒ نے ابن شہاب (زہری) سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سالم بن عبداللہ (ابن عمرؓ) سے زمین اجارہ پر دینے کے بارہ میں دریافت کیا، تو فرمایا: "سونے چاندی کے عوض اجارہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔" میں نے کہا: "آپ کو وہ حدیث معلوم

ہے جو رافع بن خدیجؓ سے روایت کی جاتی ہے؟'' فرمایا: ''رافع بہت زیادتی کرتے ہیں، اگر میرے پاس کھیتی کی زمین ہوتی تو میں اس کو ضرور اجارہ پر دے دیتا۔''

(جمع الفوائد: ۱/۳۵۷)

ملاحظہ فرمائیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ اور سیدنا زید بن ثابتؓ نے سیدنا رافع کی حدیث کے اطلاق کا انکار کیا ہے اور اس زمین کو اجارہ پر دینے کی ایک خاص صورت کو نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے مطلقاً منع نہیں فرمایا، گو بعد میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے ورع واحتیاط کے باعث زمین کو اجارہ پر دینا ترک کر دیا، مگر ممانعت کو تسلیم نہیں کیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ممانعت کا انکار فرمایا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ حضور ﷺ نے صرف ہمدردی کا مشورہ دیا تھا۔ طاؤسؒ اور سالمؒ بھی سیدنا رافعؓ کی حدیث پر کلام کرتے ہیں۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر جمہور فقہاء نے اس کو حجت نہیں سمجھا مگر بالکلیہ ردّ بھی نہیں کیا بلکہ خاص صورت کی ممانعت پر محمول کیا۔ چنانچہ عینی وغیرہ سے منقول ہے:

''وہ احادیث جن میں مزارعت سے ممانعت آئی ہے، ان کا جواب یہ ہے کہ وہ خاص صورت پر محمول ہے جب کہ ہر ایک کے لیے زمین کے خاص حصہ کی پیداوار اور مشروط ہو۔'' (حاشیہ: ۱/۳۱۲)

مگر بعض حضرات کے نزدیک حدیث رافع بن خدیجؓ اس درجہ قطعی اور یقینی ہے کہ ان کو ساری امت کا گنہگار ماننا منظور لیکن رافعؓ کی تاویل یا توجیہ منظور نہیں۔ رہا ابن حزمؒ کا یہ کہنا کہ زمین کو اجارہ پر دینے کی مطلقاً ممانعت کے راوی (رافعؓ سے) ایک دو نہیں بلکہ پانچ چھ ہیں جن میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا نام بھی لیا گیا ہے، تو اس سے زیادہ سے زیادہ حدیث کا سند کے لحاظ سے صحیح ہونا ثابت ہوگا جس سے کسی کو انکار نہیں، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی حدیث کی سند صحیح ہونے کے باوجود اگر حدیث کے الفاظ میں اضطراب ہے یا وہ عموم بلویٰ کے موقع پر شاذ ہو تو اس سے احتجاج نہیں ہوسکتا۔ رہا ابن حزم کا بہت سے ایسے تابعین کے نام گنا دینا جو زمین کو سونے چاندی یا کسی اور چیز کے بدلہ میں اجارہ پر دینے کے قائل نہ تھے، تو ان میں سے بعض کی طرف تو اس قول کی نسبت صحیح اور درست نہیں جیسے طاؤسؒ اور حسن بصریؒ کیونکہ ان دونوں سے بخاری میں

Marfat.com

جواز مذکور ہے اور ان میں سے بعض بزرگوں سے ابن بطال نے ابن حزم کے خلاف کا قول نقل کیا ہے:

''ابن بطال فرماتے ہیں کہ علماء نے زمین کو نصف یا ثلث اور ربع پیداوار کے عوض اجارہ پر دینے میں اختلاف کیا ہے، اس کو سیدنا علیؓ سیدنا ابن مسعودؓ اور سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ اور سیدنا زبیرؓ، سیدنا اسامہؓ، سیدنا ابن عمرؓ اور سیدنا معاذ بن جبلؓ اور سیدنا خبابؓ نے جائز فرمایا ہے۔ (اور یہ سب جلیل القدر صحابہ کرامؓ ہیں) یہی قول ابن المسیبؒ کا ہے اور طاؤس کا، ابن ابی لیلی، اوزاعی، سفیان ثوری، ابو یوسف، محمد اور امام احمد بن حنبل کا، ان سب نے مزارعت اور مساقات (یعنی باغات کو بٹائی پر دینے) کو جائز کہا ہے۔ اور ایک جماعت نے اس سے کراہت کی ہے۔ یہ ابن عباسؓ اور عکرمہ اور نخعی سے بھی منقول ہے، یہی امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، لیث (مگر بخاری نے لیث سے خاص صورت کی کراہت نقل کی ہے جس کو کوئی جائز نہیں کہتا) امام شافعیؒ اور ابوثورؒ کا قول ہے، مگر ان سب کے نزدیک مساقات جائز ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ اور امام زفرؒ نے مزارعت اور مساقات دونوں کو منع کیا ہے اور فرمایا کہ یہ کسی صورت سے جائز نہیں۔''

(حاشیہ بخاری:۱/۳۱۳)

ملاحظہ فرمائیں کہ آٹھ اجلہ صحابہ کرامؓ نے مزارعت اور مساقات دونوں کو جائز کہا ہے۔ اسی کے ساتھ بخاری کی اس روایت کو بھی شامل فرمالیں کہ:

''قیس بن مسلم امام باقرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:
''مدینہ میں مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جو تہائی اور چوتھائی پر کھیتی نہ کرتے ہوں اور (ان سے پہلے) سیدنا علیؓ نے سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ نے اور عبداللہ بن مسعودؓ نے اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے اور قاسم وعروہ (فقہائے مدینہ نے) اور ابوبکر صدیقؓ، عمرؓ اور علیؓ

Marfat.com

کے خاندانوں نے اور محمد بن سیرین (فقیہ بصرہ) نے مزارعت کی ہے۔ اور عبدالرحمٰن بن اسود کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن یزید (فقیہ کوفہ) کے ساتھ کھیتی میں شرکت کیا کرتا تھا۔ (اس سے مراد وہی شرکت ہے جس میں بحث ہو رہی ہے یعنی تہائی یا چوتھائی میں شرکت) اور سیدنا عمرؓ نے لوگوں سے اس طرح معاملہ کیا ہے کہ اگر سیدنا عمرؓ اپنے پاس سے بیج دیں تو ان کا نصف حصہ ہوگا، اور اگر دوسرا فریق بیج ڈالے تو اس کو اتنا ملے گا۔'' (بخاری:۱/۳۱۳)

ان اساطین امت کے سامنے ان ہستیوں کی نسبت ہی کیا ہے، جن کے نام ابن حزمؒ نے گنائے ہیں۔ اس حقیقت پر نظر رکھنے والا یہ کہنے پر مجبور ہے کہ سیدنا معاویہؓ کی خلافت کے آخری دور سے پہلے جب تک سیدنا رافع بن خدیجؓ کی حدیث کا چرچا نہیں ہوا تھا، تمام امت کا اس پر اجماع تھا کہ زمین کو نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض دینا جائز ہے، اس لیے یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ قطعی طور پر زمینداری کا ختم کرنا یہی رسول اللہ ﷺ کا منشاء مبارک اور نصب العین تھا جس کو سمجھنے والا سیدنا عمرؓ، سیدنا علیؓ، سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ، سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ، سیدنا زبیر بن عوامؓ، سیدنا اسامہ بن زیدؓ، سیدنا معاذ بن جبلؓ، سیدنا خباب بن الارتؓ، سیدنا زید بن ثابتؓ، سیدنا عبداللہ بن عمرؓ اور سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے؟ کون عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ منشاء مبارک اور نصب العین خلافت صدیق، خلافت عمرؓ، خلافت عثمان اور خلافت علیؓ تک تو صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کو معلوم نہ ہوا اور سیدنا معاویہؓ کی خلافت کے آخری دور میں تنہا رافع بن خدیجؓ کی روایت سے مسلمانوں کو اس کی خبر ہوئی اور معلوم ہو چکا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر سیدنا معاویہؓ کے آخری دور تک برابر اپنی زمینوں کو اجارہ پر دیتے رہے۔ اور سیدنا ابن عمرؓ کا عمل بھی یہی تھا۔ پھر جب ان کو سیدنا رافع بن خدیجؓ کی روایت پہنچی تو ان سے ملے اور حدیث سن کر بھی انہوں نے اس کے اطلاق کو تسلیم نہیں کیا بلکہ خاص صورت پر محمول کیا گو بعد میں احتیاط کے طور پر اپنا عمل بدل دیا، لیکن اجارۂ زمین کی حرمت کا فتویٰ نہیں دیا۔ اور

Marfat.com

سیدنا زید بن ثابتؓ نے تو صاف فرمادیا کہ رافع بن خدیجؓ نے ناتمام حدیث سنی ہے اور اس کو روایت کرنے لگے، پوری حدیث نہیں سنی تھی جس سے ان کو معلوم ہو جاتا کہ رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے مطلقاً منع نہیں فرمایا بلکہ اس کی ایک خاص صورت سے منع فرمایا تھا جو موجب نزاع ہو رہی تھی۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مزارعت اسلام میں جائز ہے البتہ اس کی بعض صورتیں جائز نہیں اور وہ صورتیں وہ ہیں جن میں مالک زمین یا کاشت کار کا نقصان ہو، اور اسلام فریقین میں سے کسی کا نقصان نہیں چاہتا۔

اجارہ:

خلفائے راشدین کے زمانہ میں دوسرے شخص سے زمین کاشت کرانے کی ایک شکل یہ تھی کہ بجائے بٹائی پر معاملہ کرنے کے نقد کرایہ پر معاملہ کیا جاتا تھا یعنی کاشتکار زمین کو کرایہ پر لیتا تھا۔ اس صورت میں کل پیداوار کاشت کار کی ہوتی تھی اور مالک زمین کو سوائے کرایہ کے اور کچھ نہ ملتا تھا۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے:

> ''جن چیزوں کے عوض اجارہ کا معاملہ کرنا جائز ہے اور ان سب چیزوں کے عوض زمین کو زراعت کے لیے کرایہ پر لینا جائز ہے۔
> وہ درہم و دینار وزنی اور عددی چیزیں ہیں۔'' (مختصر الطحاوی:۱۳۲)

مزارعت کی طرح اجارہ کی حیثیت بھی باہمی شرکت جیسی ہے، اور یہ بھی دراصل ایک طرح کا معاہدہ ہوتا تھا جس کی رو سے کاشت کار زمین کو استعمال کرتا تھا اور کرایہ کی شکل میں وہ اس کا کرایہ ادا کرتا تھا۔ یا یہ کہا جائے کہ مالک زمین کچھ رقم لے کر کاشت کار کو کاشت کی اجازت دیتا تھا۔

کسی کو زمین کاشت کے لیے مفت دے دینا یہ اس سے بہتر سمجھا جاتا تھا کہ اس کے عوض کرایہ لیا جائے۔ البتہ مالک زمین کے پاس جب اور کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہو یا زمین بے کاشت پڑی رہنے کا اندیشہ ہو تو زمین دے کر اس کے عوض کرایہ لینے کی اجازت تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے:

Marfat.com

﴿لان یمنع اخاہ ارضہ خیر من ان یاخذ علیہ اجراً معلوماً﴾ (نصب الرایہ:۳/۱۸۱)

''اپنے بھائی کو مفت زمین نہ دینا اور روک رکھنا اس سے اچھا تو یہی ہے کہ کرایہ لے کر اسے دے دے۔''

اس سلسلہ میں شرح معانی الآثار میں ہے کہ حنظلہ (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن حدیجؓ سے پوچھا کہ ''کیا سونے چاندی کے عوض زمین کو کرایہ پر دینا جائز ہے۔؟'' انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔''

چنانچہ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ کرایہ پر زمین لے کر خود کاشت کیا کرتے تھے۔ (مؤطا امام مالک، باب المزارعہ) اور سالم بن عبداللہؓ کا یہ فتویٰ ہے:

﴿لابأس بھا بالذھب والورق﴾ (مؤطا امام مالک، باب المزارعۃ)

''یعنی درہم و دینار کے عوض کاشت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

اور امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں:

''زمین میرے نزدیک مال منقولہ جیسی ہے۔ جس طرح دوسرے کو مال دے کر تجارت کرانا جائز ہے ایسے ہی دوسرے کو زمین دے کر زراعت کرانا جائز ہے۔ جو چیزیں مال تجارت میں درست ہیں وہ زمین میں بھی درست ہیں۔ جو اس میں درست نہیں وہ مال تجارت میں بھی درست نہیں۔'' (نسائی، باب المزارعۃ)

اور امام ابو یوسفؒ کا فتویٰ ہے:

﴿وکذالک الارض عندی ھی بمنزلۃ مال المضاربۃ﴾

(کتاب الخراج:۹۰)

''اور ایسے ہی زمین میرے نزدیک مال مضاربت جیسی ہے۔''

مساقات:

کھیت پر بٹائی پر معاملہ کرنا مزارعت کہلاتا ہے جب کہ باغات کا پھلوں کی

Marfat.com

بٹائی پر معاملہ کرنا ''مساقات'' کہلاتا ہے۔

عہد نبوت اور زمانۂ خلافت راشدہ میں مساقات کا رواج تھا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ مہاجرین کی بے سروسامانی کو دیکھ کر انصار مدینہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گذارش کی کہ ہمارے جو باغات اور نخلستان ہیں وہ ہم دونوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تقسیم سے انکار فرمایا۔ پھر بعد میں انہوں نے کہا کہ اچھا ان کی طرف سے محنت ہو اور پھل میں ہم دونوں شریک ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو منظور فرمالیا۔ (بخاری:۲/۳۱)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے خیبر فتح کرنے کے بعد وہاں کی زمین کو اہل خیبر کے پاس رہنے دیا تھا اور نصفا نصف پر معاملہ کرلیا تھا، یہ روایت بخاری، مسلم اور موطا امام مالکؒ جیسی کتابوں میں ہے۔

اسی لیے قریباً تمام اہل علم مزارعت کی طرح اس کے جواز کے بھی قائل ہیں۔ البتہ وہ صورتیں جائز نہیں ہیں جن میں نزاع کا اندیشہ ہو۔ (ملاحظہ ہو مسوی شرح موطا وغیرہ)

........❖❖❖........

آب پاشی

زمین میں سے ہر قسم کی پیداوار کا انحصار زیادہ تر پانی پر ہے اور اس کی کمی اور شی اکثر و بیشتر فصلوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ تمدن کے ابتدائی دور میں زمین کی ساری یداوار بارش اور چشموں کے پانی اور ندی نالوں کے قدرتی بہاؤ پر ہوتی تھی، لیکن جوں وں انسان کی تمدنی زندگی میں ترقی کی راہیں کھلتی گئیں اور اس نے تسخیر کائنات کی طرف ذم بڑھایا تو اس نے ندی نالوں پر بند لگائے اور جھیلوں اور تالابوں کے پانی کے لیے استہ بنایا اور پانی کو کنوؤں اور راہٹوں اور ٹیوب ویلوں سے زمین کی تہ سے اوپر لانے میں کامیاب ہوا، اور اس طریقہ سے اس نے زمین کی پیداوار میں اضافہ کی کوشش کی۔

اسلام سے پہلے بعض لوگ اپنے اقتدار اور طاقت کی جھوٹی شان دکھانے کے لیے پانی جیسی عام رحمت الٰہی پر قابض ہو جاتے تھے اور عوام الناس کو اس سے فائدہ اٹھانے اور سیراب ہونے سے محروم کر دیتے تھے۔ اسلام نے اس بارہ میں چند بنیادی ہدایات دی ہیں اور پانی کے اس قدرتی عطیہ کو بلا تخصیص و ترجیح اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے لیے مباح قرار دیا۔ چنانچہ پہلی شی قرآن نے یہ بتائی:

﴿وجعلنا من الماء کل شئی حتی﴾ (طہ:۳۱)

''اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز بنائی۔''

اس آیت میں پانی کی پیدائش کا تمام تر تعلق اللہ نے اپنی ذات سے وابستہ کر کے یہ حقیقت ظاہر فرمائی کہ جب اس کی پیدائش اور اس کو مفید عام بنانے میں تمہاری محنت کو کوئی دخل نہیں ہے تو پھر تمہیں اس کے استعمال سے کسی کو روکنے یا محروم کرنے کا حق کیسے حاصل ہو گیا؟ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرمایا:

Marfat.com

''اچھا تم یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم نے برسایا یا ہم نے۔'' (واقعہ: ۷۱)

اس بارہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''پانی، آگ اور گھاس میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں۔''

(کتاب الاموال: ۲۹۸)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پانی، گھاس اور آگ سے کسی کو نہ روکو کیونکہ یہ چیزیں مسافروں اور کمزور لوگوں کے لیے قوت کا باعث ہیں۔'' (کتاب الخراج: ۹۷)

ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا يمنع فضل الماء﴾ (بخاری: ۲/۳۴)

''زائد پانی سے کسی کو نہ روکا جائے۔''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص پیاسے مسافر کو پانی نہیں پلاتا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا اور اس کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔''

ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تین شخص ایسے ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ دیکھے گا اور نہ ان کی صفائی کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے کہ جس کے پاس راستہ میں بچا ہوا زائد پانی ہے اور ضرورت مند مسافر کو اس نے نہیں دیا۔''

(بخاری: ۲/۳۴)

کسی کی چراگاہ میں پانی ہوتا تو اس کا اصل مقصد پانی سے روکنا نہ ہوتا تھا بلکہ گھاس سے لوگوں کو روکنا چاہتا تھا، اس لیے وہ پانی سے بھی روک دیتا تاکہ چراگاہ سے گزر کر کوئی شخص پانی نہ لے جا سکے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے گھاس اور پانی دونوں کے متعلق ایک ہی حکم بیان فرما دیا یعنی دونوں میں سے کسی سے کسی ضرورت مند شخص کو روکا

جائز نہیں ہے کیونکہ دونوں اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں اور دونوں کے مفید بنانے میں کسی کی محنت اور قابلیت کو دخل نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ کسی شخص کے کنویں پر سے ایک قافلہ گزرا اور اس نے کنویں کے مالک سے ڈول رسی مانگی لیکن اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ اصرار اور شدت تشنگی کے اظہار کے بعد بھی اس نے نہیں دیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع سیدنا عمرؓ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا:

﴿هلا وضعتم فيهم السلاح﴾ (کتاب الخراج: ۹۷)

''تم نے ہتھیاروں سے اس کی سرکوبی کیوں نہیں کی؟''

ایسے ہی ایک اور موقع پر کسی شخص نے ایک پیاسے آدمی کو پانی نہیں پلایا تھا۔ چنانچہ وہ پیاس کی شدت کی وجہ سے مر گیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع سیدنا عمرؓ کو ہوئی تو انہوں نے اس پانی نہ دینے والے شخص کو قتل کا مجرم ٹھہرایا اور اس سے مرنے والے کی دیت وصول کی۔'' (کتاب الخراج لیحییٰ: ۱۱۱)

اسی طرح ایک اور شخص اپنی زمین سے آبپاشی کے لیے پانی نہیں لے جانے دے رہا تھا، تو سیدنا عمرؓ نے فرمایا:

﴿لولم اجد للماء مسيلاً الا علىٰ بطنك لاجريته﴾

(کتاب الخراج لیحییٰ: ۱۱۱)

''پانی لے جانے کے لیے سوائے تیرے پیٹ کے اگر کوئی راستہ نہ ملے گا تو میں تیرے پیٹ کے اوپر سے پانی لے جاؤں گا۔''

الغرض عہد خلافت راشدہ میں پانی سب کے لیے مباح عام تھا۔ نہ کسی کو آبپاشی سے روکنا جائز تھا اور نہ ہی اس کے عوض کسی قسم کا ٹیکس وصول کرنا درست تھا اور نہ ہی پانی کی خرید و فروخت کی اجازت تھی۔ جس طرح سورج، چاند اور ہوا سے فائدہ اٹھانے میں تمام انسان برابر کے شریک ہوتے ہیں بعینہ یہی صورت پانی سے فائدہ اٹھانے کی تھی۔

خلافت راشدہ کے زمانے میں جن پانیوں سے آبپاشی کی جاتی تھی ان کی تفصیل یوں ہے:

Marfat.com

1- ہر وہ پانی جو قدرتی طور پر نکلا ہو جیسے دریا اور چشمے کا پانی اور بارش کا تمام وہ پانی جو وادیوں اور تالابوں میں جمع رہتا تھا، اس قسم کے پانیوں میں تمام انسان برابر کے شریک تھے۔ کسی سے کوئی آبیانہ یا ٹیکس وغیرہ نہیں لیا جاتا تھا۔ ہر شخص کو ہر ایسے تصرف کی اجازت تھی جس سے وہ اپنی زمین تک پانی سہولت کے ساتھ لے جا سکتا ہو جیسے نالیاں کھودنا اور گھاٹ وغیرہ بنانا۔ البتہ اگر کاشت کار کے کسی تصرف سے ان چیزوں کو یا دوسرے کاشتکار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا تو مفاد عامہ کے نظریہ کے تحت اس کو روک دیا جاتا تھا لیکن اصل انتفاع سے نہ روکا جاتا تھا۔ (ملاحظہ ہو عمدۃ القاری: ۳/۶)

ان دریاؤں یا نہروں سے اپنی زمین تک پانی لے جانے میں کسی اور شخص کی زمین حائل ہوتی اور اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہ ہوتا تو اس شخص کو پانی لے جانے سے روکنے کا کوئی حق نہ تھا۔ ایسی صورت میں دوسرے شخص کے نقصان کا خیال رکھتے ہوئے پہلے شخص کو مکمل طور پر اجازت ہوتی تھی کہ وہ اپنی زمین تک پانی لے جائے۔ اگر اہل محلّہ جانوروں کے پانی پلانے کے لیے الگ گھاٹ بنا لیتے تو اس میں بھی تمام لوگ شریک ہوتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ مباح عام اشیاء سے فائدہ اٹھانے میں کسی شخص کا نقصان ہوتا تو اسی حد تک ذاتی مفاد کا خیال رکھا جاتا تھا جب تک مفاد عامہ کو اس کی وجہ سے قربان نہ کرنا پڑتا، ورنہ شخصی اور اجتماعی مفاد کے تصادم کی صورت میں اجتماعی مفاد کو ترجیح ہوتی تھی اور ہر شخص کے ذاتی مفاد کا بھی ایک حد تک خیال رکھا جاتا تھا۔ (الاحکام السلطانیہ ماوردی: ۱۷۵، فتاویٰ عالمگیری: ۴/۱۷۰، ۱۷۳، کتاب الخراج لابی یوسف: ۹۸)

2- دوسری قسم پانیوں کی وہ تھی جو محنت و مشقت کے بعد کھود کر نکالے جاتے تھے۔ اس کی کئی صورتیں تھیں۔ کبھی تو ریاست کی طرف سے اس کا انتظام کیا جاتا تھا اور کبھی پبلک کی طرف سے، اور کبھی اہل محلّہ یا اہل قریہ اپنی ضرورت کے لیے یا شخص واحد تنہا اپنی ضرورت کے لیے اس قسم کے انتظامات کیا کرتا تھا۔ اس انتظام کی بالعموم مندرجہ ذیل شکلیں ہوتی تھیں:

(الف) نہریں نکالی جاتیں۔

Marfat.com

(ب) چشمے کھود کر نکالے جاتے۔

(ج) تالاب اور نالے وغیرہ بنائے جاتے۔

(د) کنویں کھودے جاتے۔

اس زمانہ میں نہروں کی دو قسمیں تھیں۔ (1) ریاست کی جانب سے کھدوائی ہوئی نہریں (2) پبلک کی جانب سے کھودی ہوئی نہریں۔

ریاست کے لیے ضروری تھا کہ وہ دریاؤں سے نہریں نکالے یا ان کی اصلاح و درستی کرے، پل باندھے اور آبپاشی کے نظام کو زیادہ سے زیادہ عام اور سہل بنانے کے لیے ہر ممکن ذرائع اختیار کرے اور یہ سب کچھ ریاست اپنے خزانے سے کرے، اور اگر خزانہ میں گنجائش نہ ہو تو ہنگامی چندوں اور ٹیکسوں سے یہ سب انتظام کیا جائے۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے کہ:

> ''سربراہ مملکت کے ذمہ لازم ہے کہ بڑے بڑے دریاؤں سے پبلک کے لیے چھوٹی نہریں نکالے اور ان کی اصلاح و درستی کرے، بند وغیرہ کی خرابی کا اندیشہ ہو تو اس کی اصلاح کرے۔''
>
> (کتاب الخراج: ۹۷)

اگر لوگوں میں ٹیکس یا چندہ دینے کی سکت اور طاقت نہ ہو اور مالی طور پر غریب ہوں تو بجائے ٹیکسوں کا بار ان پر ڈالنے کے ان سے ذاتی طور پر کام لیا جائے لیکن اس نظام کو کسی حال میں ناقص اور نامکمل نہ رہنے دیا جائے۔

سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں بہت سی نہریں نکالی گئی تھیں جن میں سے ایک نہر ابی موسیٰ ہے۔ جو آپ نے گورنر بصرہ سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ کی معرفت کھدوائی۔ سیدنا عمرؓ نے ان کو حکم دیا کہ بصرہ کے لوگوں کے لیے ایک نہر کھدوائی جائے تاکہ انہیں وافر پانی ملے جو ان کے پینے کے کام بھی آئے اور ان کی زراعت کے کام بھی۔ چنانچہ دریائے دجلہ سے ایک نہر کاٹ کر بصرہ لائی گئی۔ یہ نہر نو میل لمبی تھی۔ اس کے نتیجہ میں پانی کی فراوانی سے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آگیا اور ان کے رہن سہن کے طریقے بدل گئے۔ یہ نہر چونکہ ابو موسیٰ اشعریؓ نے بنوائی تھی اس لیے نہر ابی موسیٰ کے نام سے مشہور ہوئی۔

Marfat.com

ایک نہر سعد کھدوائی گئی۔ اس کو کھدوانے کی وجہ یہ ہوئی کہ انبار کے لوگوں کو
کی سخت تکلیف تھی۔ اس تکلیف کے ازالہ کے لیے کئی مرتبہ کسریٰ شاہ ایران کو درخواست
دی تھی لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ جب مسلمانوں نے اس علاقہ کو فتح کیا تو لوگوں
نے سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس اپنی شکایت کا اظہار کیا۔ انہوں نے سعد بن ع
اس کام پر مامور کیا۔ انہوں نے کام تو بڑے اہتمام سے شروع کیا لیکن اس کی منا
تکمیل نہ کر سکے۔ دریا سے نہر نکالی لیکن درمیان میں کچھ فاصلے پر ایک پہاڑ آ گیا اس
سے وہ نہر وہیں چھوڑ دی گئی۔ پھر حجاج بن یوسف ثقفی نے اپنے عہد گورنری میں اس
باقی کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا، لیکن اس کا نام ''نہر سعد'' رکھا کیونکہ یہ سیدنا سعدؓ کے ز
گورنری میں شروع ہوئی تھی۔

اسی سلسلہ میں ایک اور نہر تھی جس کو مشہور صحابی رسول ؐ سیدنا معقل بن یسارؓ
کھدوایا تھا۔ یہ سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں دریائے دجلہ سے کاٹ کر تعمیر کی گئی لیکن
عرصہ کے بعد مٹی بھرنے کی وجہ سے اس کا پانی کچھ کم ہو گیا۔ چنانچہ سیدنا معاویہؓ کے
خلافت میں زیاد بن ابی سفیان نے اس کو دوبارہ کھدوا کر صاف کرایا۔ اس نہر کا نام
معقل تھا۔ (فتوح البلدان: ۳۶۶)

خلافت فاروقی میں ایک اور نہر نکالی گئی جس کا نام نہر امیر المومنین تھا۔
تمام نہروں سے زیادہ طویل اور بڑی تھی۔ اس نہر کے ذریعہ دریائے نیل کو بحر قلزم
دیا گیا تھا۔ یہ نہر قریباً ۶۹ میل لمبی اور نہایت گہری تھی جس سے جہازوں کی آمدورفت
آسانی سے ہو جاتی۔ اتنی لمبی نہر صرف چھ ماہ میں کھودی گئی۔ اس سے آبپاشی کے
دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مصر کی تجارت میں نہایت ترقی ہوئی کیونکہ مال کی باربرداری
آسانی ہو گئی۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد خلافت میں بعض گورنروں کی بے پرواہی اور
تساہل پسندی سے وہ بعض بعض جگہوں سے مٹی سے اٹ گئی یہاں تک کہ ایک مقام
بالکل بند ہو گئی۔ پھر ۱۰۵ھ میں عباسی خلیفہ منصور عباسی نے اپنی ایک ذاتی مصلحت کی وجہ
سے اس کو بالکل بند کر دیا لیکن بعد میں یہ پھر جاری کر دی گئی اور مدتوں جاری رہی۔
(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقریزی: ۱/۱۷۱، ۲/۱۳۹، حسن المحاضرۃ للسیوطی: ۹۳، سیرت عمر

طاب از حکیم محمود احمد ظفر: ۵۵۷)

سیدنا عمرؓ کے بعد نہر ثار، نہر دبیس، نہر اسادرہ، نہر عمرو، نہر حرب وغیرہ نکالی گئی
ں۔(فتوح البلدان: ۳۶۷)

ریاست کی طرف سے کھدوائی ہوئی نہروں کا حکم دریاؤں اور قدرتی پانی جیسا
تھا یعنی تمام لوگ اس میں برابر کے شریک اور حق دار ہوتے تھے۔نہ کسی کو آبپاشی سے
ا جائز تھا اور نہ آبپاشی کے عوض کسی قسم کا ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔البتہ نہر کے چھوٹی
ڑی ہونے کے لحاظ سے پبلک کے فائدہ اٹھانے کی شکلیں ان سے مختلف ہوتی
ں۔تمام آثار واحادیث اور ائمہ کے اقوال کا ماحصل یہ ہے کہ حق انتفاع میں عام لوگ
تھے اور پانی کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو اور ہر شخص کو اس کی
رت کے مطابق پانی مل جائے۔ریاست اس بات کی پوری پوری کوشش کرتی تھی کہ
ں کو بقدر کفایت پانی مل جائے۔پانی تقسیم ہونے کے بعد پھر کسی شخص کو ایسے تصرف
جازت نہ تھی جس سے حق انتفاع میں زیادتی کا شبہ پایا جائے۔

(فیض الباری: ۳/ ۳۰۷، فتاویٰ عالمگیری: ۴/ ۱۷۳)

ایسی نہروں کی صفائی اور درستی کی تمام تر ذمہ داری ریاست پر ہوتی تھی، پانی
اس انتظام سے ایک طرف تو پانی کی قلت ختم ہو جانے کی وجہ سے زمین سے وافر
ار میں غلہ اگنے لگا اور دوسری طرف کاشت کاروں نے آبپاشی کے محصول اور آبیانہ
، چھٹکارا حاصل کر کے پیداوار بڑھانے میں تن، من اور دھن کی بازی لگا دی تھی۔نتیجہ
وا کہ کاشت کاروں نے جو زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم و استبداد کے آہنی
نجوں میں جکڑے ہوئے کراہ رہے تھے، فارغ البالی اور خوش حالی کا وہ منظر دیکھا جس
ظیر نہ دنیا کی تاریخ میں ملتی ہے اور نہ آج کی حکومتوں میں۔

) اس عہد میں نہر کی ایک قسم وہ ہوتی تھی جو عام پبلک کی آبپاشی کے لیے نہیں
ی جاتی تھی بلکہ اہل شہر یا اہل قصبہ اپنی ضروریات کے لیے بناتے تھے۔چنانچہ ریاست
ی جانب سے ان لوگوں کو نہر نکالنے کی اجازت مل جاتی تھی۔

پبلک کی کھدوائی ہوئی نہروں کا حکم یہ تھا کہ پانی پینے اور جانوروں کو پلانے

Marfat.com

میں تمام لوگ برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اور ضرورت سے زائد پانی ہونے کی صورت میں آبپاشی سے بھی کسی کو روکنے کی اجازت نہ تھی، اور آبپاشی کے عوض کسی قسم کا ٹیکس آبیانہ وصول کرنا بھی جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث

﴿نهى رسول الله ﷺ عن بيع الماء﴾ (کتاب الخراج:۹۷)

''رسول اللہ ﷺ نے پانی کی بیع سے منع فرمایا ہے۔''

چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ان کے آدمی نے لکھا کہ انہوں نے آپ کی زمین اور باغ کی آبپاشی کے بعد جو کچھ پانی بچ گیا ہے اس کا تیس ہزار پر معاملہ کر لیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو جواب میں لکھا:

''جتنا فاضل پانی ہے وہ اپنے پڑوسیوں کو اقرب الاقرب کے لحاظ سے (حسب دستور) آبپاشی کی اجازت دے دو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے پانی فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔'' (کتاب الخراج:۹۷)

اور امام مالکؒ فرماتے ہیں:

﴿ليس له ان يمنع جاره فضل ماءه﴾ (کتاب الاموال:۳۰۲)

''زائد اور فاضل پانی سے پڑوسی کو روکنا جائز نہیں۔''

ایسی نہروں کی کھدائی اور صفائی وغیرہ کے اخراجات اہل نہر کے ذمہ ہوتے چونکہ پیداوار کی کمی بیشی کا گہرا تعلق پانی کی کمی بیشی پر ہوتا ہے اور پیداوار کی کمی بیشی کا اثر مارکیٹ کی ہر شے پر پڑتا ہے، اس لیے نہر کی کھدائی اور صفائی میں کوتاہی کی صورت میں ریاست ان لوگوں کو مجبور کرتی تھی، اور اگر اس طرح کام نہ چلتا تو اس کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کی مجاز ہوتی تھی۔ (کتاب الخراج:۹۵،۴۵)

چشموں سے آبپاشی:

چشموں کی تین قسمیں ہیں:

1- پہلی وہ قسم جو قدرتی طور پر خود بخود نکلے ہوں۔ ان چشموں سے اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق فائدہ اٹھانے میں برابر کی شریک ہے۔

Marfat.com

2- دوسری قسم ان چشموں کی ہے جن کو لوگوں نے کھود کر نکالا ہو۔
3- تیسری قسم ان کی ہے جنہیں کسی آدمی نے اپنی زمین میں کھود کر نکالا ہو۔

ایسے چشموں کے وہی لوگ مالک ہوتے تھے جنہوں نے انہیں کھود کر نکالا ہوتا۔ ایسے چشموں سے آبپاشی کا وہی حکم ہے جو نہر کا ہے یعنی ضرورت سے زائد پانی کا بیچنا جائز نہ ہے اور اس پانی سے کسی قسم کا آبیانہ وصول کرنا جائز نہ ہے۔ البتہ چشمہ نکالنے والے کو آبپاشی وغیرہ میں مقدم سمجھا جائے۔ چنانچہ اس بارہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے:

> ''صاحب چشمہ کو اس کا پانی فروخت کرنا جائز نہیں، نہ انسانوں کے پینے کے لیے اور نہ جانوروں اور چوپایوں کے پینے کے واسطے، البتہ اس کو یہ بات جائز ہے کہ زمین، درخت اور باغ وغیرہ کی آبپاشی سے (جبکہ دوسری جگہ پانی مل سکتا ہو یا چشمہ میں ضرورت سے زائد پانی نہ ہو) دوسروں کو روک دے۔ ایسی حالت میں کسی کو اس کی اجازت کے بغیر آبپاشی کرنا درست نہیں ہے۔ اور اگر اس نے اجازت دے دی تو پھر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اگر اس نے پانی کو فروخت کر دیا تو یہ بیع نہ فروخت کرنے والے کو درست ہے اور نہ خریدنے والے کو کیونکہ مجہول ہے اور اس میں دھوکہ ہے۔''
>
> (الاحکام السلطانیہ: ۱۷۸، کتاب الخراج: ۹۵)

تالاب اور کنویں کا حکم:

تالاب اور حوض وغیرہ اگر قدرتی ہوتے یا ریاست کی جانب سے بنوائے گئے ہوتے تو ان میں بھی تمام انسان فائدہ اٹھانے میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ ''منہروز'' نامی بنو قریظہ کی ایک وادی تھی۔ اس سے آبپاشی کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''باغ والے اپنی ضرورت کے مطابق اور کھیتی والے اپنی ضرورت کے مطابق آبپاشی کے بعد نیچے والوں کے لیے پانی چھوڑ دیں۔''
>
> (کتاب الخراج لیحییٰ: ۹۶)

Marfat.com

خلافت راشدہ کے زمانہ میں پانی کی تقسیم میں بنیادی حیثیت سے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ نہ کسی کی حق تلفی ہو اور نہ کسی کو ضرورت سے زیادہ پانی ملے جو دوسرے کی حق تلفی کا سبب بنے۔ اگر تالاب اور حوض وغیرہ کسی کی مملوکہ زمین میں ہوتے یا کسی نے کھدوایا ہوتا تو اس کی وہی تفصیل ہے جو اوپر گزر چکی ہے یعنی زائد پانی کی فروخت جائز نہ تھی۔ کسی شخص کو ضرورت ہوتی اور دوسری جگہ بآسانی پانی نہ مل سکتا تو آبپاشی سے روکنا درست نہ تھا۔ البتہ دوسری جگہ بآسانی مل جانے کی صورت میں فاضل پانی سے روکنے کی اجازت تھی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج: ۲۵، ۹۷، ۱۱۱ وغیرہ)

اور کنوؤں کی بھی فقہاء نے تین قسمیں لکھی ہیں۔ بہرحال جو کنویں حکومت کی طرف سے ہوں یا کسی فرد نے عام لوگوں کے فائدے کے لیے کھدوائے ہوں ان کے پانی کے استعمال میں تمام لوگ برابر کے شریک ہیں جیسے بیئر رومہ سیدنا عثمانؓ نے خرید کر سب لوگوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اور جو کنواں کوئی شخص اپنی یا غیر کی زمین میں اس کی اجازت سے کھدوائے، اس کے بارہ میں یہ حکم ہے کہ

> ''چشمے، کاریز اور کنوؤں کے مالکوں کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ مسافروں کو پانی پینے سے روکیں کیونکہ اس سلسلہ میں آثار و احادیث وارد ہوئے ہیں۔ اسی طرح جانوروں اور چوپایوں کو پانی پلانے سے روکنا بھی جائز نہیں ہے البتہ زراعت اور باغات کی آبپاشی سے روکنے کی اجازت ہے کیونکہ اس بارہ میں کوئی حدیث مروی نہیں ہے اور مالک کے نقصان کا یہی اندیشہ ہوتا ہے۔''
>
> (کتاب الخراج ماوردی: ۱۷۶)

اس قسم کے کنوؤں سے آبپاشی سے روکنے کی اجازت اسی صورت میں تھی جب کہ کنواں کھدوانے والے کے نقصان کا اندیشہ ہوتا اور نقصان نہ ہونے کی صورت میں آبپاشی سے بھی روکنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ یہ بات اسلامی مزاج کے خلاف ہے۔

Marfat.com

تجارت

وسائل معیشت میں زراعت کے بعد دوسرا اہم وسیلہ ''تجارت'' ہے اس لیے اس کے ذرائع کی توسیع بھی اسلامی نظام معیشت کا جزو اعظم ہے لہٰذا یہ حکومت کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اس کی توسیع کے لیے ہر ممکن کوشش کرے بلکہ موجود زمانہ میں تجارت کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے اور دنیا میں تمام امیر ملک تجارت کی وجہ سے امیر ہوئے ہیں نہ کہ زراعت کی وجہ سے۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ

> ''اس دنیا میں تجارت تمام معاشی اعمال میں سب سے بڑا وسیلۂ معاش ہے اور تمدن و حضارت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ہے۔''

اس وجہ سے اسلام نے تجارت کی بڑی ترغیب دی ہے کیونکہ اقتصادی و معاشی نظام کی ترقی کا راز سب سے زیادہ تجارت ہی میں مضمر ہے، جو قوم جس قدر تجارت میں دلچسپی لیتی ہے وہ اسی قدر معاشی اور اقتصادی ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے۔ جس ملک اور قوم کے باشندے اس زمانہ میں تجارت میں دلچسپی نہیں رکھتے وہ اقتصادی میدان میں ہمیشہ دوسروں کے دست نگر رہتے ہیں اور اسی راستہ سے دوسری قومیں ان کے تمدن، تہذیب، معیشت، اقتصادیات اور سیاست بلکہ مذہب پر قابض ہو جاتی ہیں اور اس کو غلام بنا کر ان پر مطلق العنان حکومت کرتی ہیں جیسا کہ سرزمین پاک و ہند میں انگریزوں نے کیا اور قریباً ہندوستان کے باشندے دو سو سال تک غیروں کے جبر و استبداد کا شکار رہے۔ انگریز ہندوستان میں تجارت ہی کی غرض سے آیا تھا اور آج بھی امریکہ اور یورپی ممالک اسی راہ سے دنیا پر اپنا پنجۂ استبداد مضبوط کر رہے ہیں۔ عراق کے تیل پر قبضہ

Marfat.com

کرنے کے لیے امریکہ نے وہاں ایسی خون کی ہولی کھیلی اور ابھی تک کھیل رہا ہے کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ جو قوم تجارت نہیں کرتی وہ آج نہیں تو کل ضرور غلام بن کر رہے گی اور جو ملک تجارت کی برکات سے محروم ہے وہ جلد ہی قعر ذلت و ہلاکت میں گر کر تباہ اور برباد ہو جائے گا۔

معاشی ترقی کا معنیٰ:

تجارت سے معاشی ترقی ہوتی ہے اور معاشی ترقی سے کیا مراد ہے؟ معاشی ترقی سے عموماً وہ عمل مراد لیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں مجموعی پیداوار یا فی کس آمدنی میں ایک طویل عرصہ کے دوران مسلسل اضافہ ہو۔

معاشی ترقی کے بارہ میں ماہرین معاشیات نے مختلف تعریفیں کی ہیں:

1- پروفیسر ہگنز (Huggins) نے معاشی ترقی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:
"معاشی ترقی کل قومی آمدنی اور فی کس آمدنی میں اضافہ کو ظاہر کرتی ہے۔"

2- پروفیسر آرتھر لیوس (W.Arthur Lewis) کے مطابق معاشی ترقی سے مراد زیادہ پیداوار کے ساتھ ساتھ فنی اور ادارتی نوعیت کی تبدیلیاں ہیں جن کے ذریعہ یہ پیدوار حاصل کی جاتی ہے اور تقسیم کی جاتی ہے۔"

3- پروفیسر کنڈل برگر (Kindle Bargar) کے مطابق "معاشی ترقی سے مراد زیادہ پیداوار کے ساتھ ساتھ فنی اور ادارتی نوعیت کی تبدیلیاں ہیں جن کے ذریعہ یہ پیداوار حاصل کی جاتی ہے اور تقسیم کی جاتی ہے۔"

4- پروفیسر مائر اینڈ بالڈون (Meier and Baldwin) نے معاشی ترقی کی تعریف یوں کی ہے: "معاشی ترقی ایک ایسے عمل کا نام ہے جس کے دوران کسی ملک کی حقیقی آمدنی میں طویل عرصہ کے دوران اضافہ ہوتا ہے۔ اگر حقیقی قومی آمدنی میں اضافہ ملک کی آبادی میں اضافہ سے زیادہ ہو، تو فی کس آمدنی میں بھی اضافہ ہو جائے گا بشرطیکہ خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہو اور تقسیم دولت مزید خراب نہ ہو۔"

Marfat.com

اسلام میں معاشی ترقی کا تصور:

اسلام ایک مستقل دین اور مکمل نظام حیات ہے جو انسان کو ایک ایسا ضابطہ حیات عطا کرتا ہے جس کی روشنی میں ایک قوم یا ایک فرد روحانی اور مادی ترقی کی منزلیں نہایت آسانی کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔ دیگر مذاہب جمود کے قائل ہیں لیکن ان کے برعکس اسلام جمود (Static) کا قائل نہیں بلکہ اسلام ایک حرکی (Dynamic) دین ہے جو کہ ہر قسم کے پیش آمدہ حالات اور ہر قسم کے معاملات پر غور وفکر کر کے اور قوت اجتہادیہ سے کام لے کر قرآن وسنت کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں نیا لائحہ عمل مرتب کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسی کو شریعت کی اصطلاح میں اجتہاد کہتے ہیں جس کے ذریعہ ہر زمانہ میں مسلمان اپنے لیے راہ عمل مرتب کر سکتے ہیں۔

اسلام کا مقصد انسان کی ''فلاح'' ہے۔ فلاح کا یہ تصور نہ صرف اس دنیا کی زندگی بلکہ اخروی زندگی پر بھی محیط ہے۔ اور اصل زندگی تو اخروی زندگی ہے۔ دنیوی زندگی تو پچاس ساٹھ سال ہوگی لیکن اخروی زندگی تو ہمیشہ کی زندگی ہے اور نہ ختم ہونے والی زندگی ہے۔ اور ایک مسلمان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی بہتر ہونا ضروری ہے، اسی لیے قرآن حکیم میں مومنین کو دعا سکھائی گئی۔

﴿ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار﴾

''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں جہنم کے عذاب سے محفوظ فرما۔''

بس آخرت کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھلائیوں اور ترقیوں کا حصول بھی ایک فرد اور بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کی ذمہ داری ہے۔

دنیوی زندگی میں فلاح کا حصول معاشی ترقی کے ساتھ منسلک اور وابستہ ہے۔ اس لیے اسلام اپنے ماننے والوں کو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے، غربت اور جہالت کا خاتمہ کرنے اور معاشی ترقی کے دیگر عوامل کی تحقیق وافزائش کے لیے بھرپور ترغیب دیتا

Marfat.com

ہے۔سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿کاد الفقر ان یکونً کفراً﴾

''فقر (غربت) انسان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے۔''

چنانچہ غربت کی وجہ سے بعض دفعہ انسان قادیانی یا عیسائی ہو جاتا ہے۔ اور اپنی ایمانی زندگی سے ہاتھ دھو لیتا ہے۔شاید اسی وجہ سے سرکار دو عالم ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! میں کفر اور فقر و فاقہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

یہ نقطۂ نظر انسان کو سستی اور تکاسل اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بچاتا ہے کیونکہ فقر و فاقہ سے بچنے کے لیے ایک طرف تو انسان معاشی جدوجہد کرے گا اور دوسری طرف اپنے اللہ سے کفر کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا کرے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث میں مانگنے اور دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اپنی محنت سے روزی کمانے کا حکم دیا گیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام معیشت و اقتصاد کے مقابلہ میں اسلام کے پیش نظر صرف اور صرف مادی ترقی ہی معاشی ترقی کا مقصود نہیں بلکہ معاشی ترقی کو چند حدود کا پابند کیا گیا ہے۔ اسلام معاشی ترقی کا خواہاں ہے لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے معاشرتی، اخلاقی اور دینی اقدار کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں، بلکہ چاہتا ہے کہ جو بھی ترقی ہو وہ ان اقدار کو پیش نظر رکھ کر ہو اور معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور دینی اقدار میں بھی ترقی ہو، اخلاقی اقدار کا پودا سرسبز و شاداب ہو۔ معاشرے کے تمام ادارے مثلاً خاندان، حکومت، کاروبار، مسجد و منبر مدرسہ اور خانقاہ اور سکول و کالج وغیرہ اپنا بھرپور کردار ادا کریں تاکہ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرے کا ہر فرد دینی اور روحانی ترقی کی منازل بھی طے کرتا جائے اور تقویٰ اور پاکیزگی کے لحاظ سے بھی افراد میں تنزل کے بجائے ترقی نظر آئے۔ یہی معیار اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی اس آیت میں اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے:

﴿ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم﴾

""تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی اور پرہیز گار ہے۔""

نفع کے لیے تجارت کرنے کا حق:

ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مال اور املاک کو مزید نفع کمانے اور اس طرح اپنی ملکیت اور مال میں اضافہ کرنے کے لیے استعمال کرے۔ وہ اپنے مال سے خود تجارت کر سکتا ہے اور دوسرے کاروباری شخص کے واسطے سے بھی اپنا منشا پورا کر سکتا ہے۔

اسلام نے اس حق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے اور اس کے فضائل وبرکات بھی احادیث میں ذکر کیے گئے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ﴾ (جمعہ:۱۰)

""پس جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (مال تجارت اور رزق) کو تلاش کرو یعنی حاصل کرو۔""

اس آیت میں طلب رزق اور تجارت کو ""اللہ کے فضل"" سے تعبیر کیا گیا ہے اور آیت کا شان نزول ترغیب تجارت پر مبنی ہے۔

قرآن حکیم میں ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم﴾ (النساء:)

""اپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقوں سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضا کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔""

اس آیت میں ایک لفظ ""بالباطل"" فرما کر تمام ناجائز طریقوں سے حاصل کیے ہوئے مال کو حرام قرار دے دیا۔ پھر ان ناجائز طریقوں کی تفصیلات سرکار دو عالم ﷺ کے حوالہ فرمائی۔ آپ نے ہر ناجائز معاملہ کی تفصیل بیان فرما دی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو تفصیلات ناجائز خرید وفروخت یا ناجائز اجارہ

Marfat.com

وغیرہ کی رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں مذکور ہیں وہ درحقیقت اس قرآنی حکم کی تشریح ہے، اس لیے وہ سب احکام ایک حیثیت سے قرآن ہی کے احکام ہیں۔ احادیث رسول کریم ﷺ میں جتنے احکام شرعیہ مذکور ہوئے ہیں، سب کا عام طور پر یہی حال ہے کہ ان میں کسی نہ کسی قرآنی اشارہ کی تشریح ہوتی ہے خواہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ فلاں آیت کی تشریح ہے۔

آیت کے پہلے جملہ میں ناحق اور ناجائز طریقوں سے کسی کے مال میں تصرف کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے، دوسرے جملہ میں جائز طریقوں کو حرمت سے مستثنیٰ کرنے کے لیے ارشاد فرمایا: ”الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم“ یعنی دوسروں کا وہ مال حرام نہیں جو بذریعہ تجارت باہمی رضامندی سے حاصل کیا گیا ہو۔

جائز طریقے اگرچہ تجارت کے علاوہ اور بھی ہیں مثلاً عاریت ہبہ، صدقہ میراث لیکن عام طور پر ایک شخص کا مال دوسرے کے تصرف میں آنے کی معروف و جاری صورت تجارت ہی ہے۔

پھر تجارت کے معنی عام طور پر صرف بیع وشراء کے لیے جاتے ہیں لیکن تفسیر مظہری میں اجارہ یعنی ملازمت ومزدوری اور کرایہ کے معاملات کو بھی تجارت میں داخل قرار دیا گیا ہے کیونکہ بیع میں تو مال کے بدلہ میں مال حاصل کیا جاتا ہے اور اجارہ میں محنت وخدمت کے بدلہ میں مال حاصل ہوتا ہے۔ لفظ تجارت ان دونوں کو حاوی ہے۔

(معارف القرآن: ۲/ ۳۷۸)

دوسرے کا مال حاصل کرنے کی جائز صورتوں میں سے اس آیت میں صرف تجارت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسب معاش کے ذرائع میں سے تجارت اور محنت سب سے افضل اور اطیب ذریعہ معاش ہے چنانچہ سیدنا رافع بن خدیج فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون سی کمائی حلال اور طیب ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”انسان کے ہاتھ کی مزدوری اور ہر سچی بیع وشراء (جس میں جھوٹ اور فریب نہ ہو)۔“ رواہ احمد والحاکم (مظہری وترغیب وترہیب)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿التاجر الصدوق الامین مع النبیین و الصدیقین و الشهداء﴾
(ترغیب)

''سچے اور امانت دار تاجروں کا حشر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔''

سیدنا انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿التاجر الصدوق تحت ظل العرش یوم القیامة﴾
(رواہ الاصبہانی (ترغیب)

''سچا تاجر قیامت کے روز اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔''

اور سیدنا معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

''سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے بشرطیکہ وہ جب بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں، اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں، اور جب کوئی سامان کسی سے خریدیں تو (تاجروں کی عادت کے مطابق) اس سامان کو برا اور خراب نہ بتائیں، اور جب اپنا سامان فروخت کریں تو (واقعہ کے خلاف) اس کی تعریف نہ کریں، اور جب ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو اس کو ٹالیں نہیں، اور جب ان کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو اس کو تنگ نہ کریں۔''
(حاشیہ تفسیری مظہری)

اسی لیے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے روز تاجر فاجروں اور گنہگاروں کی صف میں ہوں گے بجز اس شخص کے جو اللہ سے ڈرے اور نیکی کا معاملہ کرے اور سچ بولے۔''

(رواہ الحاکم عن رفاعہ بن رافع وارواہ الترمذی والبیہقی فی شعب الایمان)

Marfat.com

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام نے تجارت کی بہت ترغیب دی ہے اور قومیں تجارت ہی سے ترقی یافتہ بنتی ہیں، اس وجہ سے اسلام نے تجارت کرنے پر زور دیا سرمایہ یا مال و جائداد کو تجارتی، صنعتی یا زرعی کاروبار میں لگانے کے علاوہ اپنی منقولہ یا غیر اور منقولہ املاک کو کرایہ پر دینا بھی نفع آور کاروبار کی ایک جائز شکل قرار دیا گیا ہے۔

تجارت سے نفع کمانے کا ذریعہ زیادہ تر مالک کا نقد سرمایہ ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر نقد سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی چار شکلیں پائی جاتی رہی ہیں۔

1- اپنے سرمایہ سے خود تجارت کرنا اور اس سے ہونے والے نفع کو اپنا سمجھنا۔

2- کسی شخص کی تجارت یا کاروبار میں سرمایہ کے ساتھ شریک ہو جانا اور طے شدہ منافع کے مطابق حصہ دار بن جانا۔

3- خود کاروباری عمل اور تجارت میں حصہ نہ لینا بلکہ سرمایہ کو اس شرط پر کسی تاجر یا کاروباری کے سپرد کر دینا کہ وہ نفع کا ایک حصہ مالک کو دے۔

4- سرمایہ کو ایک متعین شرح سود پر قرض دینا۔

سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی بعض جدید شکلیں اور بھی ہیں جیسے کمپنیوں کے حصے خریدنا یا سرکاری بانڈز (Bonds)، تمسکات (Securities) اور سیونگ سرٹیفکیٹ (Saving Certificates) خریدنا بھی ہے۔

پہلی شکل کو ذاتی کاروبار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ نفع کمانے اور تجارت کرنے کی ابتدائی اور فطری شکل ہے اور عام طور پر لوگ تجارت کے اس طریقے کو درست اور صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ یہ نفع مالک کا اپنا کمایا ہوا نفع ہے۔

تجارت شروع کرنے سے پہلے ہر تاجر کو چند بنیادی اہمیت رکھنے والے فیصلے کرنے ضروری ہیں:

(1) وہ اپنا سرمایہ کس تجارت میں لگائے۔ (2) کس چیز کی تجارت کرے۔ (3) کس معیار کا سامان رکھے۔ (4) کس مقدار میں رکھے۔ (5) اپنی دوکان یا دفتر کہاں قائم کرے۔ (6) کس بازار یا شہر یا ملک میں اپنا مال فروخت کرے۔ یہ فیصلے اسے حال میں کرنے ہوتے ہیں جب کہ اس کا مال ایک عرصہ کے بعد مستقبل میں فروخت ہونا ہوتا

Marfat.com

ہے۔ اس کی تجارت کی آمدنی کا انحصار اس قیمت پر ہے جس پر یہ مال مستقبل میں فروخت کیا جا سکے گا۔ اس قیمت کا انحصار اس وقت کے حالات طلب اور اس مال کی مجموعی رسد پر ہے جس کی تعیین قبل از وقت نہایت مشکل ہے۔

ایک کاروباری اور تاجر کی پوری پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ لاگت اور قوت خرید کو کم سے کم رکھے اور تیار شدہ مال کو اور قیمت فروخت کو زیادہ رکھے، لیکن معاشیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کی کوشش کی کامیابی کا پیمانہ بہت محدود ہے کیونکہ بازار کی قوتیں اور مسابقت کا عمل ایک کاروباری فرد کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا حدود کے اندر رہتے ہوئے ایک کاروباری فرد اور تاجر کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا مال تیار کرنے کے لیے پیداوار کے ایسے طریقے استعمال کرے کہ لاگت کم سے کم آئے اور اس کی قیمت خرید قیمت فروخت سے کم سے کم ہو۔

یہ بات ہر شخص کے علم میں ہے کہ کاروبار میں نفع اور نقصان سے مفر نہیں۔ کاروباری فرد اور ایک تاجر سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہر صورت اپنے مال کو لاگت کے مساوی قیمت پر فروخت کرے۔ بعض حالات میں جب کہ طلب اس تاجر کی توقع سے کم ہوگئی ہو، صارفین (Consumers) اس مال کو اس قیمت پر خریدنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اس صورت میں ایک تاجر اس بات پر مجبور ہوگا کہ مال کو لاگت سے کم داموں پر فروخت کر کے اپنے سرمایہ کا جو کچھ حصہ بھی بازیافت کر سکتا ہے، کر لے۔ معاشرہ ایک تاجر کو اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ اس کا مال لاگت کے داموں ضرور فروخت ہو جائے گا اور اسے کبھی خسارہ اور نقصان نہ اٹھانا پڑے گا۔ اس حقیقت کے پیش نظر اگر حالات طلب تاجر کی توقع کے مطابق یا اس سے کچھ زیادہ موافق ثابت ہوں اور اس کے لیے یہ ممکن ہو کہ لاگت اور قیمت خرید سے زیادہ داموں پر مال فروخت کر کے نفع کمائے تو اس سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسا نہ کرے بلکہ لاگت اور قیمت خرید کے مساوی قیمت لینے پر اکتفاء کرے۔

تجارت اور کاروبار میں اس بات کو ایک اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے کہ جب خارج کی کسی تبدیلی یا ذاتی غور و فکر اور مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر مستقبل کے بارہ میں قائم کیے

Marfat.com

ہوئے اندازوں میں ترمیم وتبدیلی ہو تو اپنے کاروباری فیصلوں میں اسی مناسبت ترمیم وتبدیلی عمل میں لائی جائے اور نہایت پھرتی اور عجلت سے لائی جائے۔ مختلف اف کے اندر پھرتی کے ساتھ نئے فیصلے کرنے کی صلاحیت ایک جیسی نہیں ہوتی۔

اس طرح ایک فیصلہ کر لینے کے بعد اسے پوری طرح نافذ کرنا اور ایسے وق پر نافذ کرنا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے، تجارت کی کامیابی کے ضروری ہے۔ مختلف کاروباری افراد کے اندر یہ صلاحیت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ جن اف کے اندر یہ صلاحیتیں دوسرے افراد سے زیادہ ہوتی ہیں وہ نسبتاً زیادہ کامیابی کے سا تجارت کر سکتے ہیں اور زیادہ نفع کما سکتے ہیں۔

تجارت کے چند بنیادی اصول:

دنیا میں ہر شی چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہوتی ہے، اسی طرح اسلام کے معا اور اقتصادی نظام میں تجارت اور کاروبار کی صحت اور درستی کا مدار بھی چند اصولوں پر ہے جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

1- تجارت کا جواز چونکہ باہمی تعاون پر مبنی ہے، لہٰذا تجارت کے تمام معاملا میں جانبین سے تعاون کا وجود ضروری ہے، یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ای فریق کی طرف سے تعاون ہو اور دوسرے کی طرف سے تعاون نہ ہو۔ اس مطلب یہ ہے کہ فریقوں میں سے ایک کا زیادہ سے زیادہ نفع اور دوسر زیادہ سے زیادہ نقصان ہو۔ ارشاد خداوندی ہے:

> ''بھلائی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور ظلم پر کسی کے ساتھ ہرگز تعاون نہ کرو۔'' (المائدہ:)

2- تجارت میں جانبین سے حقیقی رضا کا وجود ضروری ہے اضطراری رضا معتبر ہے یعنی یہ نہ ہو کہ ایک شخص تو برضا و رغبت اس معاملہ کے لیے آمادہ ہے دوسرا برضا و رغبت اس معاملہ کے لیے آمادہ نہیں مگر اس کی اضطراری کیف اس کی رضا کی قائم مقام بن گئی ہے جب کہ قرآن حکیم نے باہمی رضامن

Marfat.com

کی شرط عائد کی ہے:

﴿یاایها الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل، الا ان تکون تجارة عن تراض منکم﴾ (النساء:)

''اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل طریق سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت کی راہ سے باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ ہو۔''

3- اہل معاملہ معاملہ کی اہلیت بھی رکھتے ہوں یعنی عاقل، بالغ یا ممیّز اور آزاد ہوں، مجبور، مجنون اور مکرہ نہ ہوں، کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتی یستیقظ، وعن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یعقل﴾

(مسند احمد ۶/۱۰۰، ۱۴۴ نیل الاوطار: ۱/۳۲۳)

یہ حدیث الفاظ کے کچھ اختلاف کے ساتھ ابوداؤد وغیرہ میں بھی آئی ہے۔

ایک اور روایت ہے کہ:

﴿نهی رسول الله ﷺ عن بیع المضطر﴾

(ابوداؤد، کتاب البیوع)

''رسول اللہ ﷺ نے زبردستی اور جبر کی بیع سے منع فرمایا ہے۔''

کسی معاملہ میں جانبین میں سے کسی ایک جانب میں حقیقی رضامندی نہ پائی جاتی ہو بلکہ جبری اور اضطراری رضا ہو مثلاً سود یا کسی مزدور کی اس محنت کے مقابلہ میں غیر واجبی اجرت۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جبری اور اضطراری رضا کو اسلامی نقطۂ نظر سے غیر معتبر قرار دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''اس لیے کہ ''مفلس'' مضطر اور مجبور ہوتا ہے کہ جس شی کے پورا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا اس کو اپنی بے چارگی کی وجہ سے اپنے

Marfat.com

ذمہ واجب کر لیتا ہے، اور یہ رضا ہر گز حقیقی رضا نہیں ہے۔ پس سود جیسا معاملہ نہ پسندیدہ معاملات میں سے ہے اور نہ کاروبار کے صالح اور درست معاملات میں سے ہے، اور بلا شک وشبہ یہ معاملہ باطل اور ظلم ہے۔ (وانما ھو باطل وسحت)

(حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۱۰۳)

4- تجارت کے معاملہ میں کسی قسم کا دھوکہ، بددیانتی، خیانت، ضرر، نقصان اور معصیت کا عمل دخل نہ ہو اور نہ ہی ان اشیاء کا کاروبار ہو جن کا استعمال شریعت اسلامی معصیت اور حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالرحمٰن الجزائریؒ نے لکھا ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہترین کسب بیع مبرور ہے اور آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کمانا۔

''اور بیع مبرور ایسی بیع وشراء کو کہتے ہیں جس میں متعاقدین ایک دوسرے سے تعاون اور بھلائی کا معاملہ کریں، یعنی نہ اس میں دھوکا ہو نہ خیانت، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت لازم آتی ہو۔''

(کتاب الفقہ: ۲/۲۰۲)

پھر ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لا ضرر ولا ضرار﴾

''نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔''

بیع کی تعریف:

قبل اس کے کہ ہم بیع اور خرید وفروخت پر مزید بحث کریں اور اس کی باطل اور فاسد صورتوں کو بیان کریں، یہ جاننا ضروری ہے کہ بیع کے لغوی اور شرعی معنی کیا ہے؟ علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ قیمت والی شی کو دے کر اس کی قیمت لے لینا بیع ہے، اور خریدنے اور فروخت کرنے دونوں پر بیع کا اطلاق ہوتا ہے (گویا بیع لغت اضداد میں سے ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

Marfat.com

﴿لا یبعن احدکم علیٰ بیع اخیه﴾
''کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع کو نہ خریدے۔''
یہاں خریدنے پر بیع کا اطلاق کیا گیا ہے۔ (المفردات:٦٧)
علامہ ابن نجیم مصباح کے حوالہ سے بیع کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ایک چیز کے بدلہ میں دوسری چیز دینا عام ازیں کہ وہ مال ہو یا مال نہ ہو، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے: ''وشروہ بثمن بخس دراھم معدودہ'' (یوسف:٢٠)
یعنی انہوں نے اس کو معدودے چند درہموں کے عوض فروخت کر ڈالا، حالانکہ سیدنا یوسف علیہ السلام آزاد شخص تھے ''مال'' نہ تھے۔ ہر چند کہ لغت میں بیع کا اطلاق خریدنے اور بیچنے دونوں پر ہوتا ہے لیکن بائع کا متبادر بیچنے والا ہے۔'' (البحر الرائق شرح کنز الدقائق:٥/٢٥٦)

بیع کے شرعی معنی کے بارہ میں ابن نجیم لکھتے ہیں کہ صاحب کنز الدقائق علامہ نسفیؒ نے لکھا ہے کہ ''البیع مبادلة المال بالمال بالتراضی ''یعنی باہمی رضامندی کے ساتھ مال کے بدلہ میں مال دینے کو بیع کہتے ہیں۔ اور الکشف الکبیر میں لکھا ہے کہ جس شی کی طرف طبیعت مائل ہو اور اس کو ضرورت کے وقت ذخیرہ کیا جاسکے اس کو مال کہتے ہیں۔ کسی شی کا مال ہونا اس وقت ثابت ہوتا ہے جب عرف میں اس کی کوئی قیمت ہو، اور جس چیز سے بغیر قیمت کے نفع حاصل کرنا مباح ہو (جیسے گندم کا ایک دانہ) وہ مال نہیں ہے۔ علامہ کاسانیؒ کی بدائع الصنائع میں ہے کہ کسی مرغوب چیز کا دوسری مرغوب چیز سے تبادلہ اگر قولاً ہو تو یہ ایجاب وقبول بیع ہے اور اگر فعلاً ہو تو یہ بیع تعاطی ہے۔'' (البحر الرائق:٥/٢٥٦)

اسلام میں چند ناجائز بیع:

اسلام میں بعض بیع ایسی ہیں جن کو شریعت میں منع کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

(1) بیع ملامسہ اور منابذہ:

سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع ملامسہ اور بیع منابذہ سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم حدیث نمبر:۳۶۹۱)

ملامسہ کی تعریف امام نوویؒ نے یہ کی ہے کہ کوئی شخص تاریکی اور اندھیرے میں کپڑا لائے یا لپٹا ہوا کپڑا لائے اور خریدار سے یہ کہے کہ میں یہ کپڑا تم کو اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ جب تم اس کو ہاتھ لگادو گے تو تمہارا اس کو چھونا اس کو دیکھنے کے قائم مقام ہوگا اور بعد میں تمہیں اس کو واپس کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ دوسری تعریف اس کی یہ ہے کہ صرف چھونے سے بیع لازم ہوجائے۔ فروخت کرنے والا مشتری سے کہے جب تم نے اس کو چھولیا تو بیع واجب ہوجائے گی۔

احناف کے نزدیک بیع ملامسہ کی تعریف یہ ہے کہ فروخت کرنے والا کہے میں تم کو یہ چیز اتنے پیسوں کے عوض فروخت کرتا ہوں۔ جب تم اس چیز کو چھولو گے تو بیع واجب ہوجائے گی یا مشتری اسی طرح کہے۔ (عمدۃ القاری:۱۱/۲۶۶)

اور منابذہ کی تعریف یہ ہے کہ بائع اور مشتری کسی شی کی قیمت پر راضی ہو جائیں اور بائع یہ کہے کہ جب میں یہ چیز تمہارے پاس پھینک دوں گا تو بیع لازم ہوجائے گی اور تمہیں اس کو واپس کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ (عنایہ علیٰ ہامش فتح القدیر:۶/۵۵)

ان دونوں کے ناجائز کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ غائب چیز کی بیع جائز ہے اور اس میں مشتری کو دیکھنے کے بعد اس کو مسترد کرنے کا اختیار ہے خواہ وہ بیان کردہ اوصاف کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینیؒ نے لکھا ہے کہ اس بیع کے باطل ہونے وجہ یہ ہے کہ جب مشتری سودے کو نہیں دیکھے گا تو اس بیع میں دھوکا ہوگا اور یہ قمار یعنی جوئے کے مترادف ہے۔ (عمدۃ القاری:۱/۲۶۷)

(2) کنکری پھینکنے والی اور دھوکہ کی بیع:

زمانۂ جاہلیت میں بیع کا ایک طریقہ یہ تھا کہ بائع کے پاس مثلاً کپڑوں کا ایک ڈھیر ہو اور بائع اور مشتری جب قیمت پر متفق ہو جائیں تو مشتری جس کپڑے پر بھی

Marfat.com

کنکری رکھ دے اور اس کپڑے کو دیکھے اور جانچے بغیر اس کی بیع واجب ہو جاتی تھی اور یقین کو اس کے رد کرنے کا کوئی اختیار نہ ہوتا تھا۔ (ہدایہ مع فتح القدیر:۶/۵۵)

اسی طرح دھوکہ کی بیع کا معاملہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو یہ کہے کہ میرے جال میں جتنی مچھلیاں آئیں گی وہ اتنے کی ہوں گی۔ یہ دھوکے کی بیع کہلاتی ہے کیونکہ کوئی علم نہیں کہ اس کے جال میں مچھلیاں آتی بھی ہیں کہ نہیں؟ یا پھر کتنی آتی ہیں یا کہے کہ اس گائے کے تھنوں میں جو دودھ ہے وہ اتنے کا ہے۔ یہ دھوکے کی بیع ہے۔ یہ اسلام میں جائز نہیں کیونکہ اس کی مقدار مجہول ہے۔ اسی وجہ سے سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کنکری پھینکنے کی بیع اور دھوکے کی بیع سے منع فرمایا ہے۔

(مسلم حدیث نمبر ۳۶۹۸)

3) بیع پر بیع کرنا:

حدیث میں بیع پر بیع کی ممانعت بھی آئی ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لایبیع بعضکم علیٰ بیع بعض﴾ (مسلم حدیث:۳۷۰۱)

"تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے۔"

ایک اور روایت میں فرمایا کہ "کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نہ کوئی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کرے مگر یہ کہ وہ اجازت دیدے۔"

(مسلم حدیث نمبر:۳۷۰۲)

ایک اور روایت میں جو سیدنا ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لایسم المسلم علیٰ سوم المسلم﴾ (مسلم حدیث:۳۷۰۳)

"کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے نرخ کرتے وقت نرخ نہ کرے۔"

بیع پر بیع کرنے کی ممانعت جو حدیث میں آئی ہے کہ کسی شخص نے مدت خیار میں کوئی چیز خریدی۔ اب اس سے کوئی شخص کہے کہ اس بیع کو فسخ کر دو، میں تم کو یہ چیز کم

Marfat.com

قیمت پر فروخت کر دوں گا۔ یہ ناجائز ہے۔ یا خریدار کہے کہ تم اس بیع کو فسخ کر دو میں شی کی تم کو اس سے زیادہ قیمت دوں گا۔ یہ بھی ناجائز ہے۔

اور نرخ پر نرخ کی ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ دونو کسی چیز کی بیع پر راضی ہوں لیکن ابھی عقد بیع نہ ہوا ہو کہ ایک شخص بائع سے کہے زیادہ قیمت دوں گا۔ قیمت طے ہو جانے کے بعد یہ بھی ناجائز ہے البتہ نیلام میں ز بولی دینا جائز ہے۔

(4) بیع نجش کی ممانعت:

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے

﴿نهىٰ عن النجش﴾ (مسلم حدیث نمبر: ۳۷۰۸)

''نجش سے منع فرمایا۔''

بیع نجش کے بارہ میں علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی چیز کی اصل قیم لگا دی جائے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص اس کی قیمت بڑھائے حالانکہ اس کا خود خرید۔ کا ارادہ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد صرف دوسرے شخص کو ترغیب دینا ہے تو یہ نجش ہے ج شریعت میں ممنوع ہے کیونکہ یہ ایک مسلمان کو دھوکہ دینا ہے۔ لیکن اگر کسی چیز کی قیمت نہ لگائی گئی ہو اور وہ خریدنے کا ارادہ کیے بغیر اصل قیمت لگوانے کے لیے بڑھائے تو یہ نز ہے کیونکہ اس میں کسی دوسرے کو ضرر پہنچائے بغیر مسلمان کو نفع پہنچانا مقصود ہے۔ یہ اس وقت ہے جب دوسرا شخص اس چیز کو کم قیمت سے خریدنا چاہتا ہو۔ (فتح القدیر: ۶/ ۲۱۰۷)

نجش کے ممنوع ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک حرام اور ناجائز ہے۔

نجش کے ناجائز ہونے کی وجہ سے بعض فقہاء نے نیلام کی بیع کو بھی مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ نیلام میں بھی لوگ خریداری کی بولی پر بڑھ چڑھ کر لگاتے ہیں۔ چنانچہ امام ابراہیم نخعیؒ کے نزدیک بھی نیلام کی بیع مکروہ ہے۔ لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بیع مطلقاً جائز ہے۔ (فتح الباری: ۴/ ۳۵۴)

جمہور فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک چادر اور ایک پیالہ فروخت کیا اور فرمایا کہ اس چادر اور پیالے کو کون خریدے گا۔ ایک شخص نے کہا کہ میں اس کو ایک درہم میں خریدوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک درہم سے زیادہ کون دے گا؟'' ایک شخص نے دو درہم کہا۔ آپ نے وہ چادر اور پیالہ اس شخص کو دے دیئے۔'' امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

(ترمذی:۱۹۶، ابوداؤد: ۱/۲۳۲، نسائی: ۲/۱۹۰، مجمع الزوائد: ۳/۸۴، ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۱۹۸، سنن کبریٰ بیہقی: ۷/۲۵، شعب الایمان، بیہقی: ۳/۴۰۳، شرح السنہ بغوی: ۸/۱۱۹، مسند احمد: ۳/۱۰۰، مسند ابی داؤد طیالسی: ۲۸۵، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم: ۳/۱۳۲)

(5) تلقی جلب کی ممانعت:

اسلام نے تلقی جلب سے بھی منع فرمایا ہے۔ تلقی جلب کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص شہر سے باہر نکل کر ان تاجروں کا استقبال کرے جو شہر میں فروخت کرنے کے لیے غلہ اور دیگر اجناس لاتے ہیں، اور وہ شخص ان اجناس لانے والوں کے شہر میں داخل ہونے اور شہر کا نرخ معلوم ہونے سے پہلے ان سے ان کا مال خرید لے۔ اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ تاجروں کو ضرر سے بچایا جائے کیونکہ جب وہ شہر کا بھاؤ معلوم ہونے سے قبل اپنا مال فروخت کر دیں گے تو بسا اوقات ان سے مال خریدنے والا شہر سے کم قیمت پر مال خرید لے گا۔ اس سے وہ تاجر نفع سے محروم ہو جائیں گے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سودا فروخت کرنے والوں کی ملاقات سے منع فرمایا تاوقتیکہ وہ بازار نہ آجائیں۔''

(مسلم حدیث نمبر: ۳۷۰۹، اخرجہ البخاری، والنسائی فی المجتبیٰ، ابن حبان: ۱۱/۳۳۴، احمد: ۲/۷)

امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں میں نے سیدنا ابو ہریرہؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سودا بیچنے والوں سے آگے جا کر نہ ملو۔ جس شخص نے پہلے آگے جا کر سودا خرید لیا، پھر سودے کا مالک (تاجر) بازار گیا اور اس کو بازار کا نرخ معلوم ہو گیا تو اس کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے۔ (مسلم حدیث نمبر: ۳۷۱۳)

Marfat.com

(6) شہری کو دیہاتی کا مال فروخت کرنا:

اسلام میں یہ بیع بھی منع ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ شہری کی دیہ
سے بیع حرام ہے اور وہ یہ ہے کہ دیہاتی اس وقت کے نرخ پر سودا فروخت کرنے
لیے شہر میں لائے اور اس کے پاس شہری آ کر کہے کہ اپنا مال میرے پاس رکھو تا کہ
تمہارے سامان کو موجودہ نرخ سے زیادہ تدریجاً فروخت کر دوں۔ اس بیع کے ممنو
ہونے کی حسب ذیل شرائط ہیں:

1- بیع کرنے والے کو علم ہو کہ یہ بیع منع ہے اور یہ شرط تمام ممنوعات کو شامل ہے
2- جو مال وہ لایا ہو اس کی لوگوں کو عام ضرورت ہو جیسے خوردونوش کا سامان۔ جن چیزوں کی عام ضرورت نہیں ہے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہیں۔
3- اس شی کی بیع سے شہر میں وسعت ہو۔ اگر شہر کے بڑے ہونے یا اس شی کے ہونے یا اس شی کے عام ہونے اور نرخ کے کم ہونے کی وجہ سے یہ وسعت ہو تو پھر بھی یہ بیع جائز نہیں۔
4- شہری دیہاتی پر بیع پیش کرے اور اس کو بیع کی دعوت دے، لیکن اگر دیہا نے خود شہری سے بیع کی درخواست کی ہے یا اس شی کو فروخت کرنے کے شہری کے پاس ٹھہرنے کا قصد کیا ہے اور شہری نے کہا کہ یہ معاملہ میرے سپ کر دو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر ان چاروں شرطوں کے باوجود شہری دیہاتی سے سودا خریدے تو اس کا
فعل حرام ہے، اور بیع صحیح ہے۔ خریدنے والے کے لیے خیار شرط نہیں ہوگا۔

(روضۃ الطالبین: ۴۱۲/۳)

(7) قبضہ سے قبل کسی چیز کا فروخت کرنا:

اسلام میں اناج اور دوسرے سامان کا قبضہ سے قبل فروخت جائز نہیں کیونکہ ا
سے بائع اور مشتری کے درمیان بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ ابن
بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

Marfat.com

''جو شخص اناج خریدے وہ قبضہ سے پہلے اس کو فروخت نہ کرے۔
سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم سواروں سے ناپ تول کئے بغیر اندازاً اناج خریدتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس اناج کو وزن کرنے سے پہلے فروخت کرنے سے منع کر دیا۔''

(مسلم حدیث:۳۸۳۲)

سیدنا ابوہریرہؓ نے ایک مرتبہ مروانؓ سے کہا کہ کیا تم نے سود کی بیع کو حلال کر دیا ہے؟ مروانؓ نے کہا: ''میں نے کیا کیا ہے؟'' سیدنا ابوہریرہؓ نے فرمایا: ''تم نے ہنڈی (Bill of Exchange) کی بیع کو جائز کر دیا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے قبضہ سے قبل اناج کی بیع سے منع فرمایا ہے۔'' پھر مروانؓ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور لوگوں کو ہنڈی کی بیع سے منع کر دیا۔ سلیمان (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سپاہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہنڈیاں چھین رہے تھے۔'' (مسلم حدیث:۳۸۴۸)

علماء نے قبضہ سے قبل چیز کی بیع کی ممانعت کی بڑی حکمتیں بیان کی ہیں۔ جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

1- بیع قبل القبض میں دھوکا کا امکان ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ مبیع (فروخت شدہ چیز) بائع کے پاس ہلاک ہو جائے۔

2- جب خریدار مبیع پر قبضہ کر لے گا تو پھر اس میں بائع کے تصرف کرنے کا امکان ختم ہو جائے گا، ورنہ ہو سکتا ہے کہ فروخت کرنے کے بعد بائع کو زیادہ قیمت دینے والا کوئی اور گاہک مل جائے تو وہ خریدار کو مبیع پر قبضہ نہ دے اور بیع فسخ کر دے۔

3- اس زمانہ میں بیع قبل القبض کی وجہ سے سٹے کو فروغ ہوتا ہے اور اجناس کی قیمت کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ جس سے صارفین کا استحصال ہوتا ہے۔

4- ہمارے ملک میں اسٹاک ایکسچینجوں (Stock Exchanges) میں روزانہ کروڑوں روپے کا سٹے کا کاروبار ہوتا ہے۔ سٹے میں چونکہ صرف کاغذات اور ٹیلی فون پر بیع ہوتی ہے اور عملی طور پر فروخت نہیں ہوتی اور نہ مبیع پر قبضہ کیا جاتا

Marfat.com

ہے، اس لیے اس حدیث کی رو سے یہ کاروبار ناجائز ہے۔

-5 بیع قبل القبض میں ایک شخص کسی سے کوئی شی دس روپے میں خریدتا ہے اور اس شی پر قبضہ کیے بغیر وہی شی پندرہ روپے میں کسی اور شخص کو فروخت کر دیتا جب کہ وہ شی ابھی بائع کے پاس ہے، تو اس نے دس روپے کو پندرہ روپے میں فروخت کر دیا۔ اور یہ شی حکماً سود ہے۔

(8) مجہول ڈھیر کی بیع ممنوع ہے:

کھجور، گندم، جو یا کوئی اور شی کا ڈھیر لگا ہوا ہو لیکن اس کی مقدار مجہول ہو معلوم نہ ہو کہ کھجور اور گندم کتنے من ہے۔ شریعت میں اس کی بیع ممنوع اور ناجائز چنانچہ سیدنا جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ:

"کھجوروں کے جس ڈھیر کی مقدار پیائش کے معروف طریقے سے معلوم نہ ہو اس کو معین کھجوروں کے عوض فروخت کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔" (مسلم حدیث نمبر: ۳۷۴۰)

(9) ظہور صلاحیت سے قبل درختوں پر پھلوں کی بیع:

اسلام میں ظہور صلاحیت سے پہلے درختوں پر پھلوں کو فروخت سے منع فر گیا۔ ظہور صلاحیت کا مطلب یہ ہے کہ پھل اسی مقدار کے ہو جائیں کہ وہ قدرتی آفا سے محفوظ ہو جائیں۔ فقہاء شافعیہ کے نزدیک اس کا معنی پھلوں کا پک جانا اور اس مٹھاس کا آ جانا ہے۔ (فتح القدیر لابن ہمام: ۵/۴۸۹)

علامہ ابن ہمامؒ اس بارہ میں مزید لکھتے ہیں کہ "پھلوں کے ظاہر ہونے کے ب ان کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اگر یہ شرط لگائی جائے کہ پھلوں کو درختوں پر رہنے جائے گا اور توڑا نہیں جائے گا تب بھی اس بیع کے عدم جواز میں کسی کا اختلاف نہیں۔

(فتح القدیر: ۵/۴۸۹)

موجودہ زمانے میں اکثر اسلامی ملکوں میں باغات کے پھلوں کی بیع کا طریقہ ہے کہ درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی بیع کی جاتی ہے اور درختوں سے پھلوں کو توڑ کر

Marfat.com

ں کرتے۔اور کبھی ان پھلوں کی صلاحیت کے ظہور سے قبل بیع ہو جاتی ہے،اور زیادہ تر اس وقت ہوتی ہے جب پھلوں کا ظہور بھی نہیں ہوتا اور صرف ان کا بور ظاہر ہوتا ہے، بھی اس کے ظہور سے بھی پہلے بیع ہو جاتی ہے۔پھلوں کی بیع کی یہ تمام صورتیں باطل رنا جائز ہیں کیونکہ حدیث میں ان کا جائز نہ ہونا آیا ہے۔نیز پھلوں کے ظہور سے قبل ان بیع کے عدم جواز پر تمام فقہاء کا اجماع ہے کیونکہ یہ معدوم کی بیع ہے اور معدوم کی بیع لام میں ناجائز ہے۔

باغوں کے پھلوں کی مروجہ بیع کے باطل ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خریدار پھلوں کو ایک معینہ مدت تک درختوں پر برقرار رکھتا ہے۔اگر خریدار پھلوں کو درختوں پر قرار رکھنے کی شرط سے بیع کرے تو یہ بیع بالا جماع باطل ہے،لیکن آج کل پھلوں کی بیع کا ہی طریقہ ہے۔اگر عدم جواز کے اس حکم کو اپنے ظاہر پر رکھا جائے تو آج دنیا میں کسی جگہ ھل کھانا جائز نہیں ہوگا مگر یہ کہ کوئی شخص اپنے باغ سے خود پھل توڑ کر کھائے۔یہ طریقہ گرچہ اسلام کے خلاف ہے اور مدتوں سے لوگ اسی قسم کی بیع کرتے چلے آرہے ہیں،لہٰذا ن کے اس طریقہ کو تبدیل کرنا نہایت مشکل ہے،اس لیے اس بیع کے جواز کا حل یہ تلاش کیا گیا۔

اگر بور کے ظہور سے پہلے باغ کو خریدا ہے،تو اس کے جواز کی صورت یہ ہے کہ ایک مدت معینہ تک باغ کی زمین کو کرایہ پر مالک سے لے لے۔پھر پھلوں کے اتارنے تک جو زمین سے افزائش اور روئیدگی ہوگی وہ کرایہ کا عوض اور اس کا جائز حق ہوگا جیسا کہ علامہ سرخسی نے المبسوط:۱۱/ ۱۹۹ پر لکھا ہے۔

اگر درختوں پر جس قدر بور یا پھل ہوں اس کو مشتری خریدے اور اس کے فصل تک جس قدر بھی پھل آئیں،ان سب کو باغ کا مالک خریدار پر حلال کردے۔فی الواقع باغوں کے پھلوں کی مروجہ بیع اسی طرح ہوتی ہے۔خریدار موجود پھل خرید لیتا ہے اور باغ کا مالک فصل پکنے تک پھل اس کے لیے حلال کر دیتا ہے۔

(ملاحظہ ہو مبسوط:۱۲/ ۱۹۷،فتح القدیر:۵/ ۴۹۲)

باقی رہا مسئلہ دیر تک پھلوں کو درختوں کے ساتھ رکھنا کیونکہ فقہاء کا اس بات پر

Marfat.com

اجماع ہے کہ پھل خریدنے کے بعد ان کا درخت سے اتارنا واجب ہے۔ اگر خریدار شرط لگائے کہ وہ پکنے تک پھلوں کو درختوں پر برقرار رکھے گا تو یہ شرط باطل ہے کیونکہ سودا در سودا ہے جس کی حدیث میں ممانعت ہے، یا اس وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے کہ اس میں ایسی شرط لگائی گئی ہے جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا اور رسول اللہ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع کیا ہے۔

اس اشکال کا حل یہ ہے کہ بیع بغیر شرط ترک کے کی جائے اور پھر اگر بائع پھلوں کو درخت پر رہنے دینے کی اجازت دے دے تو جائز ہے۔ اور چونکہ عرف یہ ہے کہ بیع میں یہ شرط نہیں لگائی جاتی اور ایک معینہ مدت تک پھلوں کے درختوں پر برقرار رہنے پر بائع کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا اس لیے یہاں حکماً بائع کی اجازت حاصل ہے۔

(10) ہنڈی کی بیع:

ہنڈی کی بیع اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے زید نے حبیب سے مال خریدا اور تین ماہ بعد رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے لیے زید نے حبیب کو ایک دستاویز ہنڈی (Bill of Exchange) دی جس میں اس نے لکھ دیا کہ وہ تین ماہ بعد حبیب کو ایک ہزار روپیہ ادا کرنے کا پابند ہے۔ بائع حبیب یہ ہنڈی لے کر بنک گیا اور پانچ فی صد کمیشن پر نوسو پچاس روپے میں یہ ہنڈی کی دستاویز فروخت کر دی۔ پھر بنک مقررہ تاریخ پر حبیب سے ایک ہزار روپے وصول کر لیتا ہے۔ بنک کو اس کاروبار میں پچاس روپے کا فائدہ ہوا اور حبیب کو اپنی رقم جلد مل جاتی ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ بنک وہ ہنڈی دوسرے بنک کو فروخت کر دیتا ہے۔

شرعی طور پر یہ بیع جائز نہیں ہے۔ اس کے عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس بیع میں غرر (دھوکہ) ہے کیونکہ مشتری دیوالیہ ہو جائے تو بنک کی رقم ماری جائے گی یا وہ اپنی تمام املاک فروخت کر کے بیرون چلا جائے تو بنک کی رقم ہلاک ہو جائے گی۔ اس کے ناجائز ہونے کی دوسری وجہ علماء نے یہ بیان کی کہ یہ تاخیر اور زیادتی کے ساتھ نقود کا نقود سے تبادلہ ہے اور اس کی حرمت ربا الفضل میں منصوص ہے۔

Marfat.com

(11) مال کی افزونی اور حصول نفع کا ایسا معاملہ جس میں باہمی تعاون قطعاً مفقود ہو اور ایک طرف کا فائدہ دوسری جانب کے یقینی نقصان پر مبنی ہو جیسے جوا، لاٹری اور سٹہ وغیرہ۔ ان میں متعاقدین میں سے ایک جانب کا فائدہ دوسری جانب کے مکمل نقصان کا باعث اور سبب بنتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿یسئلونک عن الخمر والمیسر، قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس﴾ (بقرہ:)

''یہ لوگ آپ سے شراب اور جوا کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدہ بھی ہے۔''

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان، فاجتنبوہ، لعلکم تفلحون﴾ (المائدہ:۹۱)

''بلاشبہ شراب، جوا، بت اور پانسے یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو۔''

(12) ایسا کاروبار بھی اسلام کی نگاہ میں حرام اور ناجائز ہے جس میں معصیت ہو یا حرام اشیاء کی خرید وفروخت ہو یا ان اشیاء کی خرید وفروخت جو اپنی ذات میں نجس ہوں۔ جیسے مردار، خون اور خنزیر کا گوشت وغیرہ۔ شراب بھی ناپاک ہے، اس وجہ سے اس کی تجارت اور خرید وفروخت حرام اور ناجائز ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ جب سود کے بارہ میں سورۃ البقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اور شراب کی تجارت حرام فرمادی۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے لکھا ہے کہ اس آیت میں شراب کی حرمت پر دس دلیلیں ہیں:

پہلی دلیل: شراب کا ذکر جوئے، بت اور تیروں کے پانسوں کے ساتھ کیا اور یہ سب حرام ہیں۔

دوسری دلیل: شراب کو رجس (ناپاک) فرمایا اور ناپاک شی حرام ہوتی ہے۔
تیسری دلیل: شراب کو "عمل شیطان" فرمایا اور عمل شیطان حرام ہے۔
چوتھی دلیل: شراب سے اجتناب کا حکم دیا، اور جس سے اجتناب فرض ہو اس
ارتکاب حرام ہوتا ہے۔
پانچویں دلیل: فلاح کو شراب سے اجتناب پر معلق کیا، اس لیے اجتناب فرض ا
ارتکاب حرام ہوا۔
چھٹی دلیل: شراب کی وجہ سے شیطان عداوت پیدا کرتا ہے۔ اور عداوت حر
ہے۔
ساتویں دلیل: شراب کے ذریعہ شیطان بغض پیدا کرتا ہے اور بغض حرام ہے۔
آٹھویں دلیل: شراب کی وجہ سے شیطان اللہ کے ذکر سے روکتا ہے اور اللہ کے ذ
سے روکنا حرام ہے۔
نویں دلیل: شراب کے سبب سے شیطان نماز سے روکتا ہے۔
دسویں دلیل: اللہ تعالیٰ نے صیغۂ استفہام کے ساتھ نہی بلیغ کرتے ہوئے فرما
"کیا تم (شراب پینے سے) باز آنے والے ہو۔" (ردالمحتار شامی: ۵/۲۹۶)

سیدنا جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں یہ فرمایا: "اللہ اور اس کے رسول نے خمر، مردار اور بتوں کی بیع (خرید فروخت اور تجارت) کو حرام کر دیا ہے۔ عرض کیا گیا: "اے اللہ کے رسول! یہ فرمایئے مردار کی چربی کا کیا حکم ہے کیونکہ ان کو کشتیوں پر ملا جاتا ہے اور وہ کھالوں پر لگائی جا ہے، اور لوگ چراغ جلا کر اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "نہیں، وہ حرام ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کر دے، جب اللہ تعالیٰ نے ان مردار کی چربیوں کو حرام کیا تو انہوں نے اس کو پگھلا کر فروخت کر دیا اور اس کی قیمت کھالی (مسلم حدیث نمبر: ۳۹۳۶، نیل الاوطار: ۵/۔)

Marfat.com

شراکت

اسلام کے ابتدائی دور میں تجارت کی مختلف قسمیں رائج تھیں۔ان میں شراکت اور مضاربت کے اصولوں پر تجارت کی جاتی تھی۔رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف شراکت کو پسند فرمایا بلکہ دوسروں کے ساتھ شراکت کی بنیاد پر کاروبار بھی کیا۔شراکت ہے کیا؟ دو یا دو سے زیادہ افراد کسی کاروبار میں متعین سرمایہ کے ساتھ نفع کے حصول کے لیے اکٹھے ہوں اور کاروبار کے نفع ونقصان میں پہلے سے طے شدہ نسبتوں کے ساتھ شریک ہوں۔

اسلام میں شرکت کا جواز:

سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت کے وقت تجارت کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں تمام ناجائز طریقوں کی ممانعت فرمادی یا پھر ان میں ان تمام طریقوں کی اصلاح فرمادی جو اخلاق اور عدل وانصاف کے تقاضوں کے خلاف تھے۔اور ہر ایسا طریقہ جس میں نزاع یا فساد کی کوئی صورت پیدا ہو یا کسی ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے فریق کا سراسر نقصان ہو،ان تمام طریقوں کو ناجائز فرما کران سے روک دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے صنعت وتجارت اور زراعت کے جن طریقوں سے منع فرمایا یا ان میں ترامیم تجویز کیں،ان کے مطالعہ سے فقہاء کرام نے ان مصالح اور مفاسد کو متعین کیا جو کسی کاروبار کے جائز یا ناجائز ہونے کا باعث تھے۔ان اسباب کا اطلاق دوسرے معاملات کے بارہ میں تحقیق کر کے ان کے جائز یا ناجائز ہونے کا تعین کرنے میں مدد دیتا ہے،لہٰذا کوئی ایسا طریقہ جو سرکار دو عالم ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا اور آپ ﷺ نے اس طریقہ کو اختیار کیا، یا آپ نے اس طریقہ کے بارہ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا، یا اس طریقہ سے کسی شخص کو نہ روکا اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی یا

Marfat.com

ترمیم تجویز کی تو اسلام کی نگاہ میں وہ طریقہ جائز ہے۔ شراکت کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب اسلامی ریاست کے سربراہ تھے تو اس زمانہ میں شراکت اور مضاربت کے تجارتی طریقے رائج تھے۔ آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ ان طریقوں سے تجارت کرتے تھے۔ آپ نے ان طریقوں پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اس وجہ سے شراکت اور مضاربت دونوں شرعی طور پر تجارت کے جائز طریقے ہیں۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ سے مروی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: جب تک دو شرکاء میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہ کرے میں ان دونوں کا تیسرا ساتھی بن جاتا ہوں۔

(ابوداؤد، بیہقی، حاکم)

حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں بازاری کاروبار کرتا ہوں اور میرا ایک شریک (Partner) مسجد میں نماز پڑھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شاید تیرے کاروبار کی برکت اسی کی وجہ سے ہے۔ (المبسوط)

سائب بن شریک کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں تجارت میں شرکت کی تھی۔ جب مدینہ منورہ میں ان صاحب سے ملاقات ہوئی تو آپ ﷺ نے اس کا ذکر فرمایا اور اس شرکت کو پسندیدگی کے ساتھ یاد کیا۔ (المبسوط، سرخسی)

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان حصہ داروں کے ساتھ ہوتا ہے جو ایمان داری سے کام لیں۔ (ابوداؤد)

یہ تو نقلی دلائل تھے لیکن عقلی لحاظ سے بھی شراکت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

1- اگر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے اور وہ اس سے تجارت اور کاروبار کر کے دس ہزار روپیہ کماتا ہے۔ جب دو افراد ایک ایک لاکھ روپیہ ڈال کر دو لاکھ سے کوئی کاروبار کریں گے تو منافع بھی زیادہ ہوگا اور کاروبار بھی بڑے پیمانے پر ہوگا، اور ان کو کاروبار میں زیادہ سرمایہ فراہم کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔

2- یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس سرمایہ موجود ہو لیکن کاروبار کرنے کی پوری صلاحیت اس میں موجود نہ ہو، اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اگر وہ اکیلا کاروبار کرے تو اپنے کاروبار کو بخوبی سرانجام نہ دے سکے، لہٰذا دوسرے فریق

کی شراکت سے اس کے لیے کاروبار چلانا بہتر اور مفید ہوگا۔

3- موجودہ زمانے میں ایک آدمی تو معمولی کام بھی نہیں کر سکتا۔ اگر دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہوں گے تو وہ تقسیم کار کر کے اپنے کاروبار کو بخوبی چلا سکیں گے جس سے استعداد عملی بھی بڑھے گی اور کاروبار کی کامیابی کے امکانات بھی روشن ہوں گے۔

شرکت کے شرائط:

فقہاء نے شرکت کے کاروبار کے کچھ شرائط بھی لکھے ہیں، جن میں اہم شرائط درج ذیل ہیں:

1- باہمی رضامندی: قرآن وحدیث کے مطابق آپس کے لین دین اور شرکت میں باہمی رضامندی ایک بنیادی شرط ہے۔

2- فریقین کا بالغ ہونا: معاہدہ شراکت کے ایک شرط یہ بھی ہے کہ فریقین بالغ ہوں کیونکہ نابالغ اور بچے کا معاہدہ قابل قبول نہیں ہوتا۔

3- عاقل ہونا: فریقین کا عمر کے لحاظ سے بالغ ہونے کے ساتھ ذہنی لحاظ سے بھی بالغ اور عاقل ہونا ضروری ہے تاکہ وہ کاروباری معاملات کو بخوبی سمجھ سکیں۔ مجنون اور بے عقل کا معاہدۂ شراکت کوئی وزن نہیں رکھتا۔

4- کاروبار بھی جائز ہو۔ حرام اشیاء اور منشیات یا دوسری ناجائز چیزوں کا کاروبار ویسے ہی شرعی طور پر ناجائز ہے لہٰذا اس میں شراکت بھی ناجائز ہے۔

5- فریقین کے نفع کا پہلے سے تعین ہوتا کہ بعد میں کوئی نزاع اور جھگڑا پیدا نہ ہو۔

6- نقصان کی ذمہ داری کا تعین ہو کیونکہ کاروبار میں جس طرح نفع کا امکان ہوتا ہے اسی طرح نقصان کا امکان بھی ہوتا ہے۔ نقصان ہونے کی صورت میں فریقین اپنے اپنے سرمایہ کی شرح سے نقصان کو برداشت کریں گے۔

شرکت کی قسمیں:

فقہاء کے نزدیک شراکت کی کئی قسمیں ہیں جو حسب ذیل ہیں:

Marfat.com

1- شراکت ملک:

یہ وہ شراکت ہے جس میں دو یا دو سے زائد افراد کسی شی یا جائداد میں ملکیت کے حقوق کی بنا پر شریک ہوتے ہیں۔ یہ شراکت دو طرح سے ہو سکتی ہے جبری شراکت یعنی جس میں انسان کا اپنا اختیار نہیں ہوتا اور وہ دوسرے کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ دوسری قسم اختیاری شراکت کی ہے جس میں ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے شریک ہوتا ہے۔

2- شراکت عقود:

یہ وہ شراکت ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ کر کے شریک ہوتے ہیں۔ فقہاء نے اس کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

(1) شراکت مال (2) شراکت ابدان (3) شراکت وجوہ

پھر ان میں سے ہر ایک قسم کو پھر دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(1) شرکۃ المفاوضہ (2) شرکت العنان

(ا) شراکت مال:

اس شراکت میں دو یا دو سے زائد فریق معین مال کے ساتھ منافع کمانے کی غرض سے ایک دوسرے کے ساتھ منافع کی نسبت طے کر کے شریک ہوتے ہیں اس کی جیسا کہ بتایا گیا ہے دو اقسام ہیں (1) شراکت مفاوضہ اور (2) شراکت عنان

(1) شراکت مفاوضہ:

شراکت مفاوضہ میں دو یا زائد فریق مساوی بنیادوں پر ایک دوسرے کے ساتھ شراکت کرتے ہیں۔ ان کی شرائط حسب ذیل ہیں:

1- فریقین کا نقد سرمایہ مساوی ہو۔

2- ہر فریق دوسرے کا نمائندہ ہو۔

3- فریقین عاقل ہوں، پاگل اور ناسمجھ نہ ہوں۔

Marfat.com

4- فریقین بالغ ہوں نابالغ اور بچے نہ ہوں۔
5- آزاد ہوں غلام نہ ہوں۔
6- دونوں ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔
7- ہر فریق دوسرے فریق کی ذمہ داری پر اپنے معاملات اور عمل کے لیے جواب دہ ہو۔
8- نفع ونقصان مساوی بنیادوں پر تقسیم ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ شرکت کی ایک اختلافی شکل شرکت المفاوضہ ہے۔ اس میں شرکاء اپنے تمام سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوتے ہیں، لیکن ان سرمایوں کا باہم مساوی ہونا ضروری ہے۔ خسارہ کی صورت میں شرکاء کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے۔ نفع کی صورت میں ہر شریک کو برابر برابر حصہ ملتا ہے۔ شرکت کی اس شکل کو صرف فقہ حنفی میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بدائع الصنائع: ۶/۵۶، بدایۃ المجتہد لابن رشد: ۲/۲۵۱)

(2) شرکت عنان:

شرکت عنان میں دو یا دو سے زیادہ فریق ایک دوسرے کے ساتھ شراکت کا مطالبہ غیر مساوی بنیاد پر کر سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں شرکت مفاوضہ کی طرح کڑی شرطیں نہیں ہیں جیسے:

1- فریقین کے سرمایہ کی نسبتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔
2- بچے اور بڑے، بالغ اور نابالغ کے درمیان شراکت ہو سکتی ہے۔
3- اس میں دونوں فریقوں کے مذہب کا یکساں ہونا ضروری نہیں۔ مسلمان اور کافر بھی شریک ہو سکتے ہیں۔
4- شرکت مال میں جائداد کے استعمال اور تصرف کے اختیارات اور کاروبار کے معاملات میں حصہ لینے کی نسبتیں اور شرحیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ سرمایہ کا مساوی اور یکساں ہونا ضروری نہیں۔

Marfat.com

5- منافع کی تقسیم سرمایہ (Capital) کے تناسب سے نہیں بلکہ آپس میں طے شدہ شرحوں کے مطابق کی جاتی ہے۔

6- نقصان میں شراکت فریقین کے سرمایوں کی نسبت سے ہوگی۔

(ب) شراکت اعمال:

شراکت کی یہ قسم دو یا دو سے زیادہ فریقوں کے درمیان ہوتی ہے۔ ہاتھوں سے کام کرنے والے کاریگروں کے درمیان یہ شراکت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو شرکۃ الصنائع بھی کہتے ہیں۔ جیسے بڑھئی اور لوہار کے درمیان یا لوہار اور لوہار کے درمیان۔ اس شرکت کی بھی دو اقسام ہیں:

(1) شرکت مفاوضہ اور (2) شرکت عنان

شرکت اعمال شوافع کے نزدیک ناجائز ہے جبکہ احناف، حنابلہ اور مالکیوں کے نزدیک جائز ہے۔

(ج) شرکت الوجوہ:

اس شرکت میں دو فریق ایک دوسرے کے ساتھ شرکت کا معاملہ اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں سرمایہ کا عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ ایک فریق یا کمپنی اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتی ہے اور دوسرا فریق یا فرم اپنے اثر ورسوخ کی بنیاد پر ادھار مال خرید کرا کے مارکیٹ میں نقد فروخت کرتی ہے۔ ایسی فرم یا ادارہ کے ساتھ شراکت شرکۃ الوجوہ کہلاتی ہے۔ شوافع میں یہ طریقۂ شرکت بھی ناجائز ہے۔

شرکت مفاوضہ کی شرائط چونکہ بہت سخت ہیں، اس وجہ سے یہ طویل عرصے جاری نہیں رہ سکتی۔ کاروباری اور تجارتی حالات تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں اس لیے ان کے مطابق کاروبار میں بھی تبدیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن شرکت مفاوضہ کی شرائط کے غیر لچک دار ہونے کی وجہ سے شراکت کا یہ معاملہ ان تبدیلیوں کو قبول نہیں کرتا۔ جب کہ شرکۃ العنان جو کہ تمام فقہاء کے نزدیک جائز طریقہ کاروبار ہے، لیکن اس میں صرف ایک شرط پر فقہاء کا اختلاف ہے۔ کچھ فقہاء کا کہنا ہے کہ ”کوئی شریک دوسرے

Marfat.com

کے عمل کے بدلہ میں نقصان کی تلافی یا ازالہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔" صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ عنان کا مطلب بچنا یا پرہیز کرنا ہے اور مذکورہ بالا شرط اگر نہ ہو تو یہ مطلب پورا نہیں ہوتا، جبکہ اکثر فقہاء کا قول ہے کہ عنان کے لغوی معنی جانور کی باگ اور لگام کے ہیں، اس لیے شرکت العنان میں تمام حصہ دار تصرف کے اختیارات رکھتے ہیں، اس صورت میں درج بالا شرط غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں شرکۃ العنان کی ایک شرط یہ ہے کہ ہر فریق دوسرے کا نمائندہ ہے۔ یہ شرط مندرجہ بالا شرط کی صورت میں پوری نہیں ہو سکتی، اس لیے اوپر والی شرط ضروری اور لازمی نہیں ہے۔

یہ تو شراکت کی وہ پرانی اور قدیم اقسام ہیں جن کا ذکر فقہاء نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ لیکن آج کل شراکت کی جدید اقسام ہیں جن کا ذکر موجودہ معاشیات کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ان میں سے مشہور حسب ذیل ہیں:

1- کاروباری شراکت (Partnership)
2- محدود کمپنیاں (Limited Companies)
3- مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں (Joint Stock Companies)
4- انجمن ہائے امداد باہمی (Cooperatives)

شرکت کے احکام:

نفع ونقصان کے لحاظ سے شراکت کے مندرجہ ذیل احکام ہیں:

(1) نفع کی تقسیم:

کاروبار میں نفع ہونے کی صورت میں وہ نفع مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھ کر فریقین میں تقسیم ہوگا۔

1- نفع کی تقسیم فریقین کے مابین طے شدہ نسبتوں کے حساب سے ہوگی اور ہر فریق کا حصہ فی صد یا نسبت کی صورت میں متعین کیا جائے گا، اور کسی فریق کے لیے نفع میں کوئی رقم پہلے سے متعین نہیں کی جائے گی۔
2- نفع کی تقسیم میں فریقین کے سرمایہ، عملی شمولیت اور ذمہ داری کے پیش نظر نفع

کی نسبت متعین کی جائے گی، البتہ ان باتوں کو نظر انداز کر کے بھی نفع کی تقسیم کی جاسکتی ہے۔

3- مساوی سرمایہ کاری کے باوجود نفع کی نسبتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

4- حسابات کرتے وقت پہلے اصل سرمایہ علیحدہ کیا جائے گا، اس کے بعد فاضل رقم کو دیکھا جائے گا۔ اگر رقم بچی تو منافع اور اصل اگر سرمایہ پورا نہ ہوا تو نقصان۔

5- مسلسل جاری کاروبار میں نقصانات کا ازالہ آئندہ ہونے والے نفع سے کیا جاسکتا ہے۔

6- کاروبار کے نفع کے حق دار اور نفع کے مالک اس وقت قرار پائیں گے جب اصل سرمایہ مالکان سرمایہ کو واپس مل جائے۔ مالکان کا اپنے سرمایہ پر قبضہ عملاً بھی ہوسکتا ہے اور قانوناً بھی۔

(2) نقصان کی ذمہ داری:

یہ تو منافع کی تقسیم کا معاملہ تھا لیکن کاروبار میں نقصان کا احتمال بھی ہوسکتا ہے اور نقصان کہتے ہیں اصل سرمایہ کے ڈوب جانے والے حصہ کو۔ نقصان کی ذمہ داری کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھے جائیں گے:

1- فقہاء کے نزدیک نقصان ہمیشہ کاروبار میں لگے ہوئے سرمایہ کی نسبت سے تقسیم کیا جائے گا۔ کوئی صاحب سرمایہ اپنے نسبتی حصہ کے نقصان کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا۔

2- جس فریق نے کاروبار میں سرمایہ نہ لگایا ہو اس کو نقصان برداشت نہیں کرنا ہے جیسا کہ مضاربت میں ہوتا ہے۔

3- مسلسل ہونے والے نقصان کو آئندہ ہونے والے منافع سے بتدریج منفی کیا جاسکتا ہے اور اس طریقہ سے نقصان کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

شراکت کی ذمہ داریاں اور حقوق:

1- ایک فریق شراکت دوسرے فریق کی اجازت سے (اجازت زبانی ہو یا تحریری

لیکن تحریری بہتر ہے) دوسرے لوگوں کے ساتھ شراکت یا مضاربت کا معاملہ کرسکتا ہے۔ تا کہ تجارت اور کاروبار کو وسعت دی جا سکے یا آسانی کے ساتھ کاروباری معاملات کونمٹایا جا سکے۔

-2 مشترکہ سرمایہ میں سے کوئی فرد یا افراد تمام شرکاء کی اجازت کے بغیر نہ تو قرض دے سکتے ہیں اور نہ ہی مشترکہ کاروبار کے لیے قرض لے سکتے ہیں۔

-3 اگر دوسرے شرکاء نہ منع کریں تو ہر شریک کاروبار کو مال ادھار فروخت کرنے کی اجازت ہے۔

-4 مشترکہ کاروباری ادارہ کی طرف سے ادھار خریدی جانے والی اشیاء اور خدمات کی قیمت ادارہ یا کمپنی کی مالیت سے زیادہ نہ ہو۔ ایسا کرنے کے لیے تمام شرکاء کی رضامندی ضروری ہے۔

-5 شراکت میں کوئی فریق دوسرے شرکاء کی اٹھائی ہوئی مالی ذمہ داریوں کا کفیل اور ضامن نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ تمام شرکاء کی اجازت سے ایسا کیا گیا ہو۔

شراکت کی مدت:

-1 کوئی فریق بھی یہ پورا پورا حق رکھتا ہے کہ شراکت کے معاہدہ کو جب چاہے منسوخ کر دے۔ دو سے زیادہ افراد کی شراکت کی صورت میں دیگر فریق معاہدہ کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

-2 شراکتی کاروبار ایک مقررہ مدت کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔

-3 کسی ایک شریک کاروبار کے مرنے کی صورت میں شراکت ختم ہو جاتی ہے، البتہ دو سے زیادہ افراد کی شراکت کی صورت میں اسے جاری بھی رکھا جا سکتا ہے۔

شراکت کی منسوخی:

جس طرح شراکت کا معاہدہ قائم ہوتا ہے اسی طرح مندرجہ ذیل صورتوں میں شراکت کا معاہدہ منسوخ بھی ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

1- فریقین میں سے ایک فریق کاروبار میں سے علیحدگی اختیار کر لے۔
2- فریقین میں سے ایک کی موت واقع ہو جائے۔
3- ایک یا دونوں فریق شراکت ذہنی طور پر معذور ہو جائیں مثلاً بالکل پاگل جائیں یا کسی حادثہ میں اپنی یادداشت کھودیں۔
4- کسی ایک فریق یا فریقین کو اپنے حصہ کے قانونی استعمال سے روک دیا جائے

موجودہ دور میں کاروبار اکثر و بیشتر لمبے عرصہ تک چلتے ہیں اور ان کی منسو درج ذیل وجوہ کی بناء پر ہوتی ہے:

1- حکومت کاروبار کو سرکاری ملکیت میں لے لے یعنی نیشنلائز کر لے۔
2- حکومت اس کاروبار کو جبراً روک دے۔
3- کسی عدالتی فیصلہ یا عدالتی کاروائی کی بناء پر کاروبار کو روک دیا جائے۔
4- کاروباری شرکاء کی اکثریت کاروبار کو ختم کرنا چاہے یا معاہدۂ شراکت کو منسو کرنا چاہے۔

شراکت اور صنعتی کاروبار:

ہماری فقہ کی کتابوں میں صنعتی کاروبار کے سلسلہ میں کوئی مباحث نہیں کیونکہ اس زمانہ میں اتنے بڑے بڑے صنعتی یونٹس نہیں ہوتے تھے۔ یہ سارے صنعتی یونٹ صنعتی انقلاب کے بعد وجود میں آئے، لیکن اسلام میں کاروبار کی ہر وہ شکل جو کسی شخص کے لیے انفرادی طور پر جائز ہے، اس میں شراکت بھی جائز ہے۔ جب عام کاروبار میں شراکت جائز ہے تو صنعتی کاروبار کی تنظیم وترویج بھی شراکت کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ و اس کی یہ ہے کہ:

1- متعدد فقہائے کرام کے نزدیک صنعتی کاروبار بھی دوسری انسانی ضروریات طرح فرض کفایہ ہے، لہٰذا جن اعمال کی انجام دہی کی ضرورت ہے اس میں اشتراکِ عمل ضروری نہ بھی ہو تو جائز ہے۔
2- موجودہ زمانہ میں صنعتی کاروبار کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہے

Marfat.com

ہے جس کی فراہمی ایک فرد کے لیے ممکن نہیں ہوتی، لہٰذا سرمایہ دار لوگ آپس میں تعاون کر کے شراکت کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرتے ہیں۔

3- غیر سودی معیشت میں سرمایہ کے حصول کا ذریعہ شراکت یا مضاربت ہے، اس لیے بھی صنعتی یونٹس میں شراکت جائز ہے۔

اسی طرح حصص کے ذریعہ کسی ایسے صنعتی کاروبار میں شراکت جائز ہے جو حرام اشیاء اور خدمات کی پیداوار اور فروخت اور لین دین نہیں کرتا۔ غیر سودی بینک کاری کا مضبوط ڈھانچہ شراکت اور مضاربت کی بنیاد پر استوار کیا جا سکتا ہے۔

........❖❖❖........

Marfat.com

مضاربت

اپنے سرمایہ کو نفع آور کاروبار اور تجارت میں لگانے کی ایک شکل مضاربت بھی ہے۔ مضاربت کا لفظ ''ضرب'' سے مشتق ہے جس کے معنی سفر کے ہیں، تجارت میں عموماً سفر درپیش ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ لفظ ''ضارب فی الارض'' سے ماخوذ ہے جس سے مراد ہے زمین کے طول و عرض میں سفر کرنا جس کا اطلاق مضاربت کے معاملہ میں ضارب کی رب المال کے سرمایہ کے ساتھ جدوجہد پر ہوتا ہے۔ مضاربت کے لیے دوسری اصطلاح ''قراض'' اور ''مقارضہ'' استعمال ہوتی ہے جو قراضہ سے ماخوذ ہے۔ قراضہ کا معنی ہے کاٹنا۔ مضاربت میں اس سے مراد یہ ہے کہ ایک سرمایہ دار آمدنی میں سے بچا بچا کر (کاٹ کاٹ کر) کچھ سرمایہ جمع کرتا ہے اور اسے کاروبار میں لگاتا ہے جب کہ ''ضارب'' منافع میں سے حصہ ''رب المال'' (صاحب سرمایہ) کو دیتا ہے۔ فقہ حنفی اور فقہ حنبلی میں ایسے کاروبار کے لیے ''مضاربت'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جب کہ فقہ شافعی اور فقہ مالکی میں ''قراض'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

اس کی تعریف فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ مالک اپنا سرمایہ کسی کاروباری شخص کے سپرد کردے۔ صاحب سرمایہ صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا کاروباری فریق اس سرمایہ کے ذریعہ کاروبار چلاتا ہے۔ یہ مضاربت کی سادہ ترین شکل ہے جس میں ایک شریک صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا فریق صرف کاروباری جدوجہد کرتا ہے۔

کاروبار کے اس طریقہ سے اگر کاروبار میں نفع ہوگا تو دونوں فریق اس نفع میں سے طے شدہ نسبتوں کے مطابق حصہ دار ہوں گے۔ اور اگر کاروبار میں نقصان ہوگا تو اس مالی نقصان کو سرمایہ لگانے والا برداشت کرے گا۔ کاروباری فریق کو یہ نقصان ہوگا کہ اس

کی جدوجہد اور سعی وکوشش بے ثمر گئی اور اسے اس کا کوئی صلہ اور فائدہ نہ ملا۔ کسی فریق کے حق میں بہرصورت کسی متعین رقم کی ادائیگی کا معاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں فریقوں میں سے کوئی فریق بھی یعنی نہ سرمایہ فراہم کرنے والا اور نہ ہی کاروباری جدوجہد کرنے والا یہ شرط پیش کرسکتا ہے کہ نفع ہو یا نقصان اسے ایک متعین رقم ضرور ملنی چاہیے۔ فقہاء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ سرمایہ فراہم کرنے والا فریق نقصان کی ذمہ داری کسی صورت بھی کاروباری فریق کے سر نہیں ڈال سکتا۔ وہ یہ بات ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ نقصان کی صورت میں بھی اسے اس کا اصل سرمایہ واپس ملنا چاہیے۔ کاروبار میں نقصان کے باعث اگر پورا سرمایہ بھی ڈوب جائے تو اس کی یا اس کے کسی حصہ کی ادائیگی کاروباری فریق کے ذمہ نہیں ہوگی۔ (بدائع الصنائع:٦/٧٧)

البتہ نفع کی تقسیم کے لیے دونوں فریق باہمی رضامندی سے جو شرح اور تناسب بھی طے کریں وہ جائز ہے۔

کاروباری جدوجہد کرنے والا شخص تو ہر لحاظ سے نفع حاصل کرنے کا مستحق ہے۔ لیکن جو فریق کاروباری جدوجہد نہیں کرتا اور نہ ہی وہ کاروباری فیصلوں اور ان کے نفاذ میں حصہ لیتا ہے۔ اس کو نفع اس کے سرمایہ کا ملتا ہے کیونکہ کاروبار شروع کرنے، کاروباری فیصلوں کو نافذ کرنے، تیار کیے جانے والے مال کے لیے پیداواری خدمات اور خام مال (Raw Material) مہیا کرنے اور کاروباری عمل کو جاری رکھنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ سرمایہ موجود ہوتا کہ کاروباری جدوجہد کرنے والا فریق اس سرمایہ کی مدد سے اپنے فیصلوں کو عملی جامہ پہنا سکے کیوں کہ بغیر سرمایہ کے کاروباری فریق نہ کوئی فیصلے کرسکتا ہے اور نہ کوئی کاروباری اسکیمیں بنا سکتا ہے اور نہ ہی ان اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ سرمایہ کی بدولت ہوتا ہے۔ چنانچہ سرمایہ دار نے کاروباری فرد کو سرمایہ فراہم کیا اور سرمایہ پر وارد ہونے والے تمام خطرات کو خود برداشت کرنے کا ذمہ لیا۔ عدم یقین کی فضا میں کاروباری فرد جو فیصلے بھی کرتا ان کے نتیجہ میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال اور امکان تھا۔ اپنے سرمایہ کو کاروباری فرد کے فیصلوں کا تابع بنا کر اور نقصان کی ذمہ داری سے کاروباری فریق کو بری قرار دے کر سرمایہ فراہم کرنے والے

نے عدم یقین کی فضا میں کاروبار میں ایک اہم حصہ لیا، لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جب کاروبار میں نفع ہو تو اس کا فیض سرمایہ دار کو بھی پہنچے کیونکہ اس نے اپنے سرمایہ سے کاروباری عمل میں ایک زبردست حصہ لیا اور نقصان کی ذمہ داری بھی قبول کی۔

مضاربت کی اہمیت احادیث سے:

احادیث میں مضاربت کو پسند کیا گیا ہے اور اس کے بارہ کتابوں میں بہت سی احادیث منقول ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

1- سرکار دو عالم ﷺ نے نبوت سے قبل سیدہ خدیجہ سلام اللہ علیہا کے مال کے ساتھ مضاربت کے تحت تجارت کی۔ (المبسوط)

2- سیدنا عباسؓ مخصوص شرائط کے ساتھ مضاربت کا کاروبار کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ (المبسوط)

3- سیدنا حکیم بن حزامؓ انہی شرائط کے ساتھ مضاربت کرتے تھے۔ (المبسوط)

4- سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ مضاربت میں برکت ہے۔ (ابوداؤد)

5- بعض روایات میں ہے کہ سیدنا عثمان بن عفانؓ بھی مضاربت کیا کرتے تھے۔

6- سیدنا عمرؓ نے بھی زید بن خلیدہ کے ساتھ مضاربت کی۔ (المبسوط)

7- سیدنا عمرؓ نے بیت المال سے بھی مضاربت کے اصولوں پر کاروبار کے لیے رقم دی۔ (المبسوط)

8- سیدنا عمرؓ کے دو صاحبزادے عبداللہؓ اور عبید اللہؓ فوجی خدمات کے سلسلہ میں عراق گئے۔ واپسی پر بصرہ کے گورنر سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ نے انہیں کچھ نقد رقم دی جو مدینہ پہنچ کر سیدنا عمر امیر المومنینؓ کے حوالہ کرنی تھی۔ اس رقم سے سیدنا عمرؓ کے صاحبزادوں نے مال تجارت خریدا اور مدینہ طیبہ پہنچ کر نفع پر فروخت کر دیا اور اصل رقم سیدنا عمرؓ کے پاس جمع کروا دی۔ سیدنا عمرؓ نے پوچھا: "کیا اسی طرح تمام سپاہیوں کو رقم دی گئی تھی یا صرف تمہیں دی گئی کیونکہ تم خلیفہ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے کہا کہ صرف ہمیں دی گئی۔ آپ نے ان کو تمام رقم نفع

Marfat.com

سمیت بیت المال میں جمع کروانے کا حکم دیا۔ سیدنا عبیداللہؓ نے کہا کہ اگر یہ رقم ان سے گم ہو جاتی تو پھر انہیں تمام رقم بیت المال میں جمع کروانا پڑتی؟ وہیں پر موجود ایک شخص نے کہا کہ یہ مضاربت کی شکل ہے اس لیے نصف نفع بیت المال میں جمع ہو اور نصف دونوں مضارب کو دیا جائے۔ اس کو سیدنا عمرؓ نے قبول فرمالیا۔

عقلی طور پر بھی مضاربت کا جواز نکلتا ہے تا کہ اہم انسانی مصالح کا تحفظ کیا جا سکے۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس سرمایہ تو ہوتا ہے لیکن کاروبار میں سے کوئی تجربہ نہیں ہوتا یا ذہنی اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے وہ کاروباری دوڑ دھوپ اور جدوجہد نہیں کرسکتا۔ اس صورت میں اپنی روزی کمانے کے لیے یا اپنے سرمایہ سے نفع حاصل کرنے کے لیے اسے مضاربت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور یہ سرمایہ انفرادی اور ملکی معیشت کے بہاؤ کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بینکوں کی وجہ سے سود کی لعنت زندگی کے ہر شعبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ کاروباری لوگ اپنے کاروبار کو بڑھانے کے لیے اور وہ لوگ جن میں کاروبار کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن سرمایہ نہیں ہوتا، اکثر و بیشتر آج کل بینکوں کا رخ کرتے ہیں تا کہ انہیں وہاں سے سود پر رقم اور سرمایہ مل جائے۔ اور سود نظام معیشت کے لیے ایک کینسر ہے۔ جو غریبوں کو کھا کر امیروں کی تجوریاں بھر دیتا ہے۔ مضاربت کو اس بینک کاری کی متبادل اساس کے طور پر اختیار کر کے معاشرہ کو سود کی لعنت سے پاک کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر کام کرنے والی کمپنیاں بجائے بینکوں کی طرف رجوع کرنے کے اپنے مالی وسائل کی کمی مضاربت کی بنیاد پر جمع اور فراہم کرسکتی ہیں۔ معاشرہ میں ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے جو مالی وسائل تو رکھتے ہیں لیکن کاروباری صلاحیت اور اہلیت ان میں موجود نہیں ہوتی، لہٰذا وہ کوئی نفع بخش کام نہیں کر سکتے۔ مضاربت کے ذریعہ ان کے ان مالی وسائل کو متحرک اور فروغ معیشت کے لیے کارآمد اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے جس سے ان کی باوقار روزی اور آمدنی کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ حکومت بھی اپنے بعض منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مضاربت کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرسکتی ہے لیکن اس پاکستان میں جو

Marfat.com

مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا تھا، وہاں کی حکومت نے یہ قسم اٹھا رکھی ہے کہ ہر غیر اسلامی کام پروان چڑھانا ہے اور کسی صورت بھی اپنے مسائل کو دین کی بنیاد پر حل نہیں کرنا۔ عدالت نے سود کو بند کیا تھا لیکن حکومت نے اپیل کروا کر سپریم کورٹ سے اس فیصلہ کو ختم کرا اور اب کم از کم نصف صدی تک کوئی امید نہیں کہ کوئی ایسی حکومت آئے جو سود کو سرکاری طور پر حرام قرار دے کیونکہ اب حالت یہ ہے کہ پاکستان میں دستور کی نہیں بلکہ ''بدستور'' کی حکمرانی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب پاکستان میں کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے ملک میں پارلیمانی نظام بھی ہے اور صدارتی نظام بھی جمہوریت بھی ہے اور فوجی حکومت بھی، وزیراعظم خودمختار بھی ہے اور بے اختیار بھی، جہاد دہشت گردی بھی ہے اور ہمارا ماٹو بھی، دو قومی نظریہ ہماری بنیاد بھی ہے اور نظریہ ضرورت ہماری بقا بھی، ایٹمی قوت ہمارے لیے باعث فخر بھی ہے اور باعث شرم بھی، ہندوستان سے ہماری دشمنی بھی ہے اور ہماری دوستی بھی، ہم نے کشکول توڑ دیا ہے اور نیا لے بھی لیا ہے، قائداعظم پاکستان کے بانی بھی تھے اور سیکولر بھی، ریموٹ کنٹرول سے بم دھماکے دہشت گردی ہیں اور بی باون سے بم باری امن پسندی، اسرائیل کا ایٹمی پروگرام تعمیری ہے اور ایران کا تخریبی، عراق کے ہتھیار تباہی پھیلانے والے تھے اور امریکہ اور یورپ کے ہتھیار خوشحالی لانے والے۔ لندن میں پچاس آدمیوں کے مرنے کا ہمیں بہت افسوس ہے اور افغانستان میں پچاس ہزار مرنے کا ہمیں کوئی گلہ نہیں، بش اور بلیئر بہت اچھے ہیں اور ملا عمر اور اسامہ بہت برے۔ اللہ میاں بہت بڑے ہیں اور امریکہ بھی۔ ہم امریکہ سے ڈرتے ہیں اللہ میاں سے نہیں ڈرتے، ہم قرون اولیٰ میں واپس جانے سے خوف زدہ ہیں جہنم میں جانے سے نہیں، ہم قرآن حکیم کی بے حرمتی پر برہم ہیں قرآن والوں کی بے عزتی پر نہیں۔ مختصر یہ کہ ستاون سال کے بعد پاکستان کے بارہ میں ہمارا کچھ نظریہ ہی اور ہوگیا ہے، اور اب اسلام کے بجائے امریکہ ہمارے دلوں پر مستولی ہوگیا ہے۔

مضاربت کے احکام:

سرمایہ دار ایک مضارب کے ساتھ مل کر جو مال حوالے کرتا ہے، شریعت میں

Marfat.com

اس کے کچھ احکام ہیں۔

1- مضارب کو مال حوالہ کرنے کے بعد کاروبار شروع کرنے سے پہلے تک اس سرمایہ کی حیثیت امانت کی ہے اور امانت کی حفاظت مضارب کی ذمہ داری ہے، اور جب صاحب سرمایہ اس رقم کو واپس مانگے تو اس کی واپسی بھی مضارب کی ذمہ داری ہے۔ البتہ مال ضائع ہو جانے کی صورت میں مضارب پر ضمان (جرمانہ) نہیں ہوگا۔

2- کاروبار شروع ہو جانے کے بعد مضارب کی حیثیت صاحب سرمایہ کے وکیل کی ہو جاتی ہے۔

3- کاروبار میں منافع ہونے کی صورت میں مضارب کی حیثیت مالیاتی معاہدہ کے شریک کی ہو جاتی ہے اور ہر شریک کاروبار کو معینہ اور طے شدہ نسبت سے منافع کی تقسیم کی جائے گی۔

4- اگر کسی سے معاہدۂ مضاربت منسوخ ہو جائے تو اس صورت میں یہ معاہدۂ مضاربت نہیں بلکہ معاہدۂ روزگار کی شکل اختیار کرے گا اور مضارب کی حیثیت ملازم کی ہو جائے گی۔ نفع یا نقصان صاحب سرمایہ کا ہوگا جب کہ مضارب کو اس کی اجرت ملے گی۔

5- اگر مضارب معاہدۂ مضاربت کی شروط میں سے کسی شرط کو تسلیم نہ کرے تو اس کی حیثیت غاصب کی ہوگی اور اس پر اصل سرمایہ کی واپسی کی ذمہ داری ہوگی۔

6- اگر معاہدۂ مضاربت کی ایک شرط یہ ہو کہ سارے کا سارا منافع مضارب کو ملے گا تو یہ معاہدۂ مضاربت نہیں بلکہ مضارب کی حیثیت مقروض کی ہوگی، اور یہ معاملہ قرض کا معاملہ ہوگا۔ نفع ونقصان کی ذمہ داری اس کی اپنی ہوگی اور سرمایہ کے ضیاع اور ہلاکت کی صورت میں سرمایہ کی صاحب سرمایہ کو واپسی اس کی ذمہ داری ہوگی۔

7- اگر شرط یہ ہو کہ سارے کا سارا منافع مالک کا ہوگا تو یہ معاملہ عقد البضاعہ کا ہوگا۔

Marfat.com

ارکان مضاربت:

مضاربت کے ارکان دو ہیں:

(1) ایجاب اور (2) قبول

اس کے لیے الفاظ کی ضرورت ہے جو جانبین کے معاہدۂ مضاربت پر رضامندی کو ظاہر کریں۔ مثلاً ایک فریق کہتا ہے کہ یہ مال لو اور اس سے مضاربت کرو یا میرا یہ مال مضاربت کے لیے لو۔ اس پر جو فائدہ اور نفع ہوگا وہ ہم آدھا آدھا یا جس نسبت سے ہو، تقسیم کرلیں گے اور جواب میں مضارب کہے کہ میں نے یہ سرمایہ لے لیا یا میں اس معاہدہ پر راضی ہوں یا میں نے تمہاری یہ پیش کش قبول کی۔

مضاربت کے شرائط:

مضاربت کے معاہدہ کی فقہاء نے کچھ شرائط لکھی ہیں جن میں سے اہم حسب ذیل ہیں:

1- سرمایہ (Capital) نقدی یا سونے چاندی کی صورت میں ہونا چاہیے۔ مال تجارت کے ساتھ مضاربت جائز نہیں ہے۔ نقدی یا سونا چاندی ضروری ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عروض التجارۃ (یعنی مال تجارت) کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے قدر سرمایہ اور منافع کی مقدار بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک شخص کہتا ہے کہ یہ کپاس یا کپڑا ایک ہزار روپے کا ہے۔ یہ کپڑا لو اور اس کو مضاربت کی بنا پر فروخت کرو۔ یہ معاملہ درست نہیں ہے۔ البتہ اگر مضارب سے کہا جائے کہ یہ مال تجارت لو اور اس کی فروخت سے جو سرمایہ حاصل ہو اس کے ساتھ مجھ سے مضاربت کرو تو فقہائے احناف کے نزدیک یہ جائز ہے۔

2- معاہدۂ مضاربت کے وقت سرمایہ معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں کسی قسم کا تنازعہ پیدا نہ ہو۔

3- معاہدۂ مضاربت کے وقت صاحب سرمایہ کے پاس سرمایہ کا موجود ہونا ضروری ہے۔ مضارب پر اگر قرض ہو تو اس کی بنیاد پر مضاربت کا معاہدہ نہیں

ہو سکتا البتہ اگر مضارب کو کسی اور شخص سے قرض وصول کرنے اور اس کے بعد کاروبار شروع کرنے کے لیے کہا جائے تو اس صورت میں مضارب صاحب سرمایہ کا نمائندہ ہوگا۔

معاہدہ کے وقت سرمایہ مضارب کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ اس میں تصرف کر سکے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سرمایہ کار مضارب کے ساتھ حصہ لے گا تو وہ معاہدہ فاسد (منسوخ) ہو جائے گا۔

متوقع منافع میں سے مضارب کا حصہ (فی صد یا تناسب کے لحاظ سے) معلوم ہونا چاہیے، مثلاً نصف یا ایک تہائی وغیرہ۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس سرمایہ سے کاروبار کرو اور منافع میں سے تمہیں دو ہزار ملے گا تو مضاربت کا معاملہ فاسد ہو جائے گا۔ اسی طرح یہ کہنا کہ نصف اور اس کے علاوہ ایک ہزار تو یہ صورت بھی درست نہیں ہے۔

مضارب کا حصہ نفع میں سے طے کیا جائے گا راس المال یعنی اصل سرمایہ میں سے نہیں۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ نصف مال تمہارا اور منافع میں سے بھی اتنا اور اتنا حصہ، تو یہ درست نہیں۔ اسی طرح یہ شرط بھی درست نہیں کہ مضارب کو نصف یا تیسرا حصہ نفع کے علاوہ ماہانہ تنخواہ بھی ملے گی۔ یہ شرط باطل ہے جب کہ معاہدہ درست ہے۔ مضارب صرف نفع میں سے حصہ کا مالک ہے، لیکن اگر شرط یہ ہو کہ مضارب کو رہنے کو مکان یا زراعت کے لیے زمین بھی دی جائے گی تو معاہدہ فاسد ہوگا۔

اگر مضارب کے پاس سرمایہ کاری کا مال یا مالی ذرائع بطور رہن موجود ہوں اور صاحب سرمایہ نے مضارب سے قرض لے رکھا ہو تو ایسے سرمایہ پر مضاربت درست نہیں ہے۔

مضارب کے حقوق:

اسلام میں جس طرح صاحب سرمایہ کے کچھ حقوق ہیں اسی طرح مضارب

Marfat.com

کے بھی حقوق اور فرائض ہیں، جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

1- مضارب کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاہدہ کی تمام شقوں اور شرائط کی پابندی کرے۔

2- مضارب کسی دوسرے شخص کے ساتھ بھی مضاربت کا معاملہ کرسکتا ہے مگر اس کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

3- کوئی تیسرا شخص مضارب کی بلا معاوضہ مدد کرسکتا ہے تاکہ وہ کاروبار کو بہتر پر چلا سکے۔

4- اکثر فقہاء کا کہنا ہے کہ صاحب سرمایہ مضارب کے ساتھ کاروبار میں عملی نہیں لے سکتا کیونکہ اس سے مضارب کے اختیارات محدود ہو جاتے ہیں وہ کھل کر کام نہیں کرسکتا۔ جب کہ بعض شوافع اس بات کی اجازت دیتے کہ صاحب سرمایہ مضاربت میں عملی حصہ بھی لے سکتا ہے۔ دور جدید بڑے پیمانے کے کاروبار میں جن میں فیصلوں کا اختیار فرد واحد کے ایک بورڈ آف ڈائرکٹرز کے پاس ہوتا ہے، صاحب سرمایہ کا مضاربت کے کاروبار میں عملی شرکت کرنا جائز ہے۔

5- مضاربت کے معاہدہ میں مضارب کی طرف سے سرمایہ کی بحفاظت واپسی کی ضمانت دینے سے مضاربت کا معاہدہ منسوخ ہو جاتا ہے البتہ مضارب کی طرف سے پوری ذمہ داری سے کام کرنے کی ضمانت لی جاسکتی ہے۔

6- مضارب کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ کاروباری خرید وفروخت سکتا ہے، اشیاء وغیرہ کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے۔ کسی فرد کے ساتھ رہن کا معاملہ کرسکتا ہے مگر یہ کہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

7- مضارب کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ صاحب سرمایہ کے سرمایہ سے کسی دوسرے فرد کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کرسکتا ہے مگر یہ کہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

8- مضاربت کے معاہدہ میں صاحب سرمایہ کی مالی ذمہ داری اس کے فراہم کردہ

Marfat.com

سرمائے کی حد تک محدود ہوتی ہے مگر یہ کہ اس نے مضارب کو قرض لینے یا ادھار خریدنے کی اجازت دی ہو۔

مضارب کاروبار میں ادھار بھی فروخت کرنے کا اختیار رکھتا ہے مگر یہ کہ اس کو صاحب سرمایہ روک دے۔

ہدۂ مضاربت کی مدت:

مضاربت کے معاہدہ کی مدت کے بارہ میں مندرجہ ذیل باتیں ذہن میں رکھیں:

صاحب سرمایہ یا مضارب دونوں میں سے کوئی فریق یا دونوں جب چاہیں معاہدہ منسوخ کر سکتے ہیں۔ اگر معاہدہ میں دو سے زائد افراد ہیں تو ان میں معاہدہ برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

مضاربت کا معاہدہ ایک خاص عرصہ کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے اور لامحدود مدت کے لیے بھی۔

معاہدہ مضاربت کسی ایک فریق کی موت سے ختم ہو جاتا ہے، البتہ دو سے زائد افراد کی صورت میں معاہدہ کو باقی فریق جاری رکھ سکتے ہیں۔

معاہدۂ مضاربت پہلے سے طے شدہ شرائط پر مسلسل جاری رکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مضاربت کا معاملہ ایک معین عرصہ کے لیے کیا گیا، اور جو کام شروع کیا گیا وہ مقررہ مدت سے قبل ہی ختم ہو گیا، اس صورت میں مضارب سرمایہ کو بقیہ عرصہ کے لیے دوسرے کاروبار میں لگا سکتا ہے، البتہ اس صورت میں نفع ونقصان کے حوالہ سے فقہاء میں کچھ اختلاف رائے ہے۔

ضاربت میں نفع ونقصان:

مضاربت میں نفع ونقصان کے احکام کچھ یوں ہیں:

شراکت میں نقصان سرمایہ کے تناسب سے سرمایہ کے مالکان کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ مضاربت میں سرمایہ ایک فریق کا ہوتا ہے اور عملی جدوجہد دوسرے فریق کی ہوتی ہے، لہٰذا نقصان کی ذمہ داری بھی اسی صاحب سرمایہ پر

Marfat.com

ہوتی ہے یعنی کاروبار میں جو بھی نقصان ہوگا وہ صاحب سرمایہ کو پورا کرنا ہو

2- نفع کی تقسیم مضاربت کے معاہدہ میں طے شدہ نسبتوں سے ہوگی۔ کسی فریق کے لیے کوئی متعین رقم پیشگی طے نہیں کی جا سکتی۔

3- حنفی فقہ کے مطابق سرمایہ صاحب سرمایہ کے حوالہ کرنے سے پہلے منا تقسیم درست نہیں ہے۔

4- مسلسل جاری کاروبار میں نقصانات کی تلافی نفع سے کی جاتی رہے گی تک کہ کاروبار ختم کر کے حسابات کر لیے جائیں۔

5- فریقین کے نفع ونقصان کی مقداروں کی تعیین کاروبار ختم ہونے پر ہی کی جا

6- کاروبار میں نفع کے حق دار اور نفع کے مالک اس وقت قرار پائیں گے اصل سرمایہ صاحب سرمایہ کو واپس مل جائے خواہ اپنے سرمایہ پر اس کا قب ہو یا قانوناً، جیسے اگر ایک فرد کسی بنک کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کر اس معاہدہ کے اختتام اور نفع کی تقسیم کے لیے یہ کافی ہوگا کہ اصل سرما فرد کے کھاتے میں جمع کر دیا جائے، یہ قانونی قبضہ ہے۔

7- نفع سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ حقیقی منافع نہ ہونے کی صورت مضارب کی محنت کا ازالہ ضروری ہے۔

8- کاروبار میں کسی قسم کے اختیارات کا حصول یا مختلف تصرفات اور معاہد اجازت یا کسی قسم کی پابندیاں باہمی رضامندی سے عائد کی جا سکتی ہیں۔

موجودہ دور میں مضاربت:

موجودہ دور میں بینک کاری اور سرمایہ کاری کے اداروں کے معاملات پیچیدہ صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان اداروں کے طریقہ کار اور سرمایہ کاری اکث اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں بلکہ سود جیسی لعنت میں مبتلا ہیں جس پر اللہ اور ا رسول ﷺ نے جنگ کا الٹی میٹم دیا ہے۔ اس وجہ سے مسلم مفکرین اور ماہرین معا اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ ان اداروں کی تشکیل اسلامی تعلیمات کے م

جائے۔ان کی یہ کوشش نظام بنک کاری کی اصلاح تک محدود نہیں بلکہ ہر اس ادارے کے لیے کوششیں جاری ہیں جو لوگوں کی بچتوں (Savings) کو کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح کے اداروں میں سرمایہ کاری کے لیے مالی وسائل کے حصول اور کام کے حوالہ سے انہیں دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مشترکہ مالی وسائل رکھنے والے اداروں میں مضاربت کے اصولوں پر کاروبار مندرجہ ذیل طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔

(ا) ایسے کاروبار میں مضارب ایک سے زیادہ سرمایہ کاروں سے سرمایہ وصول کر سکتا ہے۔ تمام فقہاء مضاربت میں اس قسم کے مشترکہ کاروبار کی اجازت دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے سرمایہ کے حصول کے دو طریقے جائز ہیں:

(1) سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ کا حصول کاروبار شروع کرنے سے پہلے کیا جاتا ہے۔

(2) پہلے سے موجود رقم سے سرمایہ کاری شروع کی جائے اور اس کے بعد سرمایہ حاصل کیا جائے۔

البتہ مضارب کے لیے ضروری ہے کہ جن جن افراد یا اداروں سے اس نے سرمایہ حاصل کیا ہے ان سب کی اجازت سے مشترکہ کاروبار میں اسے لگائے اور دوسرے یہ کہ سرمایہ کاری مناسب طریقے سے کرے۔

(ب) مضاربت میں دوسری صورت پہلے سے جاری مضاربت کے کاروبار کو مسلسل جاری رکھنے کی ہے کہ اگر پہلے ایک کاروبار ایک خاص مدت کے لیے شروع کیا جائے اور وقت مقررہ کے بعد انہی شرائط پر اس کو جاری رکھا جائے۔

مندرجہ بالا طریقہ کار کے مطابق کوئی فرد یا افراد اپنا سرمایہ کسی کمپنی یا ادارہ وغیرہ کو مہیا کرتا ہے تاکہ وہ اس سے سرمایہ کاری کر سکے۔ یہ بھی مضاربت کا معاملہ کہلائے گا۔ اس مقصد کے لیے مالیاتی ادارے عام سرمایہ کاری کے سرٹیفکیٹ یا خصوصی سرمایہ کاری کے سرٹیفکیٹ جاری کر کے ان کے ذریعے مالی وسائل حاصل کر سکتے ہیں۔

اس طرح شراکت کی بنیاد پر کاروبار کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو مالی وسائل جمع کرنے والی کمپنی خود سرمایہ کاری کرتی ہے یا کسی دوسری کمپنی کے ذریعہ سرمایہ کاری کرتی

ہے۔ اسی طرح سے بینکوں کا کاروبار ہے۔ بنک طلبی امانتوں کے علاوہ مختلف قسم کی خدمات فراہم کرتے ہیں، اس طرح بنکوں کا کام فنانس کمپنیوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ بنک حصص کی فروخت اور سرمایہ کاری کے کھاتوں سے سرمایہ حاصل کرتے ہیں اور مزید سرمایہ کے حصول کے لیے بنک سرٹیفکیٹ جاری کر سکتے ہیں۔ بنک اور اس سرمایے اسٹاک کی خریداری، براہ راست سرمایہ کاری اور سرمایہ کاری کے سرٹیفکیٹ کی خریداری کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

مضاربت کی اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مضاربت ہر لحاظ سے جائز ہے۔ کیونکہ ہر سرمایہ دار کاروباری صلاحیتوں کا حامل نہیں ہوتا اور ہر کاروباری صلاحیتوں کا حامل شخص صاحب سرمایہ نہیں ہوتا، لہٰذا معاشرتی اور سماجی مصالح کے پیش نظر ایسی راہیں تلاش کرنی ضروری ہیں کہ کاروباری جدوجہد کرنے والے اشخاص کو سرمایہ مل سکے اور سرمایہ رکھنے والے افراد کو کاروباری افراد کا صحیح تعاون حاصل ہو سکے۔ مضاربت کا اصول اسی تقاضا کی تکمیل کرتا ہے۔ (اسلامی معاشیات ۱۶۱۔۱۷۰ وغیرہ)

مضاربت تجارتی کاروبار سے آشنا لوگوں کی امداد اور ان کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہر مال دار اور سرمایہ رکھنے والے شخص کو اپنے مال کا ایک حصہ مضاربت کے لیے مخصوص کرنا چاہیے۔ یہ دراصل اقتصادی نقطۂ نظر سے سمجھ دار غریبوں اور کاروباری ضرورت مندوں کی ایک ایسی امداد ہے جو غیور اور حوصلہ مند افراد کے لیے نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ باعث تسکین بھی ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرۃ شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے بھی اس کو امداد باہمی میں شمار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''امداد باہمی کی چند اقسام ہیں۔ ان میں ایک ''مضاربت'' ہے اور وہ یہ ہے کہ مال ایک شخص کا ہو اور محنت دوسرے فرد کی اور طرفین کی رضامندی کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان ہو۔'' (حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۱۱۶)

مضاربت کے اس طریقے سے سرمایہ دار کا سرمایہ ''لعنت'' سے ''رحمت'' بن جائے گا اور معاشرہ میں نہ فاقہ کش نظر آئیں گے اور نہ قابل نفرت سرمایہ دار، اور معاشرہ روز بروز معاشی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا۔

........❖❖❖........

تجارتی بدعنوانیاں

موجودہ دور میں جب قریباً پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام نافذ ہے۔ اس معاشی نظام میں بہت سی تجارتی سہولتیں اور جائز آسانیاں بھی ہیں لیکن بہت سی تجارتی بدعنوانیاں بھی اس نظام میں موجود ہیں جن کی وجہ سے غریب دن بدن غریب تر اور امیر دن بدن امیر تر ہوتا جارہا ہے۔اسلام کا اقتصادی نظام ان تمام بدعنوانیوں کا سدباب کرتا ہے جو عام بدحالی اور قابل نفرت سرمایہ داری کو فروغ دیتی ہیں۔ان بدعنوانیوں میں زیادہ اہم اور مشہور درج ذیل ہیں:

1-احتکار واکتناز:

احتکار کا مطلب یہ ہے کہ دولت سمٹ کر کسی ایک ہی طبقہ میں محدود ومحصور ہو کر رہ جائے۔ اسلام نے احتکار کی سخت مذمت کی ہے کیونکہ اسلام کے معاشی نظام میں یہ بات ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتی کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے۔ اس کے اثرات معاشرہ پر نہایت برے پڑتے ہیں۔جس طرح خون تمام جسم میں جب تک دورہ نہ کرے اس وقت تک جسم صحیح طور پر تندرست نہیں رہ سکتا ہے اسی طرح جب تک دولت تمام معاشرہ میں گردش نہ کرے اور ہر شخص کی جیب تک پیسہ نہ جائے معاشرہ صحیح اور تندرست نہیں رہ سکتا۔سرمایہ داری کے اس کافرانہ نظام میں دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے اور غریبوں کی جیبوں تک روپیہ نہیں پہنچتا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جاتا ہے۔جس سے غریبوں کی قوت خرید کم اور امیروں کی قوت خرید زیادہ ہو جاتی ہے۔دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جانے سے غریب کو اپنی غریبی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ میرا بیٹا فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا اور

Marfat.com

اس کو کوئی دوا نصیب نہ ہو سکی اور اس کے برعکس امیروں کے کتوں کا علاج ہسپتالوں میں ہو رہا ہے تو اس وقت اس کے دل سے اپنی غریبی کے احساس کی اک ہوک سے اٹھتی ہے کہ میں کیوں غریب ہوا اور میرے غریب ہونے کے باعث میرا بچہ ہسپتال میں دوائی کے لیے گیا نہ ڈاکٹر نے اس کو دوا دی اور نہ اس کا علاج کیا۔ وہ بغیر دوا کے اس دنیا سے انتقال کر گیا۔ ایک تو وہ غریب تھا اور غریب تو خیر ہر زمانے اور ہر نظام میں رہے ہیں لیکن اسلامی نظام معیشت میں غریب کو اپنی غریبی کا احساس نہیں ہوتا۔ پھر جب غریب یہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف امراء اور دولت مند لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم غریب لوگ ڈھور ڈنگروں کی سی زندگی گزار رہے ہیں تو اس وقت بھی اسے اپنی غریبی کا سخت احساس ہوتا ہے کہ میں غریب کیوں پیدا ہوا۔ اسلام نے اس چیز کو سختی سے روکا ہے، اور پیدائش دولت اور صرف دولت اور تقسیم دولت پر کچھ پابندیاں عائد کیں۔

پیدائش دولت کے باب میں رزق حلال کی تاکید کی کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں جو لوگ زیادہ سرمایہ دار ہوتے ہیں ان کی پیدائش دولت کے طریقے اکثر و بیشتر ناجائز اور حرام ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسلام نے رزق حلال کی تاکید کی۔ رزق حلال کی جدوجہد ذاتی اغراض کے ٹکراؤ سے معاشرہ کو محفوظ کر دیتی ہے اور انسانی توانائیاں مثبت اور مفید تعمیری کاموں پر مرکوز ہو جاتی ہیں جس سے دولت کی پیدائش کا عمل تیز اور مفاسد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ معاشرہ کے تمام افراد کو اپنی صلاحیتیں بیکار چھوڑنے کے بجائے مفید پیداواری کاموں میں صرف کرنی چاہئیں۔ گداگری اور طفیلی پن کی ہر شکل معاشرہ کے توازن کو خراب کر دیتی ہے۔

اسلام نے اکتساب مال کے ایسے تمام ذرائع کی سختی سے ممانعت کر دی ہے۔ چنانچہ منشیات، سود، جوا، رشوت، لاٹری، چوری، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹ، فحش اور مخرب اخلاق اشیاء کی پیدائش اور فروخت، فحبہ گری، عصمت فروشی، رقص و سرود، کلب اور اس طرح کی دیگر اشیاء کی سرگرمیوں کے ذریعہ روزی کمانا اور ان کی خرید و فروخت اور ان کی پیدائش میں کسی قسم کی معاونت کو حرام اور ناجائز قرار دے دیا گیا ہے کیونکہ اس سے لاتعداد اور ان گنت معاشی، اقتصادی، معاشرتی، سماجی اور اخلاقی مفاسد جنم لیتے ہیں۔ اور

Marfat.com

معاشرہ کے حسن اور اس کے سکون کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسلامی نظام معیشت میں ضرر اور غرر، جبر و اکراہ اور بیگار اور اس قسم کے دیگر ذرائع آمدنی کی بھی ممانعت کر دی گئی، کیونکہ اس سے نہ صرف انسانی عظمت پر دھبہ لگتا ہے بلکہ معاشی سرگرمیوں کا توازن بھی یک قلم بگڑ جاتا ہے۔ جب دولت کی پیدائش پر اس قدر پابندیاں اور قدغنیں ہوں تو یقین جانیئے نہ تو اس زمانہ میں کوئی شخص کروڑ پتی اور ارب پتی ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی غریب ایسی غربت کی زندگی بسر کر سکتا ہے جس میں اس کو اپنی غربت کا احساس ہو۔

پھر اگر کوئی شخص اتنی پابندیوں کے باوجود کروڑ پتی اور ارب پتی ہو بھی جائے تو شریعت نے صرف دولت پر بہت سی پابندیاں لگا دیں۔ اور دولت کو خرچ کرنے کے ہر ایسے ذریعہ سے منع فرما دیا جس میں بخل اور اسراف کی بو آتی ہو۔ اسلام نے دولت کے خرچ کرنے کے باب میں کفایت شعاری اور میانہ روی کو اپنانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے مال خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کی وہ کبھی تنگ دستی سے دوچار نہیں ہوگا۔'' کفایت شعاری سے مراد جائز حاجات پر جائز حد تک مال صرف کرنا ہے۔ کفایت شعاری اور میانہ روی انسان کو بہت سے معاشی، معاشرتی اور ذہنی عوارض سے محفوظ کر دیتی ہے۔ اس سے بچتیں (Savings) بڑھتی ہیں اور پیداواری عمل کو تیز کرنے کے لیے وسائل میسر آتے رہتے ہیں جو جدید معاشیات میں ازحد ضروری ہیں۔

کفایت شعاری اور میانہ روی کی تلقین کے ساتھ ساتھ اسلام نے اسراف اور تبذیر کی شدت کے ساتھ ممانعت کر دی۔ ان دونوں سے نہ صرف وسائل کا بے دریغ ضیاع عمل میں آتا ہے بلکہ دولت پیداواری وسائل اور کاموں میں صرف ہونے کے بجائے نام و نمود، فخر و ریا اور فسق و فجور کی شیطانی راہوں پر بہ جاتی ہے۔ اسراف و تبذیر سے انسان عیش کوشی کا رسیا ہو کر خلیفۃ اللہ کے بلند مقام سے گر کر اخلاقی پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر کر اپنے انسانی جوہر سے محروم ہو جاتا ہے۔

اسراف و تبذیر کی مذمت کے ساتھ اسلام نے بخل اور شح کی بھی مذمت کی اور

Marfat.com

اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب وسزا کی سخت وعید بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿ان الله لا يحب من كان مختالاً فخوراً، الذين يبخلون ويامرون الناس بالبخل ويكتمون مااٰتاهم الله من فضله، واعتدنا للكافرين عذاباً مهينا﴾ (نساء:۳۶۔۳۷)

''بے شک اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو (دل میں) اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوں (زبان سے شیخی اور فخر ومباہات کی باتیں کرتے ہوں) جو خود بھی بخل کرتے ہوں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہوں، اور جو شی اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے اس کو چھپاتے ہوں، اور ہم نے ایسے ناشکروں کے لیے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت میں ہے ''دوسروں کو بخل کی تعلیم دیتے ہوں۔'' عام ہے کہ اپنی زبان سے ان کو ترغیب دیتے ہوں یا اپنے عمل سے تعلیم دیتے ہوں کہ ان کے عمل کو دیکھ کر دوسروں کو بخل کی ترغیب ہوتی ہو۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ مختالاً فخوراً سے مراد ہر وہ متکبر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی چیزوں کو گن گن کر رکھتا ہے اور اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ مولانا تھانوی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ آیت میں "مختال فخور" آیا ہے جس کا ترجمہ اترانے والا شیخی باز کیا ہے۔ اترانا اپنے آپ ہوتا ہے یعنی دوسرے کے بغیر بھی ہوتا ہے اور شیخی دوسرے کے سامنے اور دوسرے کے مقابلہ میں ہوا کرتی ہے۔ اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ ''اختیال'' تو ایسی چیزوں پر اترانا ہوتا ہے جو آدمی کے اندر ذاتی کمال کی ہوں، اور فخر ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو خارجی ہوں جیسے مال اور جاہ وغیرہ۔ (بیان القرآن)

ایک اور مقام اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله، فبشرهم بعذاب اليم، يوم يحمىٰ عليها في نار جهنم، فتكوىٰ بها جباههم وجنوبهم وظهورهم، هذا

ما کنزتم لانفسکم، فذوقوا ما کنتم تکنزون﴾ (توبہ:۳۴-۳۵)

''اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے خزانہ کے طور پر رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، آپ ان کو بڑے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے، وہ اس دن ہوگا جس دن ان کو (سونے چاندی کو) اول جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر رکھا تھا۔''

علماء نے لکھا ہے کہ پیشانیوں وغیرہ سے چاروں طرف مراد ہے۔ پیشانی سے اگلا حصہ، پہلوؤں سے دایاں بایاں اور پشت سے پچھلا حصہ مراد ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ سارے بدن کو داغ دیا جائے گا۔

سیدنا ثوبانؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم اس وقت سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد بعض صحابہ کرامؓ نے خدمت نبوی میں عرض کیا: ''یا رسول اللہ! سونا چاندی جمع کرنے کا تو یہ حشر ہے، اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ بہترین مال کیا ہے جس کو ہم جمع کر کے خزانہ کے طور پر رکھیں؟ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کا ذکر کرنے والی زبان، اللہ کا شکر ادا کرنے والا دل اور نیک بیوی جو آخرت کے کاموں میں معین و مددگار ہو۔

سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ آیت تو لوگوں پر بہت بار ہو رہی ہے۔ سرکار مدینہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے مشروع فرمائی ہے کہ بقیہ مال پاک ہو جائے، اور میراث تو اسی مال میں جاری ہوگی جو بعد میں باقی رہے۔ اور بہترین چیز جس کو آدمی خزانہ کی طرح محفوظ رکھے، وہ نیک بیوی ہے جس کو دیکھ کر جی راضی ہو جائے، جب اس کو حکم دیا جائے تو وہ فوراً اطاعت کرے اور جب خاوند غائب ہو (یعنی سفر وغیرہ میں ہو) تو وہ اپنی اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔

سیدنا علیؓ سرکار دو عالم ﷺ کا ایک ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

Marfat.com

مسلمانوں کے امیر اور اغنیاء کے مالوں میں وہ مقدار فرض کر دی ہے جو ان کے فقراء کے لیے کافی ہے۔ فقراء کو بھوکے یا ننگے ہونے کی مشقت صرف اس وجہ سے جھیلنی پڑتی ہے کہ اغنیاء ان کو مال دیتے نہیں۔ خبر دار رہو کہ حق تعالیٰ شانہ قیامت کے روز ان امیروں اور اغنیاء سے سخت مطالبہ کریں گے یا سخت عذاب دیں گے۔

سیدنا ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اگر اللہ جل شانہ کے علم میں یہ بات ہوتی کہ اغنیاء کی زکوٰۃ فقراء کو کافی نہ ہوتی تو زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی چیز ان کے لیے تجویز فرماتے جو ان کو کافی ہو جاتی۔ پس اب جو فقراء بھوکے ہیں وہ اغنیاء کے ظلم کی وجہ سے ہیں۔ (کہ وہ زکوٰۃ پوری نہیں دیتے) (کنز العمال)

دنیا میں امیری اور غریبی روز اول ہی سے چلی آ رہی ہے کیونکہ امیر و غریب دونوں ہی اس دنیا کے لیے باعث زینت ہیں۔ ذوق نے سچ کہا ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

کسی کو امیر بنانے یا کسی کو غریب رکھنے کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرمایا:

﴿ولو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض، ولکن ینزل بقدر مایشاء، انہ بعبادہ خبیر بصیر﴾ (شوریٰ:۲۷)

''اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لیے روزی میں وسعت کر دیتا تو وہ دنیا میں بغاوت (اور فساد) کرنے لگتے، لیکن اللہ تعالیٰ (جس کے لیے) جتنا رزق مناسب سمجھتا ہے، اتارتا ہے۔ بے شک وہ بندوں (کی مصالح) سے باخبر (اور ان کے احوال کو) دیکھنے والا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سب پر رزق کی وسعت کا ہونا دنیا میں سرکشی اور فساد کا سبب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے سب لوگوں کو مال دار بنا دیں تو پھر اس دنیا کا نظام چلنا مشکل ہو جائے۔ سب مل مالکان ہو جائیں تو ان ملوں میں کام کون

Marfat.com

کرے، سب آقا اور مالک بن جائیں تو غلام اور مزدور کون ہو۔ علاوہ ازیں خود قرآن نے کہا ہے کہ ''انسان سرکش ہوتا ہے جب وہ اپنے میں استغنا دیکھتا ہے۔'' گویا استغنا سے اس میں سرکشی اور بغاوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کتابوں میں ہے کہ عرب میں جس سال پیداوار کی کثرت ہوتی تو عرب ایک دوسرے کو قید کرنا اور قتل کرنا شروع کر دیتے، اور جب قحط پڑ جاتا تو یہ سب کچھ چھوڑ دیتے۔

قرآن میں ان آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات آئی ہیں جن میں بخل اور شح کی مذمت کی گئی ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور جو اللہ کے راستہ میں مال خرچ نہیں کرتا اس کے لیے دردناک عذاب کی نوید سنائی گئی ہے۔ قرآنی آیات کے علاوہ حدیث کا بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے جس میں لوگوں کو غرباء پر مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ بخاری اور مسلم میں حدیث ہے کہ سیدنا ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں: ''میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ اس وقت بیت اللہ کی دیوار کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھ کر سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: ''رب کعبہ کی قسم! وہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں؟ میں نے عرض کیا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان، وہ کون لوگ ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جن کے پاس مال زیادہ ہو مگر وہ لوگ جو اس طرح اس طرح اس طرح خرچ کریں۔ اپنے دائیں سے بائیں سے، آگے سے پیچھے سے لیکن ایسے آدمی بہت کم ہیں۔ (وقلیل ماھم)

اس روایت میں یہ بیان کیا گیا کہ مال و دولت کی کثرت فی ذاتہ کوئی محبوب چیز نہیں ہے بلکہ بڑے خسارے اور نقصان کی چیز ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے غفلت کا سبب بنتی ہے۔ روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے کہ تنگ دستی کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بہت کم ہوتا ہے، اور جو لوگ چاروں طرف اپنی جود وسخا کا ہاتھ پھیلاتے ہوں، ان کے لیے مال مضر نہیں ہے، لیکن آپ نے حدیث کے آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایسے آدمی بہت کم ہیں۔ عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ جہاں مال کی کثرت ہوتی ہے، فسق و فجور، آوارگی، عیاشی اور طرح طرح کی اور کئی برائیاں اپنے ساتھ لاتی ہے، اور بے محل خرچ کرنا اور نام ونمود پر صرف کرنا تو دولت کے ادنیٰ کرشموں میں سے ہے۔ شادی بیاہ اور دوسری فضول

Marfat.com

رسموں میں روپیہ خرچ کرتے وقت اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ آخر روپیہ کما کس لیے جاتا ہے اگر ان چیزوں پر روپیہ خرچ نہیں کرنا، لیکن اگر انہیں لوگوں کو یہ کہہ دیا جائے ضرورت مندوں، بھوکوں اور حاجت مندوں پر بھی کچھ رقم صرف کر دو کیونکہ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تمہارے مالوں میں ان کا حق رکھا ہے، تو اس بات کو سن کر ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں، ان کی تجوریاں خالی ہو جاتی ہیں اور غرباء اور مساکین پر خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی مال نہیں ہوتا۔ اور ان پر خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس مال کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

امام غزالیؒ نے سیدنا یحییٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے شیطان سے پوچھا کہ تجھے سب سے زیادہ کون شخص محبوب ہے اور سب سے زیادہ کس شخص سے نفرت ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے سب سے زیادہ محبت بخیل مومن سے ہے اور سب سے زیادہ نفرت فاسق سخی سے ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''اس کی کیا وجہ ہے؟'' شیطان نے کہا: ''بخیل تو اپنے بخل کی وجہ سے مجھے بے فکر رکھتا ہے۔ یعنی اس کا بخل ہی اس کو جہنم میں لے جانے کے لیے کافی ہے، لیکن فاسق سخی پر مجھے ہر وقت فکر سوار رہتی ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس کی سخاوت کی وجہ سے اس سے درگزر نہ فرما دیں۔

(احیاء العلوم)

معلوم ہوا کہ سخی اللہ کو محبوب ہے۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کسی وقت بھی اس کے گناہوں سے درگزر فرما کر اس سے راضی ہو سکتے ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاں پیدائش دولت پر پابندیاں لگائیں وہاں صرف دولت پر بھی پابندیاں اور قدغنیں لگائیں کہ مال کو کفایت شعاری میانہ روی سے خرچ کرو۔ اسراف و تبذیر سے اجتناب کرو اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے بخل نہ کرو۔ کیونکہ بخل وسائل پیدائش کو روک کر سخاوت کرنے والے خون کو منجمد کر دیتا ہے جس سے سارا نظام معیشت جمود اور تعطل کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ ذاتی احتیاجات کی تسکین کے بعد بچ جانے والے وسائل مستحق حاجت مندوں کی حاجت روائی کے لیے خرچ کیے جائیں یہ انفاق نہ صرف خیر و برکت اور رضاء الٰہی کے حصول اور غرباء او رمساکین پر

Marfat.com

حاجت مندوں کی پرخلوص دلی دعاؤں کا باعث بنے گا بلکہ اس سے مؤثر طلب (Effective Demand) میں بھی اضافہ ہوگا اور پیداواری سرگرمیوں میں تیزی کا رجحان بھی پیدا ہوگا۔

یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن سے احتکار کا قلع قمع ہوگا اور دولت سمٹ کر کسی ایک طبقہ میں یا چند ہاتھوں میں محصور اور محدود نہ ہوگی بلکہ پورے معاشرہ میں گردش کرے گی اور ہر شخص اس سے مستفید ہوگا۔

اسلام ہی وہ دین ہے جس نے سرمایہ داروں کو احتکار سے روکا۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لایحتکر الا خاطئ﴾ (ابوداؤد:۲/۱۳۲، ابن ماجہ:۲۱۵۴)

''احتکار کرنے والا گنہگار اور خطا کار ہے۔''

(والحدیث اخرجہ ایضاً مسلم فی المساقاۃ والترمذی فی البیوع وابن حبان:۱۱/۳۰۸ وابن ابی شیبہ: ۶/۱۰۲، والبیہقی فی السنن الکبریٰ:۶/۲۹، والبغوی فی شرح السنہ:۸/۱۷۹، والحاکم:۲/۴۷)

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک احتکار صرف غذائی اشیاء میں ہے۔ (ملاحظہ ہو مغنی ابن قدامہ:۴/۲۴۴، نووی شرح مسلم:۱۱/۴۳)

لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزد احتکار کی حرمت صرف غذائی اشیاء میں نہیں ہے بلکہ ہر وہ شی جس سے عامۃ الناس کو ضرر پہنچے اس کا چند لوگوں میں سمٹ جانا اور اس کا روک رکھنا احتکار ہے اور حرام ہے۔ (ردالمختار:۵/۲۸۲)

امام شوکانیؒ نے لکھا کہ اس شی کا روک رکھنا احتکار کہلاتا ہے جس سے انسانوں اور جانوروں کو تکلیف پہنچے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے احتکار کرنے والے کے بارہ میں ارشاد فرمایا:

﴿المحتکر ملعون﴾ (ابن ماجہ:۲۱۵۳، مسند دارمی:۲/۱۶۵)

''احتکار کرنے والے پر خدا کی پھٹکار۔''

ابن ماجہ ہی نے ایک اور حدیث نقل کی ہے کہ سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

"جو شخص احتکار کا جرم کرے اور مسلمانوں پر کھانے کی اشیاء کو روک دے اللہ تعالیٰ اس کو جذام اور افلاس میں مبتلا کرے۔"

اس حدیث کے بارہ میں محدث عبدالرؤف مناویؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جذام اور افلاس کا ذکر اس لیے کیا کہ محتکر کا مطلب احتکار سے یہ ہوتا ہے کہ اس کی صحت اچھی رہے اور اس کے مال میں اضافہ ہو، چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بدن کو جذام ہو اور اس کا مال تباہ و برباد ہو کر وہ مفلس و کنگال ہو جائے۔ (فیض القدیر:۶/۳۵)

احتکار و اکتناز قریباً ہم معنی ہیں لیکن فقہ کی اصطلاح میں احتکار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص غلہ وغیرہ کو بڑی مقدار میں خرید کر ذخیرہ کر لے اور جب بازار میں غلہ گراں ہو جائے اور عوام میں اس کی طلب اور مانگ کا مرکز صرف وہی بن جائے۔ اور عوام اس کے مقررہ نرخ پر لینے پر مجبور ہو جائیں اور وہ اپنی مرضی کے مطابق گراں فروشی کر سکے۔ اس احتکار کی مثال آج برصغیر پاک و ہند میں عام ملتی ہے بلکہ ہندوستان میں تو شاید کم ہو اب پاکستان کے تاجر اس ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی میں بھارت کے تاجروں سے دس قدم آگے ہیں لہٰذا پاکستان میں اب زیادہ کنج وکاؤ کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہر شہر میں آپ کو اس قسم کے ذخیرہ اندوز ملیں گے۔ رمضان کی آمد سے قبل ذخیرہ اندوز اپنے گودام سستے داموں اشیائے خوردنی اور دوسری استعمال کی اشیاء خرید کر بھر لیتے ہیں اور پھر جونہی رمضان شروع ہوتا ہے ہر چیز کے دام آسمان سے باتیں کرنے لگتے ہیں رمضان میں ان ذخیرہ اندوزوں کی عید ہو جاتی ہے جبکہ صارفین کا محرم ہوتا ہے۔ غریب عوام ان گراں فروشوں اور ذخیرہ اندوزوں کے ہاتھوں لٹتے ہیں اور غریب دن بدن غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے احتکار کرنے والے کو حدیث میں ملعون کہا گیا کہ وہ اپنی گراں فروشی کی وجہ سے کتنے غریبوں کی بددعائیں لیتا ہے۔ کیونکہ اس گروہ کی وجہ سے کاشتکار اور غریب عوام اقتصادی اور معاشی بدحالی کا شکار بنتے رہتے ہیں۔ سود کے بعد سب سے زیادہ غرباء کو بدحالی اور پریشان کرنے والی چیز یہی احتکار و اکتناز ہے۔ جب دولت اور کھانے پینے کی اشیاء چند ہاتھوں میں سمٹ جاتی ہیں اور پھر

Marfat.com

ب پر منہ مانگی قیمت لوگوں سے وصول کرتے ہیں، اور غریب اپنی جان بچانے کے
ے بامر مجبوری قرض لے کر یا اپنی دوسری ضرورتوں کو بالائے طاق رکھ کھانے پینے کی
اء مہنگے داموں خریدتے ہیں تو اس وقت ان کے دلوں کی اتھاہ گہرائیوں سے ان ذخیرہ
وزوں کے لیے بددعاؤں کا جو دھواں اٹھتا ہے وہ عرش الٰہی کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

اسلام نے اس ذخیرہ اندوزی کو ناجائز اور حرام قرار دیا کیونکہ اس سے دولت کا
کاز ہوتا ہے، اور اسی ارتکاز دولت کی وجہ سے روز بروز غربت میں اضافہ ہوتا جا رہا
ے۔ ایک طرف لاکھوں کروڑوں حاجت مند اور غریب ہیں اور دوسری طرف زمین کی
اوار اور کارخانوں اور فیکٹریوں کی مصنوعات کے انبار لگے ہوئے ہیں، مگر خرید نہیں
سکتے یہاں تک کہ لاکھوں ٹن گیہوں اور چاول سمندر میں پھینکا جاتا ہے لیکن وہ بھوکے
انوں کے پیٹ نہیں بھرتا۔ سمندر میں وہ غلہ اس لیے پھینکا جاتا ہے کہ منڈی میں اس کا
اؤ نہ گر جائے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ”اسلام ہی وہ دین ہے جس میں غرباء، امراء اور
نیاء پر ٹیکس عائد کیا گیا ہے اور یہ کوئی بھیک اور خیرات نہیں بلکہ غرباء اور مساکین اور مالی
زمین کا قانونی حق ہے جو امراء کے ذمہ عائد ہے، اور جب تک امراء اس حق کو ادا نہ
ریں وہ خدا اور رسول ﷺ اور تمام غرباء اور مساکین کے مجرم اور مقروض ہیں۔“

موجودہ معیشت میں بھی ماضی کی طرح لوگ اپنی دولت کاروبار میں لگانے کے
بجائے (تاکہ پورے معاشرہ میں دولت گردش کرے)، دفینوں کی صورت میں رکھنا پسند
کرتے ہیں، لیکن اسلام اس کا سدباب نظام زکوٰۃ کے ذریعہ کرتا ہے کیونکہ دفینوں اور
بنکوں میں جمع شدہ رقوم پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے، اور اگر اس دولت کو کاروبار میں نہ لگایا
جائے تو چند سالوں میں اس دولت کے ختم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے اس دولت کو
لوگ کاروبار میں لگانا پسند کریں گے یا پھر کسی دوسرے شخص کے ساتھ شراکت اور
مضاربت کا معاملہ کریں گے جس کے نتیجہ میں دولت کے ارتکاز و اکتناز کے بجائے
معیشت میں پھیلاؤ اور وسعت پیدا ہوگی اور غرباء کو روزگار کے مواقع بھی میسر ہوں گے
جس کی تفصیل زکوٰۃ کے باب میں آئے گی۔

Marfat.com

قمار یا سٹہ:

احتکار کی دوسری جزئی ''قمار'' ہے۔ اس سے مراد جوئے کی وہ عام شکل نہیں ہے جو مال سے کھیلا جاتا ہے بلکہ اس میں جوئے کی وہ تمام صورتیں داخل ہیں جو موجودہ زمانہ میں تجارت کے نام پر کھیلی جاتی ہیں، مثلاً سٹہ وغیرہ۔ اس کو تجارتی جوا کہا جاتا ہے جو تجارت کے نام پر موجودہ نظام معیشت میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ تجارتی جوا ملک کے معاشی نظام کو کس طرح تباہ و برباد اور پراگندہ کرتا ہے کہ آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے، اور بغیر محنت کے نفع حاصل کرنے کے لالچ میں کس طرح ہزاروں گھر خانماں برباد ہو جاتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں بھی اس قسم کی بہت سی شکلیں رائج تھیں جیسے ملامستہ، منابذہ وغیرہ جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اسلام نے اس قسم کی خرید و فروخت کو حرام و ناجائز قرار دیا ہے بلکہ اس کو میسر اور قمار (جوا) قرار دیا ہے اور اس قسم کے تمام معاملات کو اسلام ایک بااصول تجارت کے لیے تباہ کن سمجھتا ہے اور سوسائٹی کے اخلاق اور کیرکٹر کے لیے باعث ذلت و رسوائی جانتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کو معاشرتی تباہی کا پیش خیمہ یقین کرتا ہے۔

اسلام کا ایک اصول ہے جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے کہ مسلمان نہ کسی کو نقصان پہنچائے اور کوئی اس کو نقصان پہنچائے۔ ہر وہ کاروبار اور تجارت اسلام کی نگاہ میں درجۂ جواز سے گری ہوئی ہے جن میں منازعت کا اندیشہ ہو۔ سٹے اور قمار وغیرہ کے معاملات میں اکثر و بیشتر جنگ و جدل کا اندیشہ ہوتا ہے اور اس میں مواسات، رواداری، ہمدردی اور مروت کے جذبات کو تباہ اور دوسرے کی تباہی میں اپنا فائدہ سمجھنے کی ترغیب دے کر جوہر انسانی کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ احتکار کی یہ دوسری قسم ہے جو اس لیے ممنوع ہے کہ یہ بھی دولت اور سرمایہ کو بعض افراد یا گروہ میں مخصوص کر دینے کا باعث بنتی ہیں اور ایک کو تباہ و برباد کر کے دوسرے کے فائدہ کی صورت نکالتی ہے۔ یہ ایک ایسا گناہ اور جرم ہے جس کو اسلام یک قلم پسند نہیں کرتا اور اسلام تو کیا یہ انسانیت اور اخلاق کی نگاہ میں بھی ایک بہت بڑا جرم ہے کہ آدمی دوسرے کو تباہ و برباد کر کے اپنے کو بنائے۔ یہ جرم سوسائٹی کی نظر میں بھی ایک ناقابل معافی گناہ ہے۔

سٹہ کیا ہے؟ سٹہ دراصل بیع قبل القبض کا نام ہے یعنی ایک چیز جاپان سے
ن میں درآمد ہونے کے لیے چلی ہے۔اس کے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی اس کی
تھوں میں خرید وفروخت ہو جاتی ہے۔ یا اسٹاک ایکسچینج (Stock Exchange)
تلف فرموں کے حصص کی خرید وفروخت ہوتی ہے حالانکہ ان کا صرف زبانی زبانی
ر قبضہ ہوتا ہے۔ اسلام نے بیع قبل القبض کو ناجائز قرار دیا۔ چنانچہ سیدنا ابن عباسؓ
تے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اناج (غلہ) خریدے۔ وہ
وزن کرنے سے پہلے فروخت نہ کرے۔سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''احسب
شی مثلہ'' یعنی میں ہر شی کو اناج پر قیاس کرتا ہوں۔ (مسلم حدیث نمبر:۳۷۲۶)

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص
خریدے وہ قبضہ سے پہلے اس کو فروخت نہ کرے۔ (مسلم نمبر:۳۷۳۲)

اور اس کی حکمت واضح ہے کہ جب خریدار مبیع پر قبضہ کرلے گا تو اس میں بائع
صرف کرنے کا امکان ختم ہو جائے گا ورنہ ہوسکتا ہے کہ فروخت کرنے کے بعد بائع کو
ہ منافع والا کوئی اور گاہک مل جائے اور وہ خریدار کو مبیع پر قبضہ نہ دے اور بیع فسخ کر
ے۔موجودہ زمانے میں بیع قبل القبض سے سٹے کو فروغ ہوتا ہے اور اجناس کی قیمت
بیں گنا زیادہ ہو جاتی ہے جس سے صارفین کا استحصال ہوتا ہے۔جس کی مثال ہم
جاپان سے درآمد کے سلسلہ میں دی ہے۔ ہمارے ملک میں ہر روز کروڑوں روپے کا
ے کا کاروبار ہوتا ہے اور سٹے میں چونکہ کاروباری ساکھ اور کمپنیوں کے لمیٹڈ ہونے کی بنیاد
رف کاغذات اور ٹیلی فون پر سونے، روئی وغیرہ کی بیع ہوتی ہے اور عملی طور پر کوئی خرید و
اخت نہیں ہوتی اور نہ مبیع پر قبضہ کیا جاتا ہے اس لیے شریعت میں یہ کاروبار ناجائز ہے۔

سٹے کا یہ کام قمار میں شمار ہوتا ہے اور قمار کے بارہ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿یسئلونک عن الخمر والمیسر، قل فیھما اثم کبیر
ومنافع للناس، واثمھما اکبر من نفعھما﴾ (بقرہ:۲۱۹)

''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں دریافت کرتے
ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے

لیے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔"

شراب اور جوا عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور عرب شاعروں نے اپنے ... میں جوئے اور شراب کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ عرب لوگ شراب پیتے اور جوا ... اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں منقسم کرتے ... ٹکڑوں پر پانسے ڈال کر لاٹری نکالتے۔ ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر تھے جن کے نام یہ ہیں:

فذ، توام، رقیب، حلس، سبل، معلیٰ، منافس، منیح، سفیح، وغد، ان میں ... کے مختلف حصے معین کر لئے تھے اور جب جوا کھیلتے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال ... منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے۔ وہ ایک ایک تیر کو ایک ایک نام پر نکالتا۔ ج... نام پر وہ تیر نکلتے تھے، جن جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن ... کوئی حصہ نہ ہوتا تھا وہ جن کے نام پر نکلتے وہ ناکام ہوتے۔ اس طرح جو گوشت ... وہ فقیروں، غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک ... تھا، اس لیے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار سمجھا جاتا تھا اور ... کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ اس جوا بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال ... دولت کھو چکنے کے بعد بیوی اور اولاد پر بازی لگا دیتے۔ یہ قمار بازی اور وہ بھی شب ... بدمستی میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے اور ... ذبیان چہل سالہ گھوڑ دوڑ بھی قمار بازی کا نتیجہ تھی۔ حصول دولت اور کسب شہرت کے ... غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔ (سیرۃ النبی: ۴/)

حضرت شیخ الہندؒ نے اس جوئے اور شراب کے بارہ میں فرمایا:

"شراب اور جوئے کے حق میں کئی آیتیں اتری ہیں۔ ہر ایک میں ان کی برائی ظاہر کی گئی ہیں۔ آخر سورۃ المائدہ کی آیت میں صاف صاف ممانعت کر دی گئی۔ اب جو چیزیں نشہ لاویں وہ سب حرام

Marfat.com

ہیں، اور جو شرط بندھی جائے کسی چیز پر جس میں ہار جیت ہو وہ محض حرام ہے اور ایک طرف کی شرط حرام نہیں۔" (فوائد عثمانی: ۴۳)

اس آیت میں "فیھما اثم کبیر" میں بڑی گہری معنویت ہے۔ معاشرے میں آج تک جتنے فسادات شراب نوشی سے پیدا ہو چکے ہیں، اظہر من الشمس ہیں۔ گالیاں یہ بکوائے، بے حیائی یہ پھیلائے، حرام کاری کی طرف یہ بلائے، بلوے اور دنگے یہ کرائے، چوری ٹھگی پر یہ آمادہ کرے، قتل کی نوبت یہ لے آئے، ہر عبادت سے، طہارت سے اور پاکیزہ منشی سے یہ روک دے اور قمار بازی کی لائی ہوئی مصیبتیں بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ (تفسیر ماجدی)

اس فقرے کے ذریعہ قرآن حکیم نے اصل سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ اس میں بعض رفاہی فائدے بھی ہیں لیکن ان دونوں سے معاشرہ کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وجہ سے اخلاقی بہبود کے نقطۂ نظر سے یہ ناجائز ہیں۔ گویا قرآن حکیم نے اسلامی قانون کا یہاں یہ مزاج بتا دیا کہ جن چیزوں کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہو وہ اسلامی قانون میں ممنوع ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں اخلاقی اعتبار سے مضر ہیں اگر ان سے بظاہر کوئی فائدہ لوگوں کو پہنچتا بھی ہو یا پہنچایا بھی جا سکتا ہو جب بھی اس کے ضرر کے پہلو کے غلبہ کی وجہ سے اسلام میں اس سے احتراز و اجتناب ضروری ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ لوگ لاٹری ڈالیں تا کہ اس کی آمدنی سے ایک شاندار مسجد تعمیر کی جائے، یا ایک امدادی شو منعقد کریں تا کہ ان کے ٹکٹ فروخت کر کے کسی مصیبت زدہ علاقے کے مسلمانوں کی مدد کریں۔ بظاہر یہ کام نیکی اور خدمت خلق کے ہیں لیکن اسلام اس قسم کی نیکی کے جواز کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اس نیکی کے پردے میں جو بدی پرورش پاتی ہے یا اس مصلحت کی آغوش میں جو مقاصد پروان چڑھ رہے ہیں، ان کا وزن مصلحت اور نیکی سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمارے فقہاء اور قانون دان طبقہ نے اسی کو "درء المفاسد اولیٰ من جلب المصالح" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ مفاسد کی حیثیت فقہاء کی نظر میں وبا کی ہے۔ وباء کو دور کرنے کا بہر حال بندوبست کیا جائے گا خواہ اس کے نتیجہ میں کچھ مصالح اور منافع خطرے میں پڑ جائیں۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے

Marfat.com

منہیات سے روکنے کا زیادہ اہتمام کیا ہے، اور اسی بنا پر فقہاء نے منشیات کی تجارت قدغن قائم کی ہے خواہ اس میں تجارتی منافع موجود ہو، اور اسی لیے کسی مالک مکان کو اس جگہ کھڑکی وغیرہ رکھنے کی اجازت نہیں دی جہاں سے پڑوسیوں کی مستورات پر نظر پڑتی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کائنات میں سرے سے مضر ہی مضر اور ہر طرح کے اور مصلحت سے خالی کوئی شی نہیں، مثلاً شراب سے بعض بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے بعض شرابیں خوشبو رکھتی ہیں، شراب سے فوری لذت اور سرور حاصل ہوتا ہے، بعض قوتوں میں عارضی طور پر تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح جوئے میں جو جیتتا ہے اسے مشقت وتعب تھوڑی سی دیر مین آمدنی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے یہاں شراب اور جوئے کے جن منافع کا ذکر کیا ہے وہ ان کی مادی اور طبی فوائد ہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، ہمارے نزدیک ان کی یہ بات درست نہیں ہے بلکہ یہ دراصل ان فوائد کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت کے عرب سوسائٹی میں مخصوص روایات کی بنا پر پائے جاتے۔ یعنی شراب پی کر جوا کھیلنا اور جوئے کے نتیجہ میں جو کچھ یافت ہو اسے غریبوں میں تقسیم دینا، یہ ان کے یہاں بڑی اونچی بات تھی اور اسے کمالات میں شمار کیا جاتا تھا۔ قرآن حکیم یہاں انہی رفاہی فوائد کی طرف اشارہ کر رہا ہے ورنہ قرآن کو اشیاء و اعمال کے طبی مادی فوائد سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ قرآنی بلاغت کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اگر طبی اور مادی فوائد قرآن حکیم کے پیش نظر ہوتے تو آیت میں نفع کا مقابلہ اثم سے نہیں ضرر سے ہوتا "اثم" کا لفظ طبی نقصانات کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی مقاصد اور گناہوں کے لیے آتا ہے۔ اگر شراب کے طبی نفع کی ہدایت کرنی پیش نظر ہوتی تو نفع کے مقابلہ میں ضرر آتا "اثم" نہ آتا۔

اس آیت کے علاوہ قرآن حکیم میں سورۃ المائدہ میں فرمایا:

"بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے یہ سب سرتاسر نجاست ہیں
اور کار شیطان ہیں۔ پس تم ان سے بچو۔" (المائدہ:۹۰)

قمار بازی جس میں لاکھوں اور کروڑوں کی دولت لوگوں کو اس طرح مل جاتی ہے کہ ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں ملتا۔ جوئے میں جتنے عناصر

غیظ وغضب سے بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہے، شاید اتنا غصہ اور اتنا غیظ تو چور ورڈاکو پر بھی اس کو نہیں ہوتا جس کا مال چوری ہو جاتا ہے۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ اس قسم کے جوا کے معاملات کی حکمت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حق تعالیٰ شانہ نے جب مخلوق کو پیدا فرمایا اور اس کرۂ اغبر پر ان کی معاش کا انتظام فرمایا اور ان سے فائدہ اور نفع حاصل کرنے کا ان کو موقع فراہم کیا تو انسانوں کے درمیان جنگ وجدل اور کشمکش برپا ہوگئی۔ تب حق تعالیٰ شانہ کے قانون کا یہ فیصلہ ہوا کہ جو شخص ذاتی محنت، وراثت یا دوسرے کسی جائز اور صحیح طریق سے کسی شی کا مالک ہے، اس کی چیز میں دوسرا کوئی شخص مزاحمت اور کشمکش کا حقدار نہیں ہے۔ البتہ دوسرے کو بدل کے ذریعہ خریداری اور معتبر و صحیح رضامندی کے ساتھ معاملہ سے اس شی کو حاصل کرنے کا حق ہے بشرطیکہ خرید وفروخت کرنے والوں کے درمیان اس معاملہ کا علم ویقین ہو، اور فریب، چال بازی اور دھوکہ دہی کا اس میں کوئی شائبہ نہ ہو۔ اور جب کہ انسان مدنی الطبع ہے اور اس کی معیشت باہمی تعاون کے بغیر ناممکن ہے تو اللہ تعالیٰ نے باہمی تعاون کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ پس اگر کوئی معاملہ اس طرح کیا جائے جس میں نہ صحیح بدل موجود ہو اور نہ ہی باہمی تعاون پایا جاتا ہو بلکہ دوسرے کو نقصان دے کر نفع حاصل کرنا مقصود ہو جیسے قمار (جوا) یا اس میں صحیح رضامندی موجود نہ ہو جیسے سود تو یہ تمام طریقے باطل اور ظلم ہیں اور ایسے معاملات ناجائز اور حرام ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ:۲/۱۰۳)

ایک اور مقام پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

''جوئے میں لوگوں کے مال کو اس طرح اچک لیا جاتا ہے کہ اس میں بالکلیہ جہالت، حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں آدمی

Marfat.com

گرفتار ہو جاتا ہے اور دھوکہ کی گاڑی پر سوار ہو کر اس میدان میں کودتا ہے، اور حرص اور غلط آرزو وغیرہ اس کو ان شرائط کے مان لینے پر آمادہ کر دیتی ہیں جنہیں نہ شہری زندگی کی تعمیر میں اور نہ باہمی امداد و تعاون میں دخل ہے۔ ہارنے والا اگر ہارنے کے بعد خاموش ہوتا ہے تو اس کی یہ خاموشی غصہ اور ایسی ناکامی و نامرادی کی چنگاریوں پر ہوتی ہے جن میں وہ بالا رادہ گیا تھا۔ یوں ہی جیتنے والا اپنی جیت سے لذت اندوز ہوتا ہے اور اس کا کاروبار اور اس کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے، اور اس کی حرص اس فعل سے باز آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ بالآخر کچھ ہی دنوں کے بعد اس کا تاوان خود ہی اس کے سر پر مسلط ہو جاتا ہے۔

"اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس عادت بد کا رواج پیدا ہو جاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ ملک کی دولت عامہ کے نظام میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور باہم ایک طویل جھگڑوں کی بنیاد پڑ جاتی ہے، اور حصول معاش کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع ہیں ان کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں۔ لوگ باہمی امداد و اعانت سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔"

اور آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور مشاہدہ تمہیں بے نیاز کر سکتا ہے۔ آخر جواریوں میں تم نے ان امور کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا ہے کبھی کسی اور چیز کا بھی مشاہدہ کیا ہے؟"

بہرحال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ موجودہ نظام معیشت میں قمار کے ذریعہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسلام نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں کو ہی نہیں بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا ہے جیسے سٹہ وغیرہ ان کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔

Marfat.com

امر واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں یورپ نے اسلام کے قانون سے باغی ہو کر اپنے ہاتھوں اپنا جو حال کیا ہے اور کر رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ خودکشی اور اقدام خودکشی کے کتنے واقعات قمار بازی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ پھر مالی ابتری کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یورپ کی پہلی جنگ عظیم سے اکیلے انگلستان (England) سے متعلق تخمینہ ہے کہ کم ازکم دس کروڑ پونڈ سالانہ کی رقم اپنے مالکوں کے قبضہ سے نکل کر جواریوں کے ہاتھ میں پہنچتی ہے۔ یہ تخمینہ یورپ کے صرف ایک ملک اور ایک چھوٹے سے رقبہ سے متعلق تھا اور وہ بھی جنگ عظیم سے قبل کا۔ یورپ کے کل ملکوں اور امریکہ کی ساری ولایتوں کی مجموعی تباہ کاریوں کے جدید ترین تخمینہ کے لیے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حساب کے کن ہندسوں تک میزان پہنچے۔ رہیں قانون وقت کی ناکام کوششیں تو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن (Encyclopaedia of Religion) کے اسی مقالہ میں ہے کہ قانون اس میں کمی پیدا کرنے کی اپنی والی سب ہی کوششیں کر رہا ہے بجز اسے قطعی ممنوع کرنے کی ناممکن کوشش کے۔ یہ حوصلہ اسلام ہی کا تھا کہ اس نے عقلائے فرنگ کی اس ناممکن کوشش کو اپنی حدود میں ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ بنا کر دکھا دیا۔ (تفسیر ماجدی)

خلاصہ یہ کہ اسلام کے معاشی نظام میں اس قسم کے تمام تجارتی کاروبار کے لیے مطلق کوئی گنجائش نہیں جو صریح قمار اور جوا ہوں یا ان کی تہ میں مالی بڑھوتری کا وہی جذبہ کارفرما ہو جو قمار میں پایا جاتا ہے۔ اور اگر اقتصادی، معاشی اور اخلاقی ماہرین سے اس بارہ میں دریافت کیا جائے تو وہ بھی کسی اختلاف کے بغیر متفقہ طور پر یہی رائے دیں گے بلکہ یہ رائے دے چکے ہیں کہ ''قمار'' کی قسم کے تمام معاملات ہماری اجتماعی زندگی اور ہماری سوسائٹی کے لیے تباہ کن ہیں۔ احتکار کی یہ دوسری قسم ہے جو اس لیے اسلام نے ناجائز اور ممنوع قرار دی ہے کہ اس میں بھی دولت اور سرمایہ کو بعض افراد یا گروہ میں سمٹا دیا جاتا ہے اور ایک فریق تباہ و برباد ہو جاتا ہے جب کہ دوسرا مال بڑھوتری کے باعث عیش وعشرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس میں گھوڑوں کی ریسیں، سٹہ، لاٹری اور اس قسم کی جوئے کی سب قسمیں شامل ہیں۔

موجودہ زمانے میں ہر قسم کی لاٹری بھی قمار میں داخل ہے جس کی سینکڑوں

Marfat.com

صورتیں بازاروں اور کارخانوں میں رائج ہیں۔ آج کل وبا کی طرح قمار کی ایک صورت معموں کی شکل میں عام ہوگئی ہے جو حل معمہ کے عنوان سے بہت سے اخبارات اور ماہوار رسالوں کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ معمہ کی مختلف صورتیں لکھ کر اشتہار دیا جاتا ہے کہ جو شخص اس کا کوئی حل کر کے روانہ کرے اور اس کے ساتھ اتنی فیس روانہ کرے تو جن لوگوں کے حل صحیح ہوں گے ان میں انعام اس شخص کو دیا جائے گا جس کا نام لاٹری یا قرعہ اندازی کے ذریعہ نکل آئے۔ یہ قمار کی ایک صورت ہے اور شرعی طور پر ناجائز ہے۔

بعض شہروں میں بچے بادام، اخروٹ یا کانچ کی گولیاں وغیرہ سے ہار جیت کرتے ہیں اور اس پر شرطیں لگاتے ہیں۔ یہ بھی قمار وغیرہ میں داخل ہے۔ آج کل تو ہر شی پر یہاں تک کہ کرکٹ اور دوسرے کھیلوں پر بھی شرطیں لگائی جاتی ہیں یہاں تک کہ بعض شہروں میں کنکوے اڑا کر پیسوں کی ہار جیت کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اسی طرح سٹہ بازی کا سارا کاروبار قمار ہی ہے اور قرآن کی نص کے مطابق حرام ہے۔ اس کاروبار میں کسی قسم کی اعانت بھی حرام ہے۔ بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا نام دے کر جائز قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس کی مروجہ صورتیں جتنی ہمارے علم میں ہیں، سود اور قمار سے خالی نہیں، اس لیے حرام ہیں۔

........❖❖❖........

Marfat.com

سود

احتکار کی سب سے ملعون قسم ''سودی لین دین'' ہے۔ یہ تمام اقتصادی اور معاشی نظام کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ کروڑوں انسانوں کو مفلس اور نان شبینہ کا محتاج بنا کر دولت کا سمٹاؤ ایک مخصوص طبقہ کی طرف کر دیتا ہے۔ سود سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اہم اور مضبوط ستون ہے اور اس نظام کی عمارت کا زیادہ انحصار اسی پر ہے۔

ربوا یا سود ایک قدیم کاروباری مسئلہ ہے اور دنیا کی اکثر قومیں اس کاروبار کو کرتی رہی ہیں، لیکن کسی زمانہ میں بھی اس کو اچھا کام نہیں سمجھا گیا۔ سود خوار اگرچہ لوگوں میں رہتا تھا لیکن معاشرہ میں اس کی حیثیت عموماً ایک مجرم کی سمجھی جاتی تھی جو لوگوں کا خون پیتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سود خوار خود بھی اپنے کو مجرم خیال کرتا تھا۔ اس جرم کے گھناؤنے پن کی وجہ سے قرآن نے انتہائی سخت لہجوں میں ''سود خواری'' کے جرم کی مسلسل سزاؤں کا اعلان شروع کر دیا۔ سزائیں بھی ایسی شدید کہ بڑے سے بڑے کبیرہ گناہ کے بارہ میں بھی سزاؤں کی اتنی شدت قرآن حکیم میں نہیں ملتی۔ شیطانی آسیب زدوں کی شکل میں سود خوار اٹھے گا، تکثیر دولت کی تمام کوششوں کو اس کی قدرت برباد کر کے رکھ دے گی، جہنم میں اسے ابدی عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا اور آخر میں تو قرآن نے اعلان کر دیا کہ جو شخص سود خوری سے رکنے اور توبہ کرنے پر آمادہ نہیں ہے، چاہیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اعلان جنگ دیدے۔ علماء نے بھی لکھا ہے کہ کسی جرم پر خواہ وہ انسان کی زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہو، قرآن حکیم میں اتنی سزاؤں کی دھمکی نہیں دی گئی ہے۔ چونکہ سود خوری ایک معاشی جرم ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے معاشی مسائل کو کس قدر اہمیت دی ہے، لیکن قرآن کی سخت سزاؤں کے مقابلہ میں جاہل عربوں

Marfat.com

کے قلوب بھی شاید سخت ہو گئے تھے لہٰذا جواز سود پر انہوں نے یہ استدلال پیش کیا:

﴿انما البیع مثل الربوا﴾

''یعنی بیع وفروخت کے معاملہ ہی کی طرح تو سود کا معاملہ ہے۔''

مطلب یہ کہ بیع کے معاملہ میں بھی مال کا مبادلہ مال سے ہوتا ہے اور سود میں بھی مال کا مبادلہ مال ہی سے کیا جاتا ہے تو پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ جب قرآن بیع کے معاملہ کو جائز اور حلال قرار دیتا ہے تو سود کے معاملہ کو ناجائز اور حرام اور وہ بھی اتنی سختیوں کے ساتھ، اس کی عقلی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ قرآن حکیم نے ان کے اس عقلی اعتراض کا عقلی جواب تو نہیں دیا بلکہ جواب میں یہ کہا کہ ''خدا کا حکم یوں ہی ہے کہ بیع کو حلال کیا ہے اور ''ربوا'' (سود) کو حرام کر دیا ہے۔ اس کے بعد پھر ان سزاؤں کا ذکر کیا ہے جن کو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ جاہلی عرب ایک انتہائی کم عرصہ میں مسلمانوں سے مغلوب ہو گیا اور اس زمانہ کی دو سپر پاورز (Super Powers) کو بھی اسلامی جھنڈے کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا۔ اسلامی حکومتوں نے پوری مملکت میں نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی سودی لین دین کو ناجائز ٹھہراتے ہوئے ایک عام صورت ایسی پیدا کر دی کہ پھر صدیوں ''جواز سود'' کی طرف کسی کا خیال تک نہیں گیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یونہی اکثر قوموں میں یہ سودی کاروبار بدنام تھا۔ اور دوسرے اسلام کا سیاسی اقتدار جب اس کرۂ اغبر پر قائم ہوا تو جیسا کہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی بھلائی اور برائی کا معیار اس زمانہ میں اسلام ہی کا نقطۂ نظر بن گیا۔ سیاسی غلبہ کا یہ ایک عام اثر ہے جس سے دنیا ہمیشہ متاثر رہی ہے اور آج بھی متاثر ہے۔ چنانچہ کسی چیز کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل اس زمانہ میں بھی یہی ہے کہ جن قوموں کو آج دنیا میں سیاسی اقتدار حاصل ہے یہ ان کا قول یا فعل ہے۔ یورپ کے موجود تمدن کی ظاہری چمک دمک اور رنگ وروغن نے لوگوں کے دلوں کو ایسا اپنی طرف لبھایا ہے کہ دلائل کے بجائے یورپ کا طرز عمل ہی مسائل کے خطا وصواب اور عمل کے خیر اور شر ہونے کا معیار بن گیا ہے یہ دیکھنا کافی ہے کہ یورپ نے اس کا کیا فیصلہ کیا ہے اور ان کا اس بارہ میں طریق کار

Marfat.com

کیا ہے۔ اب ہر وہ مسئلہ جو اس کے مطابق نہیں وہ خطا اور ہر وہ عمل جو اس کے موافق نہیں وہ شر اور دقیانوسیت بلکہ جہالت ہے۔ چنانچہ آج کل کے اکثر مدعیان عقل کے نزدیک تحقیق کی یہی صحیح راہ ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہم کو اس کی بدولت اپنے بہت سے اصول چھوڑنے پڑے، اور ہمارے بہت سے نوجوانوں کو اپنے دینی مسائل میں غلطی محسوس ہونے لگی، اور بہت سے متکلمین جدید نے اسلام کی مدافعت میں معذرت اور اپالوجی (Apology) اختیار کی اور یہ کوشش کرنے لگے کہ کاش کسی طرح اسلام کی پیشانی سے ربا کی حرمت کا داغ مٹایا جا سکتا۔ چنانچہ ایک سوسائٹی بنی اور علی گڑھ سے اور پھر بدایوں سے اس کا اخبار بھی نکلا جس کا نام ''سودمند'' تھا اور کئی رسالے چھاپے گئے جن میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کی موجودہ تنزل اور عدم ترقی کا سبب حرمت سود کا عقیدہ ہے اور یہ دلائل اس زور شور سے پیش کیے گئے کہ قرآن حکیم اور احادیث اور فقہی روایات کی توجیہہ و تاویل کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی گئی۔ وہ زمانہ تو ختم ہو گیا لیکن حکومت کی سطح پر ''روشن خیال پاکستان'' کے عنوان سے ہر اس برائی کو سند جواز فراہم کی جا رہی ہے جس کا چلن یورپ اور امریکہ میں عام ہے اور وہاں کے عوام اب اس سے تنگ آ چکے ہیں، اور ان لقموں کو اب باہر سے پکڑ پکڑ کر نگلا جا رہا ہے جن کو اہل یورپ اور امریکہ نے باہر اگل دیا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان قوموں کی نگاہ میں دقیانوس نہ سمجھے جائیں۔ چنانچہ اب ان علماء کو بھی جاہل اور دقیانوس کے نام سے پکارا جانے لگا ہے جو لوگوں کے سامنے وہ اسلام پیش کرتے ہیں جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور چودہ سو سال سے متفقہ طور پر پوری امت اس کی قائل ہے۔ یہ سب کچھ اس پاکستان میں کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کو اسلام کے نام پر دس لاکھ انسانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے بنایا تھا اور لاکھوں انسانوں نے ہی اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں ہجرت کی تھی۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کی نگاہ میں محبوب بننے کے لیے کیا جا رہا ہے جو ایک خدا ناآشنا معاشرہ میں رہتے ہیں اور جن کے نزدیک نیکی اور بدی، خیر اور شر اور بھلائی اور برائی کا کوئی معیار نہیں۔ اگر کوئی معیار ہے تو صرف لوگوں کی پسند اور ناپسند ہے۔ اور اکثریت تو ہر زمانہ میں جاہل اور بے

وقوف رہی ہے اور ارسطو کا مقولہ بھی ہے کہ (Majority is always fools) اکثریت ہمیشہ احمقوں پر مشتمل رہی ہے۔ وہ اکثریت یورپ کی ہو یا امریکہ کی، فرانس کی ہو یا اسپین کی، پاکستان کی یا ہندوستان کی، جاپان کی ہو یا چین کی۔

بات اصل میں یہ ہے کہ زمانہ بدلا اور وقت نے کروٹ لی اور مسلمانوں کے سیاسی غلبہ نے بتدریج مغلوبیت کا رنگ ہر اس جگہ اختیار کیا جہاں وہ غالب تھے۔ اب معیار بدل گیا۔ اسلام کی طرف کسی شی کا انتساب جب اس کی خوبی کی دلیل تھی، یہ بات جاتی رہی ہے۔ ادھر یورپ جس کو مسلمانوں کی مغلوبیت کے بعد دنیا کا سیاسی اقتدار ملا کلیسائی آویزشوں کے سلسلہ میں بالآخر اس نتیجہ تک پہنچا کہ کلیسا کے ساتھ ساتھ اس مذہب کا بھی قریب قریب انکار کر دیا۔ سود حالانکہ عیسائیت میں بھی کوئی اچھا عمل نہیں جس کا کلیسائی عہد میں یورپ پابند تھا، لیکن مذہب اور کلیسا کے اقتدار کو ختم کر دینے کے بعد یورپی لوگوں کے نزدیک ''سود خوری'' جو مذہبی نقطۂ نظر سے ناپسندیدہ فعل ہے، قابل توجہ بات نہ رہی۔ لہٰذا انہوں نے سوال اٹھایا کہ خالص عقلی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ ''سود'' کی کیا حیثیت ہے؟ چنانچہ علمائے معاشیین نے اس پر بحث کرنی شروع کی اور جاہلی عرب کی وہ مردہ دلیل لوگوں کے سامنے پیش کی جس کو قرآن چودہ سو سال قبل رد کر چکا تھا ''انما البیع مثل الربو'' یورپ کے ارباب فکر و نظر نے اس دلیل کو نئے سرے سے پھر زندہ کیا اور اپنے اپنے سودی کاروبار کے قضیئے کو نئی شکلوں میں منظم کرنے کی کوشش کی۔ معاشیات کے ماہرین نے جن میں یہودی تنظیموں کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا، ہر اس شخص کے لیے سود خوری کے مواقع فراہم کر دیئے جو اپنی آمدنی سے معمولی سی رقم بھی پس انداز کر سکتے ہیں، تاکہ ان کی اس پس انداز آمدنی کا سود انہیں بغیر کسی فکر اور خرخشہ کے باقاعدہ ملتا رہے۔ اس کے علاوہ کاروبار کے ہر طریقہ میں اور لین دین کی دوسری راہوں میں بھی اس ''سود'' کی لعنت کو کچھ اس طرح جذب کر دیا گیا کہ عام کاروبار کرنا بھی عوام الناس کے لیے بغیر سود لینے اور دینے کے قریباً ناممکن ہو گیا۔ برصغیر پاک و ہند، مصر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی بعض لوگوں کے ذہنوں میں ''جواز سود'' کی دلیل ڈال دی گئی۔ علماء نے اس بارہ میں کافی دلائل دیئے، ضخیم کتابیں لکھیں فتویٰ دیئے لیکن یورپ کی

Marfat.com

سیاسی اقتدار کا اثر لوگوں کے ذہنوں پر کچھ اس طرح ہوا کہ عقلی دائروں میں جاہلی عرب کے استدلال کی جیت ہوگئی اور مذہب اس میدان میں مات کھا گیا اور بات یہاں تک پہنچی کہ اسلامی نظریہ پر قائم شدہ پاکستان کی سپریم کورٹ میں حکومت کے وکیل نے یہ بیان دیا کہ پاکستان کی معیشت سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ اس کی اس دلیل کو قبول کرتے ہوئے حرمت سود کے ایک مدلل اور ضخیم فیصلہ کو معرض التواء میں ڈال دیا گیا بلکہ قریباً قریباً ختم کر دیا گیا۔

پھر بعض حضرات شخصی مہاجنی قرضہ پر سود کو فن کی حیثیت سے بتاتے ہیں اور چند اشخاص کی مجموعی کاروباری شکل کو جس کا نام سترھویں صدی کے شروع میں بینکنگ سسٹم پڑا، جائز کہتے ہیں۔ گویا ان کا یہ کہنا ہے کہ چوری تو ناجائز ہے لیکن ڈاکہ جائز ہے یعنی ایک جرم تنہا ایک آدمی کرے تو وہ تو ناجائز اور معاشرہ کے لیے مضر ہے مگر جب اس جرم کو سازش کر کے چند آدمی مل کر کریں تو وہ جائز ہو جائے گا۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق سود سے کبھی بھی کوئی قومی فلاح یا دنیوی بہبود پیدا نہیں ہوسکتی۔ قرآن کا فیصلہ ہے اور اٹل فیصلہ ہے اور دنیا نے اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں اس کی تصدیق بھی کی ہے۔

﴿یمحق الربا ویربی الصدقات﴾ (بقرہ:۲۷۶)

''بے شک اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔''

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودی کاروبار سے ملک کی دولت میں ترقی ہوتی ہے لیکن یہ محض فریب نظر اور دھوکہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مہاجنی قرضہ کے سود سے ملک کے صرف چند اشخاص کی دولت بڑھتی ہے اور سارے اہل ملک کی دولت گھٹتی ہے۔ بینکنگ اور کواپریٹو سوسائٹیز کے سسٹم میں چند اشخاص کے بجائے سینکڑوں اشخاص کی دولت کو ترقی ہوتی ہے مگر اس کے مقابلہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کی دولت کم ہوتی ہے اور تب ان سینکڑوں کی دولت بڑھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سود کو جس حیثیت سے بھی رواج دیا جائے وہ اپنی تباہی پھیلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قرض انسان کی ایک ضروری حاجت ہے۔ اس حاجت کو پورا اسلام نے

Marfat.com

قانون کے بجائے اخلاق سے کیا ہے۔ اس نے ضرورت مندوں کو قرض دینا ثواب کا کام بتایا ہے، اور اس قرض پر مقروض سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا سود قرار دیا گیا ہے۔ اہل تقویٰ نے تو اس باب میں یہاں تک احتیاط کی ہے کہ مقروض کے ہاں دعوت کا قبول کرنا بھی مشتبہ بتایا ہے بلکہ لوگوں کو ہدیہ اس غرض سے دینا بھی کہ ان سے کچھ زیادہ وصولی کا موقع ملے ربا (سود) میں شامل کیا ہے۔

ضرورت مند کو قرض دینا اسلام نے ثواب کا بہترین عمل بتایا ہے لیکن جو لوگ قرض لے کر استطاعت کے باوجود ادا کرنے میں دیر کریں، ان کو ظالم کا خطاب دیا گیا ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ بے قرض ادا کیے مر جائیں ان کے ترکہ میں سب سے پہلے قرض ادا کرنا ضروری قرار دیا، اور قرض ادا کیے بغیر اگر وہ مر جائیں تو ان کی جنازہ کی نماز پڑھنے میں بھی تامل کیا گیا ہے۔ اسلام نے قرض کے لیے حکومت سے کہا ہے کہ وہ لوگوں کو بغیر سود قرض دینے کا انتظام کرے۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں بیت المال سے قرض لیا جاتا تھا جس کی ادائیگی اگر مقروض اپنی زندگی میں کسی وجہ سے نہ کرتا تو اس کی متروکہ جائیداد اور دولت سے اس کی وصولی عمل میں آتی۔ خلاصہ یہ کہ اسلام نے سود کی نہایت مذمت کی ہے لیکن موجودہ زمانہ میں سرمایہ دارانہ نظام نے سود کو اتنا عام کر دیا ہے کہ ایک عام آدمی کے لیے اس سے بچنا مشکل ہو گیا ہے خصوصی طور پر بنکنگ سسٹم نے ہر آدمی کو سود میں کسی نہ کسی صورت میں ملوث کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص بنک سے سود نہیں لیتا تو وہ اس سودی ادارے کے سود لینے کے گناہ میں شریک ہے۔

سود کیا ہے؟

قبل اس کے کہ ہم سود پر کوئی مزید بحث کریں، اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ سود ہے کیا؟ اور اس کی حدود کیا ہیں؟ اور اس کی حرمت کے احکامات کن معاملات سے متعلق ہیں؟ اور اسلام سود کو ختم کر کے معاشی معاملات کو کن خطوط پر چلانا چاہتا ہے۔ قرآن حکیم میں سود کے لیے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ''ربوا'' ہے۔ ربا کس کو کہتے ہیں اور اس کے کیا معنی ہیں؟

Marfat.com

﴿الربا: الزيادة على شئى﴾
''کسی شی پر زیادتی''
یعنی ربوا کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، مثلاً عربی زبان میں کہا جاتا ہے:
﴿اربیٰ فلان علیٰ فلان﴾
''فلاں شخص نے فلان کو زیادتی دی۔''
اس سے معلوم ہوا کہ ربوا کے معنی لغت عرب میں زیادتی اور اضافے کے ہیں
ر اصطلاح میں اہل عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک
رض خواہ اپنے قرض دار سے مہلت کے معاوضہ میں وصول کرتا تھا۔ اس کو ہماری زبان
یں سود کہتے ہیں۔

قرآنی آیات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ربوا کے معنی زیادتی ہی کے ہیں۔
چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:
﴿ومن آياته انک تریٰ الارض خاشعة، فاذا انزلنا عليها الماء اهتزت وربت﴾ (حم السجدة:۳۹)
''اور اس کی نشانیوں میں سے (ایک یہ) ہے کہ تم زمین کو دبی پڑی دیکھتے ہو، پھر جب ہم پانی برساتے ہیں تو یہ تازہ ہوتی ہے اور ابھرتی ہے۔''

امام راغب نے بھی کہا ہے کہ رأس المال پر جو زیادتی ہو وہ ''ربا'' ہے لیکن
قانون میں اس زیادتی کو خاص کر کہتے ہیں جو ایک مخصوص طریقہ پر ہو۔
صاحب معجم المصنفین علامہ محمود حسن ٹونکی فرماتے ہیں:
''ربا اور بیع عربی زبان کے لفظ ہیں۔ جب تک کوئی اصطلاح شرعی لغوی معنے میں تبدیلی نہ پیدا کرے، قرآن وسنت میں آئے ہوئے الفاظ کے معانی لغت عربی سے معلوم ہوتے ہیں۔ ''ربا'' لغت میں زیادت ہے اور لسان العرب وغیرہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ حقیقت

Marfat.com

بیع کی معاہدہ فی تعاوض الاموال'' ہے، لہٰذا لغوی لحاظ سے ربا کی تعریف یہ ہے کہ لین دین کے معاہدے میں عوضین مماثلین میں سے ایک عوض کا دوسرے عوض پر زیادت مذکور ہونا یا عوضین میں سے عوض دین پر زیادت مذکور ہونا، اور جب معاہدہ میں زیادت مذکور ہوتی ہے تو اس زیادت کا نام عرب میں ''ربا'' ہے، وھو المتعامل فیما بین الناس، اور معاہدے میں مذکور ہونے کی وجہ سے اس کو مشروط کہا جائے گا۔

حافظ ابن حجرؒ نے بھی فرمایا ہے:

''الربا مقصور ہے اور مد بھی بیان کیا گیا ہے، لیکن شاذ ہے۔ یہ ربا یربو سے بنا ہے اور الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے، لیکن قرآن حکیم کے رسم الخط میں واؤ کے ساتھ ہے (جیسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ) اور ربا کی اصل زیادتی ہے خواہ نفس شی میں ہو جیسے ارشاد خداوندی ہے ''اھتزت وربت'' (وہ لہلہائی اور بڑھی) یا مقابلہ میں ہو جیسے دو درہم کے مقابلہ میں ایک درہم۔ کچھ حضرات کا فرمان ہے کہ دونوں حقیقی معنی ہیں اور کچھ کی رائے میں پہلے حقیقی اور دوسرے مجازی معنی ہیں، ابن سریج کہتے ہیں کہ یہ دوسرے معنی میں حقیقت شرعیہ ہے۔

لیکن قرآن حکیم نے ہر قسم کی زیادتی کو حرام نہیں کیا، کیونکہ زیادتی تو تجارت میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے، اس لیے اس کو ''ربوا'' کا نام دیا گیا ہے۔ اہل عرب کی زبان میں اسلام سے پہلے بھی سود کو ربوا کے نام سے ہی یاد کیا جاتا تھا اور وہ لوگ ربوا کو بیع کی طرح جائز سمجھتے تھے اسلام نے آ کر بتایا کہ جو زیادتی یا اضافہ مال میں بیع سے ہوتا ہے وہ تو جائز ہے اور اضافہ سود سے ہوتا ہے وہ حرام ہے۔

''سود خوروں کا یہ حشر اس لیے ہوگا کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ربوا کی

Marfat.com

مانند ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربوا کو حرام۔"
چونکہ ربوا ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام تھا اور وہ معاشرہ میں معلوم ومشہور تھی وجہ سے قرآن حکیم میں اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی اور صرف اتنا کہنا کافی سمجھا کہ اسے حرام قرار دیا گیا۔

نزول قرآن کے وقت سودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں اور جنہیں اہل ب "ربوا" کے نام سے تعبیر کرتے تھے وہ یہ ہیں، مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ شی فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کر دیتا۔ اور اگر وہ مدت جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہوگی، یا مثلاً قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی۔ اور اگر اس مدت میں اصل رقم مع فے کے ادا نہ ہوتی تو مزید مہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔

اکثر فقہاء اور مفسرین نے صرف قانونی نقطۂ نظر سے مسئلہ سود پر بحث کی ہیں ن امام فخر الدین رازیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سود پر معاشی نقطۂ نظر سے بحث کی ۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

> لفظ "ربا" کے معنی زیادتی کے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر طرح کی زیادتی وصول کرنا حرام ہے بلکہ "ربا" کی جو حرمت ہے وہ ایک خاص قسم کا معاہدہ ہے جو ان عربوں کے ہاں "ربا" کے نام سے موسوم تھا، اور یہی "ربا نسیہ" ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس ربا کو حرام قرار دیا ہے تو اس سے یہی ربا نسیئہ مراد ہے۔

سود کی حرمت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ربا اس بات کا مقتضی ہے کہ اس میں یک انسان کا مال بغیر کسی عوض کے لیا جائے کیونکہ جو کوئی ایک درہم کو دو درہم کے بدلے ں نقد یا ادھار فروخت کرتا ہے تو وہ یہ زیادہ درہم بغیر کسی عوض کے لیتا ہے اور انسان کے مال سے اس کی احتیاط وابستہ ہوتی ہے جس کی بڑی حرمت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ انسان کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت جیسی ہے۔ پس اسی وجہ سے

Marfat.com

دوسرے کا مال بغیر کسی استحقاق اور عوض کے لینا ممنوع قرار دیا۔ اور اگر کہا جائے کہ کیوں جائز نہ ہے جب کہ رأس المال (اصل زر) زائد درہم کے بدلہ میں ایک طویل مدت تک اس کے قبضہ میں رہتا ہے۔ اگر رأس المال اس کے ہاتھ میں رہتا تو ممکن تھا مالک مال اس سے تجارت کرتا اور اس تجارت کی وجہ سے وہ فائدہ حاصل کرتا۔ پس وہ اس کو مدیون کے ہاتھ میں چھوڑتا ہے اور مدیون (یعنی قرض دار) اس سے نفع اٹھاتا ہے تو پھر کس لیے صاحب مال کو زائد درہم لینے سے روک دیا گیا؟ کیونکہ یہ اس کے اس سے نفع اٹھانے کا معاوضہ تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ جس نفع اٹھانے کا آپ نے تذکرہ کیا ہے ایک امر موہوم ہے جو کبھی حاصل ہوتا ہے اور کبھی حاصل نہیں ہوتا لیکن یہ زائد درہم یقینی امر ہے۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سود لوگوں کے کسب و ہنر میں مشغول ہونے سے روکتا ہے کیونکہ جب صاحب سرمایہ کو سود کے ذریعہ چاہے وہ نقد ہوں یا ادھار، درہم حاصل ہوں تو اس کے لیے روزی کمانا (اکتساب المعیشت) آسان ہو جائے گا لہٰذا وہ کسب، تجارت اور مشقت طلب صنعتوں کی تکلیف نہ اٹھائے گا، اور اس سے لوگوں کے فوائد (منافع الخلق) منقطع ہو جائیں گے، اور یہ تو لازمی امر ہے کہ دنیا کا کاروبار بغیر تجارت، صنعت و حرفت اور عمارات کے چل نہیں سکتے۔

تیسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ معاہدۂ ربا اس وجہ سے ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ قرض لوگوں کے درمیان نیک نامی اور شہرت کو منقطع کر دیتا ہے۔ جب سود ہی حرام ہو تو لوگ روپیہ قرض لینے اور اس کو واپس لوٹانے سے باز رہتے ہیں۔ اگر سود حلال ہو جائے تو حاجت مند شخص کی حاجت اس کو اس امر پر آمادہ کرے گی کہ ایک درہم کو دو درہم حاصل کرے۔ اس طرح آپس کی ہمدردی، نیکی اور احسان مندی ختم ہو جائے گی۔

آخر میں حضرت امام رازی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ''ربا کی حرمت قرآن حکیم سے ثابت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان کو جو احکامات دیئے جاتے ہیں اس کی حکمت بھی معلوم ہو۔ پس ربا (سود) کی حرمت نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے گو ہم اس کی وجہ نہ جانتے ہوں۔'' امام رازیؒ اس آیت ربا میں جس میں شیطان کا ذکر ہے، اس بحث

کرتے ہوئے شیطان کے وجود پر ایک دلچسپ بحث کی ہے کہ آیا وہ انسان کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے یا نہیں؟ اور آخر میں فرماتے ہیں کہ جاہل عرب صرع (مرگی) کی بیماری کو شیطان کی طرف منسوب کرتے تھے، تو جب انہیں خطاب کیا گیا تو ایسے ہی کلمات میں کیا گیا جس کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

﴿انما البیع مثل الربوا﴾

''تجارت سود جیسی ہے۔''

جاہلی لوگ ربا اور سود کو مشابہ سمجھتے تھے اور یہ کہ اگر کوئی شخص ایک کپڑا دس روپے میں خریدے اور گیارہ روپے میں فروخت کر دے تو یہ حلال ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دس روپے کو گیارہ روپے میں فروخت کر دے تو بھی حلال ہونے چاہئیں جب کہ نگاہ شریعت میں یہ حرام ہیں، کیونکہ عقلی طور پر دونوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، اور ربا نقد میں ایسا ہی ہوتا ہے، اور ربا نسیہ (ادھار) میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر وہ دس روپے کا کپڑا آئندہ سال گیارہ روپے میں فروخت کرے تو جائز سمجھا جاتا ہے۔ پس اس طرح سے اگر کوئی شخص دس روپے کے بدلے آئندہ ماہ گیارہ روپے دے تو یہ بھی جائز ہونا چاہیے کیونکہ عقلی طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور تجارت اس وجہ سے جائز ہے کہ اس میں آپس کی رضامندی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ سود بھی جب آپس کی رضامندی ہو جائے تو جائز ہونا چاہیے۔ چونکہ خرید وفروخت احتیاجات رفع کرنے کے لیے ضروری ہیں اور ممکن ہے کہ انسان احتیاجات لاحق ہوتے وقت نادار اور خالی ہاتھ ہو اور مستقبل میں بے شمار دولت اس کے ہاتھ آجائے، پس اگر سود کو جائز قرار نہ دیا جائے تو صاحب مال اس کو کچھ نہ دے گا اور انسان اپنی احتیاجات اور ضروریات میں گرفتار رہے گا اور کوئی اس کا پرسان حال نہ ہوگا۔ سود جائز ہونے کی صورت میں صاحب مال مال کی زیادتی کے لالچ میں اس کو قرض دے دے گا اور مدیون (قرض دار) دولت ہاتھ آجانے پر زیادتی کے ساتھ واپس کر دے گا، اور مال حاصل ہو جانے پر زیادتی ادا کرنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ شخص مال پانے کے قبل احتیاجات میں گرفتار رہے۔ پس یہ بات اس امر کی مقتضی ہے کہ ربا حلال ہے جیسا کہ ہم نے دوسری تمام خرید وفروخت کو حلال کر رکھا ہے کہ

Marfat.com

اس سے انسانی احتیاجات پوری ہوتی ہیں۔ یہ ان لوگوں کا شبہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام، اور جو تم نے کہا کہ وہ ایسا نص صریح ہے جو قیاس کے معارض ہے۔ اور دین نص سے ثابت ہوتا ہے نہ کہ قیاس آرائی سے۔"

(تفسیر کبیر رازی زیر آیت انما البیع مثل الربوا)

جاہلیت کا ربوا:

زمانۂ جاہلیت میں ربوا کا اطلاق جس قسم کے معاملات پر ہوتا تھا، روایات میں اس کی کئی صورتیں ذکر کی گئی ہیں:

1- سیدنا مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کا ربوا یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا کہ اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو میں تجھے اتنا زیادہ دوں گا۔

2- قتادہؒ کہتے ہیں کہ جاہلیت کا ربوا یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے کوئی چیز لیتا اور اس کی ادائیگی کے لیے مہلت لیتا۔ اگر یہ مہلت گزر جاتی اور ادائیگی نہ ہوتی تو مزید مہلت ملتی اور رقم میں اضافہ ہو جاتا۔

3- ابوبکر جصاصؒ لکھتے ہیں کہ دور جاہلیت میں لوگ ایک دوسرے سے قرض لیتے اور باہم یہ طے کرتے کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل زر سے زیادہ ادا کی جائے گی۔

کاروبار کی یہ صورتیں عرب میں رائج تھیں اور انہی کو اہل عرب ربوا کہتے تھے اور اسی ربوا کی تحریم کا حکم قرآن میں نازل ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل طائف، مکہ، مدینہ وغیرہ سود کا کاروبار عام ہوتا تھا۔ طائف میں قبیلہ ثقیف جاہلیت میں بنو مغیرہ کو قرض دیتے تھے۔ جب ادائیگی کی مدت آ پہنچتی تو بنو مغیرہ کہتے کہ ہم زیادہ دیں گے تم ہمیں مہلت دو (تفسیر ابن جریر ۴/۵۰) طائف میں قبیلہ ثقیف کے چار بھائی مسعود، عبد یالیل، حبیب بن عمرو بن عمر ثقفی تھے۔ یہ بنو مغیرہ کو قرض دیتے اور ان سے سود وصول کرتے تھے۔ طائف کی فتح کے بعد یہ چاروں مسلمان ہو گئے۔ ادھر مکہ میں بنو مغیرہ بھی مسلمان ہو گئے۔ جب ان بھائیوں نے بنو مغیرہ سے سود مانگا تو آیت نازل ہوئی کہ "سود طلب نہ کرو۔"

اسی طرح اہل مکہ بھی سودی کاروبار کرتے تھے۔سیدنا عباسؓ اور سیدنا خالد بن ولیدؓ نے زمانہ جاہلیت میں شراکت کی تھی اور سودی کاروبار کرتے تھے۔ جب سود حرام ہوا تو انہوں نے سود کی بہت بڑی رقم بنوعمرو بن عمیر کو چھوڑ دی۔

تو عرب میں سود کا عام رواج تھا۔کسی شخص کا کسی پر کچھ قرض ہوتا تو مقروض قرض خواہ سے کہتا کہ میں تجھے اتنا زیادہ دوں گا تو مجھے مہلت دے۔

(سنن کبریٰ بیہقی: ج ۵ ابواب الربا)

مدینہ میں بھی سود کا عام رواج تھا۔سعید بن ابی بردہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں مدینہ گیا اور وہاں عبداللہ بن سلامؓ سے ملا۔انہوں نے کہا: ''تم کیوں نہیں آتے؟'' تا کہ ہم تمہیں ستو اور کھجوریں کھلائیں اور تم ایک (باعظمت) گھر میں داخل ہو۔اس کے بعد انہوں نے کہا کہ تم ایک ایسے ملک میں رہتے ہو جہاں سود کا بہت رواج ہے،لہٰذا جب کسی شخص پر تمہارا کوئی قرض ہو اور وہ تمہیں گھاس کا گٹھا یا جو یا چارے کا بوجھ بھیجے تو اس کو نہ لینا کیونکہ یہ بھی سود ہے۔(بخاری مناقب عبداللہ بن سلامؓ)

تجارت اور سود میں فرق:

جاہلی عرب اور آج کل کے جدید تعلیم یافتہ حضرات کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سود اور تجارت میں کیا فرق ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بعض طبائع اتنی مسخ ہو جاتی ہیں کہ حق و باطل اور حلال وحرام میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔جدید تعلیم نے بعض حضرات کو کچھ اتنا مغرب زدہ کر دیا ہے کہ وہ بھی چودہ سو سال پرانا جملہ دہرانے لگے ہیں: "انما البیع مثل الربوا" علماء تجارت اور سود میں یہ فرق بیان کیا ہے۔

فروخت کار ایک چیز کو فروخت کرنے کے لیے پیش کرتا ہے اور خریدار اور فروخت کار کے درمیان معاملہ طے پانے کی صورت میں خریدار اس کو خریدنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ فروخت کار وہ چیز اپنی محنت سے تیار کرتا ہے یا کہیں سے لے کر آتا ہے۔ ہر دو صورت میں وہ اپنی محنت کا معاوضہ اصل رقم میں اضافہ کر کے حاصل کرتا ہے اور یہی اس کا منافع ہے۔

اس کے مقابلہ میں ربا (سود) یہ ہے کہ ایک شخص اپنا مال دوسرے شخص کو قرض

Marfat.com

دیتا ہے اور یہ شرط طے کرتا ہے کہ اتنی مدت گزرنے پر وہ اس پر اتنی رقم زائد وصول کرے گا۔ اسی زائد رقم کو سود کہتے ہیں؛ جو صرف مہلت کا معاوضہ ہے۔ اس لحاظ سے سود کی تعریف یہ ہوئی کہ قرض میں دیئے ہوئے مال پر جو زائد رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعین کے ساتھ لی جائے وہ سود ہے۔ گویا سودی معاملہ میں یہ تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔

1- اصل مال پر اضافہ

2- اضافہ کا تعین مدت کے لحاظ سے کیا جانا

3- معاملہ میں اس کا مشروط ہونا

قرض کا ہر وہ معاملہ جس میں یہ تین چیزیں پائی جائیں، سودی معاملہ ہے اور نگاہِ شریعت میں حرام ہے، خواہ قرض کسی پیداواری کام میں لگانے کے لیے لیا گیا ہو یا ذاتی ضرورت کے لیے اور قرض لینے والا امیر ہو یا غریب۔

اس لحاظ سے تجارت اور سود میں اصولی فرق علماء نے یہ لکھا ہے کہ:

1- تجارت میں فروخت کار اور خریدار کے درمیان منافع کا مبادلہ برابری کی بنیاد پر ہوتا ہے کیونکہ خریدنے والا اس شی سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اس نے فروخت کرنے والے سے خریدی ہے اور فروخت کرنے والا اس چیز میں اپنی محنت کا معاوضہ لیتا ہے۔ اس کے برعکس سودی معاملہ میں سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر کردہ مقدار لے لیتا ہے جو اس کے لیے یقینی طور پر منافع بخش ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں سود دینے والے کے لیے منافع یقینی نہیں ہے کیونکہ اس نے اگر قرض ذاتی ضرورت کے لیے لیا ہے تو یقینی طور پر سود اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ اور اگر صنعت وتجارت یا کاروبار اور زراعت کے لیے قرض لیا ہے تو بھی نفع یقینی نہیں۔ نقصان کا بھی اتنا ہی امکان موجود ہے جتنا نفع کا۔ گویا ایک فریق کا منافع تو یقینی ہے اور دوسرے کا مشکوک اور موہوم۔

2- تجارت میں چیز اور اس کی قیمت کا مبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے جب کہ سودی معاملہ میں قرض لینے والا مال لے کر خرچ کر لیتا ہے اور پھر یہ مال دوبارہ حاصل کر کے سود کے اضافہ کے ساتھ واپس کرتا ہے۔

3- تجارت میں فروخت کنندہ خریدار سے خواہ کتنا ہی منافع کیوں نہ لے وہ صرف ایک ہی مرتبہ لیتا ہے، لیکن سودی معاملہ میں رقم لینے والا مسلسل اپنے مال پر منافع وصول کرتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ اور بڑھوتری ہوتی رہتی ہے۔

4- تجارت میں انسان اپنی محنت اور ذہانت صرف کر کے اس کا فائدہ حاصل کرتا ہے جب کہ سودی کاروبار میں صرف زائد از ضرورت مال دے کر فائدہ حاصل کیا جاتا ہے یعنی سودی کاروبار ایسا شراکتی کاروبار ہے جس میں ایک فریق صرف اپنا مال دے کر ایک مقررہ اور مشروط منافع کا شریک بن جاتا ہے۔

یہ ساری باتیں نہ تو آج کل کے تاجروں کے ذہن میں آتی ہیں اور نہ ہی ان لوگوں کے ذہنوں میں گھستی ہیں جن پر مغربی تہذیب کا بھوت سوار ہے۔ چنانچہ وہ سود کے جواز پر مختلف دلائل پیش کرتے ہیں۔ گویا یہ وقت بھی آنا تھا کہ جس شی کو قرآن حکیم کی نص صریح نے حرام قرار دیا ہے مسلمان اس کے جواز کے لیے اخباروں میں بلکہ عدالتوں میں دلائل پیش کرتے ہیں، سود کے جواز کے لیے کہا جاتا ہے کہ سرمایہ (Capital) چونکہ ایک عامل پیدائش ہے اور باقی عاملین پیدائش کے ساتھ مل کر پیدائش دولت کے عمل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے، اس لیے یہ اپنا معاوضہ سود کی صورت میں وصول کرتا ہے جبکہ باقی عاملین پیدائش یعنی زمین، محنت اور تنظیم اپنا اپنا معاوضہ بالترتیب لگان، اجرت اور منافع کی شکل میں وصول کرتے ہیں، تو آخر سرمایہ کو سود کیوں نہ ادا کیا جائے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں عاملین پیدائش چار سمجھے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

نمبر	عامل	معاوضہ
-1	زمین	لگان
-2	محنت	اجرت
-3	سرمایہ	سود
-4	تنظیم	منافع

Marfat.com

کاروباری صورتوں میں اکثر و بیشتر شراکتی بنیادوں پر کاروبار ہوتا ہے جن میں حصہ دار حصص خرید کر سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور اس طریقہ سے کاروبار میں شراکت اختیار کرتے ہیں۔ اس سرمایہ سے جو ان حصہ داروں نے فراہم کیا ہے ناظم اپنی ذہنی صلاحیت کو استعمال کر کے کاروبار چلاتا ہے اور اپنی اس جدوجہد اور کدوکاوش کا معاوضہ مقرر کردہ تنخواہ کی صورت میں کمپنی سے وصول کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ ناظم کی حیثیت ایک الگ عامل پیدائش کی نہیں بلکہ اس کا تعلق محنت سے ہے اور وہ اجرت وصول کرتا ہے کیونکہ محنت بطور عامل پیدائش ذہنی یا جسمانی کاوش اور جدوجہد کا نام ہے اور اس معاوضہ اجرت کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے۔ اور جہاں تک عامل پیدائش کے طور پر سرمایہ کا تعلق ہے تو سرمایہ فراہم کرنے والا یعنی حصہ دار (Share holder) دراصل نفع و نقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے اور نفع یا نقصان کا حق دار ہوتا ہے۔ کاروبار کے تمام حصہ دار (Share holders) اسی حیثیت میں کاروبار میں شریک ہوتے ہیں کیونکہ نفع کی صورت میں ان کو نفع اور نقصان کی صورت میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ گویا سرمایہ پیدائش دولت کے عمل میں خطرہ مول لیتا ہے اور معاوضہ کے طور پر نفع یا نقصان اٹھاتا ہے۔ لہٰذا سرمایہ پر سود کی ادائیگی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا کیونکہ عاملین پیدائش درحقیقت تین ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں عاملین پیدائش کی تعداد چار تسلیم کی جاتی ہے۔ زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم۔ اشتراکی ماہرین معیشت زمین اور محنت ہی کو پیدائش کے عوامل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں تنظیم محنت ہی کی ایک شکل ہے جبکہ سرمایہ کی حیثیت ذخیرہ شدہ محنت (Stored Labour) کی ہے۔ سرمایہ زمانہ ماضی کی محنت کا وہ ثمرہ ہے جسے خرچ کرنے کے بجائے ذخیرہ کر لیا گیا تھا۔ اسلامی معاشیات کے بعض ماہرین کے نزدیک عاملین پیدائش تین ہیں: زمین، محنت اور سرمایہ۔ زمین ان تمام وسائل پر مشتمل ہے جو عطیہ خداوندی ہیں۔ محنت انسانی کاوش اور جدوجہد کا نام ہے جس میں جسمانی مشقت کے ساتھ تنظیمی کام بھی شامل ہے، اور کاروبار کے نفع و نقصان کا ذمہ دار سرمایہ ہے۔

یہ تینوں عاملین پیدائش (زمین، محنت، سرمایہ خطر) اپنی خدمات کے صلہ میں

Marfat.com

اپنا اپنا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ زمین کا معاوضہ کرایہ یا لگان کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ محنت کا معاوضہ اجرت کی شکل میں اور سرمایہ خطر (Risk Capital) کا معاوضہ نفع یا نقصان کی صورت میں، کیونکہ نفع یا نقصان کی ذمہ داری دراصل سرمایہ فراہم کرنے والے کی ہوتی ہے۔ ناظم کا کام چونکہ کاروبار کا انتظام چلانا ہوتا ہے جو وہ اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کو استعمال کر کے چلا جاتا ہے اور اس ذہنی کاوش کا معاوضہ وہ تنخواہ (اجرت) کی شکل میں وصول کرتا ہے، اس لیے تنظیم الگ سے کوئی عامل پیدائش نہیں ہے بلکہ یہ محنت کے زمرہ میں آتی ہے۔ تو ثابت ہوا کہ سود جو ادا کیا جاتا ہے وہ دراصل کسی شی کا معاوضہ نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام میں صارفین کے استحصال کی ایک صورت ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ معاشی اصطلاح ''عامل پیدائش'' کی حقیقت اچھی طرح سے ذہن نشین کر لی جائے۔ عامل پیدائش ہونا کسی عامل کے صرف وجود کا نام نہیں بلکہ پیدائش دولت کے عمل میں اس کا حصہ لینا ہے، مثلاً مزدور اس وقت معاوضہ کا حقدار ہوگا جب وہ جسمانی یا ذہنی طور پر کوئی کام کرے۔ اگر مزدور فارغ بیٹھا رہے تو وہ اجرت کا حق دار نہیں ہوسکتا۔ یہی چیز باقی عاملین پیدائش کے لیے بھی ہے۔ سرمایہ صرف روپیہ پیسہ یا درہم و دینار کی شکل میں موجود ہونا اس کو معاوضہ (شرح سود) کا حق دار نہیں بنا دیتا بلکہ جب سرمایہ کاروبار میں عملی طور پر لگایا جائے تب وہ معاوضہ کا حقدار بنتا ہے۔ اور کاروبار میں لگایا جانے والا سرمایہ نفع ونقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اسی صورت میں اپنا معاوضہ وصول کرتا ہے۔ نفع کی صورت میں نفع اور نقصان کی صورت میں نقصان۔

سود کے جواز کی ایک اور صورت یہ پیش کی جاتی ہے کہ صرفی ضروریات کے لیے جو سرمایہ یا قرض لیا جاتا ہے وہ تو واقعی نامناسب ہے کہ اس پر کسی سے سود لیا جائے، لیکن جو قرض کاروباری مقاصد کے لیے لیا جاتا ہے تو چونکہ ایسا سرمایہ نفع آور یا پیداواری کاموں میں لگایا جاتا ہے اس لیے اس میں سرمایہ پر سود لینے میں کوئی حرج اور برائی نہیں۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ بات یقینی نہیں کہ جو سرمایہ پیداواری کاموں میں استعمال کے لیے لیا گیا یا جو سرمایہ پیداواری کاموں میں لگایا گیا، وہ نفع کا

باعث ہو۔ اس میں نقصان کا احتمال بھی ہے اور عملی طور پر ہوتا یہ ہے کہ آجر اس سرمایہ کا سود مصارف پیدائش میں شامل کر کے قیمت کی صورت میں صارفین (Consumers) سے وصول کرتے ہیں یعنی سود کی ادائیگی ہر دو حالتوں میں صارفین کو کرنا پڑتی ہے خواہ سرمایہ صرفی مقاصد کے لیے لیا جائے یا کاروباری مقاصد کے لیے۔ گویا سرمایہ وصول اور استعمال آجرین کرتے ہیں اور اس کے سود کی ادائیگی صارفین کرتے ہیں۔ اس طرح یہ شرح سود دراصل شرح استحصال ہے، لہٰذا اس کا کوئی منطقی اور عقلی جواز نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام نے سود کو حرام قرار دیا کہ ایک طرف تو یہ بلا جواز ہے اور دوسری طرف اس کا سارا بوجھ بلا ضرورت صارفین کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو ایک کھلی زیادتی ہے اور اسلام کسی زیادتی کو جائز قرار نہیں دیتا۔

سود کی حرمت قرآن حکیم سے:

قرآن حکیم نے سود کے بارہ میں بڑے صریح اور واضح الفاظ میں نہایت سخت اور قطعی احکام صادر فرمائے ہیں، اور مختلف آیات میں ان احکام کو نہایت سختی سے دہرایا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿الذین یأکلون الربا لایقومون الا کما یقوم الذی یتخبطه الشیطان من المس، ذالک بانھم قالوا انما البیع مثل الربوا، واحل الله البیع وحرم الربا، فمن جاۂ موعظة من ربه فانتھیٰ فله ما سلف، وامره الیٰ الله، ومن عاد فاولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون، یمحق الله الربا ویربی الصدقات، والله لا یحب کل کفار اثیم﴾ (البقرہ:۲۷۶)

''جو لوگ سود لیتے ہیں اور اس سے پیٹ پالتے ہیں وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان کی چھوت نے باؤلا اور حواس باختہ کر دیا ہو، یہ اس لیے ہو گا کہ انہوں نے کہا کہ خرید و فروخت (بیع) بھی سود کی طرح ہے، حالانکہ خرید و فروخت کو اللہ

Marfat.com

نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام، لہٰذا اب جس کو بھی اس کے پروردگار کی یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ آئندہ سود لینے سے باز آ گیا تو جو کچھ پہلے لے چکا وہ اس کا ہو چکا، اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اور جو شخص پھر سود لے گا وہ جہنمی گروہ میں سے ہے ہمیشہ عذاب میں رہنے والا۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اور یاد رکھو! اللہ ناسپاس اور نافرمان سے خوش نہیں ہے۔''

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے بعض خاص چیزوں کے بارہ میں وضاحت فرمائی۔ اب تک تو مالیاتی مسائل کے سلسلہ میں صدقات، خیرات، ان کے فضائل اور ان کی شرائط وقیود کی نشان دہی فرمائی۔ صدقات اگر ایک طرف مالیاتی زندگی کو آسان تر بناتے ہیں تو دوسری طرف معاملاتی گناہوں کی تکفیر کا سامان کرتے ہیں۔ صدقات کے ذریعہ انسان میں اخلاق ومروت، خیراندیشی اور رفاہ عامہ کے لیے خیر سگالی کے جذبات کی تربیت ہوتی ہے، اس کے برعکس سود میں محض بے مروتی، ضرر رسانی اور ظلم واستبداد کی روح کارفرما ہوتی ہے، اس لیے یہاں صدقات کے بعد سود کا تذکرہ فرمایا ہے اور بتا دیا کہ صدقات میں جس قدر خیر ہے سود میں اسی قدر برائی ہے۔'' بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد ہی نشو ونما نہیں پا سکتی تھی اگر اس کا حکم دیتے ہوئے ان باتوں سے نہ روک دیا جائے جو اس کی ضد ہیں، اس لیے انفاق فی سبیل اللہ کے حکم کے ساتھ ہی سود کی ممانعت کر دی گئی جو اس کی ضد ہے۔

صدقات انسان میں دوسروں کی خیر خواہی، خیر اندیشی اور رفاہ عامہ کی ہمدردی کے جذبات پیدا کرتے ہیں اور سود اس کے بالکل الٹ قساوت قلبی، بداندیشی کے جذبات پیدا کرتا ہے، گویا سود صدقہ کی بالکل ضد ہے۔ صدقہ کی محرک بلند ہمتی، ہمدردی، فیاضی، ایثار اور رحم دلی ہے اور سود کی محرک بزدلی، خود غرضی، سنگ دلی اور دوسروں کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ صدقہ ضرورت مندوں کو سہارا دیتا ہے اور سود گرے ہوؤں کو اور زیادہ پستی میں گراتا ہے اور پھر اس کا خون چوستا ہے۔ چنانچہ صدقات کے بعد سود کا ذکر کیا گیا۔

دوسری بات جو اس آیت میں فرمائی وہ یہ ہے کہ ''وہ کھڑے نہ ہوسکیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان کی چھوت نے حواس باختہ اور باؤلا کر دیا ہو'' جمہور مفسرین قرآن کے خیال میں کھڑے ہونے سے مراد قیامت میں اٹھنا ہے اور مطلب ہے کہ سود کھانے والے قیامت کے روز قبروں سے ایسے اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ اور مجنون، آخرت میں اپنی قبروں سے اٹھنے پر سود خوار سیدھے کھڑے نہ ہوسکیں گے۔ کھڑے ہوں گے بھی تو خبطیوں، متوالوں اور دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے اور لڑکھڑاتے ہوئے، اس کا ایک ہلکا سا رنگ اسی دنیا میں بھی نظر آتا ہے کہ ایک ساہوکار جو روپیہ کے پیچھے دیوانہ اور باؤلا ہوتا ہے۔ اس کو دیکھ کر حقیقتاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جن بھوت چمٹ گیا ہے۔ اس کے ذہن پر ہر لمحہ اور ہر وقت سود کا بھوت سوار رہتا ہے، لہٰذا قیامت میں بھی اس کا حشر آسیب زدہ اور مجنون شخص کی طرح ہوگا۔ سیدنا عوف بن مالک کی روایت میں مرفوعاً آیا ہے کہ سود خور قیامت کے روز خبطی اور مجنون بن کر کھڑا ہوگا۔ بعض روایات میں سود خوار کا خون کی نہر میں غوطہ کھانا بھی مروی ہے یہ شاید اس وجہ سے کہ دنیا میں غریب کا خون چوستا تھا، اس لیے سزا بھی اسی قسم کی تجویز کی گئی۔

اس آیت میں تیسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ جاہلی عربوں نے کہا کہ خرید فروخت بھی سود کی طرح ہے۔ یہ حالت اس لیے ہوگی کہ انہوں نے حلال وحرام کو یکساں کر دیا اور صرف اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے۔ دونوں کو حلال کہا حالانکہ بیع اور ربا میں بڑا فرق ہے۔ بیع کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ بیع میں جو نفع ہوتا ہے وہ مال کے مقابلے میں ہوتا ہے جیسا کہ کسی نے ایک روپے کی قیمت کا کپڑا دو روپے میں فروخت کیا، اور سود وہ ہوتا ہے جس میں نفع بلا عوض ہو۔ ایک روپے کے بدلے دو روپے لے۔ پہلی صورت میں چونکہ کپڑا اور روپیہ دو جدا جدا قسمیں ہیں اور نفع اور غرض ہر ایک کی دوسرے سے جداگانہ ہے، اس لیے اس میں مساوات اور برابری ناممکن ہے۔ خرید وفروخت کی صورت میں ضرورت اور حاجت سے الگ ہو کر دونوں میں باہم موازنہ کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی، اور ضرورتیں سب کی مختلف ہیں، کسی کو ایک روپے کی اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس روپے کا قیمتی کپڑا بھی ہیچ ہوتا ہے، اور کوئی کپڑے کا اتنا ضرورت

Marfat.com

مند ہوتا ہے کہ وہ کپڑا جو بازار میں ایک روپیہ میں ملتا ہے، ضرورت کے تحت دس روپے دے کر بھی خرید لیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایک روپیہ والے کپڑے کو ہزار روپیہ میں خریدے گا تو یہ سود نہیں ہوگا کیونکہ دونوں میں موازنہ اور مساوات ممکن نہیں۔ اس لیے کہ پیمانہ ضرورت اور رغبت ہے اور اس میں بے حد و حساب تفاوت ہے اس لیے سود ممکن نہیں، برخلاف اس کے کہ ایک روپیہ کو دو روپے کے عوض فروخت کرے گا تو یہاں دونوں میں مساوات ہے، اور اس مساوات کی وجہ سے ایک روپیہ ایک روپیہ کا بدل ہوگا اور دوسرا روپیہ بدل سے خالی ہو کر سود ہوگا اور شرعاً یہ معاملہ حرام ہوگا۔

(معارف القرآن، مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

سود خواروں کو روز قیامت بدحواسی کی سزا اس لیے ملے گی کہ انہوں نے دو جرم کیے۔ ایک تو یہ کہ بذریعہ سود حرام مال کھایا، دوسرے اس کو حلال سمجھنا اور حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا کہ بیع و شراء بھی تو ربا کی طرح ہے۔ جس طرح ربا (سود) کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اور اسی طرح خرید و فروخت کے ذریعہ بھی نفع مقصود ہوتا ہے۔ اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہے حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں۔

دراصل انداز تعبیر یوں ہونا چاہیے: "انما الربا مثل البیع" یعنی سود کا لین دین بیع کی طرح ہے، لیکن قرآن حکیم کے ان مخاطبوں نے جو سود کو حرام نہیں کہتے تھے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے یہ انداز تعبیر اختیار کیا کہ "انما البیع مثل الربا" کہ ربا حلال ہونے میں بیع کی طرح ہے۔ اس طرح انہوں نے حلت کا اصلی رشتہ ربا کے ساتھ قائم کر کے یہ ظاہر کیا کہ اصلی حلال تو ربا ہے اور بیع تو حلال ہونے میں ربا سے مشابہت کی وجہ سے ثانوی درجہ میں ہے۔ بہر حال ان لوگوں نے فقط اس وجہ سے کہ دونوں میں فائدہ اور نفع مقصود ہوتا ہے، دونوں کو حلال سمجھ لیا حالانکہ بیع اور ربا میں بڑا فرق ہے۔ (معارف القرآن مولانا محمد ادریس)

آج کل کے روشن خیالوں اور مغرب زدہ جدید ذہن رکھنے والوں کی طرح زمانہ جاہلیت کے احمقوں، بیوقوفوں اور جاہلوں کا بھی یہ کہنا تھا کہ مالی نفع تجارت میں بھی ہوتا ہے۔ پھر جب تجارت حرام نہیں تو سود کیوں حرام ہے؟ ان کے اس نظریہ کی سب سے

Marfat.com

بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ تجارت کی نوعیت اور سود کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں استدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت میں لگے ہوئے مال کا منافع جائز ہے تو قرض پر دیئے گئے روپیہ کا منافع کیوں ناجائز ہے؟ اس قسم کے دلائل موجودہ زمانے کے سودخوار بھی سود کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس روپے سے خود فائدہ اٹھا سکتا ہے اسے وہ قرض پر دوسرے شخص کے حوالے کرتا ہے۔ وہ دوسرا شخص بھی بہرحال اس سے فائدہ ہی اٹھاتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرض دینے والے کے روپے سے جو فائدہ قرض لینے والا اٹھا رہا ہے، اس میں سے ایک حصہ وہ قرض دینے والے کو ادا نہ کرے، لیکن یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ دنیا میں جتنے کاروبار ہیں خواہ وہ تجارت کے ہوں یا صنعت وحرفت کے یا زراعت کے، اور خواہ انہیں آدمی اپنی محنت سے کرتا ہو یا اپنے سرمایہ اور محنت دونوں سے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں آدمی نقصان کا خطرہ (Risk) مول نہ لیتا ہو اور جس میں آدمی کے لیے لازماً ایک مقررہ منافع کی ضمانت ہو۔ پھر آخر پوری کاروباری دنیا میں ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا کیوں ہے جو نقصان کے خطرہ (Risk) سے بچ کر ایک مقرر اور لازمی منافع کا حق دار ہو۔ (تفہیم القرآن)

پھر اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ تجارت میں نفع ونقصان دونوں کا احتمال ہر وقت لگا رہتا ہے اور تجار کو نقصان سے بچنے کے لیے وقت، محنت اور ذہانت سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر تجارتی معاملہ تو ہر وقت ختم ہو جاتا ہے، برخلاف اس کے مدت اور مہلت کے ساتھ ساتھ سودخوار کے مطالبات کی میزان بھی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اکثر اوقات قرض دار تباہی اور بربادی کے کنارے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ایک کاروبار میں اپنا وقت، اپنی محنت، اپنا سرمایہ اور اپنی قابلیت رات دن کھپا رہے ہیں اور جن کی کوشش اور سعی کے بل پر بھی اس کاروبار کا بارآور ہونا موقوف ہے، ان کے لیے تو ایک مقرر منافع کی کوئی ضمانت نہ ہو بلکہ نقصان کا سارا خطرہ ان کے سر ہو، لیکن جس نے صرف اپنا روپیہ انہیں قرض دے دیا ہو وہ بے خطر اور ایک طے شدہ منافع وصول کرتا چلا جائے۔ یہ آخر کس عقل، منطق، اصول

انصاف اور کس اصول معاشیات کی رو سے درست اور صحیح ہے کہ محض مہلت اور تاریخ وقت کے عوض میں منافع وصول کیا جائے، اور یہ کس بنا پر صحیح ہے کہ ایک شخص ایک کارخانہ دار کو دس سال کے لیے بیس ہزار روپیہ قرض دے اور آج ہی یہ طے کر لے کہ آئندہ وہ دس سال تک برابر فی صد سالانہ کے حساب سے اپنا منافع لینے کا حق دار ہوگا، حالانکہ کسی کو علم نہیں کہ کارخانہ کے تیار کردہ مال کی قیمتوں کا آئندہ دس سال میں کتنا اتار چڑھاؤ ہو گا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ حادثہ کے وقت ملک میں پوری قوم خطرات کا مقابلہ کرے، جان اور مال کی قربانیاں دے مگر پوری قوم میں ایک جنگی قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا ہو کہ سو سال گزر جانے پر بھی وہ اپنے قرض کا سود وصول کرتا رہے۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی بازار میں طلب (Demand) ہے۔ وہ محنت، زحمت اور مختلف قسم کے خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کے لیے قابل حصول بناتا ہے۔ پھر وہ تاجر اپنے سرمایہ کو مال کی شکل میں بازار میں مقابلہ (Competition) کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بازار کا اتار چڑھاؤ اسے دیوالیہ (Bankrupt) بنا دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ نفع حاصل ہو جائے۔ بتائیں کہ اس تاجر کے اس سرمایہ سے اس سود خوار کو کیا نسبت ہے جس کا قلب سنگ دل اور بزدل، اور جس کا ذہن دشمن انسانیت اور جس کے جذبات خونخوار ہوتے ہیں، کیونکہ سود خوار کا سرمایہ دو بھیسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور دونوں ہی میں وہ یکساں بزدل اور خون خوار ہے۔ ایک تو وہ بنیوں، ساہوکاروں، مہاجنوں اور یہودیوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، اور اس کو سب جانتے ہیں کہ یہ لوگ کس قدر خونخوار ہوتے ہیں۔ دوسرا بھیس یہ ہے جس کو رفاہی کاموں، اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کی سرپرستی کے نام سے آتا ہے۔ اس زمانہ میں بہت سے لوگ اس بھیس میں اس کو بڑا معصوم سمجھتے ہیں، لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بزدلی اور خود غرضی کی فطرت بد اس کے اس جامے میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح مہاجن اور یہودی کے بھیس میں موجود ہے۔ دونوں صورتوں میں سود خواروں کو صرف یہ پیش نظر ہے کہ ان کا سرمایہ محفوظ رہے۔ مقررہ سود ملتا

Marfat.com

رہے یا اس کے حساب میں جمع ہوتا رہے۔ جب کہ ایک تاجر سب سے پہلے خود کو خطرے میں ڈالتا ہے اور پھر اپنے سرمایہ اور صنعت کو۔

۲. یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا مابقی من الربوٰ ان کنتم مومنین، فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ، وان تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون، وان کان ذوعسرۃ فنظرۃ الیٰ میسرۃ، وان تصدقوا فھو خیرلکم ان کنتم تعلمون

(بقرہ:۲۷۹۔۲۸۰)

یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ اس سے قبل سود اگرچہ ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس آیت کے نزول کے بعد سودی کاروبار اسلامی حکومت کے دائرے میں ایک فوجداری جرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سود کھاتے تھے ان کو حضور ﷺ نے سرکاری طور پر مطلع کر دیا کہ اگر اب وہ سودی لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ سود کی نوعیت چونکہ ایک وسیع معاشی فساد کی تھی جس کی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔

آیت میں بتایا کہ اگر تم نے اس باغیانہ روش سے توبہ نہ کی تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس کی نوعیت بالکل ایک الٹی میٹم کی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلامی نظام میں سودی کاروبار کرنا ایک سنگین فوجداری جرم ہے اگرچہ یہ ایک فرد کا عمل ہے، لیکن اگر یہ کام ایک جماعت کرے تو ان کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے جن کی سرکوبی کے لیے عندالضرورت فوجی کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔ حکم کی اس سنگینی اور قرآن کے اس الٹی میٹم سے اصل مقصد سرمایہ دارانہ اخلاق، سرمایہ دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ تمدن اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا بیخ استیصال کر کے وہ نظام قائم کرنا تھا جس میں بخل کے بجائے فیاضی، خودغرضی کے بجائے ہمدردی اور باہمی تعاون ہو، سود کے بجائے صدقات، بنک کے بجائے بیت المال ہو، سود کی ہر نوع اور قسم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے خواہ وہ ذاتی ضرورت کے قرضہ پر لیا جائے یا نفع آور کاروبار میں لگانے والے قرضہ پر ہو، یا اس قرض پر لیا جائے جو حکومت

شہریوں سے لیتی ہے اور پھر یا وہ قرض جو حکومتیں اپنی ضروریات کے لیے مختلف ممالک کے بازارزر یا بنکوں سے لیتی ہیں۔

بعض اہل علم اپنی سادہ لوحی یا علمی کمزوری یا پھر کسی اور غرض کے باعث اور سود کے بارہ میں قرآن ونبوت کے اس سنگین لب ولہجہ کے باوجود تجارتی اور کاروباری سود کو سود نہیں سمجھتے، حالانکہ سیدنا عمرؓ کا ایک فرمان کتابوں میں منقول ہے کہ

''سود کو بھی چھوڑ دو اور اس کے شائبہ کو بھی چھوڑ دو۔''

وہ حضرات مشتبہات سے دامن بچاتے تھے اور ہم اصل سے بھی محفوظ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرمائے فضیلۃ الشیخ عبداللہ دراز[1] پر جنہوں نے ۱۹۵۱ء میں پیرس میں ہونے والے کلوکیم میں تمام دنیا کے سامنے یہ بات نہایت واضح الفاظ میں بتائی کہ ''اسلام کسی درجہ میں سود کو گوارا نہیں کرتا، اور خواہ اقتصادی احوال وظروف میں کیسے تغیرات رونما ہو چکے ہوں لیکن اسلام میں سود کی ساری انواع قطعاً حرام ہیں۔ (فجمیع انواع الربا محرمة تحریماً قطعیاً) سود میں کیا کیا خرابیاں ہیں، کس طرح یہ قوموں کو تباہ و برباد کرتا ہے اور اس کے ذریعہ کس طرح دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ بعض حضرات نے اقتصادی احوال وظروف کی تبدیلی کے باعث مصالحت کا طریقہ اختیار کیا ہے لیکن یہ طریقہ مصالحت کا نہیں بلکہ شکست خوردگی کا ہے۔

---

[1] فضیلۃ الشیخ عبداللہ درازؒ ایک نہایت جید عالم تھے۔ مغربی حکومتیں اور امریکہ اپنے مختلف ملکوں میں ان حضرات کو کانفرنسیں میں مقرر کر کے اس لیے بلاتے تا کہ ان سے کوئی بات اسلام کے خلاف صادر ہو جائے تو اس کو پھر ساری دنیا میں مشہور کیا جائے۔ ۱۹۵۱ء میں پیرس کے کلوکیم میں شیخ مرحوم نے سود کے قطعی حرام ہونے کی بات کی۔ پھر ۱۹۵۴ء میں ایسا ہی ایک کلوکیم پنجاب یونیورسٹی لاہور میں منعقد ہوا۔ اس میں بھی شیخ عبداللہ دراز مرحوم کو مدعو کیا گیا۔ یہاں شیخ نے جو مقالہ لکھا اس کی پروف ریڈنگ کا شرف احقر کو حاصل ہوا۔ شیخ رات بارہ بجے تک یونیورسٹی پریس میں میرے پاس بیٹھ کر اپنے مقالہ میں ترمیمات کرتے رہے اور مجھے بھی کچھ ہدایات دیتے رہے، لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ میں صبح یہ مقالہ نہیں پڑھ سکوں گا۔ رات ۲ بجے کے قریب شیخ دراز کو اپنی جائے قیام پر دل کا دورہ پڑا اور صبح ان کی تجہیز وتکفین کر کے ان کی میت کو مصر بھیج دیا گیا۔ اللھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه۔

شیخ عبداللہ دراز مرحوم کا موقف یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ تسلیم کر کے کہ سود کی ہر نوع حرام ہے موجودہ مالیاتی اور معاشی احوال کے قوانین میں تطبیق کا کام کیا جائے۔ اسلام کا معاشی نظام کوئی راہبانہ نظام نہیں کہ دنیا کے احوال وظروف کو نظر انداز کر دیا جائے، مگر یہ کام انفرادی محنت سے نہیں بلکہ اجتماعی کاوش سے پروان چڑھ سکتا ہے۔ جدید معاشیات اقتصادیات کے ماہرین اور قدیم اسلامی سرمایہ علمی کے وارث دونوں طبقے سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس مسئلہ پر غور وفکر کر کے اس کا کوئی حل تلاش کریں۔ شیخؒ نے ایک بڑی پتے کی بات اپنے اس مقالہ میں بیان فرمائی جو موجودہ دنیا میں بڑی عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے بغیر اجتہادی مسائل کا صحیح حل نہیں تلاش کیا جا سکتا۔ آپ نے لکھا ہے کہ ''قواعد شریعت اور اسلامی علوم سے واقف ہونا ان مسائل کے حل کے لیے کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ان میں علم کے ساتھ تقویٰ اور پرہیزگاری کی وہ قوت بھی موجود ہو جو حق اور باطل میں تمیز کر سکے اور انسان کو ہوائے نفس کی اتباع سے بچا سکے''۔

اس آیت میں سود نہ چھوڑنے والوں سے جنگ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو شخص ایک اسلامی ریاست میں سود کھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو پھر اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ کی رائے ہے، لیکن دوسرے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ اس وقت ہے جب کہ وہ سود کی حلت کا معتقد ہو ورنہ اسے گرفتار کر کے توبہ کرنے تک جیل میں رکھا جائے۔ گویا سود لینا اور کھانا اسلامی قانون میں قابل دست اندازی پولیس ہے عدالت اسے سزا دے سکتی ہے۔ یہی حکم ان ظالم سلاطین کا بھی ہے جو لوگوں کے اموال ناجائز طور پر وصول کرتے ہیں یا وہ لوگ جو عام شہریوں سے ناجائز ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ جصاص نے لکھا ہے یہ لوگ سود خواروں سے بھی زیادہ سنگین مجرم ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ''نہ تمہیں ظلم کرنا ہے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا'' جو پہلے تم سود لے چکے ہو اسے اگر تمہارے اصل مال میں شمار کر لیں اور اس میں سے کاٹ لیں تو تم پر ظلم ہوگا اور ممانعت کے بعد کا سود چڑھا ہوا اگر تم مانگو تو یہ تمہارا ظلم ہے قرآن حکیم کی اس ہدایت کا اثر یہ ہوا اور ''لا تظلمون ولا تظلمون'' کی ہدایت

اثر ہوا کہ پورے عرب میں یہ عظیم معاشی اصلاح یعنی ممانعت سود بغیر کسی طبقاتی کشاکش کے عمل میں آ گئی، اور اس کی برکت سے قرض لینے والے اور قرض دینے والے دونوں مستفید ہوئے۔

اسلام میں معاشیات کی اصل بنیاد یہی ہے کہ نہ تم کسی پر کوئی مالی ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی مالی ظلم کرے۔ جب سود اور سود در سود کھانے والا طبقہ کسی قوم میں پیدا ہو جاتا ہے اور مال و دولت یک طرفہ گردش کرتی ہے تو پھر بلاشبہ ملک و قوم کا ایک قلیل طبقہ قوم کے دوسرے افراد کی دولت کو آہستہ آہستہ کھینچ کر دولت مند بن جائے گا اور قوم کی اکثریت لاغری کا شکار ہو جائے گی جس کا انجام نہایت خطرناک بلکہ خوفناک ہوتا ہے کیونکہ دولت مندوں کے پاس اگر سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو قوم کی اکثریت اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے۔ چنانچہ قوم کی جسمانی قوت دولت مندوں کی مالی قوت پر شب خون مارتی ہے۔ یہ سب کچھ اس صورت میں ہوتا ہے جب قرآن کے بتائے ہوئے قانون "لاتظلمون ولا تظلمون" سے بے رخی برتی جاتی ہے۔

اس وقت اور اس سے پہلے بھی دنیا کی سب سے بڑی ضرورت مقروض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جس نے قرض کے بوجھ کو لوگوں سے ہلکا کیا۔ قرضداروں پر احسان کرنا، ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگ دست مقروضوں کو مہلت دینا اور جو قرض ادا کرنے سے معذور ہوں ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں بتایا گیا کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو تمہیں چاہیے کہ فراخ دستی حاصل ہونے تک اسے مہلت دو، اگر تمہارے پاس علم ہے تو ایسے تنگ دست کو قرض بطور صدقہ معاف کر دینا زیادہ اچھا ہے۔

اسلام کے اس نظام سے پہلے نہ صرف عرب میں بلکہ پوری دنیا میں لوگوں کو سودخواری نے اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے تھے وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام نے مقروضوں کے قرض کی اس زنجیر کو اور بھاری بنا دیا ہے۔ قرآن حکیم کی اس آیت نے اس سارے نظام کے خلاف احتجاج کیا۔

Marfat.com

۳۔ قرآنِ حکیم میں ایک اور مقام پر سود کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا

﴿یا ایھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربا اضعافاً مضاعفة، واتقوا اللہ لعلکم تفلحون﴾ (آل عمران: ۱۳۰)

''اے ایمان والو! سود مت کھاؤ دگنا چوگنا بنا کر، اور اللہ کی نافرمانی سے بچو تا کہ فلاح کے ہم دوش ہو جاؤ۔''

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ سود مفرد جائز ہے البتہ سود مرکب کھانا جائز نہیں، حالانکہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تھوڑا سود لے لیا کرو لیکن دونے پر دونا مت لو۔ بات یہ ہے کہ جاہلیت میں سود اسی طرح لیا جاتا تھا جیسے ہمارے ہاں کے بنیئے لیتے ہیں۔ سو روپے لیے اور سود در سود بڑھاتے چلے گئے یہاں تک کہ سو روپے میں ہزاروں کی جائدادوں کے مال بن گئے۔ اسی صورت کو یہاں اضعافاً مضاعفة سے تعبیر فرمایا گیا ہے یعنی اول تو سود ویسے ہی حرام ہے اور یہ صورت تو بہت ہی شنیع اور قبیح ہے جیسے کوئی کہے میاں مسجد میں گالیاں مت بکو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسجد سے باہر گالیاں بکنے کی اجازت ہے۔

یہی سود موجودہ زمانے میں سود مرکب کہلاتا ہے۔ یہی سود بنک لیتے اور یہی سرمایہ دار ملک دوسرے غریب ملکوں سے لیتے ہیں۔ سود میں قرض خواہ کی پوزیشن بالکل محفوظ رہتی ہے لیکن اس کے برعکس قرض دار اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا تو وہ روپیہ اور اس کا سود اس طرح دے رہا ہے کہ اس نے اس سے کوئی آمدنی پیدا نہیں کی لیکن قرض دینے والے کا روپیہ محفوظ ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیں کہ ایسا شخص جو اپنے کاروبار میں کبھی نفع اٹھاتا ہے اور کبھی نقصان، اس شخص کا مقابلہ کر سکتا ہے جس پر نقصان کے سارے دروازے بند ہوں اور صرف نفع ہو، اور نفع بھی اضعافاً مضاعفه دو گنے چوگنے کے حساب سے۔ کیا یہ دونوں برابر ہیں؟

ملک کی اکثریت جب ان سود خواروں سے تنگ آ جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں سلطنتیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں، امن وامان غارت ہو جاتا ہے اور غرباء بھوکے اور غضب ناک بھیڑیوں کی طرح دولت مندوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ تاریخ نے اس بات کو

Marfat.com

مرتبہ دہرایا اور اشتراکیت بھی اسی کا نتیجہ ہے جو بقول علامہ مناظر احسن گیلانی قدس سرہ کے کہ اشتراکیت کوئی نظام نہیں بلکہ ایک انتقام ہے جو غریبوں نے امیروں سے لیا۔ جب سودی لین دین کی سرکاری طور پر اجازت ہوگی تو سرمایہ داروں کا طبقہ ملک کے اکثر افراد کے لیے شدید معاشی ضرر کا باعث ہو جائے گا۔ یورپ آج نیشلزم کے دعوے کا اپنے آپ کو ساری دنیا میں علمبردار کہتا ہے۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ چند ساہوکاروں اور پیشہ ور سود خواروں ہی کو اس سودی کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے بلکہ بینکنگ سسٹم رائج کر کے سود خواروں کو اکٹھے ہو کر غریبوں کے خون چوسنے کا موقع فراہم کیا۔ سودی کاروبار کو اختیار کر کے اس نے قدرت کو جنگ کا اعلان کر دیا۔ اسی سود کے بل بوتے پر آج بڑے ملک جن کو G-8 کہتے ہیں، غریب ملکوں کو کھا رہے ہیں۔ ماہرین کا بیان ہے کہ سود پر با آسانی حکومتوں کو اگر روپیہ قرض نہ ملتا تو روزانہ کروڑ ہا روپے کی رقم کی فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا۔ گویا آج سود ہی اعلان جنگ اور اس ہولناک جنگ کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ انسانوں کی کمائی ہوئی آمدنی دھواں بن کر کچھ تو ہواؤں میں جہازوں کی شکل میں اور کچھ مختلف میزائیلوں اور بموں وغیرہ کی شکل میں برباد ہو رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سود خواہ مفرد ہو مرکب اسلام میں اسی طرح دونوں حرام ہیں جیسے کالا اور سفید سؤر۔ سؤر کا کوئی رنگ ہو اسلام میں وہ حرام ہے۔ ایسے ہی سود کی کوئی شکل ہو، مرکب ہو یا مفرد اسلام نے اسے ممنوع قرار دے کر معاشی زندگی کے ایک بہت بڑے مفسدہ کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ سود کی وجہ سے سرمایہ داروں اور ان کے اداروں (بنکوں) کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوسیں اور ان کی خون پسینہ کی کمائی سے اپنی دولت میں اضافہ کریں۔ سود سے کئی معاشی امراض پیدا ہوتے ہیں جو کسی ملک کے جسم میں سرطان کا کام دیتے ہیں۔ دولت کی نامساوی تقسیم بھی اسی کی وجہ سے ہے، احتکار اور ارتکاز دولت بھی اسی کے سبب سے ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی احکام کی رو سے ہر قسم کا سود قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشی اور کاروباری سود اور چیز ہے، وہ شاید اس بات کو بھول

Marfat.com

جانتے ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد یہی سود ہے، اور اگر آج حکومتیں سو[د]
ممنوع قرار دے دیں تو یہ نظام اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ بعض حضرات
کہتے ہیں کہ بڑے بڑے کاروبار کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنا بغیر سود کے ممکن نہیں۔ ان کا
اعتراض اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اگر سود کو ختم کر[کے]
اس کی جگہ منافع کی بنیاد پر معاشی نظام استوار کیا جائے تو موجودہ زمانہ کی بہت سی معا[شی]
• خرابیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

سود کی وجہ سے روپیہ لگانے والوں کو معاشی اور تجارتی کاروبار سے کوئی د[لچسپی]
نہیں رہتی۔ انہیں تو سال کے اختتام پر سود کی وصولی سے مطلب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہ[وتا]
ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے اپنا روپیہ بنکوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن بنکوں کی پالیسی [میں]
انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نہ تو بنک کے معاملات میں اپنی کوئی آواز رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہو[تا]
ہے کہ بنک کا پورا کاروبار بڑے سرمایہ داروں کے مفاد اور اغراض کا تابع ہو کر رہ جاتا [ہے]
جس کے نتیجہ میں ساری تجارت، ساری صنعت اور سارے مالی ذرائع پر بھی یہی سرمایہ دا[ر]
جماعت قابض رہتی ہے کیونکہ بنکنگ نظام تجارت وصنعت کی بنیاد ہے۔ کوئی صنعت او[ر]
کوئی تجارت بنکوں کے مالی تعاون کے بغیر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی۔ اور مالی نظام جس
طبقہ کے ہاتھ میں ہو گا تجارت وصنعت پر بھی اسی کا قبضہ ہو گا۔ اسی صورت حال سے متا[ثر]
ہو کر ایک انگریز مصنف نے بطور طنز لکھا ہے کہ ''بنک آف انگلینڈ کا صدر زار روس سے [کئی]
گنا زیادہ اقتدار اور اختیار کا مالک ہوتا ہے۔'' یہ استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

اگر سود کی جگہ معاشی کاروبار کی بنیاد منافع (Profit) پر رکھی جائے تو ہر شخص ا[پنا]
روپیہ لگانے میں بڑی احتیاط سے کام لے گا کیونکہ وہ اس صورت میں صرف نفع کا شریک
نہ ہو گا بلکہ نقصان میں بھی اسے شرکت کرنا پڑے گی۔ مجبور ہو کر روپیہ لگانے والے بنک
میں موثر نمائندگی کا مطالبہ کریں گے اور بنک کے کاروبار اور اس کی پالیسی پر نظر رکھیں گے۔
ان آیات کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جن میں سود کی مذمت ہے۔

Marfat.com

سود کی مذمت احادیث نبویہ میں:

قرآن حکیم کی ان آیات کے علاوہ بہت سی احادیث میں بھی سودی کاروبار کے بارہ میں نہایت سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ جن میں سے چند ایک احادیث حسب ذیل ہیں:

1- سیدنا جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، سود دینے والے، سود کی دستاویز لکھنے والے، اور سود کے معاملہ کی گواہی دینے والے ان سب پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب معصیت کے ارتکاب میں برابر ہیں۔

(مسلم فی المساقاۃ:۳۹۸۱، ابن ماجہ نمبر: ۲۲۷۷، ابن حبان: ۱۱/۳۹۹، دارمی: ۲/۲۴۶)

2- ایک اور حدیث میں سیدنا عبداللہ بن حنظلہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سود کا ایک درہم جس کو آدمی جان بوجھ کر کھاتا ہے چھتیس (36) بار زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے اور اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کا گوشت حرام سے بنا ہو وہ آتش دوزخ کا سزاوار ہے۔''

3- سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس رات مجھے معراج ہوئی تو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے پیٹ ایسے تھے جیسے اژدہوں سے بھرپور گھر، اور اژدہے پیٹوں سے باہر بھی دکھائی دیتے تھے۔'' میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل نے جواب دیا: یہ سود خور ہیں۔ (ھؤلاء آکلۃ الرباء)

(ابن ماجہ حدیث نمبر:۲۲۷۳، مسند احمد: ۱۸/۱۳۳، مزی فی التھذیب: ۳۳/۳۲۸)

4- سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو سود نہ کھائے گا، اور اگر کوئی سود نہیں کھائے گا تو اس کو اس کا غبار ضرور پہنچے گا۔''

(ابن ماجہ: ۲۲۷۸، ابوداؤد فی الاجارات، سنن کبریٰ بیہقی: ۵/۲۷۵، شرح السنۃ بغوی: ۸/۵۵، مستدرک حاکم: ۲/۱۱، مسند احمد: ۲/۲۹۴، مسند ابی یعلیٰ: ۱۱/۱۰۵)

Marfat.com

5- سیدنا ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سونے کو سونے کے عوض صرف برابر برابر فروخت کرو، اور بعض سونے کے عوض کم سونا مت فروخت کرو، اور چاندی کو چاندی کے عوض صرف برابر برابر فروخت کرو اور بعض چاندی کو کم چاندی کے عوض مت فروخت کرو۔ اور ان میں سے کسی کو ادھار مت فروخت کرو۔ (مسلم نمبر:۳۹۴۲)

6- سیدنا عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سونے کی بیع سونے کے عوض اور چاندی کی بیع چاندی کے عوض، گندم کی گندم کے عوض، اور جو کی بیع جو کے عوض، اور کھجوروں کی بیع کھجوروں کے عوض، اور نمک کی بیع نمک کے عوض برابر برابر اور نقد بہ نقد ہو۔ اور جب اقسام مختلف ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ نقد بہ نقد ہو۔ (مسلم حدیث نمبر:۳۹۵۱)

7- سیدنا ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا بلالؓ برنی کھجوریں لے کر آئے رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: یہ کھجوریں کہاں سے لائے ہو؟ سیدنا بلالؓ نے جواب دیا: میرے پاس کچھ ردی کھجوریں تھیں میں نے ان میں سے دو صاع فروخت کر کے اس کے عوض ایک صاع کھجوریں نبی اکرم ﷺ کے کھانے کے لیے لی ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اوہ! یہ تو بعینہٖ سود ہے۔ ایسا نہ کرو، لیکن جب تم کھجور خریدنا چاہو تو اپنی کھجوریں فروخت کرو پھر اس کی قیمت سے دوسری کھجوریں خرید لو۔ (مسلم حدیث نمبر:۳۹۷۱)

شریعت میں ربوا کی دو قسمیں ہیں:

(1) ربا النسیۂ، اس کو ربا القرآن بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کو قرآن نے حرام کیا ہے۔

(2) ربا الفضل، اس کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں۔ اور ربا الفضل یہ ہے کہ ایک جنس کی چیزوں میں دست بدست زیادتی کے عوض بیع ہو، مثلاً پانچ کلو گندم آٹھ کلو گندم کے عوض فروخت کیا جائے۔ ربا الفضل کن چیزوں میں ہے، اس میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے۔

Marfat.com

ربا النسیہ یہ ہے کہ ادھار کی میعاد پر معین شرح کے ساتھ اصل رقم سے زیادہ ل کرنا یا اس پر نفع وصول کرنا۔ موجودہ زمانہ میں جو سود رائج ہے اس پر بھی سود کی یہ یف صادق آتی ہے۔

ربا النسیہ کی صحیح تعریف امام فخر الدین رازیؒ نے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''ربا النسیہ زمانہ جاہلیت میں مشہور اور معروف تھا۔ لوگ اس شرط پر قرض دیتے تھے کہ وہ اس کے عوض ہر ماہ (یا ہر سال) ایک معین رقم لیا کریں گے اور اصل رقم مقروض کے ذمہ باقی رہے گی۔ مدت پوری ہونے کے بعد قرض خواہ مقروض سے اصل رقم کا مطالبہ کرتا، اور اگر مقروض اصل رقم ادا نہ کرسکتا تو قرض خواہ مدت اور سود دونوں میں اضافہ کر دیتا۔ یہ وہ ربا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج ہے۔''

(تفسیر کبیر: ۳۵۱/۲، بیروت)

امہ ابوالولید باجی نے ربا النسیہ کی تعریف میں لکھا ہے:

''ربا جاہلیت کا یہ ہے کہ مدت پوری ہونے کے بعد قرض خواہ مقروض سے کہے کہ تم قرض ادا کر رہے ہو یا میں سود کے عوض مدت میں اضافہ کر دوں؟ اگر مقروض سود کو مان لیتا تو قرض خواہ مدت میں اضافہ کر دیتا۔ اس کے حرام ہونے میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں۔ (وهذا مما لا خلاف بين المسلمين في تحريمه)

(المنتقی: ۶۵/۵، از ربو الولید باجی مالکی)

یہ تو تھی ربا النسیہ کی تعریف، اور ربا الفضل یہ ہے کہ ایک مخصوص مال کو اس کی مثل سے نقد زیادتی کے ساتھ یا ادھار فروخت کیا جائے مثلاً ایک کلو گندم کو دو کلو گندم کے عوض نقد فروخت کیا جائے یا پانچ کلو گندم کو پانچ کلو گندم کے عوض ایک سال کے ادھار پر فروخت کیا جائے۔ یہ ربا الفضل ہے، اور اس کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث میں اس کو منع فرمایا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں سیدنا ابو سعید خدریؓ اور سیدنا عبادہ بن صامتؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سونا

Marfat.com

سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض اور نمک نمک کے عوض برابر برابر اور نقد بہ نقد فروخت کرو۔ اور جب یہ اجناس مختلف ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ نقد بہ نقد ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے زیادہ لیا یا زیادہ دیا اس نے سودی کاروبار کیا۔ دینے والا اور لینے والا دونوں برابر ہیں۔ اور ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دینار کو دو دیناروں کے بدلہ میں اور ایک درہم کو دو درہم کے بدلہ میں فروخت نہ کرو۔'' (مسلم: ۲۴/۲۶)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ربا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ربا الفضل کو اس لیے حرام قرار دیا کہ اس سے ربا النسیۂ کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خواری ہے۔ یہ حکمت رسول اللہ ﷺ نے خود بیان فرمائی۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ایک دینار کو دو دیناروں کے عوض اور ایک درہم کو دو درہموں کے عوض میں فروخت نہ کرو۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سود خواری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔'' (کنز العمال: ۴/۱۸۷، رواہ الطبرانی)

ایک جنس کی مختلف اقسام کی چیزوں کا اگر باہمی تبادلہ کرنے کی ضرورت ہو تو تو برابر برابر تبادلہ کر لیا جائے اور ان کی قیمتوں میں جو فرق ہو اس کو نظر انداز کر دیا جائے یا پھر ایک چیز کا دوسری چیز سے براہ راست تبادلہ کرنے کے بجائے ایک شخص اپنی چیز روپوں کے عوض بازار کے بھاؤ پر فروخت کر دے اور دوسرے شخصوں سے اس کی چیز بازار کے بھاؤ پر ان پیسوں سے خرید لے۔

بنک اور سود:

بنک ایک ایسا ادارہ ہے جو زر اعتبار کا کاروبار کرتا ہے۔ یہ ادارہ عوام کی بچت کی ہوئی رقوم (Saving) کو اپنے پاس بطور امانت رکھتا ہے اور پھر اس جمع شدہ رقم سے ضرورت مند لوگوں کو پیداآور (Productive) اور غیر پیداوار (Unproductive)

Marfat.com

اموں کے لیے قرضے دیتا ہے۔سودی نظام معیشت میں یہ کم شرح سود پر قرضے دے کر منافع کماتا ہے۔ پروفیسر کراؤتھر کے الفاظ میں "بنک قرضوں کا کاروبار کرتا ہے۔عوام سے امانتیں وصول کرتا ہے اور ضرورت مند اشخاص کو قرضے فراہم کرتا ہے۔ بنک کے جاری کردہ زر اعتبار کو عام لوگ بلاحیل وحجت قبول کر لیتے ہیں۔اس لیے بنک زر کی تخلیق بھی کرتا ہے۔"

سودی نظام معیشت میں ایک تجارتی بنک درج ذیل فرائض انجام دیتا ہے:

(الف) امانتیں وصول کرتا ہے (Aecepting Deposits) بنک کا زیادہ تر سرمایہ لوگوں کی امانتوں پر مشتمل ہوتا ہے جو عموماً تین قسم کی ہوتی ہیں:

-1 طلبی امانتیں (Demand Deposits)

-2 معیادی امانتیں (Fixed Deposits)

-3 بچت امانتیں (Saving Deposits)

بنک طلبی امانتوں پر سود ادا نہیں کرتا جب کہ معیادی اور بچت امانتوں پر سود ادا کرتا ہے۔

(ب) قرضے دینا: بنک کا دوسرا کام یہ ہے کہ یہ لوگوں کی امانتوں کا ایک حصہ اپنے پاس رکھ کر باقی حصہ ضرورت مندوں کو قرضے دے کر منافع کماتا ہے جو کہ بنک کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

قرضوں کی درج ذیل تین اقسام ہیں:

-1 طلبی قرضے (Call Loans)

-2 قلیل مدت کے لیے قرضے (Short-period loans)

-3 طویل مدت کے لیے قرضے (Long-period loans)

قرضوں کی ادائیگی کے لیے بنک درج ذیل طریقے اختیار کرتا ہے:

-1 اوورڈرافٹ (Over draft) کے ذریعہ

-2 نقد قرضہ (Cash Credit)

-3 ہنڈیوں کو بٹا لگا کر (Through Discounting Bills)

(ج) ایجنسی کی خدمات: بنک اپنے گاہکوں کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے

Marfat.com

اور مالی مشیر کے فرائض انجام دیتا ہے۔

(ز) انتقال زر (Money Transfer) چیک اور ڈرافٹ کے ذریعہ اندرون ملک اور بیرون ملک رقوم کی منتقلی کا کام بھی بنک انجام دیتا ہے۔

(ھ) قیمتی اشیاء اور دستاویزات کی حفاظت (Safe Deposit Lockers)

(و) سرمایہ کاری (Investment) صنعتوں اور کمپنیوں کے حصص (Shares) کی خریداری اور حکومتی کفالتوں (Securities) کی خریدلدی کے ذریعہ بنک سرمایہ کاری کرتے ہیں۔

(ر) زراعتبار کی تخلیق (Credit Creation) تجارتی بنک قرضوں کے اجراء کے ذریعہ زراعتبار پیدا کرتے ہیں۔

یہ ایک مختصر سا تعارف ہے جو بنک کا یہاں دیا گیا ہے۔ دور جدید کے یہ بنک بھی سودی کاروبار کرتے ہیں لہٰذا یہ بھی حرمت سود کے تحت آ جاتے ہیں۔ ظاہری طور پر بنک ایک خوش نما تجارتی ادارہ ہے لیکن اس میں ایک ''مارسیاہ'' پوشیدہ ہے کیونکہ بنکوں کا وجود اس لیے ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے سرمایہ میں بے پناہ اضافہ ہو اور جس دولت و ثروت کے ذریعہ محنت کے اشتراک سے متوسطہ اور غریب طبقہ کے افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے، اس کا انسداد ہو جائے اور دولت سمٹ سمٹ کر ایک مخصوص اور محدود طبقہ میں محصور ہو جائے اور تمام تجارتی کاروبار کے نفع ونقصان کی قسمت چند بنک مالکان کے ہاتھوں میں مقید ہو کر رہ جائے۔ اور اس طرح بنکوں کے سودی جال میں تجارت، زراعت اور روزمرہ کی معاشرت پھنس کر رہ جائے جس کے نتیجہ میں دنیا دو حصوں میں منقسم ہو جائے۔ ایک طرف بڑے بڑے قارون مثال سرمایہ دار ہوں جن کو آج کل کی اصطلاح میں Multi Billioner کہا جاتا ہے، اور دوسری طرف اربوں مفلس اور نادار اور محتاج و قلاش جو بدن ڈھانپنے کے لیے کپڑا اور پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لیے روٹی تک نہ رکھتے ہوں اور سردی اور گرمی میں وہ حیوانوں سے بدتر زندگی گزار کر اپنے اپنے کلبۂ احزان میں اور فٹ پاتھوں پر تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہوں یا پھر سسک سسک کر اپنی زندگی کے ایام گزارنے کے عادی ہوں۔

Marfat.com

بے شک یہ بنک بہت مفید اور موجود نظام معیشت کے لیے ضروری اور لازمی ہیں لیکن سرمایہ داروں اور مالداروں کے لیے نہ کہ غریبوں اور ناداروں کے لیے۔ یہ قارونی دولت کی کاشت کے لیے ابر نیساں ہیں اور غریبوں اور ناداروں کی لاشوں پر سرمایہ کی تعمیر کے لیے بہت عمدہ مسالہ اور سامان تعمیر۔ بنک نہایت خوبصورت طریقوں سے دولت کو دولت مندوں میں محدود کرتا اور عوام اور غرباء کی غربت کو ہولناک اور خوفناک درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ تہذیب نو کا ایک تجارتی جال ہے جو امیروں کی بہتری کے ضروری اور عوام کی تباہی پر دولت مندی کی بنیادیں رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ زمانہ کے کاروبار کو چلانے کے لیے بنک کا وجود نہایت ضروری ہے لیکن اس کی ایسی شکلیں بھی ممکن ہیں جو سود کے بغیر اس سسٹم کے مقصد کو اس حد تک پورا کر سکیں جس کے لیے اس اجتماعی ادارہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جس کا کچھ نقشہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔ موجودہ زمانے میں مسلمان کہلانے والے مغرب زدہ ذہن کے لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ بنک کا سود سود ہی نہیں ہے، جس کے لیے وہ بہت سے دلائل دیتے ہیں۔

معیشت کے یہ جدید مفکرین جن کے نام تو مسلمانوں والے ہیں لیکن ذہن میں مغربی تہذیب کا الحاد گھسا ہوا ہے، یہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں ربا (سود) اس خاص سود کو کہا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔ کوئی غریب شخص بیماری وغیرہ میں یا کسی اور نجی ضرورت کے تحت کسی ساہوکار اور مہاجن سے قرض لیتا تھا، اور کسی مصیبت زدہ شخص کی مدد کرنے کے بجائے اس سے قرض پر سود لینا بے شک ظلم، قساوت قلبی اور سنگ دلی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں اس سود کو حرام کیا گیا ہے، لیکن آج کل کا مروجہ سود اس سود سے بالکل مختلف ہے۔ آج کل بنکوں سے غریب اور مصیبت زدہ شخص قرض نہیں لیتے بلکہ متمول، سرمایہ دار، تاجر اور بڑے بڑے صنعت کار قرض لیتے ہیں۔ وہ اس روپے کو اپنے کاروبار میں لگاتے ہیں، نئی مشینیں خریدتے ہیں، نئی فیکٹریاں لگاتے ہیں اور اپنے کاروبار کو وسیع کرتے ہیں اور خوب دولت کماتے ہیں۔ ان سے اس قرض کی رقم پر جن کو انہوں نے اپنے کاروبار میں لگایا تھا بنک ایک خاص شرح سے جو سود وصول کرتا ہے وہ

Marfat.com

کوئی ظلم نہیں ہے کیونکہ اگر وہ بینک کو پندرہ فی صد سود ادا کرتے ہیں تو خود وہ اس روپے سے ساٹھ ستر فی صد تک کماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بنک سے قرض لے کر پہلے ایک فیکٹری لگاتے ہیں۔ پھر اس ایک سے دو، تین اور چار فیکٹریاں لگاتے ہیں۔ اس طرح سے تاجروں کی تجارت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اب اگر وہ اپنی اس کمائی سے بنک کو پندرہ فیصد سود دیتے ہیں تو یہ ان پر نہ تو بوجھ ہے اور نہ ہی ظلم۔ اور بنک میں روپیہ عوام کا ہوتا ہے۔ اگر بنک ان کو سات آٹھ فی صد سود ادا کرے تو یہ بنک پر کوئی بوجھ نہیں۔ سرمایہ دار اور بنک دونوں خوشی سے سود دیتے لیتے ہیں۔ اور چونکہ بنکوں میں اکثر و بیشتر غریب اور متوسط لوگ اپنی فاضل بچت کی رقمیں جمع کراتے ہیں تو سود کے ذریعہ ان کو بھی فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ جاہلیت کا سود غریبوں سے سود لیتا تھا اور اس زمانہ کی ترقیاتی اسکیم بینکوں کے ذریعہ غریبوں کو سود دیتی ہے۔ وہ ربا غریبوں پر ظلم تھا اور یہ ربا غریبوں کی خوشحالی اور ان کی مالی ترقی کا باعث ہے، اس لیے شخصی اور نجی ضروریات کے قرضوں پر سود ناجائز ہو یا جائز البتہ یہ تجارتی قرضوں پر بینک کا سود جائز ہونا چاہیے۔

یہ دلیل ہے تو بڑی خوش آئندہ اور غریبوں کو خوش کرنے والی لیکن اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بالکل بودی دلیل ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن حکیم میں مطلقاً سود حرام ہے خواہ نجی ضروریات کے قرضوں پر سود ہو یا تجارتی قرضوں پر ہو، خواہ اس سود سے غریبوں کو نقصان ہو یا فائدہ، اللہ تعالیٰ نے امارت وغربت کا فرق کیے بغیر سود کو علی الاطلاق حرام کیا ہے۔ (سوۃ البقرہ آیات نمبر: ۲۷۵، ۲۷۸، ۲۷۹)
ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سود کو مطلقاً حرام کیا ہے۔ سود مفرد کو بھی حرام کیا اور سود مرکب کو بھی، اور ہر جگہ سود کو مطلق حرام کیا اور نجی اور کاروباری قرضوں کا فرق نہیں کیا۔ علاوہ ازیں تاریخ اور حدیث سے ثابت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کاروباری قرضوں پر بھی سود لینے کا عام رواج تھا۔ چنانچہ علامہ ابن جریر طبری نے ”وذروا مابقی من الربوا“ کی آیت کے تحت لکھا ہے:

”یہ وہ سود تھا جس کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں لوگ خرید وفروخت کرتے تھے۔“

ایسا ہی علامہ سیوطیؒ نے تفسیر در منثور: ۱/۳۶۶ پر لکھا ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے زمانۂ جاہلیت میں بھی بڑے بڑے تاجر خوردہ فروشوں کے ہاتھ ادھار مال فروخت کرتے تھے اور اس پر سود لیتے تھے۔ معلوم ہوا زمانۂ جاہلیت میں بھی کاروباری اور تجارتی قرضوں پر سود لگانے کا عام رواج تھا، اور قرآن حکیم نے عموم کے صیغہ سے سود کی ممانعت کی ہے۔

یہ جدید مفکرین اس سلسلہ میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ بینک کے سود کے جائز ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ افراط زر کی وجہ سے روپے کی قدر (Value) روز بروز گرتی جا رہی ہے اور اجناس اور جائیداد کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ آج سے ستر سال پہلے سونا ۲۵ روپے تولہ تھا، دیسی گھی تین روپے سیر اسی طرح دوسری اشیاء بھی بہت سستی تھیں، لیکن اب (۲۰۰۵ء) سونا دس ہزار روپے تولہ اور دیسی گھی اڑھائی سو روپیہ کلو ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر سال میں روپیہ کی قدر (Value) کئی گنا گھٹ گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے ستر سال قبل بینک میں ایک ہزار روپیہ رکھوایا تھا اب اس کی قیمت پچاس روپے سے بھی کم ہو گئی ہے۔ اگر اس ہزار پر ہر سال سود لگتا رہتا تو اس کی ساکھ کسی حد تک بحال رہتی، اور جو لوگ بنک میں اپنی بچتوں (Savings) کو جمع کراتے ہیں، ان کا نقصان نہ ہوتا، اس لیے بنک کا سود جائز ہونا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بنک کے سود کے ناجائز قرار دینے کی بنا پر افراط زر کی وجہ سے روپیہ کی قدر گر جاتی ہے۔ اگر بنک سے سود نہ لیا جائے تو ستر سال میں بنک میں جمع کرایا ہوا ایک ہزار روپے کی قیمت بہت کم رہ جائے گی تو مسلمان ہونے کے ناطے اس دلیل کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ ایک مسلمان کے لیے اللہ کے حکم پر عمل کرنے اور اس کے منع کردہ کام سے بچنے کی وجہ سے اگر ہمیں کوئی مادی نقصان ہوتا ہے تو ہمیں اس کو بخوشی گوارا کرنا چاہیے۔ مسلمان کے نزدیک نفع اور نقصان کا معیار دنیوی اور مادی اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اخروی اور معنوی اعتبار سے ہے۔ دنیوی اور مادی اعتبار سے زکوٰۃ، قربانی اور حج وغیرہ کے لیے زر کثیر خرچ کرنا بھی مال کا ضیاع اور نقصان ہے، تو کیا اس مادی نقطۂ نظر سے ان تمام مالی عبادات کو خیر باد کہہ دیا جائے گا؟ اور جب مسلمان مالی

Marfat.com

عبادات کو چھوڑنے پر تیار نہیں تو سود کھا کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلان جنگ کے لیے کیسے تیار ہو سکتے ہیں؟ ایک سچے اور پکے مسلمان کے نزدیک سود چھوڑنے کی وجہ سے روپے کی قدر کا کم ہو جانا خسارہ نہیں ہے بلکہ اصل خسارہ یہ ہے کہ سود لینے کی وجہ سے آخرت برباد ہو جائے۔

دوسرا جواب اس بات کا یہ ہے کہ یہ نقصان دراصل ہماری ایک اجتماعی غلطی کی سزا ہے اور وہ یہ کہ ہم نے اسلامی طریقہ مضاربت کو رواج نہیں دیا اور اس سودی نظام نے قریباً تمام قوم کو حریص، لالچی اور بددیانت بنا دیا ہے۔ اگر کوئی ریٹائرڈ شخص اپنی تمام عمر کی پونجی کسی شخص کے ساتھ مضاربٹ میں لگاتا ہے تو دوسرا شخص اس کا تمام روپیہ ہضم کر جاتا ہے۔ اگر بنک اس روپیہ کو مضاربت میں لگائے تو بنک کا بھی فائدہ ہو اور مضارب کا بھی۔ لیکن بنک چونکہ یہودیوں کا ایجاد کردہ ادارہ ہے لہٰذا وہ اپنا روپیہ مضاربت کی بجائے مختلف کاروبار میں سود کی شرح پر لگاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب لوگ بنکوں پر زور دے رہے ہیں کہ وہ اپنا روپیہ مضاربت پر لگایا کریں۔ دنیا میں اس وقت ستر (۷۰) کے قریب بنک اور مالیاتی ادارے ہیں جو غیر سودی بنیادوں پر کاروبار کرتے ہیں۔ بنک بھی زیادہ نفع کماتے ہیں اور لوگوں کو بھی بنکوں کے ذریعہ مضاربت میں روپیہ لگانے سے زیادہ فائدہ ہو رہا ہے۔

سود کے مختلف مفاسد:

سود کے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور اجتماعی قسم کے بہت سے مفاسد ہیں۔ آپ اخلاق اور روحانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں کیوں کہ اخلاق اور روح ہی جوہر انسانیت ہے، اور اگر کوئی شی ہمارے اس جوہر کو نقصان پہنچائے تو وہ ہر حالت میں قابل ترک ہے خواہ کسی دوسرے پہلو سے اس میں کتنے ہی فوائد کیوں نہ ہوں۔ اب اگر آپ سود کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ روپیہ جمع کرنے کی خواہش سے لے کر سودی کاروبار کے مختلف مرحلوں تک پورا ذہنی عمل خود غرضی، حرص، بخل، تنگ دلی بلکہ سنگ دلی اور زر پرستی جیسی صفات رذیلہ کے زیر اثر جاری رہتا ہے، اور جتنا جتنا آدمی اس

کاروبار میں آگے بڑھتا ہے یہی صفات رذیلہ اس کے اندر نشو ونما پاتی جاتی ہیں۔

تمدنی حیثیت سے پہلی نظر ہی میں ایک شخص بخوبی جان سکتا ہے کہ جس معاشرے میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں۔ کوئی اپنی ذاتی غرض اور ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے۔ ایک کی حاجت مندی دوسرے کے لیے نفع اندوزی کا موقع بن جائے اور مال دار اور سرمایہ دار طبقوں کا مفاد نادار اور حاجت مند طبقات کی ضد ہو جائے، ایسا معاشرہ کبھی بھی مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اس کے اجزاء ہمیشہ انتشار و پراگندگی ہی کی طرف مائل رہیں گے۔ اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورت حال کے لیے مددگار بن جائیں تو ایسے معاشرے کے اجزاء کا باہم متصادم ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرے کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو، جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی اور فراخ حوصلگی کا معاملہ کریں، جس میں ہر دوسرے شخص کی احتیاج کے موقع پر فراخ دلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائے، اور جس میں مال دار اور سرمایہ دار لوگ نادار اور حاجت مند لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ اعانت یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں، ایسے معاشرے میں آپس کی محبت اور خیر خواہی اور باہمی دلچسپی نشو ونما پائے گی۔ اس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ اور ایک دوسرے کے پشتیبان ہوں گے۔ اس میں اندرونی نزاع اور تصادم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلے معاشرے کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوگی۔

ایسا ہی حال بین الاقوامی تعلقات کا بھی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور اس کی مصیبت کے لیے کھلے دل سے تعاون کا ہاتھ بڑھائے۔ ممکن نہیں ہے کہ دوسری طرف سے اس کا جواب محبت اور شکر گزاری اور مخلصانہ خیر خواہی کے سوا کسی اور صورت میں ملے۔ اس کے برعکس وہی قوم اگر اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ خود غرضی اور تنگ دلی کا برتاؤ کرے اور اس کی مشکلات کا ناجائز فائدہ اٹھائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ مال کی صورت میں وہ بہت کچھ فائدہ اور نفع اس سے حاصل کرے لیکن یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ پھر اپنے اس شائیلاک قسم کے ہمسایہ کے لیے اس قوم کے دل میں

Marfat.com

کوئی اخلاص، محبت، ہمدردی اور خیر خواہی رہ جائے۔

سود کے اگر معاشی پہلو پر نگاہ ڈالی جائے تو اس میں بھی بہت سے نقصانات مضمر ہیں۔ سود کا تعلق معاشی زندگی کے ان معاملات سے ہے جو صرف برصغیر پاک و ہند تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر بلا ہے۔ یہ وہ بلائے عظیم اور بلائے بے درماں ہے جس میں ملک کے متوسط اور غریب طبقوں کی اکثریت بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے قلیل المعاش کارکنوں کی آمدنی کا بڑا حصہ مہاجن یا بنک لے جاتا ہے۔ شب و روز کی ان تھک محنت اور مشقت کے بعد تھوڑی سی تنخواہ یا مزدوری ان کو ملتی ہے ان میں سے سود ادا کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ وہ دو وقت کی روٹی چلا سکیں۔ یہ چیز صرف یہی نہیں کہ ان کے اخلاق کو بگاڑتی ہے اور انہیں جرائم کی طرف دھکیلتی ہے، اور صرف یہی نہیں کہ ان کے معیار زندگی کو پست اور ان کی اولاد کے معیار تعلیم و تربیت کو پست تر کر دیتی ہے بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دائمی فکر اور پریشانی ملک کے عام کارکنوں کی قابلیت کار کو بہت گھٹا دیتی ہے۔ اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی محنت کا پھل دوسرا لے جا رہا ہے تو پھر اپنے کام سے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے سودی کاروبار کی یہ قسم صرف ایک ظلم ہی نہیں بلکہ اس میں اجتماعی معیشت کا بھی بڑا بھاری نقصان ہے۔

اس کا دوسرا معاشی نقصان یہ ہے کہ اس طرح غریب طبقہ کی رہی سہی قوت خرید بھی سود خوار ساہوکار خواہ وہ کوئی شخص ہو یا بنک کی شکل میں ادارہ چھین لے جاتا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کی بے روزگاری اور کروڑوں آدمیوں کی ناکافی اور قلیل آمدنی پہلے ہی تجارت و صنعت کے فروغ میں مانع تھی، اس پر تم نے اچھی آمدنیاں رکھنے والوں کو یہ راستہ دکھایا کہ وہ خرچ نہ کریں بلکہ زیادہ سے زیادہ پس انداز کیا کریں۔ اس سے کاروبار کو ایک نقصان اور پہنچا۔ اب اس پر مستزاد یہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب آدمیوں کو ناکافی اور قلیل تنخواہوں اور مزدوریوں کی شکل میں جو تھوڑی بہت خریداری حاصل ہوتی ہے اس کو بھی وہ اپنی ضروریات زندگی خریدنے میں استعمال نہیں کرنے پاتے بلکہ اس کا بڑا حصہ ساہوکار اور بنک ان سے چھین لیتا ہے اور اس کو اشیاء ضروریہ کی خریداری میں صرف

Marfat.com

کرنے کے بجائے سوسائٹی کے سر پر مزید سود طلب قرض چڑھانے میں استعمال کرتا ہے۔ ذرا حساب لگا کر دیکھیں کہ اگر دنیا میں پانچ کروڑ آدمی بھی ایسے ہوں جو مہاجنوں، ساہوکاروں اور بنکوں کے پھندے میں پھنسے ہوں اور وہ اوسطاً دس روپے مہینہ ادا کر رہے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ماہ پچاس کروڑ روپے کا مال فروخت ہونے سے رہ جاتا ہے، اور اتنی بھاری رقم معاشی پیداوار کی طرف پلٹنے کے بجائے مزید سودی قرضوں کی تخلیق میں ہر ماہ صرف ہوتی رہتی ہے۔ (مسئلہ سود)

سود کی انہی خرابیوں اور نقصانات کے علاوہ دوسرے نقصانات کو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''احیاء العلوم'' میں ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں بڑی نفیس اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ اہل علم ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ سود کے بارہ میں قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں بڑی پتے کی باتیں لکھی ہیں جو اہل علم کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ خلاصہ ان سب حضرات کا یہی ہے کہ سود جس کو زمانہ جاہلیت میں اور اس عہد جدید میں بھی معیشت کی ترقی کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے اور سپریم کورٹ میں حکومت کے وکیل نے بھی یہ بیان دیا تھا کہ پاکستان کی معیشت کے لیے سود نہایت ضروری ہے، لیکن تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان جوشیلے مسلمانوں کی یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس سود نے آسٹریا کی معیشت کو تباہ کیا۔ ہنگری کی معیشت پر سود کے تباہ کن اثرات پڑے (ملاحظہ ہو لینڈ بنک، لندن کا رسالہ بابت مئی، جون ۱۹۲۹ء، نیویارک ٹائمز بابت ۱۶ دسمبر ۱۹۳۳ء) پھر بلغاریہ اور رومانیہ کی معیشت پر بھی اس کے نہایت تباہ کن اثرات پڑے (لندن ٹائمز بابت ۳۱ اگست ۱۹۳۳ء، ۱۱ اگست ۱۹۳۳ء، ڈیلی میل، یکم ستمبر ۱۹۳۳ء) سود جس معاشرہ میں بھی ہو گا وہاں دولت سمٹ سمٹا کر چند ہاتھوں میں چلی جائے گی اور عوام کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ اس سلسلہ میں مسٹر جافری بیڈ لیپ کا یہ کہنا بالکل درست اور صحیح ہے کہ ایسا معاشرہ جو اپنے بنکروں کے حلقۂ اثر میں ہو، اور ان کی اخلاقی تلقین کا روادار ہو باقی رہنے کے قابل نہیں ہے۔ معاشرے کی خرابیوں کے ذمہ دار یہی بنک کار ہیں۔

Marfat.com

اسلامی معاشرہ میں بنکوں کا قیام:

وہ لوگ جو موجودہ زمانہ کے عجائبات کو ہمیشہ نہایت فخر سے ذکر کرتے ہیں اور بنک کاری کے بڑے بڑے اداروں کو موجودہ دنیا کی ایک اہم ایجاد سمجھتے ہیں، ان کو یہ جاننا چاہیے کہ اسلام نے بنک کاری کا ایک ایسا قومی اور مرکزی ادارہ قائم کیا ہے جس کی شاخیں تمام ملک میں ہوں۔ یہ ادارہ ''بیت المال'' کے نام سے موسوم ہے۔ بیت المال موجودہ مرکزی بنک کا پیش رو ہے جو قوم کی ملک ہوتا تھا اور سوائے اجرائے زر کے کم و بیش وہ سارے کام انجام دیتا تھا جو اس زمانہ میں بنک انجام دیتے ہیں۔ اسلام نے اجرائے زر کا کام حکومت کے سپرد کیا ہے جو صحیح ترین اصول ہے۔ اسلامی نظام معیشت میں ہم جس قدر چاہیں جدید اور ترقی یافتہ بنک کاری کے ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ فرق یہ ہوگا کہ اس میں وہ تمام نقائص موجود نہ ہوں گے جو موجودہ بنک کاری کے اداروں میں پائے جاتے ہیں۔ معاشرہ میں جو بنک اب موجود ہیں ان کو اسلامی ریاست میں قائم رکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ دو ترمیمات کر دی جائیں۔

1- امانتوں پر سود دینے کی اجازت نہ ہو۔ یہ کام چنداں دشوار نہ ہوگا کیونکہ اس وقت بھی انگلستان اور دنیا کے دوسرے کئی ممالک میں ایسے بنک موجود ہیں جو امانتوں پر سود ادا نہیں کرتے۔ یورپ کے ملکوں میں میعادی امانتوں پر جو معمولی سود دیا جاتا ہے اس کی شرح نہایت قلیل ہے۔ اسے پس اندازی کو متاثر کیے بغیر آسانی سے اڑایا جا سکتا ہے۔

2- بنک اپنے گاہکوں کو جو قرضے دے اس پر کسی قسم کا سود وصول نہ کرے۔ بہت سے لوگوں کو یہ سفارش ناقابل عمل معلوم ہوگی کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ بنک اپنی خدمت کا معاوضہ (Service Charges) لیے بغیر اپنے کاروبار کو کیسے انجام دے سکتے ہیں۔ سود کو مسدود کرنے کے خلاف یہ ایک بہت ہی اہم اعتراض معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر ہم ٹھنڈے دل اور غیر جانب داری سے غور کریں تو یہ اعتراض اتنا اہم نہیں معلوم ہوگا جتنا کہ بظاہر دکھائی دیتا ہے، اگر

Marfat.com

بنک بغیر سود کے امانتیں وصول کرتے ہیں اور اس پر انہیں کسی قسم کی ادائیگی نہیں کرنا پڑتی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ بغیر سود کے لوگوں کو قرض نہ دے سکیں۔ اس کے جواب میں فوری طور پر یہ کہا جائے گا کہ ایسی صورت میں وہ اپنے عملہ کی تنخواہیں اور اپنے دیگر مصارف کہاں سے پورے کریں گے، لیکن یہ سوال بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ ملک میں دواخانے، ہسپتال اور رفاہ عامہ کے دیگر اداروں کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں؟ اگر بنک موجودہ معاشرہ کے واقعی سنگ بنیاد ہیں اور ان کی خدمت معاشرہ کی بہتری اور بہبود کے لیے اتنی ہی ضروری ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس ادارہ کی خدمات بھی ضرورت مندوں کو مفت نہ دی جائیں، اور ان کے اخرجات کا بار ملک کے محاصل پر اسی طرح نہ ڈال دیا جائے جس طرح کہ رفاہ عامہ کے دیگر اداروں کا بار ڈالا جاتا ہے۔ یہ بار چنداں گراں نہ ہوگا۔ اگر ہم اپنے ذہن میں اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ اس مفت کی خدمت کی وجہ سے قومی دولت میں اضافہ ہوگا اور لوگوں کی ٹیکس ادا کرنے کی قوت کا بڑھ جانا ضروری امر ہے۔ حکومت کو جو ٹیکس سے زیادہ آمدنی ہوگی اس میں سے وہ آسانی سے اس خدمت کا معاوضہ دے سکتی ہے، لیکن اسلامی نظام معیشت میں بنک ان سے کچھ بڑھ کر خدمت کریں گے۔ بنک اسلامی نظام میں ملک کے لیے ایک اثاثہ کا کام انجام دیں گے اور اپنے اخراجات خود پورے کر سکیں گے۔

موجودہ بنک کاری کے نظام کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ یہ گرم بازاری کو بڑھاتا ہے اور گرم بازاری کے زمانہ میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ ایسے ناموزوں کاموں میں مصروف نہ ہوں جو بلآخر منفعت بخش ثابت نہیں ہو سکتے۔ جب صنعتی کاروبار میں ترقی ہو رہی ہو تو بنک کھلے دل سے قرضے دیتے ہیں اور طرح طرح کی صنعتوں کو فروغ دینے میں مدد دیتے ہیں۔ جب قرضوں کی طلب بڑھنے لگتی ہے تو وہ شرح سود میں اضافہ کر دیتے ہیں کیونکہ گرم بازاری کے زمانہ میں زیادہ سود ملنے کی امید رہتی ہے۔ کاروباری ترقی کی امید پر کارخانہ دار اور تاجر بڑھی ہوئی شرح سود پر قرض

Marfat.com

لینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جب بنک یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ زیادہ رقمیں دے چکے ہیں تو پھر وہ رقموں کی واپسی کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ عام خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے اثاثوں کو زیادہ سیال صورتوں میں رکھیں۔ چنانچہ قرضے واپس لینے کی کوشش ہوتی ہے اور آئندہ مزید قرضے نہیں دیئے جاتے۔ صنعت خواہ اس کی ساکھ اور مالی حالت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، اس کے لیے فوراً قرضے ادا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تخفیف اور کمی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیکاری کا عفریت پھیلنے لگتا ہے اور کساد بازاری شروع ہو جاتی ہے۔

بنک اپنے مفاد کو صنعت کے مفاد سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں کیونکہ صنعت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ان کی حیثیت محض قرض خواہوں کی ہوتی ہے اور ان کو صنعت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ بنک کاری کے نظام میں اس نمایاں نقص کو روز بروز زیادہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ ان تمام ممالک میں جہاں نئی صنعتیں قائم ہو رہی ہیں، اس امر پر زور دیا جا رہا ہے کہ بنکوں کو چاہیے کہ وہ صنعتوں کی ترقی میں زیادہ حصہ لیں اور ان کے ساتھ روابط قائم رکھیں۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جبکہ بنک صنعت وحرفت اور تجارت کے لیے صرف قرض دہندہ نہ رہیں بلکہ اس کے حصہ دار اور شریک (Partner) بنیں۔

اسلام سود کی سخت ممانعت کرتا ہے لیکن منافع اور شراکت کو جائز قرار دیتا ہے۔ بنک اگر صنعتوں کو قرضہ دینے کی بجائے ان کے حصہ دار (Partner) بن جائیں اور ان کے نفع ونقصان دونوں میں شریک رہیں تو پھر ایسے بنکوں کے خلاف اسلامی نظام معیشت میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ مالیات اور صنعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کا یہی ذریعہ ہے کہ یہ دونوں نفع ونقصان میں شریک رہیں۔ اس اتحاد سے ملک کی صنعتی ترقی میں اضافہ ہوگا اور بنکوں اور صنعتوں میں زیادہ رابطہ پیدا ہو جائے گا۔ صنعت و مالیات کے یہ خوش گوار تعلقات صرف اسلامی معاشی نظام کی صورت میں قائم رکھے جا سکتے ہیں۔

اگر ایسا اشتراک بنکوں اور صنعت وتجارت کے درمیان عمل میں آ جائے تو بنکوں کو جو نفع حاصل ہوگا وہ اس سے کہیں زیادہ ہوگا جو ان کے اخراجات کی پابجائی کے

Marfat.com

لیے ضروری ہے۔ جب بنک صنعت وحرفت کے قرض خواہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کے شریک کار رہیں گے تو ان کا تعاون پہلے سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ ایک مشہور مغربی مصنف اور دانشور جافری مارک نے اپنی کتاب ''موجودہ بت پرستی'' میں لکھا ہے کہ ہر قسم کی خانگی بنک کاری کو ممنوع قرار دیا جائے اور سود کو قطعی ناجائز سمجھا جائے اور اس کے بجائے تمام امانتوں پر ایک قسم کا ٹیکس لگایا جائے۔'' اس مصنف کو شاید یہ معلوم نہیں اسلام نے چودہ سو برس قبل سود کی قطعی ممانعت کر دی تھی اور فاضل رقومات پر زکوٰۃ کی صورت میں اڑھائی فیصد محصول عائد کر دیا تھا۔

اسلامی دنیا میں بلاسود بنک کاری کی ضرورت:

پوری اسلامی دنیا اور تیسری دنیا اس وقت سود کے بھاری بوجھ تلے کراہ رہی ہے اور سود کے اس استحصالی نظام کی گواہی دے رہی ہے۔ آج تیسری دنیا کے ممالک ۳۰ کھرب ڈالر سے زیادہ کے مقروض ہیں۔ ان پر قریباً دوسو ارب ڈالر سالانہ سے زیادہ سود ادا ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء کے درمیان گذشتہ بیس سالوں میں سود کی شرح میں ۸۰ گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہ ۱۹۷۰ء میں ۲۴ ارب ڈالر تھا اور آج ۱۹۹۰ء میں ۱۲۶ ارب ڈالر ہے۔ اس طرح اس سود کے ذریعہ دنیا کے غریب ممالک کا خون چوس (Suck) کر امیر ممالک ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔

خود پاکستان نے ۱۹۷۰ء تک گذشتہ تیس پینتیس سالوں میں جو قرضے لیے ان کی مالیت تین ارب ڈالر تھی۔ آج ہم ۳۶ ارب ڈالر کے مقروض ہیں۔ قرض سے زیادہ ڈالر ہم سود میں ادا کر چکے ہیں بلکہ سود ادا کرنے کے لیے ان سے پھر قرضے لیتے رہے ہیں جس سے روز بروز ہمارے قرضے بڑھتے رہے اور ہم ان قرضوں کا سود بھی ادا نہیں کر سکتے۔ یہی حالت ۱۹۹۰ء میں الجزائر کی تھی۔ جو کہ تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود ۳۰۔۳۲ ارب ڈالر کا مقروض تھا۔ اب معلوم نہیں وہ کتنے ارب ڈالر کا مقروض ہے۔ یہی حالت دوسرے مسلمان ملکوں کی ہے۔ جو ملک ایک دفعہ ان سودی اداروں کے جال میں پھنس گیا وہ پھر جتنا مرضی پھڑپھڑائے اس جال سے نکل نہیں سکتا بلکہ جال اور

Marfat.com

زیادہ اس کے بدن میں گھستا ہے۔ پھر قرض دینے والے ممالک اور کنشورسیم نہ صرف بھاری شرح سود کے ساتھ قرض دیتے ہیں بلکہ اپنی مصنوعات بھی بھاری قیمتوں کے ساتھ فروخت کر کے اپنے ماہرین بھی بھاری تنخواہوں کے ساتھ ان مقروض ملکوں میں روانہ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے قرضوں کا بڑا حصہ واپس انہیں کو مل جاتا ہے۔ پھر وہ مشیر مشورے بھی صحیح نہیں دیتے بلکہ ان کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ یہ ممالک غیر ترقی یافتہ ہی رہیں اور سالہا سال تک ہمیں سود ہی ادا کرتے رہیں۔ اس طرح سے سود ان غریب ممالک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ اور ان کے عوام کے معیار زندگی میں ترقی کے بجائے تنزل اور پستی کا سبب بنتا ہے۔ اس لیے سود کسی طور پر پسندیدہ نہیں ہے اور اس کا متبادل نظام وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔

بنکوں کی افادیت اپنی جگہ پر مسلمہ لیکن سود کو انہی خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے حرام قرار دیا ہے، لہٰذا بنک کاری نظام کو ضروری ہے کہ اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ موجود بنکنگ نظام معاشرے میں ناانصافی، ظلم، استحصال، وسائل کے ضیاع اور قوموں کے مابین وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا باعث ہے، لہٰذا خالص اور لادینی اور عقلی بنیادوں پر بھی بلاسود بنک کاری ایک مہذب، اور خدا ترس معاشرہ کی اہم ضرورت ہے۔ بنک سرمایہ کاری کے لیے صنعت کاروں اور تاجروں کو کاروبار کے لیے سودی قرضے دیتے ہیں جب کہ کاروبار میں نفع ونقصان کی ساری ذمہ داری تاجر حضرات پر ہوتی ہے۔ کاروبار میں نفع ہو یا نقصان کاروباری افراد کو قرض کی رقم مع سود بنک کو واپس لوٹانی پڑتی ہے۔ یہ معاملہ کاروباری افراد کے لیے ناانصافی کا باعث ہے۔ لہٰذا غیر سودی بنک کاری ضروری ہے۔

بنک کا اس میں فائدہ ہے کہ اس کو تمام رقم سود سمیت مل جاتی ہے۔ بنک قرض دینے سے پہلے سرمایہ کے استعمال کے بارہ میں مکمل معلومات حاصل کرتا ہے، لیکن اس کی بنیادی دلچسپی اس بات سے ہوتی ہے کہ سرمایہ کار قابل اعتبار ہو اور تسلی بخش ضمانت (Securities) فراہم کر رہا ہو تا کہ اس کی رقم نہ ڈوب جائے۔ اس صورت میں عموماً سرمایہ کی بہترین استعداد کی (Efficient) تقسیم کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اور معاشرہ

میں بہت سے ایسے کاموں کے لیے سرمایہ فراہم کر دیا جاتا ہے جو معاشرہ کے نقطۂ نظر سے نہ نفع بخش ہوتے ہیں اور نہ ہی مفید، البتہ بنک کے قرضہ کے معیار اہلیت پر پورے اترتے ہیں۔ اس طرح معاشرہ کے منافع بخش کاموں کے لیے سرمایہ فراہم نہیں ہو پاتا کیونکہ اس میں متوقع شرح سود نہیں ملتی۔ اس طرح سود بہت سے مفید کاموں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں صارفین کے قرضوں (Consumption Loans) پر سود کی وصولی سراسر ناانصافی اور ظلم ہے کیونکہ صارفین اس قرض سے کوئی دولت پیدا نہیں کر رہے ہوتے، لیکن بنک ان سے ان قرضوں پر بھی سود لیتا ہے جو کہ نہ معاشی لحاظ سے اور نہ ہی اخلاقی نقطۂ نظر سے جائز اور مناسب ہے۔

غیر سودی بنک کاری عملی میدان میں:

غیر سودی بنک کاری عملی طور پر ہو سکتی ہے، چنانچہ اس بارہ میں کئی لوگوں نے اپنی کتابوں میں اس کے نقشے پیش کیے ہیں۔ جن میں زیادہ مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں:

(1) غیر سودی بنک کاری: ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی۔

(2) بلا سود بنک کاری: محمد اکرم خان۔

(3) غیر سودی بنک کاری: مقالہ پروفیسر سینٹر خورشید احمد وغیرہ۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سود اسلام میں مطلق حرام ہے۔ بنک کاری نظام میں سود کا متبادل کیا ہو اور بنکوں کے نام کی نوعیت کیا ہو؟ اس پر ان حضرات نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اسلام میں بنک کو اپنی ذمہ داری کے اعتبار سے ایک نیا کردار ادا کرنا ہے۔ موجودہ بنک صرف مالیاتی ادارے ہوتے ہیں جن کا کام کھاتے داروں کی رقوم اور بچتیں جمع کرنا اور دوسرے لوگوں کو قرض پر دینا اور اس کی بنیاد پر قرضے پیدا کرنا ہے، لیکن اسلام کے نزدیک بنک صرف مالیاتی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک سرمایہ کار بھی ہے، اور اس کا بنیادی کردار سرمایہ کارانہ ہے۔ اس لیے غیر سودی بنک صرف مالیاتی ضمانت پر قرضہ نہیں دے گا بلکہ مجوزہ منصوبے کے قابل عمل ہونے کا جائزہ بھی لے گا اور اس کے سماجی اثرات کو بھی پیش نظر رکھے گا جس کے نتیجے میں زیادہ مفید اور نفع بخش منصوبے عمل میں آئیں

Marfat.com

گے جو حقیقی معاشی ترقی کے لیے بنیاد فراہم کریں گے۔

پھر وہ بنک سود کی بنیاد پر کام نہیں کرے گا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے بلکہ وہ اسلامی اصول مضاربت کی بنیاد پر کام کرے گا، یعنی ایک طرف سرمایہ ہے اور دوسری طرف محنت۔ اس میں سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں محدود جواب دہی کے اصول پر سرمایہ کو تحفظ دینے کے بجائے محنت کو تحفظ دیا گیا ہے۔ مضاربت میں کاروباری نقصان سرمایہ دار کو اٹھانا پڑے گا جب کہ محنت کار کی محنت ضائع ہوگی۔ اور منافع کی صورت میں دونوں فریق منافع میں شریک ہوں گے۔ اس وجہ سے غیر سودی بنک کاری میں امانت و دیانت کے اعلیٰ اور بلند معیار کی اشد ضرورت ہے ورنہ شراکت و مضاربت کا اصول کارگر نہ ہو سکے گا۔ دوسری ضرورت ٹیکس کے نظام کو درست کرنے کی ہے جس کی وجہ سے لوگ کئی کئی کھاتے بناتے ہیں جس کے نتیجے میں لوگوں میں امانت و دیانت کا فقدان پیدا ہو گیا ہے اور جھوٹ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے، جس کے نتیجہ میں قومی اور ملی ضروریات کے لیے سرمایہ بھی ٹیکس کی صورت میں نہایت کم مقدار میں ملتا ہے۔

غیر سودی بنک کاری کے اصول پر اب تک بہت سے ادارے معرض وجود میں آ چکے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں ملائیشیا میں حج بیت اللہ کے خواہش مند لوگوں کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا جہاں لوگ اپنی بچت جمع کرواتے تھے اور حسب ضرورت قرض لیتے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں ۱۲۹۱ حصہ داروں سے اس ادارہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آج اس کے حصہ داروں کی تعداد دس لاکھ ہے۔ اس ادارہ کا قیام ۴۶ ہزار چھ سو ملائیشیائی ڈالر سے ہوا تھا۔ آج اس کا سرمایہ بیس ارب ملائیشن ڈالر سے زیادہ ہے۔ ۱۹۸۵ء تک پورے ملک میں اس کی شاخوں کی تعداد ۶۵ ہو چکی تھی۔

بلا سود بنیادوں پر کام کرنے والے ادارے اب دنیا کے بڑے بڑے مالیاتی اداروں جیسے ورلڈ بنک، آئی ایم ایف اور آئی ایف سی وغیرہ سے معاملات کر رہے ہیں جس سے اسلامی بنکوں کے ساتھ ان کے تجربات وغیرہ ہو رہے ہین۔ ۱۹۷۵ء میں بلا سود بنک کاری کا قیام عمل میں آنا شروع ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں اسلامک بنک دوبئی اور پھر اسی سال اسلامی ترقیاتی بنک قائم ہوا۔ اس وقت ایسے سو کے قریب بنک اور ادارے بلا سود

Marfat.com

بنک کاری کی بنیاد پر کام کر رہے ہیں جن کی تین سو پچاس سے زائد شاخیں مختلف ممالک میں کام کر رہی ہیں۔ وہ ہولڈنگ کمپنیاں یعنی بڑے ملٹی نیشنل ادارے، ایک بیت المال اسلامی ہے جس کے قریباً ۴۰ بنک اور سرمایہ کاری کی کمپنیاں یا انشورنس کمپنیاں ۲۵ ممالک میں کام کر رہی ہیں۔ دوسرا ''البرکہ'' گروپ ہے جس کے ۲۵ ادارے ۱۵ ممالک سے زائد میں کام کر رہے ہیں۔ یہ تمام ادارے بڑی کامیابی کے ساتھ غیر سودی اسلامی بنک کاری کے تجربات سے گزر رہے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے غیر سودی بنک کاری اب ایک خواب وخیال نہیں رہی بلکہ عملی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور سودی نظام بنک کاری کے متبادل کے طور پر بین الاقوامی سطح پر اس کا اعتراض اور تذکرہ ہو رہا ہے۔

غیر سودی بنکوں اور مالیاتی اداروں کی اجمالی فہرست:

1- بنک البرکہ السوڈانی، خرطوم، سوڈان
2- فیصل اسلامی بنک آف سوڈان، خرطوم، سوڈان
3- اسلامک بنک آف ویسٹ سوڈان، خرطوم، سوڈان
4- اسلامک کواپریٹو ڈویلپمنٹ بنک، خرطوم، سوڈان
5- اسلامک انوسٹمنٹ کمپنی آف سوڈان، خرطوم، سوڈان
6- سوڈان اسلامک بنک، خرطوم، سوڈان
7- تدمن اسلامک بنک، خرطوم، سوڈان
8- البرکہ نیل ویلی کمپنی، قاہرہ، مصر
9- عرب انوسٹمنٹ بنک (اسلامک بنکنگ آپریشن) قاہرہ، مصر
10- بنک مصر (اسلامی برانچ) مصر
11- فیصل اسلامک بنک آف مصر، مصر
12- انٹرنیشنل اسلامک بنک فار انوسٹمنٹ اینڈ ڈویلپمنٹ، قاہرہ، مصر
13- ناصر سوشل بنک، قاہرہ، مصر
14- البرکہ انوسٹمنٹ لمیٹڈ، لندن، یوکے

Marfat.com

15- البرکہ انوسٹمنٹ کمپنی لمیٹڈ، لندن، یو کے
16- الراجحی کمپنی فار اسلامک
17- اسلامک فنانس ہاؤس پبلک لمیٹڈ کمپنی، لندن، یو کے
18- اسلامک انوسٹمنٹ کمپنی، میلبورن، آسٹریلیا
19- اردن فنانس ہاؤس کمپنی، عمان، اردن
20- اردن فنانس ہاؤس، عمان، اردن
21- اردن اسلامک بنک فار فنانس اینڈ انوسٹمنٹ، عمان، اردن
22- دارالمال اسلامی نساؤ، بہاماس
23- اسلامک انوسٹمنٹ کمپنی لمیٹڈ، نساؤ، بہاماس
24- بنک التقوی، بحرین، سوئٹزرلینڈ
25- اسلامک بنک مانامہ، بحرین
26- البرکہ اسلامک انوسٹمنٹ بنک، مانامہ، بحرین
27- بحرین اسلامک انوسٹمنٹ کمپنی، مانامہ، بحرین
28- اسلامک انوسٹمنٹ کمپنی آف دی گلف، مانامہ، بحرین
29- مصر فیصل الاسلامی، بحرین
30- اسلامک بنک آف بنگلہ دیش لمیٹڈ، ڈھاکہ، بنگلہ دیش
31- جامی لمیٹڈ، ڈربن جنوبی افریقہ
32- اسلامک بنک انٹرنیشنل آف ڈنمارک، کوپن ہیگن، ڈنمارک
33- بیت النصر اربن کواپریٹو سوسائٹی، بمبئی، انڈیا
34- التوخیم انٹرنیشنل ایکسچینج کمپنی، صفات، کویت
35- کویت فنانس ہاؤس، صفات، کویت
36- افریقن عربین اسلامک بنک، مونرویا، لائبیریا
37- اسلامک فنانس ہاؤس یونیورسل ہولڈنگ، ایس اے لکسمبرگ
38- بنک اسلام ملائیشیا، کوالالمپور، ملائیشیا

Marfat.com

39- پلگرمز مینجمنٹ اینڈ فنڈ بورڈ، کوالالمپور، ملائیشیا
40- دوبئی اسلامک بنک دوبئی، متحدہ عرب امارات
41- اسلامک انوسٹمنٹ کمپنی لمیٹڈ، شارجہ، یو اے ای
42- فیصل اسلامک بنک آف نائجر، نیامی، نائجر
43- دارالمال اسلامی جنیوا، سوئٹزر لینڈ
44- فیصل اسلاملک بنک آف سینی گال، ڈکار، سینی گال
45- البرکہ انوسٹمنٹ اینڈ ڈویلپمنٹ کمپنی جدہ، سعودی عرب
46- اسلامک ایکسچینج اینڈ انوسٹمنٹ کمپنی، دوحہ، قطر
47- قطر اسلامک بنک، قطر
48- بنک التمویل السعودی التیونسی، قطر
49- البرکہ ترکش فنانس ہاؤس، استنبول، ترکی
50- فیصل فنانس انسٹی ٹیوشن، استنبول، ترکی
51- مصرف فیصل الاسلامی، گیانا، کوناگری، گیانا
52- سپاہ اسلاملک بنک تہران، ایران
53- عربین تھائی انوسٹمنٹ کمپنی لمیٹڈ، بنکاک، تھائی لینڈ
54- دی فلپائن امانتہ بنک، ڈمبونگاسی، فلپائن
55- مصرف فیصل الاسلامی، جرمنی، سینٹ ہیلز
56- شریعہ انوسٹمنٹ کمپنی لمیٹڈ، جنیوا، سوئٹزر لینڈ
57- اسلامک بنکنگ سسٹم فنانس، ایس اے، ویڈوز، لیمپئن سٹائن

انشورنس (Insurance)

انشورنس کی تعریف کچھ یوں کی جاتی ہے کہ
''انشورنس ایک ایسا معاہدہ ہوتا ہے جس میں ایک فرد انشورنس کنندہ (Insurer) دوسرے فرد انشورنس شد (Insured) کو ایک معینہ

Marfat.com

رقم یعنی پریمیم (Premium) کی ادائیگی کے بدلہ میں کسی خاص واقعہ کے ہونے کی صورت میں کچھ رقم ادا کرتا ہے۔''

''خاص واقعہ'' میں کسی غیر یقینی کیفیت کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ غیر یقینی کیفیت یا تو انسانی زندگی کے بیمہ (Life Insurance) کی صورت میں ہو سکتی ہے جہاں موت تو یقینی ہے لیکن اس کے وقوع پذیر ہونے کا وقت غیر یقینی ہے، یا پھر کسی متوقع حادثاتی واقعہ کی صورت ہو سکتی ہے جو شاید کبھی بھی وقوع پذیر نہ ہو۔

اس بات سے ہر شخص آشنا ہے کہ انسانی زندگی میں خطر (Risk) اور غیر یقینی کیفیت روزہ مرہ کا معمول ہے۔ انسان چھوٹے چھوٹے خطرات اور غیر یقینی کیفیتوں کو آسانی سے برداشت کر لیتا ہے لیکن معاشی سرگرمیوں میں بعض اوقات ان خطرات کا مقابلہ کرنا اس کے لیے نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔

معاشی سرگرمیوں میں اس خطر (Risk) کی نوعیت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی معاشی سرگرمی کے نتیجہ میں نفع بھی ہو سکتا ہے اور نقصان کا اندیشہ بھی رہتا ہے کیونکہ جو شی اس نے اپنی فیکٹری میں بنائی اگر اس کی لاگت کے اخراجات کم اور فروخت کی قیمت زیادہ ہوگئی تو اس کو نفع ہو گیا اور اگر اس کے برعکس ہوا تو نقصان ہو گیا یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا امکان ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کاروبار میں نفع کے علی الرغم نقصانات کا امکان موجود رہے اور ان نقصانات کا وقوع پذیر ہونا قابل پیمائش بھی ہو جیسے بحری جہازوں کے سمندر میں ڈوب جانے یا کوئی اور حادثہ پیش آنے کے امکانات یا فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں کے حادثات میں زخمی ہونے کے امکانات وغیرہ۔

کاروبار کے اس دوسری قسم کے خطرات انشورنس کا ہدف بنتے ہیں۔ اس طرح کے کاروبار کے خطرات میں بیمہ (Insurance) کیا جاتا ہے جس کا مقصد لوگوں کے نقصان کی صورت میں سہولت فراہم کرنے اور ان کی کارکردگی میں اضافہ کرنے اور کاروباری خطرات کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ بیمہ کا یہ طریق انسان کے لئے بڑا مفید ہے اسی سے کاروباری افراد کو ایک گونہ تحفظ کا احساس ہوتا ہے جس کی وجہ سے

کسی پرخطر کاروبار میں بھی ہاتھ ڈالنے کی جرأت کرتے ہیں۔

انشورنس کی اہمیت کے بارہ میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

''انشورنس ایک بنیادی انسانی ضرورت ہے۔ یہ بات ان تمام حادثات اوران کے مالی عواقب کے بارہ میں درست ہے جن سے ایک آدمی دو چار ہوسکتا ہے۔ اچانک موت، معذوری، علالت، بے روزگاری، آتش زدگی، سیلاب، ژالہ باری، غرقابی اور نقل وحمل سے متعلق حادثات اور ان کے نتیجے میں واقع ہونے والے مالی نقصانات کسی مخصوص اختیاری عمل اور پیشے وغیرہ پر مبنی نہیں ہیں۔ ان کے نتیجے میں اکثر اوقات متاثر ہونے والا فرداوراس کا خاندان حقیقی محتاجی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔اس کے نتیجے میں بہرصورت افراد کی وہ معاشی کارکردگی متاثر ہوتی ہے جس کا انحصار مال اور املاک پر ہے۔ یہ حقیقت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ زندگی کے ایک بڑے دائرے میں انشورنس کو بنیادی انسانی ضرورت کا درجہ دیا جائے۔''

(انشورنس انسانی معیشت میں:ص۸۰۔۸۱)

انشورنس کا ارتقاء:

انشورنس کی ابتداء تاجروں اور کاروباری حلقوں نے کی اور تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا آغاز بحری تجارت سے ہوا کیونکہ تجارتی جہاز اور بادبانی کشتیاں طوفانوں میں گھر کر تباہ ہوجاتی تھیں اور تاجروں کا مال سمندر میں غرق ہوکر برباد اور تباہ ہوجاتا تھا جس کی وجہ سے تاجر حضرات کنگال اور دیوالیہ ہوجاتے تھے۔ ان ناگہانی خطرات، حادثات اور نقصانات کا مقابلہ کرنے کے لیے بحری تاجروں نے انشورنس کا آغاز کیا اور سب سے پہلے اندلس (اسپین) کی مسلم حکومت کے دور میں بحری تجارت کرنے والے مسلمان تاجروں نے اس کا آغاز کیا۔ آٹھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں نے بحری سائنس کو بہت زیادہ ترقی دی اور بحراوقیانوس میں ایک مضبوط بحری

Marfat.com

بیڑا تشکیل دیا، اور عبدالرحمٰن الداخل نے سب سے پہلے مسلم اسپین میں اس کا آغاز کیا اور باقاعدہ ایڈمرل کا تقرر کیا (یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ بحری بیڑے کے اصل بانی سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ ہیں۔ ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''سیدنا معاویہ تاریخ کی روشنی میں'') جب کہ عبدالرحمٰن سوم کے زمانہ میں عرب نیوی مغربی اوقیانوس میں سب سے طاقتور بحری طاقت بن گئی۔ ان کے بحری جہاز بحرالکاہل (Pacific Ocean) سے مشرق میں چین، ایسٹ انڈیز (East Indies) اور فلپائن تک جاتے اور مغرب میں بحراوقیانوس کے جزائر تک۔ بحری سفر میں خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے اشتراکت کی بنیاد پر انشورنس کا نظام قائم کیا۔ اس طرح وہ جہازوں اور جہازوں میں لدے ہوئے سامان (Cargo) کو مکمل طور پر بیمہ (Insure) کرتے تھے۔ شراکت کی بنیاد پر قائم اس انشورنس کے نظام میں سود کا شائبہ تک نہ تھا۔ بحری سفر میں نقصان اٹھانے والوں کو کاروباری لوگوں کے مشترکہ فنڈ سے ہرجانہ ادا کیا جاتا تھا۔

انشورنس کی ایک شکل بعض روایات کے مطابق ہمیں سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب میں نظر آتی ہے۔ مکہ کے تاجروں نے شام، عراق اور دوسرے ممالک کو جانے والے تجارتی قافلوں کے لٹ جانے اور نقصانات ہونے کی صورت میں ان کی مدد کے لیے ایک فنڈ قائم کیا تھا۔ جب سرکار دو عالم ﷺ خود تجارت کیا کرتے تھے اس دوران ایک بڑا تجارتی قافلہ صحرا میں گم ہو گیا۔ صرف چند افراد زندہ بچے۔ مشترکہ فنڈ کے ذمہ داران نے اس قافلہ کے زندہ بچ جانے والے افراد اور مرنے والوں کے اہل خانہ کو ان کے تجارتی مال، اور مر جانے والے اونٹوں اور گھوڑوں کی قیمت ادا کی۔ سرکار دو عالم ﷺ سیدہ خدیجہؓ کے مال سے تجارت کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے منافع میں سے فنڈ میں اپنا حصہ ادا کیا۔

مسلمانوں نے آٹھویں صدی کے اواخر میں انشورنس کے نظام کا آغاز کیا اس وقت تک یورپ کے خواب وخیال میں بھی اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یورپ میں چودھویں صدی میں اٹلی کے تاجروں نے مسلم اسپین کے اس عمل کو اپنایا۔ اس کے بعد ہالینڈ کے مالکانِ جہاز، بحری تاجروں، صناعوں اور زراعت پیشہ لوگوں نے انشورنس کے کاروبار

Marfat.com

غاز کیا۔ اس کو اس وقت گارنٹڈ ایسوسی ایشن (Guaranted Association) کا نام
یا گیا۔ اس ایسوسی ایشن کے شرکاء کسی بھی حصہ دار کو پیش آنے والے نقصانات کے
قابلہ میں ''حصہ رسدی'' کی ادائیگی کر کے فنڈز کو برقرار رکھتے تھے۔ بعد میں اس کی ترقی
فتہ شکل لائیڈز (Lylioyds) سسٹم کہلائی۔ اس سے ملتا جلتا ایک اور نظام مشترکہ نظام
یمہ (Mutual Insurance) کا ہے جس میں بیمہ دار ہی کاروبار کے حصہ دار ہوتے
یں۔ موجودہ دور میں مقررہ پریمیم (Fixed Premium) کا نظام زیادہ مقبول ہے
جسے سرمایہ دارانہ نظام انشورنس (Capital Form of Insurance) کہا جاتا ہے۔
نشورنس کی سب سے ہمہ گیر شکل ریاستی انشورنس (State Insurance) کی ہے جس
کے تحت حکومت شہریوں کو خاص خاص حوادث اور مصائب کے مقابلہ میں تحفظ اور تلافی
کے ذرائع بہم پہنچاتی ہے۔ اور آج کے دور میں تو جان (Life) مال (Property)
خاندان (Family) اور کاروبار (Business) سے متعلقہ کوئی مفاد ایسا نہیں جس کی
انشورنس نہ ہوتی ہو۔

انشورنس کے بارہ میں علمائے کرام کے نظریات:

انشورنس کا چلن اگرچہ اب پوری دنیا میں ہے لیکن اس میں بہت سی باتیں
خلاف اسلام ہیں۔ چنانچہ مصری عالم استاد ابوزہرہ مرحوم کی اس بارہ میں یہ رائے ہے:

''اگرچہ اس کی اصلیت تو تعاون محض ہے لیکن اس کا انجام بھی ہر اس
ادراہ کا سا ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا کہ یہودیوں نے اس نظام
کو جس کی بنیاد "تعاونوا علی البر والتقویٰ" پر تھی، اسے ایک
ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا جس میں قمار (جوا) اور ربا دونوں
پائے جاتے ہیں۔'' (بحوالہ اسلام اور جدید اقتصادی نظریات: ص۴۰۴)

سید مودودی نے بیمہ پر بحث کرتے ایک سوال کے جواب میں لکھا:

''انشورنس کے بارہ میں شرع اسلامی کی رو سے تین اصولی
اعتراضات ہیں جن کی بنیاد پر اسے جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

Marfat.com

-1 انشورنس کمپنیاں جو روپیہ پریمیم (Premium) کی شکل میں وصول کرتی ہیں اس کے بہت بڑے حصے کو وہ سودی کاموں میں لگا کر فائدہ حاصل کرتی ہیں اور اس ناجائز کاروبار میں وہ لوگ آپ سے آپ حصہ دار بن جاتے ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں اپنے آپ کو یا اپنی کسی چیز کو اس کے پاس انشور (Insure) کراتے ہیں۔

-2 موت یا حوادث یا نقصان کی صورت میں جو رقم دینے کی ذمہ داری یہ کمپنیاں اپنے ذمہ لیتی ہیں، اس کے اندر قمار کا اصول پایا جاتا ہے۔

-3 آدمی کے مرجانے کی صورت میں جو رقم ادا کی جاتی ہے، اسلامی شریعت کی روشنی میں اس کی حیثیت مرنے والے کے ترکے کی ہے جسے شرعی وارثوں میں تقسیم ہونا چاہیے، مگر یہ رقم ترکے کی حیثیت میں تقسیم نہیں کی جاتی بلکہ اس شخص یا ان اشخاص کو مل جاتی ہے جن کے لیے پالیسی ہولڈر (Policy Holder) نے وصیت کی ہو، حالانکہ وارث کے حق میں شرعاً وصیت ہی نہیں کی جا سکتی۔

موجودہ زمانے میں انشورنس کی بڑی اہمیت ہے اور ساری دنیا میں اس کا چلن ہے، مگر نہ اس دلیل سے کوئی حرام چیز حلال ہو سکتی ہے اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب حلال ہے۔ یا اسے اس بنا پر حلال ہونا چاہیے کہ دنیا میں اس کا چلن ہو گیا ہے۔ ایک مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم جائز و ناجائز میں فرق کریں اور اپنے معاملات کو جائز طریقوں سے چلانے پر اصرار کریں۔

انشورنس کے کاروبار کو صحیح بنیادوں پر چلانے کے سلسلہ میں سید مودودی لکھتے ہیں:

''رہا یہ سوال کہ انشورنس کے کاروبار کو اسلامی اصول پر کس طرح چلایا جا سکتا ہے تو اس کا جواب اتنا آسان نہیں ہے جتنا یہ سوال آسان ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ماہرین کی ایک مجلس جو اسلامی اصول کو بھی جانتی ہو اور انشورنس کے معاملات کو بھی سمجھتی ہو۔ اس پورے مسئلہ کا جائزہ لے اور انشورنس کے کاروبار میں ایسی اصلاحات تجویز کرے جن سے یہ کاروبار چل

Marfat.com

بھی سکتا ہو اور شریعت کے اصولوں کی خلاف ورزی بھی نہ ہو۔"

(معاشیات اسلام: ص ۲۰۸۔۲۰۹)

ان دو حضرات کے علاوہ اور بھی کئی حضرات نے اس مسئلہ کے بارہ میں اپنے اعتراضات نقل کیے ہیں۔ اس زمانہ میں دوسرے مسائل کے ساتھ تامین یعنی انشورنس کا معاملہ بھی بہت زیادہ عام ہو چکا ہے۔ اس کی بنیاد جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ سود اور جوئے پر ہے اور ان دونوں کی حرمت نص قرآن سے ثابت ہونے کی وجہ سے بدیہی ہے۔ اس بارہ میں امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں۔

یہ بات کہ انشورنس جوا اور سود اپنے دامن میں کیسے سمیٹے ہوئے ہے، تحقیق طلب نہیں ہاں البتہ ذرا تفصیل طلب ہے۔

لکھنؤ (بھارت) کی مجلس تحقیقات شرعیہ نے اس موضوع پر ایک سوال نامہ مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کا جواب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مفتی ولی حسن ٹونکیؒ نے دیا۔ دونوں جواب اپنے موضوع پر مفید معلومات کے حامل ہیں، لیکن مفتی ولی حسن صاحبؒ کا جواب چونکہ مفصل ہے، اس لیے اس کا یہاں ایک اقتباس نقل کیا جا رہا ہے:

کہا جاتا ہے کہ بیمہ کی ابتداء دہلی کے تاجران اسلحہ سے ہوئی۔ ان لوگوں نے یہ دیکھ کر بعض تاجروں کا مال تجارت سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی تنگ دستی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس صورت حال کا حل یہ نکالا کہ اگر کسی شخص کا مال تجارت سمندر میں ضائع ہو جائے تو تمام مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ یا ہر سال ایک مقررہ رقم ادا کیا کریں۔ یہی تحریک ترقی کر کے جہازوں کے بیمہ تک پہنچی کہ ہر ایک ممبر (Member) ایک مقررہ رقم ادا کرے تا کہ اس قسم کے حوادث وخطرات کے موقعہ پر نقصان کا کچھ نہ کچھ تدارک کیا جا سکے۔

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اندلس کی مسلم حکومت کے دور میں بحری تجارت میں حصہ لینے والے مسلمانوں نے تجارتی بیمہ کی طرح ڈالی۔ ابتداء میں بیمہ کی سادی صورت تھی۔ بعد میں اس کی نئی نئی صورتیں نکلتی رہیں اور تجربے ہوتے رہے۔ ہالینڈ اس تجربہ میں پیش پیش رہا۔ موجودہ دور میں بیمہ کاری کا نظام سب سے زیادہ مقبول ہے جسے

Marfat.com

سرمایہ کارانہ نظام بیمہ کہا جاتا ہے۔ اب دنیا کی حکومتیں بیمہ کو لازمی قرار دے رہی ہیں جسے ریاستی بیمہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بیمہ (انشورنس) کی ابتداء ۱۴۰۰ء سے ہوئی۔ ابتداء ہوتے ہی اسے بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا، اور اس کے مقدمات اس کثرت سے عدالتوں میں آنے لگے کہ ۱۴۳۵ء میں اس کے لیے خاص عدالتیں قائم ہوئیں جو صرف بیمہ کے مقدمات کی سماعت کرتی تھیں۔ بیمہ بحری کے بہت عرصہ بعد بیمہ بری شروع ہوا۔

آل عثمان کے زمانہ حکومت میں جب ترکی حکومت کے تجارتی تعلقات یورپ کے ملکوں سے قائم ہوئے تو یورپین تاجروں کے توسط سے بیمہ اسلامی ملکوں میں داخل ہوا اور اس کے بارہ میں علمائے وقت سے سوالات شروع ہوئے۔ چنانچہ تیرھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامی تحریر فرماتے ہیں:

> ”طریقہ یہ ہو گیا ہے کہ تاجر جب کسی حربی سے کوئی بحری جہاز کرایہ پر لیتے ہیں تو اس کا کرایہ ادا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دارالحرب کے کسی باشندے کو جو اپنے علاقہ میں مقیم رہتا ہے، کچھ رقم اس شرط پر دیتے ہیں کہ جہاز میں لدے ہوئے سامان کی آتش زدگی، غرقابی اور لوٹ مار ہو جانے کی صورت میں یہ شخص مال کا ضامن اس کو رقم ”سوکرہ“ (بیمہ کی رقم یعنی پریمیم) کہا جاتا ہے۔ اس کا ایجنٹ ہمارے ملک کے ساحلی شہروں کو شاہی اجازت نامہ کے بعد مستامن بن کر رہتا ہے جو تاجروں سے بیمہ کی رقم وصول کرتا ہے، اور مال کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں تاجروں کو پورا پورا معاوضہ ادا کرتا ہے۔“ (ردالمختار:۳/۲۴۵)

اس سے معلوم ہوا کہ بیمہ بحری کو اس زمانہ میں اچھا خاصہ فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ یورپین ممالک سے جو جہاز کرایہ پر لیے جاتے تھے ان کا لازمی طور پر بیمہ کرایا جاتا تھا۔ بیمہ کمپنیوں کا عمل دخل ترکی حکومت میں جاری تھا۔ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ ترکی کی بندرگاہوں پر باضابطہ سلطانی اجازت کے بعد مقیم تھے اور انہوں نے اپنے دفاتر کھول

Marfat.com

رکھے تھے یہاں تک کہ اہل علم کے پاس اس سے متعلق سوالات آنے لگے اور کتب فتاویٰ میں ردالمختار شامی وہ منفرد کتاب ہے جس میں انشورنس اور بیمہ کے متعلق تفصیل سے جواب دیا گیا ہے۔

بیمہ کی ابتداء جس جذبے کے تحت ہوئی اور پھر جن ارتقائی منزلوں سے وہ گزرا وہ سب کے سامنے ہے، لیکن اس کا انجام فاضل جلیل الاستاذ علامہ ابوزہرہؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

> ''اگر چہ اس کی اصلیت تو تعاون محض تھی لیکن اس کا انجام بھی ہر اس ادارہ کی طرح ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا۔ یہودیوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد تعاون علی البر والتقویٰ پر تھی ایک ایسے نظام میں تبدیل کر دیا جس میں جوا اور سود دونوں موجود ہیں۔''
>
> (لواء الاسلام بحوالہ ماہ نامہ برہان، دہلی)

مصر و شام میں مدت سے اس پر بحثیں ہو رہی ہیں۔ وہاں بیمہ کے نظام کو سمجھانے کے لیے متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

مصر میں کئی سال قبل نئے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک مجلس ترتیب دی گئی تھی جس میں استاذ ابوزہرہ، استاذ خلاف اور دیگر علماء شریک ہوئے۔ اس کے پہلے اجلاس میں جو مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کی زیر صدارت منعقد ہوا، بیمہ کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ اس مجلس کی پوری روئیداد مجلّہ لواء الاسلام، قاہرہ، مصر میں شائع ہوئی ہے۔

پھر شام کے مشہور فاضل مصطفےٰ الزرقاء نے مجلّہ مضارۃ الاسلام، دمشق کے صفحات پر عقد التابین وموقف الشریعہ کے عنوان سے بحث چھیڑی اور علماء کو دعوت دی کہ وہ اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کریں، چنانچہ الاستاذ ابوزہرہ نے الاستاذ الزرقاء کے جواب میں نہایت مدلل مقالہ سپرد قلم کیا۔

الاستاذ الزرقاء کے مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علمائے مصر و شام اس مسئلہ میں مختلف الخیال ہیں، اگر چہ اکثریت کا یہی خیال ہے کہ بیمہ ناجائز ہے جب تک کہ بیمہ کے موجودہ نظام کو تبدیل نہ کیا جائے، یہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔

Marfat.com

مختلف الخیال حضرات کی آراء اور ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

''کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہر قسم کا بیمہ جائز ہے۔ یہ حضرات بیمہ کے موجودہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی حلت اور جواز کے قائل ہیں۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ امداد باہمی کی ایک شکل ہے۔ تعاون اور امداد باہمی اسلامی حکم ہے جیسے بیع الوفا کو گوارا کر لیا اسی طرح اس کو بھی گوارا کر لیا جائے۔ بیمہ کمپنی ضرورت مندوں کو قرض دیتی ہے اور اس پر جو سود لگاتی ہے یا بیمہ دار کو اصل مع منافع دیا جاتا ہے وہ شرعی ربوا اور سود نہیں ہے۔

دوسرا گروہ جس کی قیادت الاستاذ الزرقاء کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ غیر سودی بیمہ جائز ہے۔ بیمہ میں اگر قباحت ہے تو وہ سود ہے۔ اس کو ختم کرنے کے بعد بیمہ کی ہمہ اقسام جائز ہیں۔ ان حضرات کے دلائل کا تجزیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے:

(ا) عقد موالات پر قیاس کہ اس میں ایک غیر شخص دیت وغیرہ کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں میراث کا حصہ دار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بیمہ بھی ہیں۔

(ب) ودیعت باجر اور مسئلہ ضمان الطریق میں بیمہ کی بعض صورتوں کو داخل کیا جا سکتا ہے۔

(ج) مالکیہ کے نزدیک اگر کوئی شخص کسی سے وعدہ کرے بدون کسی عقد کے تو وہ وعدہ لازم ہو جاتا ہے، اور نقصان کی صورت میں وعدہ کرنے پر معاوضہ نقصان ضروری ہوتا ہے۔

تیسرا گروہ جس کی قیادت الاستاذ ابو زہرہ کے ہاتھ میں ہے، اس کا قائل ہے کہ بیمہ مطلقاً ناجائز ہے۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

1- بیمہ اپنی اصل وضع میں یا تو قمار ہے جب کہ مدت مقررہ کے اختتام سے قبل ہی بیمہ دار کو موت واقع ہو جائے، یا ربوا ہے جب کہ کل اقساط کی ادائیگی کے بعد

بیمہ دار بیمہ شدہ رقم مع منافع حاصل کرے۔ قمار اور ربوا دونوں حرام ہیں۔

2- بیمہ میں صفقتان فی صفقتہ (یعنی ایک معاملہ کے ختم ہونے سے پہلے اس میں دوسرا معاملہ داخل کر دیا جائے) ہے اور اس کی ممانعت نص حدیث سے ثابت ہے، اور اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

3- بیمہ سے نظام میراث درہم برہم ہو جاتا ہے کیونکہ بیمہ دار کے نامزد کردہ شخص کو بیمہ کی رقم ادا کی جاتی ہے جب کہ ہر شرعی وارث مال متروکہ کا حق دار ہے۔

4- یہ عقد صرف ہے (عقد صرف روپے کی بیع روپے یا سونے چاندی کی باہم بیع کو صرف کہتے ہیں۔ اس میں شرط ہے کہ معاملہ کرنے کے بعد مجلس ختم ہونے سے پہلے مال پر قبضہ کر لیں)۔ جس میں مجلس میں قبضہ ضروری ہے اور یہاں یہ شرط مفقود ہے۔

5- عقیدہ تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ پیش آنے والے حوادث اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیئے جائیں، اور یہاں بیمہ کرنے والے اس عقیدے سے فرار کرتے ہیں۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کا فتویٰ:

علامہ ابن عابدین شامی قدس سرہ نے انشورنس کے مسئلہ کو اپنی کتاب ''ردالمختار'' میں مستامن کے باب میں ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان تاجروں کو ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ التزام مالا یلزم کی صورت ہے یعنی جو چیز قانوناً لازم اور ضروری نہیں ہے اس کو اپنے ذمہ لازم کر لینا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ امانت رکھنے والا امانت کی حفاظت پر اجرت قبول کرے اور مال ضائع ہو جائے تو وہ ضامن ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیمہ کے مسئلہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہاں مال بیمہ کمپنی کی تحویل میں نہیں ہوتا بلکہ بحری جہازوں کے پاس یا ان کے مالکوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور اگر یہ صورت ہو کہ بیمہ کمپنی ہی کا جہاز بھی ہو پھر بھی ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا درست نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں بیمہ کمپنی اجیر مشترک ہے جس نے مال کی حفاظت اور مال کے لے جانے دونوں کی اجرت لی ہے، اور ظاہر ہے کہ اجیر مشترک ناگہانی مال کے تلف ہونے کی صورت میں ضامن نہیں ہوتا۔ اگر یہ خدشہ ہو کہ باب

Marfat.com

الکفالت میں یہ مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا: کہ اس راستہ پر سفر کرو، راستہ قابل اطمینان ہے۔ شخص مذکور نے سفر کیا۔ سفر میں مال ضائع ہو گیا تو راستہ کا اطمینان دلانے والا ضامن نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس اگر اس نے ضمانت لی اور کہا کہ تیرا مال چھیننے کی صورت میں میں ضامن ہوں۔ اب اگر راستہ میں مال ضائع ہو گیا تو ضمانت دینے والا شخص نقصان کا معاوضہ دے گا۔ صاحب درمختار نے دونوں مسئلوں میں فرق اس طرح کیا ہے کہ دوسرے مسئلہ میں ضمانت کے الفاظ صراحتاً موجود ہیں پہلے میں نہیں، اور جامع الفصولین میں اس فرق کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جسے دھوکہ دیا جائے وہ دھوکہ باز سے ضمان لینے کا اس وقت حق دار ہے جب کہ دھوکہ عقد معاوضہ میں ہو یا دھوکہ باز نے مال کے محفوظ رہنے کی ذمہ داری قبول کی ہو، مثال کے طور پر ایک شخص کسی چکی والے کے پاس گیہوں پسانے گیا۔ چکی والے نے اس سے کہا کہ اس برتن میں گیہوں ڈال دو اتفاق سے برتن میں سوراخ تھا اور چکی والا اس سوراخ سے واقف بھی تھا۔ پھر بھی اس نے گیہوں برتن میں ڈالنے کے لیے کہا جس کی وجہ سے گیہوں سب ضائع ہو گئے۔ تو چکی کا مالک اس نقصان کا ضامن ہوگا کیونکہ اس نے عقد میں ہی دھوکہ دیا ہے حالانکہ معاملہ کا تقاضا یہ تھا کہ مال کی حفاظت ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں یہ قید ناگزیر ہے کہ دھوکہ دینے والا نقصان سے واقف ہو اور دوسرا اس سے ناواقف ہو۔ ظاہر ہے کہ بیمہ کمپنیوں کا مقصد تاجروں کو دھوکہ دینا نہیں ہوتا اور نہ ان کو جہاز کے ڈوب جانے یا آگ لگ جانے کا علم ہوتا ہے۔ وہاں عام خطرہ تو تاجر اور بیمہ کمپنی دونوں کو ہوتا ہے کیونکہ تاجر بیمہ کراتے ہی اس وقت تک جب ان کو خطرہ ہو اور ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینے کی طمع ہو، لہٰذا بیمہ کے مسئلہ کو اس پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر مسلمان تاجر کا کوئی حربی شریک ہو اور وہ دارالحرب میں بیمہ کمپنی سے معاملہ طے کرے اور مال ہلاک ہونے کی صورت میں معاوضہ کی رقم میں کچھ مسلمان تاجر کا بھی حصہ لگا لے تو یہ رقم مسلمان کے لیے حلال ہوگی کیونکہ عقد فاسد دارالحرب میں رہنے والے دو شخصوں کے درمیان ہوا ہے؛ اور دارالحرب والوں کا مال ان کی رضامندی سے مسلمانوں کو پہنچا ہے، لہٰذا اس کے لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسلمان تاجر

دارالحرب میں ہوتا ہے اور وہاں ان کے سامنے یہ معاملہ طے کرتا ہے اور معاوضہ دارالاسلام میں لیتا ہے۔ کبھی اس کے برعکس بھی صورت ہوتی ہے یعنی معاملہ دارالاسلام میں ہوا اور وصولی دارالحرب میں ہوئی۔ پہلی صورت میں معاوضہ لینا جائز ہے کیونکہ دارالحرب میں طے کیا ہوا معاملہ کالعدم سمجھا جائے گا، اور یہ کہیں گے کہ حربی کا مال اس کی خوشی سے لیا گیا ہے، اس لیے جائز ہے۔ دوسری صورت میں چونکہ عقد دارالاسلام میں قرار پایا ہے اس لیے عقد پر فساد کا حکم لگایا جائے گا اور معاوضہ ناجائز ہوگا۔

انشورنس (بیمہ) کا متبادل نظام:

اسلامی نظام معیشت میں ایک مسئلہ کفالت عامہ کا ہے جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ اس کفالت عامہ کا مقصد محروم اور محتاج اور نادار افراد کی ضروریات اور حاجات کی تکمیل ہے، مثلاً معاشرے کے ہر فرد کے لیے اسلامی نظام معیشت میں خوراک، لباس، مکان، علاج اور تعلیمی سہولتیں، ایک اسلامی اسٹیٹ اپنے عوام کی ان تمام ضروریات کی فراہمی کی ذمہ دار ہے۔ اسلامی ریاست کے فرائض میں معاشی ترقی کا اہتمام کرنا اور تقسیم دولت کے پائے جانے والے تفاوت کو ختم کرنا بھی شامل ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو اچانک پیش آنے والے خطرات سے تحفظ اور مالی نقصانات کو پورا کرنے کا پورا پورا اہتمام کرے۔

حکومت کی طرف سے کفالت عامہ کی ذمہ داری قبول کر لینے کے بعد لوگوں کے لیے انشورنس کرانے کی ضرورت ختم ہو جائے گی جبکہ حکومت اس مقصد کے لیے مختلف طریقوں سے فنڈز حاصل کر سکتی ہے، مثلاً زکوٰۃ اور عشر سے حاصل ہونے والی آمدنی اور دیگر اضافی ٹیکسوں کے ذریعہ جب کہ ملازمین اور مزدوروں کو پراویڈنٹ فنڈ اور پنشن وغیرہ کی اسکیموں کے ذریعے معذوری یا ریٹائرمنٹ کی صورت میں جو مالی تحفظ حاصل ہے اس کو جاری رکھا جائے۔ اگر یہ ان کی کفالت کے لیے کم ہو تو ان کی ضروریات کی فراہمی بھی بیت المال سے کر دی جائے۔

3- ایک اسلامی ریاست کے لیے ضروری ہے کہ وہ سوشل انشورنس کا اہتمام

Marfat.com

کرے، خاص طور پر لائف انشورنس اور جنرل انشورنس کا کام تو ریاست ہی کے ذمہ ہونا چاہیے کیونکہ انشورنس کے کاروبار کو مکمل طور پر نجی ہاتھوں میں دینے سے عوام کے استحصال کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ جن خطرات کے پیش نظر بیمہ کروایا جاتا ہے، ان خطرات کو روکنے کے لیے اقدامات کرنے کی بھی ضرورت ہے، مثلاً آتش زدگی، سڑکوں کے حادثات، صنعتی حادثات، مہلک امراض سے خطرات کا موثر تدابیر اختیار کر کے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ پس ان خطرات کو روکنے کے لیے تدابیر اور خطرات واقع ہونے پر ان کی مالی تلافی ایک ہی ہاتھوں یعنی ریاست کی طرف سے انجام پائے تو منظم انداز سے اس انسانی ضرورت کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

-4 مخصوص صنعتوں، پیشوں اور سرگرمیوں کے دائرہ میں انشورنس کا کام نجی کاروباری اداروں اور انجمن امداد باہمی کی طرف کے اداروں پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ انسانی تمدن کی ترقی اور پیداواری عمل کی وسعتوں کے نتیجہ میں انشورنس کی جو ضرورت نئے دائروں اور حلقوں میں پیدا ہوتی رہتی ہے، اس ضرورت کو نجی ادارے پوری کر سکیں گے۔ نجی اداروں میں باہمی مقابلہ (Competition) کے نتیجہ ان کی کارکردگی بہتر ہوگی، اور اگر یہ ادارے عوام کا استحصال کر رہے ہوں تو ان کو قومی تحویل میں بھی لیا جا سکتا ہے۔

-5 نجی انشورنس کمپنیوں کو اس بات کا پابند بنایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ریزرو (Reserves) کا ایک حصہ ریاستی اسناد قرض کی صورت میں رکھیں، اور اپنے قابل استعمال سرمایہ کا ایک حصہ ''ریاستی حصص شرکت'' خریدنے پر صرف کریں۔

-6 نجی انشورنس کمپنیوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ اپنے کام میں ایسے طریقوں سے کلی طور پر اجتناب کریں جن کا لازمی نتیجہ ربا، قمار (جوا) غرر (دھوکا) یا ضرر رسانی کی صورت میں نکلے کیونکہ ''لاضرر ولا ضرار'' بھی اسلام کا ایک زریں اصول ہے۔ پس نجی ادارے اپنے پاس جمع شدہ رقوم کو غیر سودی بنیادوں پر کاروبار میں لگا کر نفع کما سکتی ہیں۔

Marfat.com

مختصر یہ کہ اسلام سود کو کسی صورت گوارا نہیں کرتا خواہ وہ بنکوں کی صورت میں ہو یا انشورنس، ہنڈی یا پھر کواپریٹو سوسائیٹیوں کی صورت میں ہو۔ کیونکہ سود کسی معاشرے کی تباہی کا اولین اور آخری زینہ ہے۔ جس سماج میں اس کا چلن کسی صورت ہو گیا ہے وہ اس سوسائٹی میں غیر مساوی تقسیم دولت کا باعث بن کر اور غریبوں کو غریب تر اور امیروں کو امیر تر بنا کر پوری سوسائٹی میں اشتراکیت کے جراثیم پیدا کر دے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ عنقریب غریب امیروں سے انتقام لینے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے، اور باہمی چپقلش کی وجہ سے ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گا۔

ہنڈی سسٹم بھی سود کا ایک ذریعہ ہے۔ قدیم زمانہ میں بھی ہنڈی سسٹم سے کام لیا جاتا تھا۔ کوئی ''درشنی ہنڈی'' کہلاتی تھی اور کوئی غیر درشنی ہوتی تھی لیکن ان سب میں سود کا عمل دخل ضرور تھا جس کو مہاجنوں اور ساہوکاروں کی اصطلاح میں ''سود بٹہ'' کہتے تھے۔ اگرچہ پاکستان میں بے شمار بنک ہیں لیکن ہنڈی کے ذریعہ لین دین اب بھی ہے۔ اور یہ تجارتی لین دین میں بڑی دخیل ہیں۔

پاکستان میں امداد باہمی کے اصول کے تحت کواپریٹو سوسائٹیز کا چلن بھی ہے یہ اگرچہ یہ غریب کاشتکاروں، مزدوروں، متوسط طبقوں کو سستے داموں قرض دینے کے اصول پر بنائی گئی ہیں لیکن ان میں بھی سود کی نجاست موجود ہے، چنانچہ یہ باہمی امداد کی سوسائٹیاں بھی غریبوں کی امداد کے بجائے ان کے لیے ہندو مہاجنوں کی طرح وبال جان بنی ہوئی ہیں۔ حکومت کو اس سلسلہ میں غیر سودی بنیادوں پر غریب لوگوں کے لیے اس قسم کی سوسائٹیاں بنانی چاہئیں۔ اسلام امداد باہمی کی سوسائٹیاں بنانے کا نہ صرف حامی ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ معاشرہ میں غریبوں کی مددگیری ہو۔ لیکن ان میں موجودہ کواپریٹو سوسائٹیوں کی طرح سود کی نجاست اور گندگی نہ ہو۔ سود کی شرح خواہ کم ہی کیوں نہ ہو اسلام اس کو کسی صورت برداشت نہیں کرتا۔ البتہ سوسائٹی کے اصل سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اس کے عملہ اور اس کی بلڈنگوں کے اخراجات حاصل کرنے کے لیے منافع کے ایسے جائز طریقے اختیار کیے جائیں جن سے امداد باہمی کے ساتھ ساتھ اصل سرمایہ کا تحفظ اور مجلس کے انتظامی کارکنوں کے مصارف اور اخراجات کا سامان مہیا ہوتا رہے تاکہ یہ سوسائٹیاں

قائم رہیں۔اور غریبوں، ہاریوں، کسانوں اور متوسط طبقہ کے لوگوں کو جو قرضہ کی رقوم دی جائیں وہ سود کے لالچ میں نہ دی جائیں بلکہ حسن سلوک اور انفاق فی سبیل اللہ کے جذبہ کے تحت دی جائیں۔لہٰذا معاشی بزرجمہروں اور ماہرین کو جمع کر کے اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ وضع کیا جائے جس سے سوسائٹیوں کا نظام بھی احسن طریق سے چلتا رہے اور "تعاونوا علی البر والتقویٰ" کا جذبہ ان کے چلانے میں کارفرما ہو۔اس ترغیب کے ساتھ ساتھ اسلام نے امداد باہمی کے بعض طریقے بھی بیان کیے ہیں جیسے مضاربت، شراکت، شرکت الصنائع، مزارعت اور مساقات وغیرہ جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔

........❖❖❖........

اسلام اور تقسیم دولت

قومی آمدنی مختلف عاملین پیدائش کی مشترکہ اور باہمی مساعی اور جدوجہد سے وجود میں آتی ہے اور پھر ان عوامل کے درمیان مختلف معاوضوں کی شکل میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے پیدائش دولت کا عمل معاشی فروغ اور ترقی اور معیشت کے پائیدار استحکام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر عامل کو ٹھیک طریقہ سے اپنی معاشی جدوجہد اور اقتصادی مساعی کا صلہ مل جائے تاکہ وہ نہایت خوش دلی کے ساتھ اپنے معاشی عمل کو رواں رکھ سکے۔

اسلامی نظام معیشت کی یہ بھی خواہش ہے کہ دولت کی تقسیم نہایت احسن طریق سے ہو اور اگر غور سے سوچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں پوری معیشت کی بنیاد ہی تقسیم دولت کے شعبہ کو مستحکم اور عادلانہ بنانے پر رکھی گئی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ دولت کی تقسیم کا نظام عدل اور احسان کی بنیاد پر قائم ہو اور معاشرے کے ہر فرد کو فضائل معیشت باوقار طریقہ سے میسر آئیں۔ یہ بات اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے بلکہ پورے معاشرہ میں گردش کرے اور دولت کا ارتکاز و احتکار نہ ہو۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں سب سے بڑی غلط بات یہ ہوتی ہے کہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز ہوتا ہے جس کی وجہ سے غریب اور متوسط طبقوں کی دولت ان کے ہاتھوں سے نکل نکل کر سرمایہ دار طبقہ کے پاس جمع ہوتی جاتی ہے اور تنخواہ دار اور معینہ آمدنی والے افراد وغیرہ غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں، جس کے بہت سے معاشی، سماجی اور اخلاقی نقصانات ہیں۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان جائز ذرائع سے حاصل کردہ مال کو اپنی ذاتی ضروریات خریدنے پر صرف کرے، یا کسی جائز کاروبار

Marfat.com

میں لگائے یا پھر دوسروں کو دیدے تاکہ وہ اس سے اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کر سکیں۔ کیونکہ قرآن حکیم کی مختلف آیات سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ:

1- دولت کو مسلسل گردش میں رہنا چاہیے اور اس کی گردش میں کوئی رکاوٹ اور موانع نہیں ہونا چاہیے۔

2- یہ دولت کسی ایک طبقہ میں گردش نہ کرے بلکہ معاشرہ کے تمام طبقات میں گردش کرنی چاہیے جیسے خون پورے جسم میں گردش کرتا ہے۔ اور اگر کسی عضو میں دوران خون رک جائے تو وہ عضو سوکھ جاتا ہے۔ ایسے ہی دولت کی گردش اگر کسی طبقہ میں رک جائے تو وہ طبقہ غریب تر ہو جاتا ہے۔

3- دولت سے استفادہ اور اس کی گردش میں اخلاقی ضوابط کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اسلام نے اس بات کا انتظام یہ کیا ہے کہ مختلف معاشرتی، قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ اور عادلانہ ہو اور دولت پورے معاشرہ میں گردش کرتی رہے اور ہر فرد کی جیب تک پیسہ پہنچے اور دولت کا ایک جگہ ارتکاز نہ ہو۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہ نے نہایت شدت کے انداز میں فرمایا:

"اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو (وہ عذاب) اس روز (واقع ہوگا) جب کہ اس (سونے اور چاندی) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اس وقت ان سے کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے (دنیا میں) اپنے لیے جمع کیا تھا۔ تو جو کچھ تم جمع کرتے رہے (آج) اس کا مزہ چکھو۔

(التوبہ:۳۴-۳۵)

ایک اور مقام پر فرمایا:

"جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے مال دیا ہے اور وہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں۔ وہ اس (بخل) کو

اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے۔ وہ
جس مال کا بخل کرتے ہیں یقیناً وہ قیامت کے روز ان کے گلے
میں عذاب کا طوق بنا کر پہنا دیا جائے گا۔ (آل عمران:۱۸۰)

اسلام نے جہاں بھی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تاکید کی ہے وہاں قرآن نے اس کے لیے ''انفاق'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اور انفاق کے معنی خرچ کرنا ہے، نفس کو بخل، تنگ دلی اور دنیا پرستی جیسے مذموم جذبات کی آلودگیوں سے پاک رکھنے اور روحانی قدروں سے آراستہ کرنے کا ایک موثر ترین ذریعہ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنا دل پسند مال خوشی خوشی اللہ کے راستہ میں لٹائے۔ یہ صرف زکوٰۃ کی مقررہ مقدار ہی ادا کرنا نہیں ہے بلکہ جب بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے یا حوصلہ دکھانے کا موقع میسر آئے تو اسے اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام سمجھ کر دل کھول کر انفاق کرنا ہے۔ تمام برائیوں کی اصل جڑ دنیا پرستی ہے (حب الدنیا رأس کل خطیئة) اور دنیا کی طرف کھینچنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ پرکشش اور طاقتور چیز مال و دولت ہے۔ اسی لیے سرکار دو عالم ﷺ نے مال کو امت کے لیے فتنہ قرار دیا ہے اور امت کو اس خطرے سے ہوشیار رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں بخل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور بخل کے شرعی معنی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر واجب ہو اس کو خرچ نہ کرے۔ اس لیے بخل حرام ہے اور اس پر جہنم کی شدید وعید آئی ہے۔ اور جن مواقع میں خرچ کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے وہ اس بخل حرام میں داخل نہیں، البتہ معنی عام کے اعتبار سے اس کو بھی بخل کہہ دیا جاتا ہے۔ اس قسم کا بخل حرام نہیں لیکن خلاف اولیٰ ہے۔

بخل ہی کے معنی میں ایک دوسرا لفظ بھی احادیث میں آیا ہے یعنی ''شُحّ'' اس کی تعریف یہ ہے کہ اپنے ذمہ جو خرچ کرنا واجب تھا وہ ادا نہ کرے اس پر مزید یہ کہ مال بڑھانے کی حرص میں مبتلا رہے۔ تو وہ بخل سے بھی زیادہ شدید جرم ہے۔ اسی لیے سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿لا یجتمع شحّ وایمان فی قلب رجل مسلم ابداً﴾

(رواہ النسائی عن ابی ہریرۃ)

Marfat.com

"یعنی شح اور ایمان کسی مسلمان کے قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔"

متذکرہ بالا آیات میں اسلوب کی انتہائی شدت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ قتل و زنا کے معاملات میں بھی اسلوب کی یہ شدت نظر نہیں آتی۔ قرآن حکیم نے اس بات پر زور اس لیے دیا ہے تاکہ یہ مال مالداروں کے حلقے ہی میں کہیں سمٹ سمٹا کر نہ رہ جائے اور امیر سرمایہ دارانہ نظام کی طرح امیر تر نہ ہوتے جائیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿کی لایکون دولۃً بین الاغنیاء منکم﴾ (حشر:۷)

تاکہ یہ مال تمہارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ (اور غریب اس سے سیراب اور بہرہ ور نہ ہو سکیں)

1۔ زمین کا لگان:

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کے نظام معیشت میں انسان کو ذاتی ملکیت کا حق دیا گیا ہے، لیکن اس حق کو آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کو بعض شرائط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ ذاتی ملکیت کے استعمال کے سلسلہ میں اسلام نے مندرجہ ذیل حقوق کو تسلیم کیا ہے:

1- اشیاء کے استعمال اور تصرف کا حق
2- مزید نفع کمانے کے لیے مال کو کاروبار میں لگانے کا حق
3- انتقال ملکیت کا حق
4- تحفظ مال کا حق
5- مال جمع کرنے کا حق

ملکیت کے نفع آور استعمال کی ایک جائز شکل اشیاء کو کرایہ پر دینا ہے۔ اجارہ اور کرایہ صرف ان اشیاء کا جائز ہے جو صرف (Consume) نہ کی جائیں بلکہ استعمال (Use) کی جائیں۔ اور ایسا صرف پائیدار اشیاء (Durable Goods) کے معاملہ میں ہوتا ہے جیسے زمین، مکان اور مشین وغیرہ جب کہ ضیاع پذیر اشیا (Perishable Goods) کو کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا۔

کرایہ کیا ہے؟ اسلامی نظام معیشت میں کرایہ کسی چیز کے استعمال کے فائدوں

Marfat.com

ں قیمت کو کہتے ہیں۔ زرعی زمینوں کے کرایہ کو عرف میں لگان کہتے ہیں۔ زرعی زمین کا
ندہ استعمال یہ ہے کہ اس کو پیداوار حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس لیے بنجر اور
رزمین جو زراعت کے قابل نہیں ہوتی اس کو کرایہ پر دینا جائز نہیں۔ اگر زمین زراعت
ے قابل ہے لیکن کسی خارجی سبب کی وجہ سے جس میں کرایہ دار کے ارادہ اور اختیار کو کوئی
ں نہ ہو، اس سے پیداوار حاصل کرنا ناممکن ہو جائے تو کرایہ دار پر اس کا کرایہ دینا
جب نہ ہوگا۔ (بدایۃ المجتہد: ۲/۲۳۱ بحوالہ اسلامی نظریہ ملکیت، نجات اللہ صدیقی: ۱/۱۸۲)

اس لحاظ سے علم معاشیات میں زمین کے لگان سے مراد معاوضہ کی وہ رقم ہے
کسی عامل پیدائش کو اس کی قیمت رسد سے زائد وصول ہو۔ قیمت رسد سے مراد وہ کم از
کم معاوضہ ہے جو کسی عامل پیدائش کو پیدائش کے میدان میں رکھنے کے لیے لازماً ادا کرنا
تا ہے۔ اس لحاظ سے تمام عاملین پیدائش کی وصولیوں میں لگان کا عنصر شامل ہو
سکتا ہے۔

مشہور ماہر معاشیات جس کا تعلق کلاسیکی مکتبۂ فکر سے تھا، اس نے زمین کے
لگان کی تعریف یہ کی ہے:

> ''لگان زمین کی وہ فاضل پیداوار ہے جو مالک زمین کو زمین کی ازلی اور پائیدار صفات کی بنا پر دی جاتی ہے۔ چونکہ مختلف قطعات زمین میں زرخیزی اور محل وقوع کے لحاظ سے فرق پایا جاتا ہے، اس لیے وہ مساوی لاگت سے مختلف پیداوار دیتے ہیں۔ یہ فاضل پیداوار جو ایک بڑھیا اور عمدہ زمین کو گھٹیا زمین کے مقابلہ میں حاصل ہوتی ہے، لگان کہلاتی ہے۔''

اسلام نے لگان کے نظریہ کو کچھ اس انداز میں تشکیل دیا ہے کہ دولت کا رخ
امیروں کے بجائے غریبوں کی طرف ہو جائے۔ اور لگان ارتکاز دولت کا سبب بننے کے
بجائے گردش دولت کا سبب بن جائے۔

اسلام کے نظام معیشت میں لگان کا نظریہ تین اصول پر مبنی ہے:

(1) عدل (2) احسان اور (3) نفئ ظلم (لاضرر ولاضرار)

Marfat.com

لہٰذا زمین کے لگان کا تعین کرتے وقت ان تینوں اصول کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ عدل کا تقاضا ہے کہ کاشتکار پر زمین کا لگان اس کی استطاعت کے مطابق لگایا جائے تا کہ وہ مطمئن ہو کر کام کر سکے۔ احسان کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے لگان اس صورت میں لیا جائے جب زمین کی پیداوار ان کی ضروریات سے بڑھ کر ہو۔ ایسا کرنے سے دونوں فریق ایک دوسرے کے خیر خواہ ہو جائیں گے۔

تیسرا اصول لگان کے تعین میں یہ ہے کہ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ ہی تمہارے ساتھ کوئی ظلم کرے۔ اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ زمین کا لگان نہ تو اتنا زیادہ ہو کہ کاشت کار اس کو ادا نہ کر سکے یا ادائیگی کے بعد اس کے پاس کچھ باقی نہ بچے۔ اور نہ ہی اتنا کم کہ مالک زمین کو کچھ نہ ملے بلکہ دونوں کے حقوق کا تحفظ پیش نظر ہو۔ ایک اسلامی ریاست کاشت کار اور مالک زمین دونوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے لگان کا تعین کرتے وقت ان چیزوں کو اپنے پیش نظر رکھے۔

1- زمین کی پیداواریت (Productivity of Land)

2- کاشت کار کی فلاح (Welfare of Cultivation)

3- مصارف کاشت (Cost of Cultivation)

بعض حضرات نے کہا کہ لگان کے تعین کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن میں رکھا جائے۔

(1) زمینوں کا فرق (2) فصلوں کا فرق (3) آبپاشی کا فرق

رسول اللہ ﷺ کی اس بارہ میں یہی تعلیم ہے۔ اور سیدنا عمرؓ تو اپنے عہد خلافت میں اپنے عمال کو لگان کے تعین میں ایمان داری کا حکم دیتے تھے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے بھی اپنی کتاب الخراج میں لکھا ہے:

''ہم کاشت کاروں پر ان کی ادائیگی کی صلاحیت سے زیادہ لگان عائد نہ کریں۔ جتنا زمین برداشت کر سکتی ہے اس سے زیادہ بوجھ ان پر نہ ڈالیں۔

لگان کے تعین میں موجودہ دور میں ان چیزوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

1- سب سے پہلی شی زمین کی نوعیت ہے کہ زمین کس قسم کی ہے۔ زرخیز ہے یا

بہت زیادہ زرخیز۔ اگر کم زرخیز ہے تو کم لگان وصول کیا جائے گا اور اگر بنجر ہے تو اس وقت تک لگان وصول نہیں کیا جائے گا جب تک وہ زرخیز نہ ہو جائے۔ اگر زمین زیادہ زرخیز ہے تو اس پر لگان وصول کیا جائے گا اور اگر زمین کی پیداوار صرف اپنے اخراجات ہی پورے کرتی ہے تو لگان وصول نہیں کیا جائے گا۔

2- دوسری اہم شی اس سلسلہ میں یہ ہے کہ فصل کی نوعیت زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ فصل اچھی ہو تو آمدنی زیادہ ہوگی اور اگر فصل ناقص ہو تو آمدنی کم ہوگی۔ لہٰذا فصل کی نوعیت کے مطابق لگان عائد کرنا چاہیے۔ اچھی فصل پر زیادہ لگان اور ناقص پر کم۔

3- تیسری اہم شی لگان کا تعین کرتے وقت یہ ہے کہ آبپاشی کی نوعیت کو پیش نظر رکھا جائے۔ قدرتی طور پر سیراب ہونے والی زمینوں کی پیداوار پر شرح زیادہ ہو گی جب کہ مصنوعی طریقہ پر سیراب ہونے والی زمینوں پر شرح لگان کم ہوگی۔

4- عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ لگان متعین کرتے وقت کاشت کار کی محنت کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور عمل پیدائش میں کاشت کار کی محنت کا الاؤنس اس کو دیا جائے۔ جن زمینوں پر محنت کم اور آبپاشی کا طریقہ آسان ہو ان سے زیادہ لگان وصول کیا جا سکتا ہے اور جن پر کاشت کار کو زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے اور ان کی سیرابی نہایت مشکل ہے، ان سے کم لگان وصول کیا جائے۔

اسلام نے عرب، ایران اور روم میں لگان کے ظالمانہ طریقوں کو ختم کیا اور آج بھی اگر اسلامی نظام معیشت قائم ہو تو یہ سب ظالمانہ طریقے ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے دولت غریب کسانوں سے نکل نکل کر امراء کے خزانوں میں زیادتی اور اضافہ کا باعث بن رہی ہے۔ اسلام کی خواہش ہے کہ غریب کسان جو اپنے خون پسینہ کو بہا کر زمین سے پیداوار حاصل کرتا ہے، وہ اس کی فصل سے بخوبی فائدہ اٹھا سکے نہ کہ جاگیرداری نظام کی طرح زمینوں کے مالک تو اپنی زمینوں سے دور رہ کر داد عیش دیتے رہیں اور ان کی زمینوں پر محنت کرنے والے غریب کسان اور ہاری دو وقت کی روٹی کو بھی ترستے رہیں۔

Marfat.com

2- منافع (Profit)

انفرادی ملکیت کے جو حقوق اسلام نے انسان کو عطا فرمائے ہیں، ان میں بعض شرائط بھی رکھ دی گئیں۔ ان میں ایک حق یہ ہے کہ ایک فرد نفع کے لیے کاروبار کر سکتا ہے، کاروبار میں دوسرے شخص کے ساتھ شراکت کر سکتا ہے، مضاربت کر سکتا ہے اور اس طرح وہ منافع کمانے کے لیے ہر جائز کام کر سکتا ہے۔ قرآن وسنت میں منافع کو اللہ کا فضل قرار دیا گیا ہے اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی سعی و کوشش کرنا شریعت میں مستحسن سمجھا گیا ہے۔

اسلام کاروبار میں بلکہ ہر کام میں اخلاقی اصولوں کے منافی طریق کار اختیار کرنے سے روکتا ہے بلکہ بعض دفعہ ان جائز افعال سے بھی روکتا ہے جن کے نتیجہ میں پورے معاشرے پر نقصان دہ اثرات مرتب ہوتے ہوں۔ چنانچہ اس بارہ میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے لکھا ہے کہ

1- کاروبار میں جن منافی اخلاق حرکتوں کے ذریعہ نفع کا حصول چاہا جاتا ہے ان میں دھوکا، فریب اور غلط بیانی بہت نمایاں چیزیں ہیں۔ کاروباری دنیا میں غلط اور مبالغہ آمیز اشتہار بازی، عیب دار مال کو اچھا بنا کر پیش کرنا، گھٹیا مال کو بظاہر بلند معیار بنا کر سامنے لانا یا قیمت خرید کے بارہ میں غلطی بیانی سے کام لے کر خریدار کو زیادہ قیمت دینے پر آمادہ کرنے کی شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ اسلام نے ان تمام حرکتوں کو ممنوع اور قانوناً قابل گرفت قرار دیا ہے۔

2- ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ناپ تول کے پیمانے بالکل درست اور معیار کے مطابق ہوں۔ اس سلسلہ میں ہر کوتاہی کو قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے۔

3- اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کرنے اور اس طریقہ سے خریداروں کو دھوکہ دینے کو قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا۔

4- مال کی ذخیرہ اندوزی (احتکار) کرنا تاکہ مارکیٹ میں نایاب یا کمیاب ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت بڑھے، اسلام میں اس شخص کو ملعون تک کہا گیا ہے۔ ایک

Marfat.com

روایت میں ہے کہ جو شخص مارکیٹ میں نرخ گراں کرنے کی خاطر ذخیرہ اندوزی کرے وہ غلط کار ہے اور اللہ اس سے بری الذمہ ہے۔ (رواہ الحاکم فی المستدرک)

5- تجارت میں خرید و فروخت کرنے والے افراد کی باہمی رضامندی ضروری ہے جبر و اکراہ کے ساتھ خرید و فروخت کا معاملہ اسلام میں ممنوع ہے۔

6- عیب دار مال کی فروخت کے معاملہ میں خریدار کو مال کے عیب کے بارہ میں آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ خریدار نہایت سوچ سمجھ کر خریداری کر سکے۔ اور بعد میں کسی تنازعہ کی صورت پیش نہ آئے۔

7- خریدار یا فروخت کنندہ کی اضطراری کیفیت اور شدت طلب سے بے جا فائدہ اٹھا کر زیادہ یا کم دام پر اشیاء کی خرید و فروخت کرنا غلط ہے۔ ایسا معاہدہ فاسد ہے۔

8- کاروبار میں اجارہ داری سے غلط فائدہ اٹھانا ناجائز ہے۔ یہ اجارہ داری (Monopoly) قدرتی عوامل کی بناء پر ہو یا مصنوعی عوامل کی بناء پر۔ ہر دو صورت میں اشیاء کو اجارہ دارانہ قوت کی بنا پر، مہنگا فروخت کرنا اور زائد نفع کمانا یا اشیاء کی مقدار رسد کو مقدار طلب سے جان بوجھ کر کم رکھنا بالکل ناجائز اور ممنوع ہے۔

9- ایک یا چند افراد کے فائدے کی خاطر پورے معاشرہ کو نقصان پہنچانا اسلام کی نگاہ میں کسی لحاظ سے پسندیدہ اور قابل تحسین نہیں ہے جیسے اگر کسی صنعت کے شہری آبادی کے قریب لگانے سے فضائی یا زمینی آلودگی میں اضافہ ہو یا کسی صنعت میں تالہ بندی کر کے سینکڑوں اور ہزاروں مزدوروں کو بے روزگار کرنے کا منصوبہ ہو، تو ایک اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے غلط اقدامات کو روکنے اور اس کا سد باب کرنے کا اہتمام کرے۔

10- اسی طرح تاجر حضرات کا دیہاتی لوگوں سے راستہ میں ہی مارکیٹ کی قیمت سے کم قیمت پر مال خریدنا بھی حدیث نبوی کی رو سے ممنوع ہے۔

ان شرائط کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام منصفانہ اور مناسب

منافع کمانے کی پوری پوری اجازت دیتا ہے، لیکن بے جا منافع اور ظلم و استحصال کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلام یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ معاشرے کے افراد کو نقصان پہنچے، لہٰذا اس کی نگاہ میں ذخیرہ اندوزی (احتکار)، بلیک مارکٹنگ، مبالغہ آمیز اشتہار بازی (False Advertisement) دھوکا اور فریب کے کاروبار قابل تعزیر جرم ہیں۔ زیادہ منافع کے حصول کی خاطر اگر تاجر اور کاروباری افراد قیمت میں اضافہ کرتے رہیں تو اس صورت میں ایک اسلامی ریاست قیمتیں مقرر بھی کر سکتی ہے۔ اگرچہ اسلام میں پرائس کنٹرولنگ کی اجازت نہیں لیکن اگر غلہ کے مالکان اجارہ دار بن کر قیمتوں میں ناجائز اضافہ کرنے لگیں تو لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اہل الرائے اور اہل بصیرت لوگوں کے مشورہ سے ریاست قیمتیں مقرر کر سکتی ہے۔

اسلام نے منافع کے تعین کے لیے کوئی لگا بندھا ضابطہ تو مقرر نہیں کیا تاہم حصول منافع کی مساعی کو عدل اور احسان کی روح کے مطابق انجام دینے کی ایک معقول معیار کے مطابق شرح منافع لی جانی چاہیے۔ ان حدود و قیود کی موجودگی آجروں کی طلب اور رسد (Demand and Supply) کے عمل اور ردعمل سے منافع کی ایک معقول اور مناسب شرح کاروبار اور بازار میں عملاً قائم ہو جائے گی۔

3-اجارہ:

اجارہ اس کو عام زبان میں اجرت بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ صلہ ہے جو ایک انسان اپنی دماغی کاوش یا جسمانی محنت کے عوض حاصل کرتا ہے۔ یہ صلہ مال کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور اشیاء کی صورت میں بھی، لیکن اکثر و بیشتر مال کی صورت میں ہوتا ہے۔

اجرت کی دو قسمیں ہیں:

(1) زری اجرت

(2) حقیقی اجرت

1- زری اجرت سے مراد وہ معاوضہ اور صلہ ہے جو کسی مزدور، اجیر اور محنت کار کو زر

Marfat.com

یعنی روپے اور مال کی شکل میں ملتا ہے۔

2- حقیقی اجرت سے مراد وہ تمام اشیاء وخدمات ہیں جو ایک مزدور یا محنت کار اپنی محنت کے صلہ میں حاصل کرتا ہے۔اس میں تنخواہ کے علاوہ حاصل ہونے والی دیگر سہولتیں اور رعائتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

اجرتوں کے تعین کا مسئلہ:

اجرتوں کا تعین کس طرح کیا جائے اور کتنا کیا جائے؟ یہ مسئلہ نہایت مشکل اور پیچیدہ ہے۔جدید ماہرین معاشیات کے اس بارہ میں مختلف نظریات ہیں۔الفریڈ مارشل کا کہنا ہے کہ کسی محنت کار کی اجرت کسی فرم اور فیکٹری میں لگائے ہوئے آخری مزدور کی مختتم پیداواری مالیت سے متعین ہوگی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مکمل مقابلہ کے تحت کام کرنے والی ایک فرم اگر دیگر عاملین پیدائش (زمین اور سرمایہ) کو معین فرض کر کے مزدوروں کی تعداد میں اضافہ کرتی جائے تو ایک ایسا نقطہ آجاتا ہے جس کے بعد ہر زائد مزدور کی مختتم پیداوار قانون تقلیل حاصل کی وجہ سے گرتی چلی جاتی ہے، اور جب یہ رائج شرح اجرت کے برابر ہو جائے تو مزید مزدور اور محنت کش نہیں لگائے جاتے اور تمام مزدوروں کو مختتم پیدوار کی مالیت کے برابر اجرت دی جاتی ہے۔اس طرح کسی فرم میں مختتم پیداوار ہی مزدوروں کی اجرت کا تعین کرتی ہے۔

اس بارہ میں دوسرا نظریہ فرانس کے مشہور ماہر معاشیات کوئزنے (Quesnay) نے پیش کیا۔اس کا کہنا ہے کہ مزدوروں کی اجرت کا تعین اس رقم کے برابر ہونا چاہیے جس سے وہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے لیے ضروریات زندگی خرید کر گزر اوقات کر سکے۔اجرتیں نہ اس معیار سے زیادہ ہوتی ہیں اور نہ کم۔

ان نظریات کے علاوہ ایک اور نظریہ ہے جس کو نظریہ اجرت فنڈ اور نظریہ حق بقیہ (Residual Claimant Theory) بھی کہتے ہیں۔اس میں پہلے نظریہ کو آدم اسمتھ (Adam Smith) اور دوسرے نظریہ کو فرانسس واکر (Francis Walker) نے پیش کیا۔

اسلامی نظریۂ اجرت:

ان سب جدید نظریات کے مقابلہ میں جن کو موجودہ زمانہ کے ماہرین معاشیات نے بڑے کروفر کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا اور ان کے ملکوں نے ان کے ان نظریات کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی، اسلام نے جو اجرتوں کے تعین کا نظریہ پیش کیا وہ نہایت اہم اور ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اسلام ارتکاز دولت کے خاتمہ اور گردش دولت (Circulation of Wealth) کے اضافہ کے لیے اجرتوں کے تعین کے مسئلہ کو بہت اہمیت دیتا ہے، اور اس ضمن میں محنت کاروں اور مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کا بھی پورا پورا حکم دیتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ مزدوروں اور محنت کاروں کو مناسب اجرت دی جائے، بروقت دی اور معاہدہ کی شرائط کے مطابق دی جائے۔ وہ کسی صورت بھی آجروں کو اجیروں اور کارخانہ داروں کو مزدوروں کے حقوق کو غصب کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اجرتوں کے تقرر کے بارہ میں قرآن حکیم نے ایک اصول مقرر کیا بلکہ یہ اصول زندگی کے ہر شعبہ میں لاگو ہوتا ہے، اور وہ اصول ہے لاتظلمون ولا تظلمون (بقرہ: ۲۷۹) یعنی نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ اس اصول کے مطابق ضروری ہے کہ نہ تو آجر مزدور کو وہ اجرت دے کر اس کا حق پورا ادا نہ ہو، نہ یہ ہو کہ آجر کو اتنی اجرت دینے پر مجبور کر دیا جائے کہ اس کا کاروبار اس کا متحمل نہ ہو سکے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

﴿وخلق الله السماوات والارض بالحق، ولتجزیٰ کل نفس بما کسبت، وھم لایظلمون﴾ (الجاثیہ:۲۲)

''اور اللہ نے آسمان اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے، اور مقصود یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے (چنانچہ قیامت میں ایسا ہی ہوگا) اور لوگوں پر (کسی طرح کا) ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اس آیت میں منصفانہ اجرت کا اصول پیش کیا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کو اس کی محنت اور پیداوار میں اس کے حصہ کی نسبت سے کم اجرت نہ دی جائے۔ اگر ایسا کیا جاتا

Marfat.com

ہے تو یہ غلط اور ظلم ہے۔ پس اجرتوں کے تعین کے سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہے گی کہ ہر شخص کو اس کی محنت اور پیداوار میں اس کے حصہ کے مطابق اجرت ضروری دی جائے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحقاف میں بیان کی۔ (احقاف:۱۹) احادیث میں بھی یہ بات بیان کی گئی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مناسب اجرت مزدور کے لیے ایک رعایت نہیں بلکہ اس کا بنیادی حق ہے جو حکومت کی طاقت سے اس کو حاصل ہونا چاہیے۔

بعض حضرات نے قرآن حکیم کی اس آیت "ومامن دابة فی الارض الا علی اللہ رزقها" یعنی زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں کہ اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔ (۶:۱۱) کی روشنی میں یہ لکھا ہے کہ ایک اسلامی ریاست براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس بات کی مکلف ہے کہ وہ اپنے تمام لوگوں کو کم از کم ضروریات زندگی (Sustenance) فراہم کرے۔ کم از کم منصفانہ معیار اجرت کے علاوہ اسلامی تعلیمات میں مزدوروں کی مثالی اجرت کا تصور بھی ملتا ہے۔ اس کے مطابق مزدوروں کو وہ اجرت ملنی چاہیے جو ان کے معیار زندگی کو آجروں کے معیار کے برابر یا قریب کر دے۔ اس کی مثال حدیث میں ملتی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> "تمہارے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس جس کا بھائی اس کے ماتحت ہو اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور اسے وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے، اور یہ اسے اس کام کی تکلیف نہ دے جو اس سے نہ ہو سکے۔ اگر اس کام کی اس کو تکلیف دے جو اس سے نہیں ہو سکتا تو خود اس کی مدد کرے۔" (مشکوٰۃ)

اس حدیث میں مندرجہ ذیل امور ثابت ہوئے:

1- آجر اور اجیر ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا ان کو آپس میں بھائیوں جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ آجر مزدور کا استحصال نہ کرے اور مزدور پوری دل جمعی کے ساتھ کام کر کے آجر کو فائدہ پہنچائے۔

Marfat.com

2- آجر کی طرف سے مزدور کو اتنا معاوضہ ضرور دیا جائے جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہوسکیں۔

3- مزدوروں سے ان کی استطاعت کے مطابق کام لیا جائے۔ اس اعتبار سے مزدوروں کے اوقات کار اور حالات کار ہر حال میں معقول اور مناسب ہونے چاہئیں۔

4- مزدوروں کو وہ اجرت دی جائے گی جو ان کے معیار زندگی کو بلند کر کے آجروں کے معیار کے قریب کر دے تا کہ بے جا معاشرتی عدم مساوات اور تفاوت دور ہو سکے۔

پس آجر اور اجیر، صنعت کار اور مزدور دونوں اسلامی اقدار کی روشنی میں اپنا رویہ تشکیل دیں تو دونوں کے درمیان مثالی تعلقات وجود میں آئیں گے جس کی وجہ سے ملک کی انڈسٹری دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے گی۔ مزدوروں کو اپنے حقوق کی خاطر ہڑتال نہیں کرنا پڑے گی اور آجروں کو اپنی فیکٹریوں کی تالہ بندی نہیں کرنا پڑے گی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کریں گے۔ یہی اسلام کی خواہش ہے، لیکن ہم اسلام کی قوانین اور اس کی تعلیمات کو اپنانے کے بجائے ILO یعنی انٹرنیشل لیبر آرگنائزیشن کے قوانین کو اپنائیں گے، کیونکہ ہماری نہاد ذہنی ہی ایسی ہو چکی ہے۔

محنت کی عظمت:

اسلام دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے جس نے دنیا میں محنت کی عظمت (Dignity of Labour) کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ اس کا اعتراف بھی کیا۔ اسلام سے قبل قدیم ترین یونانی اور رومی معاشروں سے لے کر آج کے جدید سرمایہ دارانہ نظام تک محنت کش اور مزدور کو بڑا ہی رسوا کن اور فروتر مقام حاصل رہا ہے۔ اشتراکی نظام اگرچہ محنت کشوں کی اٹھان کے نام پر وجود میں آیا، لیکن عملاً اس نے بھی انہیں معاشی مشینری کا ایک بے جان پرزہ بنا کر رکھ دیا اور صرف دو وقت کی روٹی دے کر اسے آزادی ضمیر اور شرف انسانیت سے محروم کر دیا۔ اشتراکیت کوئی مستقل نظام نہیں تھا بلکہ چند سیاسی

Marfat.com

لیڈروں نے مزدوروں، غریبوں اور کاشتکاروں کا نام استعمال کر کے سوشلزم کے نظریہ کی حمایت کر دی۔ نام مزدوروں اور غریبوں کا استعمال کیا گیا لیکن غریب تو اسی طرح غریب رہا بلکہ اس کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہوگئی لیکن چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کے علی الرغم ایک بہت بڑا سرمایہ دار ان مزدوروں اور غریبوں کے سروں پر بیٹھ گیا جس نے ان سے احتجاج (Protest) کی ہمت بھی چھین لی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نظام ایک صدی بھی نہیں چل سکا۔ ان تمام نظاموں کے برعکس اسلام ہی ایک ایسا دین اور نظریہ ہے جس نے محنت کش کو اس کے حقیقی مقام سے آشنا کیا ور آجروں کی غلامی سے آزاد کرا کر اس کے حقوق کا تعین کیا اور اس کو اوج ثریا کے ہمدوش کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے خود محنت کر کے محنت کے مقام سے لوگوں کو آشنا کیا اور بتایا کہ محنت کش کوئی معمولی شخص نہیں ہے بلکہ دنیا میں اور اللہ کے ہاں اس کا بہت بڑا مقام ہے۔ کیونکہ دنیا میں جس قدر پیغمبر تشریف لائے ان میں سے ہر ایک نے کوئی نہ کوئی محنت کا کام کیا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بکریاں چرائیں۔ اپنے ہاتھوں اپنے کپڑوں کو پیوند لگائے، اپنے جوتے گانٹھے اور اپنے اصحاب کو مختلف کاموں کی ترغیب دی۔ کبھی فرمایا کہ ''محنت سے کمائی کرنے والا اللہ کا دوست ہوتا ہے۔'' ایک اور موقع پر فرمایا کہ ''کسی شخص نے کوئی کھانا اس سے بہتر نہیں کھایا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کما کر کھائے، اور اللہ کے نبی داؤد علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ہاتھوں سے کام کر کے کھاتے تھے۔''

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین کمائی مزدور کی کمائی ہے جب کہ وہ خلوص اور خیر خواہی سے کام کرے۔

رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں صحابہ کرامؓ کا طرز عمل بھی یہی تھا کہ وہ محنت و مشقت کر کے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کماتے تھے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کشوں اور مزدوروں پر جو ظلم ہو رہا ہے اور جس طرح سے انہیں استحصال کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اسلام آجروں اور اجیروں دونوں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور یہ چیز بھی اسے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت سے ممتاز کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ داروں کا تحفظ کیا جاتا ہے محنت کشوں کی کوئی نہیں سنتا،

اور اشتراکیت میں سرمایہ داروں کا استحصال کیا جاتا ہے اور ان کو مزدوروں اور کاشت کاروں کے انتقام کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایک طرف تو سرمایہ داروں کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ مزدوروں کے حقوق نہایت خوش دلی اور فراخ دلی سے ادا کریں اور دوسری طرف مزدوروں کو بوقت ضرورت ملکی قوانین اور عدلیہ کی وساطت سے اپنے حقوق اور مفادات حاصل کرنے کا بھی پورا پورا حق دیتا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے حقوق بھی یاد کراتا ہے تاکہ کوئی فریق دوسرے کے حقوق کو پامال کرنے کی کوشش نہ کرے۔

........❖❖❖........

زکوٰۃ اور تقسیم دولت

موجودہ دنیا میں جس قدر بھی نظامہائے معیشت رائج ہیں، ان سب میں ایک خرابی بدرجۂ اتم موجود ہے اور وہ ہے ارتکاز دولت یعنی دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹاؤ۔ اشتراکیت تو دنیا میں فیل ہو چکی ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام نے غریبوں، مزدوروں اور کاشت کاروں کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے کہ غریب روز بروز غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے جس کے اثرات معاشرہ پر نہایت برے پڑ رہے ہیں۔ اسلام ہی دنیا میں ایک ایسا نظام معیشت پیش کرتا ہے جس میں کسی صورت ارتکاز دولت نہیں ہوتا بلکہ دولت کے ارتکاز کو روکنے کے لیے اور دولت کی گردش میں اضافہ کرنے اور معاشرہ میں دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے بڑے موثر اقدامات تجویز کیے گئے ہیں۔ یہ اقدامات دو قسم کے ہیں:

1- قانونی اقدامات (Legal Measures)

2- اختیاری اقدامات (Optional Measures)

پھر قانونی اقدامات دو قسم کے ہیں:

1- اثباتی اقدامات (Positive Measures)

2- امتناعی اقدامات (Prohibitive Measures)

اثباتی اقدمات کی پھر دو قسمیں ہیں۔

1- نظام زکوٰۃ کا قیام اور مال غنیمت اور رکاز میں خمس نکالنے کا حکم۔

2- قانون وراثت

پھر امتناعی اقدامات حسب ذیل ہیں:

Marfat.com

1- ارتکاز دولت (کنز) کی ممانعت

2- سود کی حرمت

3- حرام اشیاء کی خرید وفروخت کی ممانعت

4- اسراف اور بخل کی ممانعت

5- سٹہ بازی کی ممانعت

6- دھوکہ دہی (غرر) کی ممانعت

1- قانونی اقدامات (Legal Measures)

اسلام نے اس سلسلہ میں جو قانونی اقدامات کیے ہیں، ان میں سے ایک چیز زکوٰۃ ہے۔ اسلام میں عبادات کی دو قسمیں ہیں:

(1) مالی عبادات (2) بدنی عبادات

زکوٰۃ:

مالی عبادات میں سب سے پہلی چیز زکوٰۃ ہے، اور اسلام میں نماز کے بعد جو فریضہ سب سے اہم ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ نماز حقوق اللہ میں سے ہے جب کہ زکوٰۃ حقوق العباد میں سے ہے اور یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ قرآن حکیم میں بیس مقامات پر اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ایتاءِ زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے۔ وفد عبدالقیس نے ۵ھ میں بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپ ﷺ نے اعمال میں سب سے پہلے نماز اور پھر زکوٰۃ کا بیان فرمایا۔ (بخاری:۱/۱۸۸)

نماز اور زکوٰۃ کو جو قرآن حکیم میں اکٹھا بیان کیا گیا ہے اس کے باہمی ارتباط کی علماء کے نزدیک ایک وجہ یہ ہے کہ اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے جن میں ایک بنیاد روحانی ہے اور دوسری مادی۔ اسلام کا روحانی نظام نماز باجماعت سے جو مسجد میں ادا ہو، قائم ہوتا ہے جب کہ نظام مادی زکوٰۃ ہے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ دونوں عبادات ساتھ ساتھ ذکر کی گئی ہیں۔ یہی وجہ

Marfat.com

تھی کہ خلافت صدیقی میں جب بعض قبائل نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہیں کریں گے بلکہ انفرادی طور پر دیں گے، تو مزاج شناس نبوت سیدنا ابوبکرؓ نے ان کی اس تجویز کو قبول نہ کیا اور ان کو بزور زکوٰۃ بیت المال میں جمع کرنے پر مجبور کیا۔

سورۃ التوبہ میں اس مال کو کنز کہا گیا جس کی زکوٰۃ نہ دی جائے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ نکال دی جائے وہ مال کنز میں داخل نہیں ہے۔ جمہور فقہاء کی رائے بھی اس کے مطابق ہے۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ ''کنز'' کا مطلب ہے کہ مال کو اوپر تلے رکھنا، مال جمع کر کے اس کی حفاظت کرنا۔ چنانچہ خزانہ کو ''کنز'' کہتے ہیں۔ احادیث نبویہ میں ان لوگوں کی سخت مذمت آئی ہے جو مال تو جمع کرتے ہیں لیکن اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، قیامت کے روز اس کے لیے ایک گنجا سانپ بنایا جائے گا جس کے دو زہریلے ڈنگ ہوں گے۔ اس سانپ کو اس کا طوق بنا دیا جائے گا۔ پھر وہ اس کو اپنے جبڑوں سے پکڑے گا اور کہے گا: ''میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔'' پھر آپ ﷺ نے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۸۰ پڑھی۔

(بخاری حدیث نمبر: ۱۴۰۳، نسائی حدیث نمبر: ۱۴۴۰، ابن خزیمہ حدیث نمبر: ۲۲۵۷، موطا امام مالک حدیث نمبر: ۳۰۵، مسند امام احمد بن حنبل: ۲/ ۹۸، التمہید لابن عبدالبر: ۶/ ۵۴۶)

زکوٰۃ کو مال کا حق کہا گیا ہے اور مال کا حق کیا ہے؟ اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو تم نے اس حق کو ادا کر دیا جو تم پر واجب تھا۔''

(ترمذی حدیث نمبر: ۶۱۸، ابن ماجہ حدیث نمبر: ۱۷۸۸، معرفۃ السنن والآثار، بیہقی حدیث نمبر: ۸۴۲۷، سنن کبریٰ بیہقی: ۴/ ۸۴)

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ایک اسلامی ریاست کی غرض و غایت ہی یہ بیان فرمائی:

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہو جائے تو وہ

Marfat.com

نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے اور نیک کاموں کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے روکیں گے، اور تمام امور کا انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے۔" (حج:۴۱)

زکوٰۃ کی اہمیت کے پیش نظر امام نوویؒ فرماتے ہیں:

"جس نے زکوٰۃ کے وجوب کا انکار کیا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی، لہٰذا اس کے کفر کا حکم دیا جائے گا۔"

(المجموع:۵/۳۳۴)

انسان کسی شی کا حقیقی مالک نہیں:

اس بات پر کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ انسان کسی شی کا حقیقی مالک نہیں، بلکہ ہر شی کا مالک اللہ جل شانہ ہے، اس نے زمین کو انسان کے لیے مسخر کیا تا کہ وہ اس کے راستوں پر چلے اور اللہ تعالیٰ نے جو روزی اس کو دی ہے اس میں سے کھائے۔ گویا روزی دینے والا اللہ ہے۔ سورہ واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت اور اپنی عنایات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"کبھی تم نے یہ سوچا کہ یہ بیج جو تم بوتے ہو، ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو ان کے کھیتوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو الٹی چٹی پڑ گئی بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔ کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جو تم پیتے ہو اسے تم نے بادلوں سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری (کڑوا) بنا کر رکھ دیں پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟ کبھی تم نے خیال کیا، یہ آگ جو تم سلگاتے ہو اس کا درخت تم نے پیدا کیا یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لیے

Marfat.com

سامانِ زیست بنایا ہے۔'' (الواقعہ:۶۳۔۷۳)

﴿الحمدللہ الذی سقانا عذباً فراتاً برحمتہ ولم یجعلہ اجاجاً بذنوبنا﴾

''سب تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے اپنی رحمت سے ہمیں میٹھا پانی پلایا اور ہمارے گناہوں کی نحوست سے اسے کڑوا نہیں کر دیا۔''

قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام اشیاء جو انسان کی ملکیت سمجھی جاتی ہیں اور جن چیزوں کی ملکیت وہ اپنے جہل کی وجہ سے اپنی طرف منسوب کرتا ہے ان سب کی نسبت اور اضافت اسی کی طرف کرنی چاہیے جو ان کا پیدا کرنے والا اور حقیقی مالک ہے، اور جس نے انسان کو ان چیزوں پر اختیار صرف محدود مقاصد کے لیے اور محدود طریقہ پر بخشا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے تمام انسانی معاملات کو اللہ جل شانہ کے حوالہ کر دیا ہے اور انسان کو صرف ایک چیز کا ذمہ دار بنایا ہے اور وہ چیز ہے منصب خلافت یعنی انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔ اور جہاں اس نے اس کو اپنی توانائیاں اور مال خرچ کرنے کے لیے کہا ہے وہاں اس کو خرچ کرے اور اپنے کو ان تمام اشیاء کا مالک نہیں بلکہ کسٹوڈین سمجھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿ومما رزقناھم ینفقون﴾ (البقرۃ:۳)

''اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔''

انسان چونکہ بالطبع مال کی محبت میں غرق ہے "واحضرت الانفس الشح" یعنی بخیلی اس کی فطرت ہے۔ اپنے گاڑھے خون پسینے کی کمائی کا ایک پیسہ بھی کسی کو دینا گوارا نہیں کرتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انفاق مالی کا عنوان دل نشین رکھا۔ تاکہ یہ قربانی آسان ہو جائے۔ فرمایا یہ ہمارا ہی دیا ہوا مال تو ہے جس میں سے خرچ کرنے کو کہا جا رہا ہے۔ ماں کے پیٹ سے تم یہ مال ساتھ نہیں لائے۔ وہاں سے تو ننگ دھڑنگ خالی ہاتھ آئے تھے، اور اپنے کسب پر گھمنڈ ہے تو ہاتھ پاؤں، دل و دماغ اور ہنر اور فن بھی تو ہمارے ہی دیئے ہوئے ہیں۔ پھر یہ زعم کیسا؟ ہم اگر سارا مال لے لیتے تو یہ ہمارا ہی تھا تمہارا تو نہیں تھا۔

Marfat.com

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس میں زکوٰۃ، صدقات، خیرات واجبہ اور غیر واجبہ سب داخل ہیں۔ بتایا یہ کہ ہم تھوڑا سا مانگ رہے ہیں یعنی صرف اڑھائی فیصد۔ اور وہ بھی ہر مال میں سے نہیں بلکہ صرف تجارتی مال میں سے (خواہ روپیہ فی الحال تجارت میں نہ لگ رہا ہو) اور وہ بھی خاص مقدار تک پہنچنے کے بعد، ورنہ اس سے پہلے چھوٹ رہتی ہے۔ غرض یہ اقل قلیل مقدار تو حکومتوں کے آئے دن کے ٹیکسوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نسبت نہیں رکھتی۔ اس عنوان میں جہاں تسہیل پیش نظر ہے کہ زکوٰۃ اور صدقات واجبہ ادا کرنا دشوار نہ رہے وہیں خرچ میں اعتدال کی تعلیم دینا بھی ہے۔ اول نیک کام میں خرچ کرو، فضولیات اور خرافات یا نام ونمود کے لیے مت لٹاؤ اور اتنا خرچ نہ کرو کہ کل خود محتاج ہو کر اپنا دیا ہوا پیسہ ہی مانگنے بیٹھ جاؤ۔ یہ دونوں نکتے ''من'' سے سمجھ میں آرہے ہیں جس کے معنی ''بعض'' کے ہیں۔ چنانچہ عام مسلمان چالیس روپیہ میں سے صرف ایک روپیہ زکوٰۃ نکالتے ہیں مگر خواص چالیس میں سے ایک روپیہ اپنے صرف میں لاتے ہیں اور انتالیس روپے اللہ کی راہ میں دیتے ہیں، اور اخص الخواص تو جان و مال سب فی سبیل اللہ وقف کر دیتے ہیں۔ اہل محبت کے نزدیک ''من'' تبعیضیہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ لکھتے ہیں:

> ''اس مختصر جملے میں لفظ ''مما رزقناھم'' پر غور کیجیے تو ایک طرف یہ لفظ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی داعیہ شریف انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے کہ جو کچھ مال ہمارے پاس ہے وہ سب خدا ہی کا عطا کیا ہوا ہے اور اسی کی امانت ہے۔ اگر ہم اس تمام مال کو بھی اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لیے خرچ کر دیں تو حق اور بجا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی احسان نہیں۔ اس پر مزید اضافہ لفظ ''مـمـا'' نے کر دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دیئے ہوئے مال کو بھی پورا خرچ نہیں کرنا بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا ہے۔'' (معارف القرآن:۱/۱۱۰)

Marfat.com

اس آیت میں بتایا یہ کہ مال تمہارا نہیں بلکہ ہمارا عطا کردہ ہے، اس میں سے کچھ اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔ ایک اور مقام پر مسلمانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

﴿واتوھم من مال اللہ الذی اتاکم﴾ (النور:۳۳)

''اور اللہ کے مال میں سے بھی انہیں دو جو اس نے تمہیں دیا ہے۔''

یہ قدرتی وسائل خود تو پیدا نہیں ہو گئے بلکہ ان کا کوئی پیدا کرنے والا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کا اصل مالک ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہم ان وسائل پر قبضہ کرنے اور ان کا مالک بننے یا استعمال کرنے میں آزاد نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے پابند ہیں، لیکن مادہ پرستی کے جنون نے ان نظریات رکھنے والوں کو اصل مالک کے تصور ہی سے یک قلم غافل کر دیا۔ سرمایہ دارانہ نظام آزادانہ ملکیت کا قائل ہے کہ انسان جس طرح چاہے چیزوں کو حاصل کرے اور جس طرح چاہے صرف کرے، اس پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کی فہمائش کے جواب میں ان کی قوم نے جواب میں جو کہا تھا:

﴿لو ان نفعل فی اموالنا مانشاء﴾

''یعنی ہم اپنے مال میں آزاد ہیں جو چاہیں کریں، آپ کون ہیں
جائز اور ناجائز بتلانے والے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مشرکین کا نظریہ معیشت بھی سرمایہ دارانہ تھا۔ اس کے برعکس اشتراکی نظریہ معیشت میں ہر طرح کی ساجھے داری ہے، لہٰذا ناممکن العمل ہے۔ قرآن حکیم نے ان دونوں بیہودہ نظریوں پر رد کرتے ہوئے یہ اصول بنایا کہ کائنات کی ہر شئی اللہ کی ملکیت ہے۔ اس نے اپنے فضل و کرم سے انسان کو ایک خاص قانون کے تحت ملکیت عطا فرمائی اور جن چیزوں کا وہ اس قانون کی رو سے مالک بنا دیا گیا ہے اس میں دوسروں کے تصرف کو اس کی اجازت کے بغیر حرام قرار دیا، لیکن مالک بننے کے بعد بھی اس کو آزاد ملکیت نہیں دی کہ جس طرح چاہے کمائے اور جس طرح چاہے خرچ کرے بلکہ دونوں طرف ایک عادلانہ اور حکیمانہ قانون رکھا کہ فلاں طریقہ کھانے کا حلال ہے اور فلاں حرام ہے، اور فلاں جگہ خرچ کرنا حلال ہے اور فلاں جگہ حرام، اور یہ جو شئی اس کی ملکیت میں دی ہے اس میں کچھ لوگوں کے حقوق بھی لگا دیئے جن کو ادا کرنا اس کی ذمہ

Marfat.com

داری ہے۔اس لیے فرمایا:"واتوھم من مال الله الذی اتاکم" اس آیت میں چند اہم معاشی اصول بیان فرمائے۔ایک یہ کہ ہرشی کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے۔دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کے ایک حصہ پر تمہیں مالک بنایا ہے،اور تیسرا یہ کہ جس چیز کا مالک بنایا ہے اس پر کچھ پابندیاں بھی اللہ تعالیٰ نے لگائیں ہیں یعنی بعض جگہ خرچ کرنا جائز اور بعض جگہ ناجائز کر دیا۔ترمذی کی ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ قیامت کے روز جو چار سوال پوچھے جائیں گے ان میں سے دو سوال مال کے بارہ میں ہیں کہ "من این اکتسبه وفیما انفقه" کہ مال اس نے کہاں سے کمایا اور کہاں کہاں خرچ کیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام نے مال کے کمانے پر بھی پابندی عائد کی اور اس کے خرچ کرنے پر بھی قدغن لگائی کہ فلاں فلاں جگہ خرچ کرو اور فلاں فلاں جگہ خرچ نہ کرو،اور چونکہ مال کے مالک اللہ تعالیٰ ہیں لہٰذا انہیں ہرقسم کی پابندی کا استحقاق ہے۔

مسلمانوں میں انفاق فی سبیل اللہ کی گرم جوشی:

اس نظریہ نے کہ ہرشی کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور انسان ایک کسٹوڈین ہے مسلمانوں کے دلوں میں انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عقیدہ کی آبیاری کی یہاں تک کہ یہ عقیدہ ان کے دلوں میں بخوبی راسخ ہو گیا۔اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے مختلف عنوانات سے مسلمانوں کو باور کرایا کہ یہ مال جو تم محنت اور جدوجہد سے کماتے ہو یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔تم اس کے امین ہو،لہٰذا معاشرہ کے وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے کسی وجہ سے اس نعمت سے محروم رکھا ہے ان کا تمہارے مالوں میں حق رکھا گیا ہے،لہٰذا جس طرح نماز کا ادا کرنا تمہارے ذمہ ضروری ہے اسی طرح ان لوگوں کا مالی حق بھی تمہارے ذمہ ضروری اور لازمی ہے۔یہ بات مسلمانوں کے اذہان وقلوب میں اس قدر راسخ ہو گئی کہ اب ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا بالکل گراں معلوم نہیں ہوتا تھا۔چنانچہ ابن ابی حاتمؒ نے سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۱۱ کے نزول کے بارہ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿من ذالذی یقرض الله قرضاً حسناً، فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وله

Marfat.com

اجر کریم﴾ (الحدید:۱۱)
''کون ہے ایسا کہ قرض دے اللہ کو اچھی طرح، پھر وہ اس کو دگنا کردے اس کے واسطے اور اس کو ملے ثواب عزت کا۔''

تو سیدنا ابوالدحداح ؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، اے ابوالدحداح!'' انہوں نے کہا: ''ذرا اپنا ہاتھ مجھے دکھایئے۔'' آپ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں آپ ﷺ کا ہاتھ لے کر کہا: ''میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض دے دیا۔'' سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: کہ اس باغ میں چھ سو کھجور کے درخت تھے۔ اسی میں ان کا گھر بھی تھا۔ اور وہیں ان کے بچے رہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور باہر سے بیوی کو پکار کر کہا: ''دحداح کی ماں! باہر نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے۔'' وہ بولیں: ''دحداح کے ابا! تم نے نفع کا سودا کیا، اور اسی وقت اپنا سامان اور بچے لے کر باغ سے نکل گئیں۔ (الاصابہ: ۷/۵۸)

اسلام نے جب مال کے بارہ میں مسلمانوں کا ذہن بنا دیا کہ یہ مال اللہ کا ہے اور وہ اس کے امین ہیں، تو اب مال کی ہر قربانی ان پر آسان ہوگئی، اور حالت یہ ہوگئی کہ وہ اپنی ضرورت روک کر اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں پر خرچ کرتے تھے۔ جس کا نام قرآن حکیم نے ایثار رکھا ہے (ویؤثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصة)۔ (حشر:۹)

زکوٰۃ کب فرض ہوئی؟

زکوٰۃ کب فرض ہوئی؟ مکہ میں یا مدینہ منورہ میں۔ اگرچہ زکوٰۃ کا ذکر مکی سورتوں میں بھی آیا ہے لیکن وہاں اس سے مراد مطلق خیرات ہے جس میں نصاب، مقدار اور حولان حول کی شرائط موجود نہیں ہیں۔ مکہ میں مسلمانوں کی پراگندگی، شکستہ حالی، پریشانی اور غربت ومسکنت کی جو کیفیت تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ کسی یتیم ومسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دیں، اس لیے اس زمانہ میں اس قسم کی خیرات کی تعلیم دی گئی۔ چنانچہ سورۃ البلد میں فرمایا:

Marfat.com

""پس اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی، اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو (غلامی، قرض یا قید سے) چھڑانا، یا بھوک کے دن میں ناطے کے کسی بن باپ کے بچہ کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا۔""

(سورۃ البلد:۱۱۔۱۵)

آیت میں لفظ ''اقتحم'' آیا ہے اور ''اقتحام'' کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی سخت اور مشقت طلب کام میں ڈالنا اور ''عقبہ'' گھاٹی اور اس دشوار گزار راستہ کو کہتے ہیں جو پہاڑ پر جانے کے لیے ہو۔ پہاڑ پر چڑھ کر یا گھاٹی میں چھپ کر انسان اپنے دشمن سے خود کو بچا لیتا ہے یعنی طاعات وعبادات کو ''عقبہ'' سے تعبیر فرمایا ہے کہ جس طرح عقبہ انسان کو دشمن سے نجات دلانے کا سبب ہوتا ہے اسی طرح اعمال صالحہ (طاعات و عبادات) آخرت کے عذاب سے انسان کی نجات کا ذریعہ ہیں۔ بتایا یہ کہ وہ کون سا خرچ اور مال کا کون سا مصرف ہے جو انسان کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، لیکن اس کے لیے انسان کو اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ کسی غلام کو آزاد کیا جائے یا اس کی مالی مدد کی جائے تا کہ وہ اپنا بدل کتابت ادا کر کے آزاد ہو جائے یا کسی غریب کی گردن قرض کے بوجھ سے نکال لے یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی تاوان سے زیر بار ہو گیا ہو تو اس کی جان اس سے چھڑا دے۔ اسی طرح آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی رشتہ دار یا پردیسی، یتیم اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دست گیری اور مدد کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بجتے اور نہ ہی ان کو کھلا کر آدمی کی دولت مندی اور دریا دلی کے وہ چرچے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شاندار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتے ہیں، مگر اخلاص و بلندی کی طرف جانے کا راستہ اسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔

مختصر یہ کہ مکی زندگی میں زکوٰۃ سے مراد صرف صدقات اور اللہ کی راہ میں غریبوں، مسکینوں وغیرہ میں مال خرچ کرنا تھا۔ اس کے لیے نصاب وغیرہ کی کوئی شرط نہ

Marfat.com

تھی، لیکن جب اسلامی معاشرہ میں انفاق کا یہ عقیدہ پختہ ہو گیا اور لوگوں میں ایثار، ہمدردی، انفرادی اور جماعتی انانیت سے آزادی، اخلاقی اطاعت و انقیاد کے جذبات موجزن ہونے لگے اور داد و دہش کا ذوق، ان کا مزاج اور ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا اور مسلمان مکہ کی سنگلاخ زمین سے جہاں وہ مصائب و آلام کی چکی میں پس رہے تھے، ہجرت کر کے مدینہ طیبہ کی خوش گوار اور آزاد فضا میں آ گئے اور انہوں نے اطمینان سے روحانی اور کاروباری مشاغل میں اپنے آپ کو مشغول کر لیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ سنہ ۲ھ میں صدقہ فطر واجب ہوا یعنی یہ کہ سال میں رمضان کے آخر میں اور عید الفطر سے پہلے ہر مسلمان کچھ غلہ اللہ کی راہ میں خیرات کرے تا کہ غریب و محتاج اور یتیم و مسکین لوگ بھی اپنی عید کا دن خوشی اور مسرت سے گزار سکیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ''ہم اللہ کی راہ میں کیا خیرات کریں؟''۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿یسئلونک ماذا ینفقون؟ قل العفو﴾ (بقرہ:۲۱۹)

''اور (لوگ) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟
آپ کہہ دیجئے کہ جو ضرورت سے بچ جائے۔''

اس آیت میں ''العفو'' کا لفظ بول کر مال ذخیرہ نہ کرنے کی طرف اشارہ کر دیا۔

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم تھا۔ چنانچہ بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا قول نقل کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار اور اس کے نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ مال میں سے جو کچھ بچے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خیرات کر دیں اور آئندہ کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھیں۔ (بخاری مع فتح الباری:۳/۲۱۶) کیونکہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور بڑی بڑی جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو اب حکم ہوا کہ:

''اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے بہترین چیزیں اللہ کی راہ میں

Marfat.com

خرچ کرو اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیئے زمین سے پیدا کیا ہے
(اس میں سے بھی خرچ کرو)۔

قرآن حکیم کی ان تعلیمات کی روشنی میں صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال دینے کے لیے بے قرار رہتے۔ دوسرے لوگ تو مال جمع کرنے کی فکر میں ہوتے تھے جب کہ صحابہ کرامؓ مال اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے لیے بیقرار اور فکرمند رہتے تھے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ نادار صحابہ کرامؓ محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتے اس میں سے صدقہ کرتے حالانکہ وہ خود حاجت مند ہوتے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات نے ان پر ایسا اثر کیا کہ وہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر ترجیح دیتے۔

جب اسلام کی دعوت دور دور تک پھیل گئی اور فتح مکہ کی وجہ سے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے، اور سنہ ۸ھ میں فتح مکہ نے تمام عرب کو ایک سرشتہ میں منسلک کر دیا۔ اب اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلام انفاق کے بارہ میں اپنا ایک خاص نظام قائم کرے۔ اس وقت قرآن حکیم میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها﴾ (توبہ:۱۵۳)
"(اے پیغمبر!) ان کے مالوں میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو
کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کو پاک وصاف کر سکو۔"

تطہیر اور تزکیہ کے الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ زکوٰۃ وصدقات عام سرکاری ٹیکسوں کی طرح نہیں جو نظام حکومت اور کاروبار سلطنت چلانے کے لیے وصول کیے جاتے ہیں۔ بلکہ مال داروں کو گناہوں سے پاک وصاف کرنے کے لیے ہے۔ یہ فائدہ تو خود صاحب مال کا ہوا کہ وہ گناہوں سے پاک اور مال کی محبت وحرص اور بخل وشح جیسے امراض مزمنہ سے صحت یاب ہو جاتا ہے، اور اس کا دوسرا فائدہ جو غرباء اور فقراء سے متعلق ہے، وہ بالکل واضح ہے۔ اس سے قوم کے پس ماندہ اور کمزور ترین طبقہ کو کتنا بڑا سہارا ملتا ہے۔ یتیم بچوں، بیوہ اور بے سہارا عورتوں، اپاہج اور معذور افراد کی پرورش ہوتی ہے، لیکن بالفرض اگر کسی جگہ یا کسی موقع پر یتیم، بیوہ اور مسکین موجود نہ ہوں، تب بھی مالدار حضرات سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ وصدقات کی اصل

Marfat.com

مشروعیت کسی کی حاجت روائی کے لیے نہیں بلکہ مالی حق کے طور پر وہ ایک عبادت ہے۔ نماز، روزہ بدنی عبادات ہیں اور یہ مالی عبادت ہے۔

یہ سب کچھ سنہ ۸ ھ میں ہوا۔ اس کے بعد اگلے سال محرم سنہ ۹ ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام اور قوانین مرتب ہوئے اور اس کو اکٹھا کرنے کے لیے محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا اور پھر باقاعدہ ایک بیت المال بنایا گیا جس میں زکوٰۃ کا یہ روپیہ اکٹھا کر کے غرباء اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا۔

زکوٰۃ کی مقدار:

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل کی زکوٰۃ کی مقدار پیداوار میں دسواں حصہ (عشر) تھا اور نقد میں آدھا مثقال جو امیر وغریب سب پر یکساں فرض تھا، لیکن چونکہ زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور اسی طرح نقد دولت کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض دفعہ دولت بغیر کسی محنت کے ہاتھ آجاتی ہے اور بعض دفعہ سخت محنت ومشقت کر کے دولت کمائی جاتی ہے، اس لیے سب پر یکساں زکوٰۃ کی مقدار نہیں عائد کی جا سکتی۔ تورات وانجیل نے اس فرق کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ لیکن اسلام میں اس بارہ میں جو اصول ہیں وہ نہایت فطری اور عقل سلیم کے مطابق ہیں۔ اور اسلام نے ہر ایک کے لیے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی ہے۔ اللہ کی راہ میں مال کو قرآن کی اصطلاح میں ''انفاق'' یا ''صدقہ'' کہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری قرار دے دیا کہ ہر شخص کے مال و دولت میں غریبوں، مسکینوں، محتاجوں اور ان لوگوں کے لیے جو معاشرہ میں دولت سے کسی وجہ سے محروم کر دیئے گئے ہیں یا دوسرے نیک کاموں کے لیے بھی ایک سالانہ مقرر حصہ ہے، اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں زکوٰۃ رکھا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں سورۃ معارج میں ارشاد فرمایا:

﴿والذین فی اموالھم حق معلوم، للسائل والمحروم﴾

(معارج: ۲۴۔۲۵)

''اور جن لوگوں کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حصہ ہے۔''

Marfat.com

بعض حضرات نے اس سے یہ سمجھا کہ مقررہ حق سے مراد فرض زکوٰۃ ہے کیونکہ اسی میں نصاب اور شرح دونوں مقرر کی گئی ہیں، لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ سورۃ معارج بالاتفاق مکی ہے اور زکوٰۃ کا نصاب اور شرح دونوں مدینہ میں فرض اور مقرر ہوئی ہیں، اس لیے حق مقرر کرنے کا صحیح مطلب یہ ہے کہ انہوں نے بطور خود اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حصہ طے کر رکھا ہے جسے وہ اس کا حق سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ اور سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے، امام شعبیؒ اور امام ابراہیم نخعیؒ نے بھی اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔

''سائل'' سے مراد یہاں پیشہ ور بھیک مانگنے والا نہیں بلکہ وہ حاجت مند شخص ہے جو کسی سے مدد مانگے۔ اور ''محروم'' سے مراد ایسا شخص ہے جو بے روزگار ہو یا روزی کمانے کی کوشش کرتا ہو مگر اس کی جائز ضروریات زندگی پوری نہ ہوتی ہوں، یا کسی حادثہ کا شکار ہو کر محتاج ہو گیا ہو، یا روزی کمانے کے قابل ہی نہ ہو، ایسے لوگوں کے بارہ میں جب معلوم ہو جائے کہ وہ واقعی محروم ہیں تو ایک خدا پرست انسان اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ وہ اس سے مدد مانگیں بلکہ ان کی محرومی کا علم ہوتے ہی وہ خود آگے بڑھ کر ان کی مدد کرتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے، اس لیے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے، اور جیسے جیسے محنت بڑھتی اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے۔ چنانچہ مال غنیمت جو اعلائے کلمۃ اللہ کے دوران بلاقصد اور بلا محنت اور اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے، اس لیے اسلام نے پانچواں حصہ (خمس) نظام جماعت کا حق اور حکومت کے مختلف مصارف کے لیے مقرر کیا۔ (انفال:۴۱)

بتایا یہ کہ کل مال غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں۔ چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے جائیں اور پانچواں حصہ (خمس) پھر پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ، اور آپ کے رشتہ داروں، یتیموں، نادار مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ گویا یہ اصول قائم کیا گیا کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ

آجائے اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے۔ چنانچہ اسی اصول کی بنیاد پر ''رکاز'' یعنی دفینہ بھی جو کسی محنت کے بغیر اتفاقاً غیب سے ہاتھ آجائے اس کا پانچواں حصہ مسلمانوں کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

اسلام میں پیداوار پر شرح زکوٰۃ مختلف ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ سب سے پہلے پیداوار کی ان اقسام پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتی ہیں تاکہ ان سے حسب منشاء خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جاسکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی وجہ سے سبزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں، کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں کی گئی۔ اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں مثلاً آلات، مکان، لباس، سواری، اسباب سواری، اور قیمتی پتھر وغیرہ ان پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی۔ کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشوونما پانے والی چار چیزیں ہیں۔ زمین، جانور، سونا اور چاندی یا اس کے سکے اور تجارتی مال۔ چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔

شریعت میں زمین کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک قسم وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ اگر چہ کاشتکار کرتا ہے لیکن اس کی سیرابی میں کاشت کار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ ہی سیراب ہو جاتی ہے، لہٰذا اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی پیداوار کا دسواں حصہ (عشر) مقرر کیا گیا ہے۔ زمین کی دوسری قسم جس کی سیرابی میں کاشت کار کو خاصی محنت اور مزدوری کرنی پڑتی ہے مثلاً کنویں کے پانی سے زمین کو سیراب کرنا یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس زمین میں قسم اول سے نصف زکوٰۃ مقرر کی گئی ہے یعنی پیداوار کا بیسواں حصہ۔ نقد سرمایہ جس کی ترقی، نشوونما، افزائش اور حفاظت کے لیے دن رات سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش اور ترقی کے لیے سرمایہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہر قوم پر اس کی چوری اور نقصان کا خطرہ بھی ہوتا ہے، لہٰذا اس کی شرح زکوٰۃ زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسواں حصہ مقرر ہوا۔

(زادالمعاد لابن قیم: ۱/۱۴۵ باختصار)

Marfat.com

زکوٰۃ کی مدت کی تعین:

اسلام سے قبل زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بھی بڑی افراط وتفریط تھی۔ تورات کے مطابق جو عشر مقرر کیا گیا تھا وہ تین سال میں ایک مرتبہ واجب ہوتا تھا۔ اسلام میں اس کی مدت کی تعیین نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں ہوئی کہ انسان بار بار زکوٰۃ دینے سے اُکتا جائے اور اسے اس کی ادائیگی ناگوار معلوم ہو، اور نہ اس قدر طویل مدت ہوئی کہ غرباء اور مساکین کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے طویل انتظار کی تکلیف اٹھائی پڑے۔ اسلام نے اس کے لیے ایک سال کی مدت مقرر کی کیونکہ تمام متمدن و مہذب دنیا میں کاروبار کے لیے بارہ مہینوں کا سال مقرر کیا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصل سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور اس کی تجارت کرنا ہے آمدنی کے ان تمام ذرائع کے لیے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں، جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف گذر جائیں تاکہ پورے سال کے آمد وخرچ اور نفع ونقصان کا اندازہ ہو سکے اور کاشت کار، زمین دار اور ملازم وکاریگر وغیرہ ہر ایک اپنی آمدنی اور سرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ اور تخمینہ لگا سکے۔ چنانچہ شریعت نے اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے۔ اس بارہ میں حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ ۲/۳۰ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

زکوٰۃ کے فوائد:

زکوٰۃ کے روحانی، اقتصادی اور تجارتی بے شمار فوائد ہیں۔ اخلاقی فوائد کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور دنیوی فوائد بھی اس میں ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ زکوٰۃ صرف ان چیزوں پر واجب ہوتی ہے جن میں دو صفات پائی جاتی ہوں۔ بقا اور نمو۔ بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ اشیاء ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں کیونکہ جو شی باقی رہنے والی نہ ہو گی اس کی تجارت میں کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی وہ دوسروں کے استعمال کے لیے دیر تک

Marfat.com

ذخیرہ بن سکتی ہے۔ان کو Perishable items کہتے ہیں جیسے سبزیاں اور ترکاریاں۔ چنانچہ ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اور دوسری صفت نمو سے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا توالد و تناسل یا مبادلہ کی بناء پر افزائش کی صلاحیت ہو۔ اسی لیے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزروعہ زمین اور مکان میں بھی کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بے کار اور منجمد نہ رکھیں بلکہ محنت، کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں اور اس میں اضافہ کریں ورنہ اصل سرمایہ سال بہ سال کم ہوتا چلا جائے گا جس کو انسانی فطرت برداشت نہیں کرسکتی۔ چنانچہ زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ سرمایہ پوری سوسائٹی میں تجارت اور زراعت کی صورت میں گردش کرے اور اس سے زراعت اور تجارت کو ترقی ہو کیونکہ اگر کوئی شخص سرمایہ کو منجمد کر کے رکھے گا تو اسے لازمی طور پر اس مال اور سرمایہ پر ہر سال زکوٰۃ دینا ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا سرمایہ ہر سال کم ہوتا چلا جائے گا، لہٰذا سرمایہ کو پوری سوسائٹی میں گردش میں لانے اور اس میں اضافہ اور بڑھوتری کے لیے زکوٰۃ ایک سب سے بڑا عامل ہے۔ صحابہ کرامؓ اور ان سے بعد آنے والے مسلمان اپنے سرمایہ کو منجمد کرنے کے بجائے اس کو ہر وقت اپنے کاروبار اور تجارت میں لگائے رکھتے تھے جس سے مال پورے معاشرہ میں گردش کرتا تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں دولت چند ہاتھوں میں جمع ہوتی رہتی ہے اور اس نظام کی وجہ سے معاشرے میں دو طبقات پیدا ہو گئے ہیں۔ امراء کا طبقہ (Haves) اور محرومین کا طبقہ (Have nots) وجود میں آتے ہیں، لیکن اسلام اول تو ارتکاز دولت کو حکماً روکتا ہے اور علاوہ ازیں حلال اور جائز طریقہ سے حاصل ہونے والی دولت میں غرباء اور فقراء کا حصہ مقرر کرتا ہے جس سے دولت خود بخود امراء سے غرباء کی طرف منتقل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اور قرآن بھی کہتا ہے ''تاکہ دولت مند لوگوں میں مال نہ پھرتا رہے۔'' (حشر: ۷) اس طرح دولت جب امراء سے غرباء کی طرف منتقل ہوتی ہے تو معیشت کی مجموعی طلب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس بڑھی ہوئی طلب کو پورا کرنے کے لیے پیداوار میں اضافہ ناگزیر ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں لوگوں کے لیے روزگار کے دروازے کھلتے ہیں

Marfat.com

اور معیشت مجموعی طور پر پھلتی پھولتی ہے۔

زکوٰۃ سے جہاں منصفانہ تقسیم دولت ہوتی ہے اور امیر و غریب کے درمیان پائی جانے والی وسیع خلیج کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ غریبوں کا معیار زندگی بہتر ہونے لگتا ہے وہاں نظام زکوٰۃ کی وجہ سے لوگوں کے روزگار میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور غرباء میں قوت خرید زیادہ ہونی شروع ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں سامنے آیا کہ لوگ مال زکوٰۃ لے کر پھرتے تھے اور زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ملتا تھا۔ علامہ اقبالؒ کا قول ہے کہ ''اسلام وہ دین ہے جس میں غرباء امراء پر ٹیکس عائد کرتے ہیں، اور یہ کوئی بھیک اور خیرات نہیں بلکہ غرباء، مساکین اور محرومین کا قانونی حق ہے جو امراء کے ذمہ عائد ہے، اور جب تک امراء اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا اور رسول ﷺ اور تمام غرباء اور مساکین کے مجرم اور مقروض ہیں''۔

زکوٰۃ ارتکاز دولت کا خاتمہ کرتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر کزنے (Kuznet) اپنی کتاب ''معاشی ترقی اور آمدنی کی غیر مساویانہ تقسیم'' میں لکھتا ہے:

> ''عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ امیر نسبتاً امیر ہیں اور غریب غریب تر، مثلاً پاکستان میں ساٹھ فیصد آبادی کو کل آمدنی کا اٹھائیس فی صد ملتا ہے۔ لنکا میں ۳۰ فیصد اور امریکہ میں ۳۴ فیصد جب کہ پاکستان اور بھارت میں بیس فیصد آبادی (جو امیر طبقہ پر مشتمل ہے) کو کل آمدنی کا ۵۵ فیصد ملتا ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ارتکاز دولت ہوتا چلا جاتا ہے اور نظام زکوٰۃ اس ارتکاز دولت کو ختم کرتا ہے۔ اور دولت کے تالاب میں سے زکوٰۃ کی نہریں اگر نکلیں تو سوکھے کھیت ہرے ہو جاتے ہیں اور گرد و پیش کی ساری زمینیں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں۔

زیورات بھی سرمایہ کو منجمد رکھنے کی ایک صورت ہے۔ عورتیں زیورات بنوا کر ان کو زیب و زینت کے لیے استعمال کرتی ہیں، اس لیے اگرچہ اسلام نے عورتوں کے لیے زیورات کو جائز رکھا ہے لیکن اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی کیونکہ یہ بھی سرمایہ کے انجماد کی ایک صورت ہے جس سے ملک کی اقتصادیات میں رکاوٹ پیدا ہو کر ملک و قوم کو فقر و

Marfat.com

محتاجی میں مبتلا کر سکتی ہے۔ جس طرح خون پورے جسم میں گردش کرتا ہے اور پورا جسم تندرست اور صحیح رہتا ہے، اسی طرح جب دولت اور سرمایہ پورے معاشرہ اور سماج میں گردش کرے گا تو پورا معاشرہ تندرست اور صحیح وسالم رہے گا اور پورا سماج معاشی اور اقتصادی طور پر ترقی کرے گا۔

(۲) زکوٰۃ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے کا زکوٰۃ دینے سے نہ صرف مادی اور معنوی تطہیر اور تزکیہ ہوتا ہے بلکہ اس کے نفس کا اور اس کے مال کا بھی تزکیہ ہوتا ہے۔ اس کی مالی اور نفس کی معنوی غلاظت اور گندگی دور ہو جاتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے کے مال میں زیادتی اور اضافہ ہوتا ہے۔ علامہ ابن اثیر جزریؒ نے زکوٰۃ کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿اصل الزکوٰۃ فی اللغۃ الطھارۃ والنماء والبرکۃ والمدح، وکل ذالک قد استعمل فی القرآن والحدیث﴾

(نہایہ ابن اثیر:۲/۳۰۷)

''لغت میں زکوٰۃ کا معنی پاکیزگی، بڑھنا، برکت اور مدح ہے، اور ان میں سے ہر معنی میں قرآن وحدیث میں استعمال ہوا ہے۔''

(۳) زکوٰۃ انسان کو بخل سے پاک کرتی ہے۔ بخل ایک نہایت مہلک اور خطرناک برائی ہے جو انسانی نفس میں رچی بسی ہوتی ہے۔ انسان کے نفس کی تہوں میں بہت سے نفسیاتی میلانات اور جبلتیں موجود ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس میں مال اور ملکیت کی محبت اور بقاء کی محبت کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ انہی نفسانی میلانات اور رجحانات کے زیر اثر انسان جس شی کا مالک ہوتا ہے اس میں بخل اختیار کرتا ہے اور اس کے فوائد اور منفعتوں سے خود ہی مستفید ہونا چاہتا ہے اور دوسروں کو اس میں شریک نہیں کرنا چاہتا۔ ایک بندہ مومن کو دنیا وآخرت میں کامیابی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ بخل کی اس مکروہ خصلت سے نجات حاصل کر لے۔ حدیث میں بخل کے بارہ میں سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے: ''بخل سے بچو، گذشتہ قومیں دراصل بخل ہی سے ہلاک ہوئیں۔''

(رواہ ابوداؤد والنسائی، مختصر المنذری:۲/۲۶۳)

Marfat.com

بخل کے اس مہلک مرض کا علاج زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ دینے والا اس تباہ کن بخل سے پاک ہو جاتا ہے، اور جس قدر مال وہ زکوٰۃ دینے میں خرچ کرتا ہے اس قدر اسے پاکی حاصل ہوتی ہے، اور قلبی اور ذہنی طور پر ایک گونہ خوشی محسوس کرتا ہے کہ اس نے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اپنے مال کو راہِ خدا میں خرچ کیا۔

(۴) انسان زکوٰۃ کے ذریعہ بخل کی دنائت سے پاک ہو کر انفاق کا عادی ہو کر نفسِ انسانی کی گراوٹ سے بلند تر ہو جاتا ہے اور کمالاتِ ربانی سے قریب تر ہو جاتا ہے امام رازیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ نفس ناطقہ جس کے ذریعہ انسان بنا ہے، اس کی دو قوتیں ہیں۔ ایک نظری قوت اور دوسری عملی قوت۔ نظری قوت کا کمال اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم میں ہے جب کہ عملی قوت کا کمال مخلوق پر شفقت کرنے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی کہ روح یہ کمال حاصل کرے اور مخلوقات پر احسان کرنے کی صفت سے متصف اور اس کے ساتھ بھلائی کرنے کے وصف سے موصوف ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اخلاق الٰہی اختیار کرو۔''

(۵) زکوٰۃ انسان کے نفس میں اللہ تعالیٰ کے شکر کے احساس کو بیدار کرتی ہے اور اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احسان اور اس کی نعمتوں کے شکر پر آمادہ کرتی ہے۔ چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دو قسم کی نعمتیں عطا فرمائی ہیں: جانی اور مالی۔ جسمانی عبادتیں جانی نعمتوں کا شکر ہیں جب کہ مالی عبادتیں مالی نعمتوں کا شکر ہیں۔ وہ شخص کس قدر خسیس اور ذلیل ہے جو فقیر کی جانب دیکھے کہ اس کا رزق تنگ ہے اور وہ حاجت مند ہے، پھر اس کے نفس میں یہ داعیہ پیدا نہ ہو کہ وہ اسے سوال سے مستغنی کرکے اور اس کی ضرورت رفع کرکے اللہ کا شکر بجا لائے اور اسے اپنے مال میں صرف چالیسواں یا دسواں (عشر) حصہ دیدے۔'' (احیاء العلوم: ۱/۱۹۳)

ان کے علاوہ زکوٰۃ کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں جن کو طوالت کی وجہ سے ذکر نہیں کیا جا رہا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ زکوٰۃ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی

Marfat.com

ہے۔ یہ ان کی انشورنس کمپنی ہے۔ یہ ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے۔ یہ ان کے لیے ذریعہ ورش ہے، اوران سب سے بڑھ کر یہ زکوٰۃ وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو فکر فردا سے بالکل بے نیاز کردیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادھا اصول یہ ہے کہ آج تم مال دار ہو تو دوسروں کی دکرو، کل تم نادار اور قلاش ہو گے تو دوسرے تمہاری مدد کریں گے۔ تم کو یہ فکر کرنے کی روورت نہیں کہ ہم مفلس ہو گئے تو کیا بنے گا؟ مر گئے تو بیوی بچوں کا کیا ہوگا؟ کوئی کہانی آفت آن پڑی، بیمار ہو گئے، گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آ گیا وغیرہ وغیرہ تو یا ہوگا؟ ان سب فکروں سے صرف زکوٰۃ تم کو ہمیشہ کے لیے بے فکر کردیتی ہے۔ تمہارا م بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت میں سے اڑھائی فیصد دے کر اللہ تعالیٰ ی ''انشورنس کمپنی'' میں اپنا بیمہ کرالو۔ جب تم کو اس دولت کی ضرورت ہوگی یا تمہاری لاد یا بیوی ضرورت مند ہوگی تو نہ صرف تمہارا اپنا دیا ہوا مال بلکہ اس سے بھی زیادہ تم کو پس مل جائے گا۔

کوٰۃ دہندہ کے متعلق شرائط:

اسلام میں زکوٰۃ کی فرضیت کے بارہ میں کچھ شرائط ہیں اور یہ شرائط دوطرح کی ں بعض کا تعلق صاحب زکوٰۃ سے ہے اور بعض کا تعلق مال زکوٰۃ سے ہے۔ جن شرائط کا علق صاحب زکوٰۃ یعنی زکوٰۃ دہندہ سے ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

- اسلام: زکوٰۃ دہندہ کے لیے سب سے پہلی شرط اسلام ہے کیونکہ کافر پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ چنانچہ بدائع میں ہے کہ ''زکوٰۃ کے وجوب کی ایک شرط مسلمان ہونا ہے۔ کافر پر زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور کفار عبادات کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔'' (بدائع الصنائع: ۲/۴، فتح القدیر: ۲/۱۱۲)

امام نوویؒ نے بھی لکھا ہے کہ ''زکوٰۃ کا وجوب صرف آزاد مسلمان پر ہوگا۔''

(المجموع للنووی: ۵/۳۲۶)

- حریت: یعنی آزادی۔ وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط آزاد ہونا ہے کیونکہ غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی وجہ یہ ہے غلام کسی چیز کا مالک بننے کی صلاحیت ہی

Marfat.com

نہیں رکھتا۔اس کے پاس جو کچھ ہے مالک کی ملکیت ہوتا ہے۔

(بدائع الصنائع:۲/۶،المجموع:۵/۳۲۶،بحرالرائق:۲/۲

3- بلوغ: بالغ ہونا بھی وجوب زکوٰۃ کے لیے شرط ہے، چنانچہ نابالغ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، جیسے نماز اور روزہ اس پر واجب نہیں ہے۔

(بدائع الصنائع:۲/۴،الفقہ الاسلامی وادلتہ:۲/۳۹

4- عقل: وجوب زکوٰۃ کے لیے عقل بھی ایک شرط ہے چنانچہ مجنون اور پاگل پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔(فتح القدیر:۲/۱۱۷،المجموع:۵/۳۲۹)

5- فریضۂ زکوٰۃ کا علم ہونا: فقہاء نے ایک شرط یہ بھی بیان کی ہے کہ صاحب مال کو نفس فریضہ زکوٰۃ کا کسی بھی طرح علم حاصل ہو جائے۔(بدائع الصنائع:۲/

6- فراغت عن الدین: وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط فراغت عن الدین ہے جس کا مطلب ہے کہ زکوٰۃ دہندہ کے ذمہ کوئی ایسا قرض نہ ہو جس کا بندوں کی طرف سے کوئی مطالبہ کرنے والا ہو۔قرض خواہ معجل ہو یا مؤجل۔البتہ قرض کی مقدار مالیت سے منہا کرنے کے بعد بھی بقدر نصاب مال رہ جائے تو اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔(بدائع الصنائع:۲/۶)

مال زکوٰۃ کے متعلق شرائط:

مال زکوٰۃ کے بارہ میں مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

1- ملک تام: زکوٰۃ کے لیے شریعت میں ''ملک تام'' کو بنیادی شرط قرار دیا ہے،اور صرف انہی اموال میں زکوٰۃ واجب کی گئی ہے جن پر انسان کو ملک تام حاصل ہو۔ملک تام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس شی پر مالکانہ حقوق حاصل ہوں اور وہ شی اس کے قبضہ اور تصرف میں بھی ہو۔

2- نما: وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط نما ہے یعنی مال کا نامی ہونا۔نما کا مطلب ہے زیادتی اور بڑھوتری۔جدید اصطلاح میں اس کا مطلب ہے کہ وہ مال صاحب مال کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو،لہٰذا وہ مال جس میں صاحب مال

Marfat.com

اپنے ذریعہ یا اپنے نائب کے ذریعہ اضافہ یا بڑھانے پر قدرت نہ رکھتا ہو اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہ ہوگی، اگرچہ اس مال پر اس کو ملکیت حاصل ہو جیسے مال ضمار، صحرا میں دفن کیے ہوئے مال اور مال مفقود وغیرہ پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی گئی۔ (فقہ الزکوٰۃ، ۱/۱۳۹)

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ نما وجوب زکوٰۃ کے لیے شرط بھی ہے اور علت بھی، اس لیے شروع سے لے کر آج تک تمام علماء اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ہر وہ مال جو نامی ہو اور بقدر نصاب ہو، زکوٰۃ کا محل ہے۔ خواہ اس کا ذکر احادیث میں ملتا ہو یا وہ بعد کی پیداوار ہو اور اس کا ذکر قدیم ذخیروں میں نہ ملتا ہو، نما کی علت جہاں پائی جائے گی وہاں زکوٰۃ کا حکم داخل ہوگا۔

3- **حاجات اصلیہ سے فارغ ہونا:** وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط مال کا حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہے اور اس مال پر ملک تام بھی حاصل ہے اور وہ مال نامی بھی ہے، مگر وہ مال اس شخص کی حاجت اصلیہ میں مشغول ہے تو شرعاً اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ حاجت اصلیہ سے فارغ ہونے کی وجوب زکوٰۃ کے لیے شرط اس لیے قرار دی گئی ہے کہ اس کے بغیر غنا یعنی مال داری اور نعمت کا تحقق ہی نہیں ہوتا ہے، کیونکہ جو شخص ضروریات اصلیہ کا محتاج ہوتا ہے اسے عرف میں مال دار ہی نہیں سمجھا جاتا، اور نہ وہ برضا ورغبت زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے جب کہ حدیث میں ہے کہ ''اپنے مالوں کی زکوٰۃ خوش دلی سے ادا کرو۔''

حاجت اصلیہ کیا ہے۔ علامہ شامیؒ نے اس کے بارہ میں لکھا ہے:

''حاجت اصلیہ وہ چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دور کردیں۔ تحقیقاً جیسے نفقہ، رہائش مکانات، آلات حرب، گرمی اور سردی سے تحفظ دینے والے کپڑے، یا تقدیراً جیسے قرض کیونکہ قرض دار ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اس کو قید سے بچانے کے لیے جو ہلاکت کے مترادف ہے، نصاب کے مال میں سے قرض ادا کرے، اسی

Marfat.com

طرح آلات حرفت، گھریلو سامان، سواری کے جانور، اور اہل علم کے لیے علمی اور فنی کتابیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک جہالت بھی ہلاکت ہی کے مثل ہے۔" (ردالمختار:۲/۲۶۲، بحرالرائق:۲/۲۰۶)

4- قرض سے محفوظ ہونا: وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرطوں میں سے ایک شرط "مال نامی" کا دین سے محفوظ ہونا بھی ہے۔ اگر مال نامی حوائج اصلیہ سے زائد ہے لیکن دین (قرض) سے محفوظ نہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مثلاً کسی شخص کے پاس دس لاکھ روپے حوائج اصلیہ سے زائد ہیں لیکن وہ دس لاکھ کا مقروض بھی ہے تو اس پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں، لیکن اگر وہ ایک لاکھ کا مقروض ہے تو ایک لاکھ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ بقیہ نو لاکھ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

5- حولان حول: اس کا مطلب ہے سال کا گزرنا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی مال کو مالک کے پاس بارہ اسلامی مہینے گزر جائیں، یہ بھی وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط ہے۔ اس کا تعلق مویشی، نقود یعنی سونا چاندی اور سامانِ تجارت سے ہے جب کہ زرعی پیداوار، پھل اور کانوں سے نکالی جانے والی اشیاء وغیرہ پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے سال گزرنے کی شرط نہیں ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک سونے چاندی اور مویشیوں پر وجوب زکوٰۃ کے لیے سال کا گزرنا شرط ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سال گزر جانے تک مال پر زکوٰۃ نہیں ہے۔"

(بدایۃ المجتہد لابن رشد الاندلسی:۲/۲۶۱)

زکوٰۃ کن لوگوں کو دی جائے؟

زکوٰۃ کے مصارف خود قرآن حکیم نے متعین کیے ہیں، اور وہ آٹھ مصارف ہیں جن کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن

السبیل، فریضة من الله، والله علیم حکیم﴾ (التوبہ:٦٠)

''یعنی صدقات تو درحقیقت فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں، اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مقرر ہوں، اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب (دل جوئی) مطلوب ہو، اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں، اور قرض داروں کی مدد کرنے میں، اور اللہ کے راستہ میں، اور مسافروں کی دیکھ بھال میں، یہ اللہ کی طرف سے ایک فریضہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور بڑا دانا اور بینا ہے۔''

(1) فقیر:

فقیر سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی ضروریات زندگی میں دوسروں کی مدد کا محتاج ہو، خواہ جسمانی نقصان یا بڑھاپے کی وجہ سے، یہ محتاجگی مستقل ہو یا عارضی طور پر، کوئی وقتی مدد کا محتاج اور سہارا ملنے پر خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہو جیسے یتیم بچے، بے سہارا بیوائیں اور بے روزگار لوگ مستحق زکوٰۃ ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ غنی اور مال دار پر زکوٰۃ صرف کرنا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ غنی زکوٰۃ وصول کرنے پر عامل مقرر ہو۔

(2) مسکین:

مسکین کے معنی چونکہ عاجزی، درماندگی اور بے چارگی کے ہیں، اس لیے مسکین ایسے شخص کو کہیں گے جو عام حاجت مندوں سے زیادہ درماندہ ہو۔ مسکین فقیر سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ حدیث کی رو سے ایسے لوگ خصوصیت سے مستحق زکات ہوتے ہیں جو انتہائی ضرورت مند اور مفلوک الحال ہونے کے باوجود کسی کے سامنے زبان نہیں کھولتے۔ چنانچہ حدیث میں ہے ''مسکین وہ ہے جو ضروری مال سے بھی محروم ہو اور پہچان میں نہ آئے اور نہ ہی وہ لوگوں سے کھڑے ہو کر مانگتا ہے۔'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''مسکین صرف وہ نہیں جس کے پاس مال نہیں بلکہ مسکین وہ بھی ہے جس کے پاس کوئی کمائی کا ذریعہ نہیں۔

(3) عاملین:

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو سرکاری طور پر صدقات وزکوٰۃ کے نظام پر مامور ہوں۔ وصول یابی، حفاظت، تقسیم اور حساب و کتاب کے کاموں پر مقرر ہوں تو ان کی حیثیت اور کام کی نوعیت کے مطابق ان کو تنخواہیں دی جائیں گی۔ ان کی اس اجرت کا تعلق ان کی غربت و مسکنت سے نہیں ہوگا۔ گویا ان کے مصارف زکوٰۃ کے ذریعہ ہونے والی آمدنی سے پورے کیے جائیں گے۔

(4) مؤلفۃ القلوب:

تالیف قلب کے معنی دل جوئی کے ہیں، یہاں خاص ان لوگوں کی دل جوئی مراد ہے جو بلاوجہ اسلام کی مخالفت میں سرگرم رہے ہوں، ان کے جوش کو ٹھنڈا کرنے اور غیر مسلموں سے ان کو توڑنے کے لیے، اسی طرح جو لوگ تازہ تازہ مسلمان ہوئے ہوں ان میں پچھلے کفر کے اثرات کا اور اسلام دشمنی کا خطرہ ہو، تو ایسے لوگوں کے مستقل یا عارضی وظائف مقرر کر دیئے جائیں تاکہ وہ کفر کی طرف پلٹنے کے بجائے اسلام میں پختہ، اس کے مددگار اور فرمان بردار بن جائیں۔ ان لوگوں پر مال غنیمت اور مال زکوٰۃ وغیرہ خرچ کیے جا سکتے ہیں خواہ وہ مال دار ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کے لیے محتاج یا پردیسی ہونا شرط نہیں ہے۔

(5) فی الرقاب:

گردن چھڑانے کا مطلب غلام کی قیمت ادا کر کے آزاد کرا دینا ہے۔ کوئی غلام اپنی آزادی کے لیے اگر اپنے مالک سے یہ طے کر لے کہ اپنی آزادی کے بدلہ میں میں اتنا روپیہ دوں گا اور مالک یہ روپیہ لینے کے لیے تیار ہو جائے تو زکوٰۃ کے روپے سے اس غلام کی مدد کی جا سکتی ہے تاکہ اس کے بدلہ میں وہ آزاد ہو جائے۔

(6) غارمین:

اس سے مراد ایسے مقروض لوگ ہیں جن کے پاس اگرچہ روپیہ ہے لیکن اگر وہ اس روپیہ کو قرض میں ادا کر دیں تو ان کا روپیہ نصاب سے کم رہ جائے گا۔ تو ایسے مقروض

Marfat.com

حضرات کو بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، خواہ یہ بے روزگار ہوں یا نہ ہوں، اور لوگ انہیں غریب سمجھتے ہوں یا امیر۔ البتہ بعض فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے فضول خرچی اور شاہ خرچیوں میں مال کو بے جا لٹا دیا ہو اور مقروض ہو گیا ہو تو اس کی مدد زکوٰۃ سے جائز نہیں تاوقتیکہ وہ توبہ کر لے۔

(7) فی سبیل اللہ:

ساتواں مصرف زکوٰۃ کا ''فی سبیل اللہ'' ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جہاد کرنے والوں پر جہاد کی رقم خرچ کی جائے۔ اور ان کے لیے اسلحہ اور سامان حرب و ضرب اور کھانے پینے کی اشیاء خریدی جائیں۔ امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ کا یہی مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک غازی اور مجاہد کو اسی وقت زکوٰۃ دی جاسکتی ہے جب وہ محتاج ہو۔ باقی ائمہ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔

موجودہ دور میں بعض حضرات نے ''فی سبیل اللہ'' کی تعیم کے نظریہ کو فروغ دیا ہے اور انہوں نے زکوٰۃ کو ہر کار خیر میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے یہاں تک کہ مساجد اور مدارس کی تعمیر بھی زکوٰۃ کے روپے سے کرنا شروع کر دی۔ یہ لوگ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ''فی سبیل اللہ'' کی تعیم کا نظریہ امام رازیؒ نے بھی پیش کیا ہے۔ امام رازیؒ اگر بڑے عالم تھے لیکن حضرات ائمہ اربعہ اور دیگر مجتہدین فقہاء کی متفقہ رائے کے مقابلہ میں امام رازیؒ کی رائے کی اتنی اہم حیثیت نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل کے لیے (ملاحظہ ہو احقر کی کتاب اسلام کا نظام زکوٰۃ: ص ۱۲۲)

(8) ابن السبیل:

اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس سفر میں مال نہ ہو اگرچہ گھر میں اس کے پاس مال موجود ہو، لیکن حالت سفر میں وہ تہی دست ہو اور مدد کا محتاج ہو تو اس کی زکوٰۃ سے مدد کی جاسکتی ہے۔ (روح المعانی: ۱۰/۱۲۴)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں چار مصارف کا ذکر لام تملیک کے ساتھ کیا ہے اور جب ''رقاب'' کا ذکر کیا تو ''لام'' کے بجائے ''فی'' کا لفظ

استعمال کیا اور فرمایا "وفی الرقاب" اور اس فرق کا کوئی فائدہ ضرور ہے، اور وہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں زکوٰۃ میں ان کا حصہ ان کو دے کر ان کو ان حصص کا مالک بنا دیا جائے اور باقی چار مصارف میں زکوٰۃ میں ان کا حصہ ان کے مصالح اور ان کی بہتری اور ان کے فوائد میں خرچ کیا جائے اور ان کو ان کا مالک نہ بنایا جائے۔ (تفسیر کبیر: ۶/۸۶، ابوسعود: ۳/۱۶۳، روح المعانی: ۱۰/۱۲۴) لیکن جمہور فقہائے احناف تملیک کو ادائیگی زکوٰۃ کا رکن قرار دیتے ہیں، اور یہ زکوٰۃ کی تمام اصناف کے لیے رکن ہے۔ چنانچہ امام کاسائیؒ نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "فقیر کی ہتھیلی پر آنے سے قبل صدقہ رحمٰن کے ہاتھ میں آتا ہے۔"

زکوٰۃ کو مساجد، سرائے، مدرسوں کی عمارات، پانی کی سبیل بنانے، پلوں کی مرمت، مزدوروں کو دفن کرنے اور نیکی کے دوسرے کاموں میں خرچ کرنا جائز نہیں کیونکہ ان میں تملیک بالکل نہیں پائی جاتی یہ اشیاء وقف ہوتی ہیں اور وقف کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔ (بدائع الصنائع: ۲/۴۵۶)

اسی طرح امام ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ "مال زکوٰۃ میں سے مسجد بنائی جائے گی اور نہ میت کو کفن دیا جائے گا کیونکہ ان دونوں صورتوں میں تملیک نہیں ہوتی اور تملیک زکوٰۃ کا رکن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو صدقہ فرمایا ہے اور صدقہ کی حقیقت یہ ہے کہ فقیر و مسکین کو مال زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے۔ (فتح القدیر: ۲/۲۷۲)

کیا ٹیکسوں کی موجودگی میں زکوٰۃ دینا ضروری ہے؟

آج کل اکثر ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ موجودہ دور میں ہر مال دار اور صاحب ثروت شخص مختلف اقسام کے ٹیکس ادا کرتا ہے۔ انکم ٹیکس، ویلتھ ٹیکس، سیلز ٹیکس اور پراپرٹی ٹیکس وغیرہ، اور ان ٹیکسوں کی مجموعی مقدار زکوٰۃ کی مقدار سے بڑھ جاتی ہے، علاوہ ازیں ٹیکسوں کے بھی کئی مصارف وہی ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں یعنی معذوروں کی مدد، بے روزگاروں کو روزگار کی فراہمی، غریبوں کی تعلیم اور علاج کی سہولتیں مفت

Marfat.com

فراہم کرنا وغیرہ۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تمام ٹیکس زکوٰۃ دینے سے مستغنی کر دیتے ہیں یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں یہ بات ذہن میں رہے کہ زکوٰۃ میں تین اہم بنیادی امور کا پایا جانا ضروری ہے۔

1- وہ متعین مقداریں جو شریعت نے مقرر کی ہیں یعنی عشر، نصف عشر اور ربع عشر وغیرہ۔

2- اللہ کے حکم کی ادائیگی کی نیت اور اس حکم کو فرض عبادت سمجھ کر انجام دینا۔

3- قرآن حکیم کے بیان کردہ آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کی تقسیم۔

یہ تینوں امور حکومت کے لاگو کردہ ٹیکسوں میں نہیں پائے جاتے۔ موجودہ دور میں ہماری زندگیوں میں ایک قسم کا تضاد پایا جاتا ہے۔ مسلمان ایک طرف تو زکوٰۃ کو فرض اور عبادت تصور کرتے ہیں اور دوسری طرف دین اسلام بحیثیت ایک نظام کے اپنی زندگیوں میں جاری نہیں کرتے یعنی وہ دین کو مانتے ہیں لیکن اس کو جاری نہیں کرتے۔ مسلمان حکمران تاریخ کے ہر دور میں زکوٰۃ وصول کرتے رہے ہیں اور مسلمان اپنے تمام اموال کی زکوٰۃ باقاعدگی سے دیتے رہے ہیں۔ اس میں بعض حکمرانوں اور بعض مسلمانوں سے کوتاہی ضرور ہوئی ہے لیکن کسی دور میں ایسا نہیں ہوا کہ زکوٰۃ کلیتہً معطل ہو گئی ہو، اور مسلمانوں نے کلیتہً نظام زکوٰۃ کو خیر باد کہہ دیا ہو، لیکن جب غیر ملکی طاقتیں عالم اسلام پر قابض ہو گئیں اور انہوں نے اسلامی نظام حیات کو ختم کر کے اپنا نظام حیات جاری کر دیا اور اپنے نظام تعلیم کی مدد سے مسلمانوں میں ایک ایسی نسل اٹھائی جو اسلامی عقائد کے بارہ میں شکوک وشبہات سے دوچار اور اسلام کے فرائض کے بارہ میں تذبذب کا شکار ہو گئی، اور انہوں نے اسلام کے اجتماعی مالی نظام پر ضرب لگانے کے لیے نظام زکوٰۃ کو ختم کر دیا اور اس کی جگہ ٹیکس جاری کر کے سرمایہ دارانہ سودی نظام کی بنیاد رکھ دی۔ اب اگرچہ اسلامی ممالک میں مغربی سامراج رخصت ہو چکا ہے لیکن وہ اپنے پیچھے اپنی تیار کردہ ایک ایسی نسل چھوڑ گیا ہے جس نے تہذیب مغرب کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اب یہ نسل سامراج کے تفویض کردہ فرائض کو انجام دے رہی ہے۔ اسلام کو رجعت

Marfat.com

اور پس ماندگی قرار دیتی اور مغرب کے لادینی طرز زندگی کو ترقی اور حضارت کا نام دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا سے زکوٰۃ بحیثیت ایک نظام ختم ہو چکی ہے، اور اگر بعض ارباب خیر اور اصحاب ثروت زکوٰۃ نہ دیتے رہتے تو زکوٰۃ کا نام تک باقی نہ رہتا۔

کن مالوں پر زکوٰۃ فرض ہے؟

وہ اموال جن پر زکوٰۃ فرض ہے ان کو قرآن حکیم نے بیان نہیں فرمایا اور نہ ہی ان کی شرائط کو بیان کیا ہے۔ ان تمام امور کی تفصیلات احادیث نبویہ میں ملتی ہیں۔

مال ہے کیا؟

جب اللہ تعالیٰ نے مال پر زکوٰۃ مقرر کی تو اب دیکھنا یہ ہے کہ مال ہے کیا؟ اور قرآن اور حدیث میں جو مال کا لفظ آیا ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ اہل عرب کے نزدیک ہر وہ شی مال ہے جس کے حاصل کرنے اور اسے اپنی ملکیت میں رکھنے کی طرف طبیعت مائل ہو اور انسان میں اس کی خواہش موجود ہو۔ اس مفہوم کے لحاظ سے اونٹ، گائے، بکریاں، زمینیں اور سونا چاندی مال ہیں۔ اسی لیے لغت کی کتابوں میں ہے کہ جس چیز کے تم مالک ہو جاؤ وہ مال ہے، چنانچہ گاؤں کے رہنے والے لوگ عرفاً جانوروں کو اور شہر میں رہنے والے لوگ سونا چاندی کو مال کہتے ہیں۔ (القاموس: ۴/۵۲)

شریعت میں مال ہر وہ شی ہے جس پر کسی کا قبضہ ہو سکے اور جس سے رواج کے مطابق فائدہ اٹھایا جا سکے جیسے زمین، جانور اور سونا چاندی وغیرہ مال ہیں۔ چنانچہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ اصول فقہ کے ماہرین کے نزدیک مال وہ ہے جسے ضرورت کے وقت کے لیے ذخیرہ کر کے رکھا جا سکے جو ظاہر ہے کہ ٹھوس مادی اشیاء ہی کو ذخیرہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے منافع اور فوائد کو نہیں کیا جا سکتا۔ (بحر الرائق: ۲/۲۱۷)

سونے اور چاندی پر زکوٰۃ:

سونا اور چاندی انسان کے آغاز آفرینش ہی سے انسانی معاشرہ میں زر نقد اور اشیاء کی قیمت کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں، اسی لیے شریعت نے ان دونوں کو مال نامی

Marfat.com

قرار دیا ہے اور ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے، خواہ یہ زرنقد کی صورت میں ہوں یا زیورات یا کسی اور صورت میں، لیکن فقہاء نے سونے اور چاندی پر زکوٰۃ کے موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(1) زرنقد کی زکوٰۃ (2) زیورات اور آرائشی اشیاء کی زکوٰۃ

زرنقد پر زکوٰۃ:

شروع ہی سے انسان زرنقد کے استعمال کی طرف متوجہ ہوا۔ اگرچہ اس سے قبل انسانی معاشرہ میں طریقۂ تبادل تھا یعنی اشیاء کا اشیاء سے تبادلہ، لیکن بعد میں سونے اور چاندی کو زرنقد کے طور پر استعمال کیا جانے لگا جس سے انسانوں کے درمیان معاملات بڑی سہولت اور آسانی سے طے پانے لگے۔ سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت کے وقت بھی عرب سونا چاندی کو اشیاء کی خرید و فروخت میں استعمال کرتے تھے۔ سونے کا سکہ ان کے ہاں دینار کہلاتا تھا اور چاندی کا درہم۔ آپ ﷺ نے سونے اور چاندی کو زرنقد تسلیم فرما کر شریعت کے بہت سے احکام جاری فرمائے جن میں ایک زکوٰۃ بھی تھی۔

چنانچہ قرآن حکیم نے اسی نقود زر یعنی سونا اور چاندی پر زکوٰۃ کو فرض کیا۔ فرمایا:

> ”جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں بڑی دردناک سزا کی خوشخبری سنا دیجئے۔ اس روز اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی، پھر اسی سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔“ (توبہ:۳۴۔۳۵)

اسی وجہ سے مسلمان ہر دور میں اس بات پر متفق رہے ہیں کہ سونے اور چاندی پر زکوٰۃ ہے۔ زرنقد پر زکوٰۃ اس لیے فرض کی گئی تا کہ یہ گردش (Circulation) میں رہے اور لوگ اسے اپنے ہاں روک کر ”کنز“ نہ بنالیں۔ اگر لوگوں نے زرنقد کو روک لیا تو معاشرہ میں کساد بازاری کو فروغ ہوگا اور اقتصادی تگ و دو سکڑ کر رہ جائے گی اور ہر شخص

کی جیب تک پیسہ نہیں پہنچے گا۔ اور جب سوسائٹی میں زر نقد یعنی مال ایک جگہ کنز کی صورت میں رک جائے گا تو تمام سوسائٹی مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ جیسے جسم انسانی میں اگر کسی حصہ میں دورانِ خون رک جائے تو وہ حصہ مفلوج ہو جاتا ہے۔ جب ہر سال زر نقد پر زکوٰۃ واجب ہو گی خواہ اس مال کو نفع بخش کاموں میں لگایا گیا ہو یا نہ لگایا گیا ہو تو آدمی اس کو نفع بخش کاموں میں لگانے پر مجبور ہو جائے گا اور اس طریقہ سے مال پورے معاشرہ میں گردش کرے گا وگرنہ ہر سال اس مال پر زکوٰۃ دیتے دیتے بالآخر وہ ختم ہو جائے گا۔ گویا مال کے انجماد اور اس کے چند ہاتھوں میں سکڑنے سے روکنے کا بہترین ذریعہ نظام زکوٰۃ ہے۔ یہ نظام ایک آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے مال کو پیداواری کاموں میں لگائے اور اس سے مستقل آمدنی حاصل کرے ورنہ زکوٰۃ مال کو کھا جائے گی۔

زر نقد پر زکوٰۃ کی مقدار:

زر نقد پر زکوٰۃ کی مقدار احادیث نبویہ اور اجماع امت سے اڑھائی فیصد ہے اور اس مقدار میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (المغنی:۳/۷)

فصلوں اور پھلوں کی زکوٰۃ عشر (دسواں حصہ) اور نصف عشر (بیسواں حصہ) ہے، لیکن زر نقد تخفیف کر کے چالیسواں یعنی اڑھائی فیصد کر دیا۔ اس لیے کہ زمین کی نسبت سے فصلوں اور پھلوں کی مقدار اتنی ہوتی ہے جتنا مال میں منافع کی نسبت ہوتی ہے۔ گویا زرعی پیداوار میں زکوٰۃ منافع پر ہے جب کہ زر نقد میں زکوٰۃ اصل رأس المال پر ہوتی ہے خواہ اس میں افزائش ہو یا نہ ہو اور منافع حاصل ہو یا نہ ہو۔

آج کل کے بعض متنورین کا خیال ہے کہ اس ترقی پذیر معاشرہ میں زکوٰۃ کی یہ مقدار ناکافی ہے، لہٰذا حکومت وقت یا ایک اسلامی ریاست اس میں اضافہ کر سکتی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے، اس مقدار میں نہ تو کوئی اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ کمی۔ کیونکہ مقداروں میں کسی شی کی حد مقرر کرنا صرف شارع علیہ السلام کا حق ہے۔ ان میں قیاس موثر نہیں ہے، لہٰذا نص اور اجماع سے ثابت شدہ مقداریں کسی کے کہنے پر تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ اگر زکوٰۃ کی مقدار میں تبدیلی حکومتوں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو ''ہر کہ آمد عمارت نو ساخت''

Marfat.com

ہر حکمران اس میں اپنی مرضی سے اضافہ کر کے اسے بازیچۂ اطفال بنا دے گا۔ پھر جس شی میں زیادتی ہوسکتی ہے اس میں کمی بھی کی جاسکتی ہے اور اسے بالکلیہ ختم بھی کیا جاسکتا ہے۔

زرنقد کا نصاب:

جس طرح شریعت نے چرانے والے جانوروں اور فصلوں کا زکوٰۃ کے لیے نصاب مقرر کیا ہے اسی طرح زرنقد کا نصاب بھی مقرر کیا ہے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''پانچ وسق (۳۲ من) سے کم (زرعی پیداوار) میں زکوٰۃ نہیں ہے، نہ پانچ اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ ہے، اور نہ ہی پانچ اوقیہ (دو سو درہم یا ساڑھے باون تولہ یا ۶۱۲.۳۶ گرام چاندی سے کم میں زکوٰۃ ہے۔'' (مسلم حدیث نمبر:۲۱۵۹)

اور سونے کا نصاب بیس دینار یا بیس مثقال جو ساڑھے سات تولے یا ۸۷.۴۸ گرام کے برابر ہے۔ اس سے کم مقدار پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ اور جب اس مقدار پر ایک سال گزر جائے تو چالیسواں حصہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عہد نبوت میں چاندی کے سکے (یعنی درہم) عرب میں کثرت سے استعمال ہوتے تھے۔ (المصنف لابن ابی شیبہ:۳/۲۲۲)

اسی لیے مشہور احادیث میں فرض زکوٰۃ اور اس کے نصاب اور مقداروں کے بارہ میں دراہم کی صراحت موجود ہے۔ اور جہاں تک سونے کے سکوں یعنی دینار کا تعلق ہے تو اس کے نصاب زکوٰۃ کے بارہ میں اس درجہ کی قوی احادیث موجود نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ سونے کے نصاب زکوٰۃ پر فقہائے امت کا ایسا اجماع نہیں ہے جیسا کہ چاندی کے نصاب زکوٰۃ پر ہے۔ (ملاحظہ ہو المغنی لابن قدامہ:۳/۱، نیل الاوطار:۴/۱۳۹)

چنانچہ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ:

> ''احادیث صحیحہ میں سونے کے نصاب کا ذکر نہیں ہے۔ بعض احادیث میں سونے کا نصاب بیس مثقال بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ

سب روایات ضعیف ہیں۔ البتہ معتبر فقہائے اسلام کا اس امر پر اجماع ہے۔" (نووی شرح مسلم: ۳۱۶/۱)

مال تجارت پر زکوٰۃ:

اسلام میں حلال اشیاء کی تجارت جائز ہے اور اس پر نفع حاصل کرنا بھی اسلام میں بالکل جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ تجارت کی مشغولیت انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد اس کے ذکر سے غافل نہ کر دے۔ اسلام میں مال تجارت پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ سامان تجارت کی تعریف فقہاء نے یہ کی ہے کہ جو اشیاء فائدہ حاصل کرنیکی غرض سے خرید وفروخت کے لیے مہیا کی گئی ہوں، وہ سامان تجارت ہے۔ اس پر ایک سال گزر جائے اور اس کی قیمت بقدر نصاب ہو تو اس پر اس کی قیمت کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ لازم آئے گی۔ یہ زکوٰۃ اس اصل مال پر ہے جو تجارتی گردش میں ہو اور اس کے منافع پر بھی۔ صرف منافع پر نہیں ہے، لہٰذا ابن حزمؒ کا یہ کہنا کہ مال تجارت پر زکوٰۃ نہیں ہے درست نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿یاایھا الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض﴾ (بقرہ: ۲۶۷)

"اے ایمان والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین میں سے تمہارے لیے نکالا ہے، اس میں سے بہتر حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔"

امام ابوبکر ابن العربیؒ نے لکھا ہے کہ:

"ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ کسب سے مراد تجارت اور زمین سے نکلنے والی اشیاء سے مراد فصلیں اور نباتات ہیں یعنی کسب کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو زمین سے حاصل ہوتا ہے جس میں تمام نباتات آجاتے ہیں، اور دوسری قسم کسب کی وہ ہے جو زمین پر سعی و کوشش اور جدوجہد سے حاصل ہوتا ہے، مثلاً تجارت، پیداوار، مال غنیمت کا حصول وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے اغنیاء

Marfat.com

بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے تنگ دستوں اور فقراء کو بھی دیں۔ ان طریقوں کے مطابق جن پر رسول اللہ ﷺ نے عمل فرمایا ہے۔" (احکام القرآن: ۱/۲۳۵)

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ بعض اہل ظاہر کی رائے یہ ہے کہ تجارتی سامان پر زکوٰۃ نہیں ہے، مگر یہ رائے برملا اجماع امت کے خلاف ہے۔" (معالم السنن: ۲/۲۲۳)

مختصر یہ کہ قرآن وسنت، اجماع امت اور قیاس کی رو سے مال تجارت پر زکوٰۃ ضروری ہے، لیکن فقہاء اسلام نے اس کے لیے کچھ شرائط بھی بتائیں ہیں۔

مال تجارت کی شرائط:

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہر خریدی ہوئی شی مال تجارت نہیں ہوتی۔ ہم مختلف اشیاء اپنے استعمال کے لیے خریدتے ہیں۔ یہ مال تجارت نہیں بلکہ یہ ذاتی استعمال کی چیزیں ہوتی ہیں۔ مال تجارت کی تعریف فقہاء نے یہ کی ہے کہ "تجارت مال کے بدلہ میں کسب کرتا ہے۔" (ردالمختار: ۲/ ۱۸) اور مال تجارت وہ ہے جو حصول نفع کے لیے خرید وفروخت کے لیے تیار کیا جائے۔ مطلب یہ کہ کوئی شی اس نیت سے خریدی جائے کہ اسے فروخت کر کے نفع حاصل کیا جائے۔ کسی مال کو تجارتی مال قرار دینے کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک عمل اور دوسری نیت۔ (ردالمختار: ۲/ ۱۸) اس لیے اگر نفع کمانے کی نیت ہو لیکن تجارت کا فعل انجام نہ دیا، یا تجارتی فعل انجام دیا مگر نیت نہ ہو تو یہ تجارت نہ ہوگی۔ اگر کسی شخص نے کوئی شی اپنے ذاتی استعمال کے لیے خریدی جیسے کار سواری کے لیے اور نیت یہ کی کہ اگر منافع ملا تو فروخت کر دوں گا، تو یہ موٹر مال تجارت نہ ہوگی۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص نے تجارت کی غرض سے کئی موٹریں خریدیں اور ان میں سے ایک اپنے استعمال میں رکھی۔ تو اس استعمال سے وہ موٹر سامان تجارت سے خارج نہ ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل نیت کا اعتبار ہے۔

مال تجارت پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ:

ایک تاجر کے لیے اپنے مال پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا طریقہ

Marfat.com

فقہاء نے اس طرح لکھا ہے کہ جب زکوٰۃ کی ادائیگی کا وقت آجائے تو تاجر اپنی نقدی اور تجارتی سامان کا جائزہ لے اور تمام سامانِ تجارت کی قیمت متعین کرے۔ پھر اس رقم میں اس قرض کو بھی شامل کر لے جو اس نے کھانے پینے اور آسودہ حال لوگوں کو دے رکھا ہے اور اس کے ملنے کی امید ہے۔ پھر اس مجموعی رقم سے وہ قرضہ جات جو اس نے بنک یا دوسرے لوگوں سے لے رکھے ہیں ان کو منہا کرے اور بقیہ رقم کی زکوٰۃ کرے۔

زکوٰۃ کے بارہ میں شریعت کا عمومی اصول یہ ہے کہ جس مال کا نصاب ہو زکوٰۃ اسی میں سے ادا کی جائے، البتہ اگر کوئی شخص عین مال میں سے زکوٰۃ دینے کے بجائے اس کی قیمت سے زکوٰۃ دے تو فقہاء نے اسے بھی جائز اور درست قرار دیا ہے۔

(درمختار مع ردالمختار: ۲/۳۴)

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے اموال تجارت کے کس نرخ کا اعتبار کیا جائے گا جس نرخ پر مال خریدا ہے یا آئندہ جو متوقع نرخ ہو اس کا، یا جس روز سال گزرا ہے اور زکوٰۃ واجب الادا ہوئی ہے اس دن کا نرخ یا پھر جس روز زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہے اس دن کا نرخ یا متوقع نرخ؟ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جس دن سال پورا ہوا ہے اس دن کا جو نرخ ہو، خواہ کم ہو یا زیادہ اس دن کے نرخ کے حساب سے زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، اور صاحبینؒ کے نزدیک جس دن زکوٰۃ ادا کر رہا ہے اس روز کی قیمت کا اعتبار ہوگا خواہ قیمت کم ہو یا زیادہ۔

(بدائع الصنائع: ۲/۳۲، ردالمختار: ۲/۲۴، فتاویٰ عالمگیری: ۱/۱۸۰)

علماء کے نزدیک صاحبینؒ کی رائے زیادہ قابل عمل ہے، اس لیے کہ زکوٰۃ میں اصلاً تو وہ شی واجب ہوتی ہے جس کی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے۔ قیمت وہ اس کے عوض اور بدل کے طور پر ادا کرتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ادائیگی کے وقت وہ اتنی رقم ادا کرے جس میں اس سامان کا بدل بننے کی صلاحیت موجود ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر قیمتوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے اتار کم ہی ہوتا ہے، اس لیے ادائیگی کے وقت کی قیمت کا اعتبار کرنے کی صورت میں فقراء کے لیے زیادہ نفع کی توقع ہے اور یہ بجائے خود زکوٰۃ کے احکام میں ایک اہم وجہ ترجیح ہے۔ سامان کی قیمت اس شہر کی لگائی جائے گی جس میں وہ رہتا ہے دوسرے شہروں کی نہیں لگائی جائے گی۔ (بحرالرائق: ۲/۲۲۹)

اب ایک سوال یہ ہے کہ سامان تجارت میں ادائیگی کے روز جو نرخ لگایا جائے گا وہ تھوک (Whole Sales) کا ہوگا یا خوردہ (Retail) کا ہوگا۔ اس بارہ میں تاجر کی کیفیت کا اعتبار ہے۔ اگر تاجر تھوک کا کاروبار کرتا ہے تو اس صورت میں تھوک کی قیمت معتبر ہوگی اور جو تاجر خوردہ فروشی کا کام کرتا ہے وہ خوردفروشی کے اعتبار سے قیمت لگا کر زکوٰۃ دے، اور جو تاجر دونوں طرح خرید وفروخت کرتا ہے تو وہ "تقویم بالانفع للفقراء" کے اصول کے تحت خوردہ قیمت لگا کر زکوٰۃ دے۔

تجارتی زمین پر زکوٰۃ:

جو شخص زمین کا کاروبار کرتا ہے اس طرح کہ خریدتا ہے اور فروخت کرتا ہے، رکھتا نہیں ہے۔ مالک زمین سے ایک پلاٹ خرید لیا اور پھر ضرورت مندوں کے ہاتھ جس کو جس قدر ضرورت ہے قیمتاً دیتا ہے تو ایسی زمین مال تجارت قرار پائے گی، اور جس طرح مال تجارت کی قیمت لگائی جاتی ہے اسی طرح اس تجارت والی زمین کی قیمت بھی جو اس وقت ہے، لگائی جائے گی اور نقد سے اس کی قیمت کو ملا کر مالک زکوٰۃ ادا کرے گا۔ نہ پہلے کی قیمت کا اعتبار ہوگا اور نہ ہی آئندہ کی متوقع قیمت کا اعتبار ہوگا بلکہ دیکھا جائے گا کہ اس وقت اگر کوئی خریدار ہوتا تو وہ کس بھاؤ سے لیتا اور مالک زمین کس نرخ سے دیتا۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ:

جب آدمی مل کر کوئی کارخانہ یا کمپنی کھولتے ہیں اور خود ان کے پاس پورا سرمایہ نہیں ہوتا تو وہ اس کے حصص متعین کر لیتے ہیں اور ہر حصہ کی ایک مناسب قیمت زمانہ کے اعتبار سے مقرر کر لیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ فی حصہ کی قیمت اتنی ہے۔ پھر ہر شخص اپنی صواب دید یا حیثیت کے مطابق جتنے چاہے شیئرز (Shares) خرید سکتا ہے۔ اور سال میں کمپنی کو جو منافع ہوگا وہ تمام حصہ خریدنے والوں پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ ان حصوں کی جو قیمت اس وقت بازار میں ہوگی ہر حصے والے کو اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی کہ یہ روپے بہ غرض تجارت لگائے گئے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ وہ صاحب نصاب بنتا ہو۔ (ردالمختار: ۲/۱۳)

Marfat.com

جو روپیہ شیئرز کی صورت میں کسی حصہ دار نے کمپنی کے کاروبار میں لگایا ہے، وہ اس میں دو قسم سے لگا ہے۔

1- کمپنی کی حاجت اصلیہ میں

2- کمپنی کے Running Capital میں

جو سرمایہ حاجت اصلیہ میں لگا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے رننگ کیپٹل میں فی حصہ کا تناسب Balance Sheet سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے، اور یہ حصہ مال واجب الزکوٰۃ شمار ہونا چاہیے اور اس کی مالیت کا شمار مارکیٹ ریٹ سے ہوگا۔

کمپنی کے شیئرز کی مستقل خرید وفروخت ہوتی ہے تو ایسے شیئرز کا شمار اموال تجارت میں ہوگا اور اس کی پوری مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ چنانچہ علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

''اموال تجارت تو ان میں زکوٰۃ واجب ہے۔ برابر ہے کہ مال تجارت سامان ہو یا زمین ہو یا مکیلی یا موزونی چیز میں سے کچھ ہو۔''

(بدائع الصنائع:۲/۵۴)

اگر کمپنی کے شیئرز کی مستقل خرید وفروخت نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ صنعتی کمپنی ہے یا کرایہ پر لوگوں کو سامان وغیرہ دیتی ہے تو ایسی صورت میں آلات صنعت اور کارخانہ کی مشینیں جو اموال نامی سے نہیں ہیں، ان کو مستثنیٰ کر کے تیار شدہ مالوں کے شیئرز میں ہر شخص پر نصاب کی شرط کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اسی طرح کرایہ کے سامان کو علیحدہ کر کے صرف اس کے کرایہ اور نفع پر جو حاصل ہوتا ہے، ہر شخص کے شیئرز میں سال گزرنے اور نصاب کی شرط کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہوگی۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

''حصص اگر بہ نیت تجارت خریدے ہوں یعنی خود حصص کی خرید و فروخت مقصود ہو تو حصص کی کل قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ حصص کی صرف اس مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی جو تجارت میں لگی

Marfat.com

ہوئی ہے۔'' (احسن الفتاوی:۴/۲۸۷)

ایسا ہی حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا تھانویؒ اور دیگر مفتیان کرام نے لکھا ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ:

پروایڈنٹ فنڈ کی حیثیت یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کی ہر ماہ کی تنخواہ سے تھوڑا سا حصہ حکومت تنخواہ دینے سے پہلے لازماً کاٹ لیتی ہے اور اس کو ایک مخصوص کھاتہ میں جمع کردیا جاتا ہے۔ جتنا روپیہ ملازم کی تنخواہ سے کاٹا جاتا ہے اتنا روپیہ سرکار اپنے ملازم کے مستقبل کے پیش نظر اپنی طرف سے جمع کراتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پوری رقم ملازم کو دے دی جاتی ہے۔ اس رقم پر حکومت ایک اضافی رقم بنام انٹرسٹ بھی دیتی ہے۔ اس مجموعہ کو پراویڈنٹ فنڈ کہا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اور اگر واجب ہوگی تو کب سے واجب ہوگی؟ پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اس کے ملنے کے بعد ایک سال گزرنے پر واجب ہوتی ہے۔ چنانچہ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

''پراویڈنٹ فنڈ پر جمع شدہ رقم پر بھی زکوٰۃ نہیں۔ بعد وصولی کے حولانِ حول پر زکوٰۃ ہوگی۔'' (کفایت المفتی:۴/۲۴۶)

یہی بات حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ نے لکھی ہے۔

(ملاحظہ ہو فتاوی دار العلوم:۶/۳۳۱)

مویشیوں پر زکوٰۃ:

شریعت میں مویشیوں کی ہر نوع اور ہر مقدار پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے بلکہ اس میں بھی مال و دولت اور سونا چاندی کی طرح زکوٰۃ کے لیے کچھ شرائط ہیں جیسے نصاب، حولانِ حول، مویشیوں کا چرنے والے جانور ہونا، اور ان جانوروں سے خدمت نہ لی جاتی ہو وغیرہ۔ مویشیوں پر زکوٰۃ کی تفصیل احقر کی کتاب ''اسلام کا نظام زکوٰۃ: ص ۲۵۸ تا ۲۷۸ ملاحظہ فرمائیں۔

زکوٰۃ الفطر:

زکوٰۃ الفطر جس کو صدقۃ الفطر یا فطرانہ بھی کہتے ہیں یہ سنہ ۲ھ میں واجب ہوئی اوراسی سال رمضان المبارک کے روزے بھی فرض ہوئے۔اس کی فرضیت کا مقصود علماء کے نزدیک یہ ہے کہ روزہ دار لغو اور رفث سے پاک وصاف ہو جائیں، اوراس کا کفارہ ہو جائے اور مساکین اور حاجت مندوں کے لیے کھانا اور دوسری ضروریات فراہم ہو جائیں اور وہ عید کے روز سوال کی ذلت سے بچ جائیں۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ الفطر اس لیے فرض فرمائی کہ روزہ دار لغو اور رفث سے پاک ہو جائے اور مساکین کو کھانا میسر آ جائے۔''

(رواہ ابوداؤد فی باب زکوٰۃ الفطر)

حاکم نے بھی اس حدیث کو مستدرک میں روایت کیا ہے۔(مستدرک: ۱/۴۰۹)

زکوٰۃ الفطر اور دوسری زکوٰۃ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ الفطر اشخاص اور افراد پر عائد ہوتی ہے جبکہ دوسری زکوٰۃ مال پر عائد ہوتی ہے۔اسی لیے فطرہ میں ملکیت نصاب وغیرہ کوئی شرط نہیں ہے۔سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ الفطر کی فرضیت کا اعلان رمضان میں فرمایا۔ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ہر مسلمان آزاد اور غلام، مرد اور عورت پر فرض ہے۔جمہور فقہاء کے نزدیک فرضیت کے معنی وجوب کے ہیں۔یعنی زکوٰۃ الفطر واجب ہے۔

صدقات وخیرات:

زکوٰۃ کے علاوہ صدقات کا لفظ ہی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اسلام دولت مندوں اور مال داروں سے زکوٰۃ لینے کے بعد بھی ان کو قومی اور اجتماعی اور انفرادی انفاق کی ذمہ داری کے بار دوش سے سبک دوش نہیں کرتا بلکہ زکوٰۃ کی علاوہ انفاق کے لیے دوسری راہیں کھولتا ہے اور ان کو صدقات سے تعبیر کرتا ہے۔ پھر صدقات کی دو قسمیں ہیں۔نافلہ اور واجبہ۔ نافلہ کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے کہ وہ کار خیر میں اپنی

Marfat.com

مرضی سے حصہ لے۔اور واجب پھر دو حصوں پر منقسم ہے ایک انفرادی جیسے صدقۃ الفطر، غریب والدین کا نفقہ اور غریب اولاد کا نفقہ۔ دوسری قسم اجتماعی ہے یعنی زکوۃ کی طرح قوم کی اجتماعی اقتصادی حالت کی بہتری کے لیے خرچ کرنا جیسے جہاد اور رفاہ عامہ کے اہم مواقع پر زکوۃ اور عشر کے علاوہ ارباب دولت وثروت سے حسب تقاضا حقوق اجتماعی وصول کرنا۔صدقات کی کچھ تفصیل گذشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے۔

........❖❖❖........

Marfat.com

اسلام کا قانون وراثت

اپنی ضروریات پر خرچ کرنے، راہ خدا میں صدقہ و خیرات کرنے اور زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی کے باوجود جو دولت ایک جگہ سمٹ کر رہ گئی ہو، اس ارتکاز کو بھی اسلام پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کو پھیلانے کے لیے اسلام نے ایک اور تدبیر اختیار کی جس کو قانون وراثت کہتے ہیں۔ اس قانون کی غرض و غایت یہ ہے کہ جو شخص مال اور جائداد چھوڑ کر مر جائے، وہ جائداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ، زیادہ ہو یا کم، اس کو بھی مختلف حصوں میں تقسیم کر کے دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں ایک ضابطہ کے تحت منقسم کر دیا جائے۔ اور اگر کسی کا کوئی وارث نہ ہو تو بجائے اس کے کہ اس کو متبنٰی بنانے کا حق دیا جائے، اس کے مال کو اسلامی ریاست کے بیت المال میں داخل کر کے قومی ملکیت قرار دیا گیا ہے تا کہ اس سے پوری قوم مستفید ہو۔ اس سے پتہ چلا کہ اسلام کسی صورت بھی ارتکاز دولت کو پسند نہیں کرتا۔

وراثت ایک غیر اختیاری انتقال ملکیت ہے جس کے ذریعہ ایک مرنے والے کا ترکہ اس کے ورثاء میں بطریق جانشینی منتقل ہو جاتا ہے۔ کسی مرد یا عورت کے انتقال پر اس کے مال متروکہ کے بارہ میں قرآن حکیم کا قانون یہ ہے کہ وہ مال اس کے والدین، اس کی اولاد اور اس کی بیوی یا شوہر کے درمیان ایک مقرر نسبت کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔ اور اگر والدین اور اولاد نہ ہو تو اس کے حقیقی، علاتی اور اخیافی بھائی (یعنی صرف ماں شریک یا صرف باپ شریک) بھائی بہنوں کو دیا جائے۔ اس کے بارہ میں تفصیلی احکام سورۃ النساء آیت نمبر: ۷ تا ۱۲ اور آیت نمبر: ۱۷۶ میں بیان ہوئے ہیں۔

اسلام نے جب اس طریقۂ تقسیم دولت کا اعلانِ کیا تو سرمایہ دارانہ ذہنیت

رکھنے والی قوموں نے اس کے خلاف یہ نعرہ بلند کیا کہ اگر جاگیروں یا تعلقہ میں تقسیم وراثت کا یہ نظام جاری کر دیا جائے تو اس سے دولت وثروت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تھوڑے ہی عرصہ میں بڑی بڑی جائدادیں تقسیم ہو کر چند کھیتوں کی صورت میں باقی رہ جائیں گی۔ اسی وجہ سے انگریز کی عمل داری کے زمانہ میں بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں نے حکومت انگریزی کو یہ لکھ کر دیا تھا کہ ہم وراثت کے معاملہ میں قرآن حکیم کی پیروی نہیں کریں گے۔ اور یہ صرف اس لیے لکھ کر دیا گیا تھا کہ ان کی جاگیریں منقسم نہ ہوں۔ اور اسی وجہ سے بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار اپنی بیٹیوں کی دوسرے خاندانوں میں شادیاں نہیں کرتے تھے، اور اگر اپنے خاندان میں کوئی لڑکا نہ ملتا تو وہ لڑکی ساری عمر گھر میں کنواری بیٹھی رہتی، اور لوگوں سے یہ کہا جاتا کہ اس کا قرآن شریف سے نکاح ہو گیا ہے۔ گویا قرآن کی حکم عدولی کر کے قرآن کو بدنام کیا جاتا۔ آج بھی پاکستان کے بعض علاقوں میں بڑے بڑے جاگیرداروں کے ہاں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ وگرنہ اس قانون وراثت پر اگر صحیح طور پر عمل کیا جاتا تو ہزاروں ایکڑ پر مشتمل جاگیر دو تین نسلوں میں چند ایکڑ پر مشتمل رہ جائے گی۔ اگرچہ جاگیرداروں نے اپنی جاگیروں کو بچانے کے لیے یہ سارے حربے اختیار کیے لیکن آج زمانہ بدل گیا ہے۔ اسلام نے دنیا میں شعور پیدا کیا اور تقسیم دولت کے اس قانون کو رحمت سمجھا جانے لگا۔ اب ہر شخص کی یہ آواز ہے کہ ارتکاز دولت کو ختم کیا جائے۔ اب قریباً دنیا کے ہر ملک میں ارتکاز دولت کو روکنے کے لیے قانون بن رہے ہیں لیکن اسلام نے ان تمام اقوام کے ترقی پذیر اقتصادی نظریوں سے صدیوں قبل اس سرمایہ دارانہ مذموم نظام معیشت کے خلاف اعلان جہاد کیا اور قانون وراثت کے ذریعہ تقسیم دولت کی راہ کھول دی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

> ''مردوں کا اس (مال) میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑیں، اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں، (وہ مال) تھوڑا ہو یا بہت۔ اس میں (اللہ کا) مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔'' (النساء:۷)

اور سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے

Marfat.com

ارشاد فرمایا:

﴿اقسموا المال بین اھل الفرائض علیٰ کتاب اللہ﴾

(رواہ مسلم وابوداؤد)

''اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق اپنا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کر دیا گیا ہے۔''

اسلام کا یہ قانون وراثت دولت کی تقسیم کے لیے ایک ایسا معتدل اور مدبرانہ طریقہ ہے کہ اگر اس کو صحیح طور پر اختیار کیا جائے اور معاشرہ میں اس کا رواج عام ہو جائے تو نہ اس سے ارتکاز دولت ہونے کا امکان باقی رہتا ہے اور نہ ہی افراد و اشخاص کے مابین افلاس اور فاقہ مستی کو فروغ ہو سکتا ہے کیونکہ اس نظام سے دولت ہر وقت گردش میں رہتی ہے اور اس سے ہر فرد کو فائدہ پہنچتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے وراثت کے اس علم کو ''علم الفرائض'' فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ''لوگو! علم الفرائض خود بھی سیکھو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ کیونکہ وہ نصف علم ہے، اور بے شک وہ بھلا دیا جائے گا۔ اور سب سے پہلے جو علم میری امت سے اٹھا لیا جائے گا وہ علم الفرائض ہے''۔ قرآن حکیم نے سورۃ النساء آیت نمبر: ۷ تا ۱۰ میں ان حصوں کو بیان کیا گیا ہے۔

اسلام کا منشاء یہ ہے کہ مرنے والے شخص کے مال کا دو تہائی تو لازماً قانون وراثت کے مطابق تقسیم ہو اور باقی ایک تہائی مرنے والے کے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے۔ اس طرح مرنے والا اپنے مال کے ایک تہائی ترکہ کے بارہ میں وصیت کر سکتا ہے۔ اس لیے ترکہ کی تقسیم سے قبل اس میں سے تجہیز و تکفین کے اخراجات اور قرض کی ادائیگی کے بعد وصیت کے مطابق ترکہ تقسیم ہوگا۔ اور بقیہ اعزاء و اقرباء میں قانون وراثت کے تحت تقسیم کیا جائے گا۔

قانون وراثت کی معاشی اہمیت:

اسلام کا یہ قانون وراثت ساری دنیا کے نظاموں سے انوکھا ہے۔ یورپ میں

Marfat.com

مرنے والے شخص کا سب سے بڑا بیٹا ہی وراثت کا حق دار ہوتا ہے اور دیگر بیٹوں اور بیٹیوں کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اپنے بڑے بیٹے کو بھی اپنی جائیداد سے محروم کر کے کسی بھی شخص کو اپنی وراثت منتقل کر سکتا ہے جس کا نتیجہ بہت خراب نکل سکتا ہے۔

ہندوؤں میں عورتیں وراثت کی حق دار نہیں ہیں۔ صرف مرد ہی وراثت کے حق دار تسلیم کیے گئے ہیں۔ لیکن اس سب نظاموں کے برعکس اسلام کے نظام معیشت میں تقسیم وراثت میں مردوں اور عورتوں دونوں کو وراثت میں حق دار قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ اس قانون وراثت کے پورے نظام معیشت پر بہت دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اثرات فرد اور معاشرہ دونوں پر مرتب ہوتے ہیں۔

1- سب سے بڑا اثر جو معاشرہ پر اس قانون سے پڑتا ہے وہ ارتکاز دولت کا خاتمہ ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ارتکاز دولت سے روکنے کا دنیا میں اس سے بڑا اور اعلیٰ اور کوئی قانون نہیں ہے۔ اس قانون کے تحت میت کے ترکہ کو ''ذوالفروض''، ''عصبات'' اور ''ذوی الارحام'' میں اس طرح تقسیم کرنے کا منصوبہ قرآن حکیم نے پیش کیا کہ کوئی قریبی عزیز اس سے محروم نہیں رہتا۔ پھر دور کے رشتہ داروں یا ان لوگوں کے لیے جن کو قانون وراثت میں حصہ نہیں ملتا جیسے پوتا اور نواسہ، قانون وصیت مقرر کیا گیا ہے۔ اگر مرحوم کا کوئی قریبی رشتہ دار نہ ہو تو اس کے دور کے رشتہ دار وراثت کے حق دار ہیں۔ اس کے لیے ایک اصول ''الاقرب فالاقرب'' (یعنی پہلے قریبی عزیز اور بعد ازاں دور کے رشتہ دار) مقرر کیا گیا ہے۔ اسلام کے اس قانون وراثت میں جمع شدہ دولت جو معاشرہ میں گردش کر رہی ہے یا نہیں کر رہی، دو تین پشتوں میں تقسیم در تقسیم کے ذریعہ معاشرہ میں پھیل جائے گی اور ارتکاز دولت کے بد اثرات سے معاشرہ محفوظ ہو جائے گا۔

2- جب قانون وراثت کے ذریعہ دولت مختلف عزیزوں اور رشتہ داروں میں تقسیم ہو جائے گی تو جاگیریں بھی تقسیم در تقسیم ہو کر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم

Marfat.com

ہو جائیں اور جاگیرداری نظام خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس کے لیے کوئی قانون بنانے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ اور اس نظام سے وابستہ تمام خرابیاں اپنی موت آپ مرجائیں گی۔

-3 جب دولت تقسیم ہوگی اور دولت کا ارتکاز ختم ہوگا تو وہ خود بخود معاشرہ میں گردش میں آئے گی اور معیشت میں صرف دولت میں اضافہ اور اس کے نتیجہ میں پیداواری عمل میں اضافہ، روزگار کے مواقع میں اضافہ اور پورے ملک میں معاشی ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔

-4 بڑی بڑی جاگیروں میں جاگیردار اپنی زمینوں کی طرف پوری توجہ نہیں دیتے اور نہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی جاگیردار پیداواری عمل میں خود حصہ لیتا ہے بلکہ اس کی زیادہ تر توجہ عیش وعشرت یا پھر ملکی سیاست کی طرف ہوتی ہے۔ اسلامی قانون وراثت کی رو سے جب بڑی بڑی جاگیروں کی تقسیم عمل میں آئے گی تو زمین کے چھوٹے ٹکڑوں پر نئے مالکان زیادہ توجہ اور محنت سے بہتر پیداوار حاصل کر سکیں گے۔ جس کے نتیجہ میں زرعی پیداوار میں زیادتی اور ملکی معیشت کی رفتار میں اضافہ ہوگا جس سے ملک میں زیادہ سے زیادہ افراد کو روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے۔

Marfat.com

اوقاف

انفاق فی سبیل اللہ کے اخلاقی وسائل میں سے ایک بہترین وسیلہ وقف بھی ہے اسلام میں اس کی بہت ترغیب دی گئی ہے۔ وقف کیا ہے؟ وقف اپنی منقولہ یا غیر منقولہ ذاتی ملکیت سے کچھ حصہ نکال کر ''فی سبیل اللہ'' دے دینا، اسلامی اصطلاح میں وقف کہلاتا ہے اور اس وقف کی تمام آمدنی بیت المال یا اس کے لیے ہوگی جس کے لیے وہ وقف کیا گیا ہے جیسے کوئی مسجد وغیرہ۔ اس بارہ میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ نے کیا خوب لکھا ہے کہ:

> ''ارباب ثروت کی شبانہ روز زندگی کا یہ نقشہ ہمارے سامنے ہے کہ ایک شخص اپنی پیدا کی ہوئی یا دوسرے جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت کو اگرچہ اپنی ضروریات سے فاضل سمجھتا ہے پھر بھی دولت کی محبت اور سرمایہ کی فراہمی کا عشق اکثر و بیشتر اس کو حاجت مندوں کی اعانت اور جماعت کے غریب افراد کی امداد کی جانب کسی طرح متوجہ نہیں ہونے دیتا، لیکن جب اس کا آخری وقت آتا ہے اور وہ موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں آکر مغلوب ہو جاتا ہے تو باحسرت و یاس اس دولت سے منہ موڑنے پر مجبور ہوتا ہے، لیکن اس صبح و شام پیش آنے والے منظر کے باوجود دولت میں سرشار دولت مندوں کو وقت سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں آتا، اور یتامیٰ، بیوگان اور دوسرے حاجت مندوں کی فریادیں اس کی ہوس

Marfat.com

کے مستحکم قلعوں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ اس لیے اسلام اہل ثروت کے اجتماعی حقوق سے تغافل کو دور کرنے اور جذبات عالیہ اور اخلاق حسنہ کی روح پیدا کرنے کے لیے توجہ دلاتا ہے کہ اہل ثروت کی فاضل دولت کو کار خیر میں صرف کرنے اور اجتماعی حیات کو فروغ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انسان موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں آنے سے قبل بحالت صحت وتندرستی اور بقاء ہوش وحواس اپنی دولت کا ایک حصہ ''صدقہ جاریہ'' کر دے۔ اسی کا نام ''وقف'' ہے۔

(اسلام کا اقتصادی نظام: ۳۶۱۔۳۶۲)

وقف صدقہ جاریہ کی ایک قسم ہے، اور صدقہ جاریہ کے بارہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے تمام اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، مگر تین عمل ایسے ہیں جن کا ثواب اسے مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے۔ ایک صدقہ جاریہ، دوسرا وہ علم جس سے نفع اٹھایا جائے اور تیسرا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا گو ہو۔ (مسلم)

صدقات جاریہ میں سے وقف سب سے اعلیٰ اور اہم ہے۔ اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے خود بھی اپنی اشیاء وقف کیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ چنانچہ سیدنا ابو طلحہ انصاریؓ انصار مدینہ میں سے ایک مالدار شخصیت تھے اور ان کا سب سے زیادہ محبوب مال مدینہ کا نخلستان تھا۔ سرکار دو عالم ﷺ کی مسجد کے بالکل سامنے اس کا محل وقوع تھا۔ خود سرکار مدینہ ﷺ بھی اس نخلستان میں تشریف لے جاتے اور پانی وغیرہ نوش فرماتے، اور یہ باغ ابو طلحہؓ کے دل کی ایک کلی تھی۔ جب قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی: ''لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون'' (آل عمران: ۹۲) تو ابو طلحہؓ خدمت

Marfat.com

اقدس میں حاضر ہوئے۔ اس باغ کا نام بیرحاء تھا۔ سیدنا طلحہؓ نے عرض کیا: ؟''یا رسول اللہ! مجھے اپنے تمام سرمایہ میں سب سے زیادہ محبوب یہی بیرحاء کا نخلستان ہے۔ میں اس کو اللہ کے راستہ میں خیرات کرتا ہوں۔ آپ ﷺ اسے اپنی صواب دید سے جہاں چاہیں خرچ کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''واہ واہ بہت بڑا اور نفع والا سرمایہ ہے۔ میں اس کو تیرے ہی رشتہ داروں میں تقسیم کروں گا۔ سیدنا ابوطلحہؓ نے کہا کہ جو جی چاہے کیجیے۔ مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ حضور ﷺ نے یہ باغ سیدنا حسان بن ثابتؓ اور سیدنا ابی بن کعبؓ کو دے دیا۔''

اسی طرح کے اور کئی واقعات احادیث کی کتابوں میں ملتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیزیں وقف کر دیں اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دی۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیماری سے اٹھے تھے۔ بے حد کمزور تھے۔ مچھلی کھانے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔ ایک روز بعد بڑی مشکل سے ڈیڑھ درہم میں مچھلی ملی۔ غلام نے پکا کر آپ کی خدمت میں پیش کی۔ اسی اثناء میں کسی سائل نے دروازے پر دستک دی۔ آپ نے نوکر سے فرمایا کہ روٹی اور مچھلی مانگنے والے کو دے آؤ۔ نوکر کو دونوں باتیں معلوم تھیں۔ آپ کا غلبہ اشتیاق اور مچھلی کی دیر بعد دستیابی، لہٰذا اس نے فقیر کو دینے میں لیت ولعل کیا لیکن سیدنا ابن عمرؓ نے اصرار سے کہا کہ جاؤ مچھلی فقیر کو دے آؤ۔ نوکر دروازے پر گیا اور فقیر کو ایک درہم دے کر آ گیا اور بتایا کہ میں نے فقیر کو پیسے دے دیئے ہیں۔ لہٰذا آپ مچھلی نوش فرمائیں۔ سیدنا ابن عمرؓ نے کہا جاؤ روٹی اور مچھلی فقیر کو دے آؤ اور اس سے پیسے بھی واپس نہیں لینا کیونکہ میں نے حضور ﷺ سنا ہے کہ ''جو شخص اپنی خواہش اور چاہت کو دبا کر دوسرے کو اپنے پر ترجیح دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتا ہے۔''

اسلام میں سب سے پہلے واقف سیدنا عمرؓ ہیں جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیدنا عمرؓ کو خیبر میں کچھ زمین ملی۔ آپ نے سرکار دو عالم ﷺ

Marfat.com

کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی: ''یا رسول اللہ! میرا سب سے زیادہ عزیز اور بہتر مال وہ ہے جو خیبر میں میری جاگیر ہے۔ میں اس کو راہ خدا میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ فرمائیں کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اصل زمین کو اپنے قبضہ میں رکھو اور اس کی پیداوار اناج اور پھل وغیرہ اللہ کی راہ میں وقف کر دو۔'' چنانچہ سیدنا عمرؓ نے اس کو وقف کر دیا اس شرط کے ساتھ کہ اس زمین کو نہ فروخت کیا جائے اور نہ وراثت اس میں جاری ہو اور نہ کسی کو ہبہ کیا جائے۔ سیدنا عمرؓ نے فقراء، رشتہ داروں، قیدیوں، ناداروں اور مسافروں کے لیے اس زمین کی پیداوار کو وقف کر دیا۔ البتہ یہ کہا کہ جو شخص اس وقف کا نگران مقرر ہو گا اس کے لیے کوئی گناہ نہیں اگر وہ معروف طریقے سے اس میں سے کچھ لے کر کھالے اور اپنی جائداد نہ بنائے۔'' (رواہ البخاری ومسلم)

علامہ یوسف قرضاوی نے لکھا ہے کہ ''سیدنا عمرؓ کو زمین کی پیداوار وغیرہ اللہ کی راہ میں وقف کر دینے کا حکم دے کر رسول اللہ ﷺ نے خیراتی وقف کے لیے شرعی بنیاد فراہم کر دی جو ہر دور کے مسلم معاشرے میں کافی موثر کردار ادا کرتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ کی ضروریات میں سے کوئی ضرورت ایسی نہیں جس کے لیے معاشرہ کے اہل ثروت نے اپنی دولت کا کچھ وقفہ نہ کر دیا ہو۔''

''یہ اوقاف اپنی وسعت اور تنوع کے اعتبار سے بجا طور پر نظام اسلامی کے لیے باعث صد افتخار رہیں۔ فقراء اور ناداروں کے لیے محتاج خانے قائم کر دیئے گئے جو ان کی خوراک اور لباس کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ خیراتی شفا خانے کھول دیئے گئے جو فقراء اور اہل حاجت کے لیے علاج معالجے اور دوا دارو کی سہولتیں مہیا کرتے تھے، اس کے علاوہ ان سے لوگوں کے لیے سفر وغیرہ کی سہولتیں بھی مہیا کی گئیں۔

''مسلمان اس تلاش میں رہتے تھے کہ معاشرہ میں کون کون سی ضروریات ایسی ہیں جن پر خرچ کیا جائے۔ پھر ان کے لیے اپنے مالوں اور جائیداوں کے کچھ حصے وقف کر دیتے یہاں تک کہ انہوں نے بیمار جانوروں کے علاج اور گم شدہ کتوں کی خوراک

Marfat.com

وغیرہ کے لیے اوقاف قائم کیے۔ جن بے زبان جانوروں کے بارہ میں مسلمانوں کا یہ رحم دلانہ طرزِ عمل تھا تو پھر اشرف المخلوقات انسان کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہوگا:

''وقف املاک قانون اسلامی میں مختلف ضوابطہ کی پابند ہوتی ہے۔ وقف کرنے والے یا بعض شرائط کے تحت وصیت کے ذریعہ ملکیت منتقل کرنے والے نے جو پابندیاں عائد کی ہوں ان کے بارہ میں اسلامی ریاست کی طرف سے وضع کردہ قواعد وضوابط کا اطلاق بھی وقف پر ہوتا ہے۔ وقف املاک پوری سوسائٹی کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہیں۔ نہ تو اسے بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ملکیت کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوسکتی ہے، البتہ جس فرد یا ادارہ کے لیے وقف کی گئی ہو اسے فائدہ اٹھانے کا حق ہوتا ہے۔ وقف املاک کو واپس مالک کی ملکیت میں نہیں لوٹایا جا سکتا۔'' (اسلامی حکمت معیشت: ص ۲۱۰)

اسی وجہ سے مسلم معاشرہ میں شکستہ حال لوگوں اور محتاجوں کے لیے برصغیر پاک و ہند میں اوقاف کا ایک نہایت وسیع نظام قائم تھا جس کا مقصد دولت کو چند ہاتھوں میں سمٹا رہنے کے بجائے پورے معاشرہ میں گردش کرانا تھا۔ انگریز کے جب منحوس قدم برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر پڑے تو اس نے جہاں اپنی حکومت کو مضبوط (Stable) رکھنے کے لیے انگریزی زبان کی ترویج کی وہاں مسلم اوقاف پر بھی قبضہ کر لیا، مسلمان امراء اور حکام نے مدارس، مساجد اور دوسرے دینی احکام سرانجام دینے کے لیے بڑے بڑے اوقاف قائم کیے ہوئے تھے جن کی آمدنی سے یہ ادارے چلتے تھے۔ انگریزوں نے جونہی انگریزی نظام تعلیم کو رائج کیا اور اس کی ترویج کے لیے بڑے بڑے اسکول اور کالج قائم کیے۔ ان کالجوں اور کلیات کو چلانے کے لیے انگریزوں نے مسلمانوں کے اوقاف پر قبضہ کر لیا اور اس آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا جو ان اوقاف سے حاصل ہوتی تھی اور ان ذرائع آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا جن سے مساجد اور مسلمان بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے ہوتے تھے۔ بعض مساجد کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا۔

(جمال الدین الافغانی: العروۃ الوثقی: ۴۱۳، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۲۵، عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ: ص ۵۶)

Marfat.com

لارڈ ہیٹنگز نے ۱۷۷۲ء میں مساجد کے اوقاف پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن یہ ناکام رہا۔ اس کے بعد لارڈ کارنوالس گورنر جنرل ہند نے ۱۷۹۳ء میں پھر اوقاف کو سرکاری تحویل میں لینے کی طرف توجہ کی لیکن اس کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر ۱۸۱۵ء میں انگریزی عدالت نے اپنے ایک انگریزی جسٹس کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے اوقاف کو چھین لیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے انگریزی حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ متوقع تھا۔ بنگال کے صوبہ کے ٹیکس کی آمدنی کی ایک چوتھائی انگریزوں تک نہیں پہنچنے پاتی تھی کیونکہ مساجد اور مدارس کے اوقاف میں شامل اراضی ٹیکس سے مستثنیٰ تھی، اور اوقاف زیادہ تر بنگال ہی میں تھے۔

انگریزی زبان کی ترویج اس وقت تک نہیں ہوسکتی تھی جب تک دینی اور تعلیمی ادارے بند نہ ہوں اور ان کو بند کرنے کا نہایت موثر طریقہ صرف یہی تھا کہ جن اوقاف کی آمدنی پر وہ ادارے چل رہے تھے ان اوقاف پر قبضہ کرلیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کہ اسلامی اوقاف پر قبضہ کرنے سے مسلمان اپنے بہت سے اداروں سے یک قلم محروم ہو گئے۔ اوقاف کے چھن جانے کے بعد مساجد، بڑے بڑے تالاب، پارک اور دوسری کئی ایک چیزیں بالکل ویران ہوگئیں۔ مساجد یا تو گرجا گھروں میں تبدیل کردی گئیں یا پھر انگریزی حکومت کے پارکوں اور چھاؤنیوں میں بدل دی گئیں۔

(شاتلیہ الغارۃ علی العالم الاسلامی: ص ۴۷)

ولیم ہنٹر (William Hunter) نے اپنی کتاب Our Indian Musalman میں لکھا ہے۔

''مسلمان ہم پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو دینی امور کے انجام دینے سے روکا ہے، اوران کے نزدیک ہمارا یہ سب سے بڑا جرم ہے کہ ہم نے ان اوقاف کو چھین لیا ہے جو مسلمان سربراہوں نے مساجد اور تعلیم کے لیے وقف کیے تھے، اور ہم نے

Marfat.com

ان کا دوسرا مصرف نکالا ہے۔''

ہنٹر نے مزید لکھا ہے کہ:

''ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ذلیل کیا اور ان کے قانون وراثت کو مسخ کر دیا۔ ان کے مذہبی شعائر کو مضحکہ بناتے تھے۔ ان کی مساجد کے اوقاف اور سارے منصوبے ہمارے قبضہ میں آ گئے۔''

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسلمانان ہند: ولیم ہنٹر: ص ۲۰۸، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند: ص ۴۰۹ وغیرہ)

اوقاف کی یہ تفصیل اس لیے دی ہے کہ نہ صرف صحابہ کرامؓ اور قرون اولیٰ میں مسلمانوں نے اوقاف بنائے بلکہ ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے دینی خدمت کے لیے بے شمار اوقاف قائم کیے جن سے مساجد، مدارس اور دوسرے دینی ادارے چلتے تھے۔ یہ سب اسلامی تعلیمات کے تحت کیا گیا تھا کیونکہ اسلام میں صرف زکوٰۃ کی نہریں ہی نہیں بلکہ صدقات وخیرات کے چشمے اور وقف و اوقاف کے ڈول نکالنے کی ترغیبات بھی کی گئیں تاکہ امراء واغنیاء کی دولت کے تالاب سے ایک تسلسل کے ساتھ مال غرباء کی نالیوں میں منتقل ہوتا رہے اور وہ اس سے سیراب ہوتے رہیں اور معاشرے میں دولت کی گردش کا عمل کسی طرح رکنے نہ پائے۔ اس طرح کے اوقاف آج بھی قائم ہو سکتے ہیں لیکن پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کے دلوں میں ولت کی ہوس اور حرص نے اس طرح گھر کر لیا ہے کہ وہ ایک روپیہ بھی کسی غریب اور مسکین کو دینے سے پہلے دس بار سوچیں گے کہ دینا چاہیے یا نہ دینا چاہیے۔ اس کی مثال آپ کے سامنے ہے کہ لاہور میں بڑے بڑے کروڑ پتی اور ارب پتی ہیں لیکن ایک بھی سر گنگا رام اور گلاب دیوی نہیں، اور اس سلسلہ میں اگر کسی نے تھوڑا بہت کام کیا ہے تو وہ صرف میاں شریف مرحوم اور منشی خان ہے۔ منشی خان نے غریب ہونے کے باوجود اتنا بڑا ہسپتال بنا کر حکومت کو سونپ دیا۔ مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے یا وقف کرنے کے لیے بہت بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔

مختصر یہ کہ وقف کا ادارہ بھی صدقات وزکوۃ کی طرح دولت کو گردش میں لاتا ہے اور یہ دولت اس طریقہ سے امراء سے غرباء کی طرف منتقل ہوتی ہے جس سے امیر و غریب کی عدم مساوات ختم ہوتی ہے۔ ارتکاز دولت کا خاتمہ ہوتا ہے، غربت وافلاس دور ہوتا ہے اور معاشرہ میں ہر فرد کو زندگی کی بنیادی ضروریات کی فراہمی ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ ہر طریقہ سے عوام کو زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرے، یہاں تک کہ اگر اس کو عوام کے اموال فاضل (Surplus Wealth) پر ٹیکس بھی عائد کرنا پڑتے ہیں تو کرے۔ اس سلسلہ میں امام ابن حزمؒ نے تو اپنی یہ رائے دی ہے کہ:

> ''ہر ملک کے مال دار لوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریب لوگوں کی کفالت کریں اور یہ کہ جب اسلامی ریاست کے دوسرے شہر بہت تکلیف اور مشکل میں مبتلا ہوں تو مال دار اور متمول لوگوں کو اپنی زائد دولت اپنے پاس رکھنا غیر قانونی ہے۔''

لیکن نیشنلائزیشن (Nationalization) کے نام پر لوگوں کی دولت پر ناجائز قبضہ کرنا یہ اشتراکیت میں تو جائز ہے لیکن اسلام میں جائز نہیں ہے۔

اسلام میں معاشی ترقی کا یہ تصور جو آج ہمیں بتایا جا رہا ہے بالکل غلط ہے کہ ملک کو غیروں کا مقروض بنا دیا گیا ہے۔ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور حکومت ''غریب مکاؤ'' پروگرام کو ''غربت مکاؤ'' پروگرام کا نام دے کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔ اسلام میں معاشی ترقی وہ نہیں جو ہمیں بتائی جا رہی ہے بلکہ اسلام میں معاشی ترقی ایک ایسے عمل کا نام ہے جس کے دوران کسی ملک کی حقیقی قومی آمدنی اور فی کس آمدنی کے ساتھ ساتھ اس ملک کے باشندوں کی عزت نفس، آزادی عمل اور دیگر فعالیت میں اضافہ ہو، اور اس ملک کے لوگ مادی اور روحانی لحاظ سے اپنے آپ کو ماضی کے مقابلہ میں بہتر حالت میں پائیں۔ معاشی ترقی میں جہاں ایک طرف ملکی پیداوار میں

Marfat.com

اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف معاشرہ میں حلال اور ضروری اشیاء کی رسد میں اضافہ اور ان اشیاء کی طلب میں مناسب تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ طلب کے ضمن میں اسلام سب سے زیادہ زور آمدنی کی منصفانہ تقسیم پر دیتا ہے اور اسلام کے نظام زکوٰۃ، صدقات و خیرات، اوقاف، نظام وراثت، وصیت اور نظام نفقات اور دیگر نظاموں کا بڑا مقصد آمدنیوں کی منصفانہ اور بہتر تقسیم ہے جس کے نتیجہ میں معاشرہ کی طلب کے ڈھانچہ میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور معیشت میں پھیلاؤ اور ترقی کے امکانات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں میں عزت نفس پیدا کرتا ہے اور یہ بھی اسلامی معاشی ترقی کا ایک اہم عمل ہے۔ اسلام ایک خدا کی غلامی کی تلقین کرتا ہے اور دیگر تمام نام نہاد خداؤں کے آگے جھکنے سے یک قلم روکتا ہے۔ معاشرہ میں ہر فرد کو برابر کا درجہ دیتا ہے۔ ایک فرد کو دوسرے فرد پر فوقیت مال کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے تقویٰ کی وجہ سے دیتا ہے۔ پس معاشی ترقی خوشحال افراد کی عزت نفس میں اضافہ کا ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے ہر فرد کو عزت نفس کا سبب بنتی ہے۔

یہ تھا ایک مختصر سا خاکہ اور ''معیشت و اقتصاد کے اسلامی تصور'' کا نقشہ جس کو بڑے مختصر طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظام معیشت جب دنیا میں رائج تھا تو ہر شخص خوشحال تھا، پورے معاشرہ میں دولت کی گردش ہوتی تھی۔ ہر غریب کی جیب تک پیسہ پہنچتا تھا۔ اور جب سے یہ سرمایہ دارانہ نظام دنیا میں رائج ہوا تو وسائل معاش کو حاصل کرنے کے لیے شدید مسابقت شروع ہوگئی، انسان کی ساری تگ و تاز کا مرکز و محور اس کی مادی احتیاجات کی تسکین ہوگیا، انسان اپنے سرمایہ اور صلاحیتوں کا رخ ان پیشوں کی طرف موڑنے لگا جہاں انہیں زیادہ سے زیادہ منافع کی توقع ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ داروں کے ظالمانہ استحصال نے معاشرہ کو آجر اور اجیر، مالک اور مزدور کے دو متحارب گروہوں میں تقسیم کردیا جس سے معاشرہ کی ہم آہنگی اور سکون پارہ پارہ ہوگیا۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے بڑے بڑے سرمایہ دار پیدا کیے جنہوں نے کاروبار کے

Marfat.com

گھناؤنے طریقے اختیار کیے۔ سودی کاروبار کی قہرمانیوں نے پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معاشی رقابتیں شروع ہوگئیں اور مہنگا طرز زندگی وجود میں آیا کیونکہ رہائش، خوردونوش، علاج معالجہ اور تعلیم وتفریح کا جو معیار عملاً معاشرہ میں رائج ہوتا ہے وہ سرمایہ داروں کی پسند کے مطابق ہوتا ہے جس کی پشت پر ان کا مصنوعی وقار، معاشرتی تفاخر اور نام ونمود کا جذبہ ہوتا ہے۔ معیار زندگی کی اس چمک دمک کو بڑھانے اور اپنے مصنوعی وقار میں اضافہ کرنے کی دھن میں مصارف زندگی بھی بڑھ جاتے ہیں جن کے بوجھ تلے کم آمدنی والے اور متوسط آمدنی والے افراد پس کر رہ جاتے ہیں۔ ان پر غربت کے مہیب سائے منڈلانے لگتے ہیں۔ اس نظام میں معاشی خوشحالی کے ثمرات صرف چند سرمایہ داروں کا مقدر بن کر رہ جاتے ہیں جب کہ عوام کی غالب اکثریت غربت وافلاس کے مہیب سائے میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ''غربت میان امارت'' Plenty (Poverty admist) کا عبرت ناک نظارہ اس نظام کے تحت دیکھنے میں آتا ہے۔

........❖❖❖........

Marfat.com

نحن قسمنا بينهم معيشتهم في الحيوة الدنيا

معیشت و اقتصاد کا اسلامی تصور

حکیم محمود احمد ظفر

Marfat.com